گلِ رعنا

تذکرہ شعرائے اردو

مولانا حکیم سید عبدالحیؒ
(سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

تذکرہ شعرائے اردو

موسوم بہ

گل رعنا

یعنی

اردو زبان کی ابتدائی تاریخ اور اس کی شاعری کا آغاز اور عہد بہ عہد
کے باکمال اردو شعرا کے صحیح حالات اور ان کے منتخب اشعار اور ان کے
ہر قسم کے کلام کے نمونے

مولانا حکیم سید عبدالحیؒ
(سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ)

دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

سلسلۂ دارالمصنفین نمبر ۲۲

نام کتاب : گل رعنا

مصنف : مولانا حکیم سید عبدالحی سابق ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

صفحات : ۵۵۴

ایڈیشن : ۲۰۱۴ء

مطبع : معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

ناشر : دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (یو، پی) انڈیا

باہتمام : عبدالمنان ہلالی

ISBN: 978-93-82201-43-4

Darul Musannefin Shibli Academy
P.O. Box No: 19
Shibli Road, Azamgarh - 276 001 (U.P.)
e-mail: shibli_academy@rediffmail.com
Website : www.shibliacademy.org

فہرست مضامین

گل رعنا

☆☆

دیباچہ طبع جدید

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کی اہم مطبوعات میں ''گل رعنا'' شامل ہے۔ اکیڈمی نے اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا، اس وقت معارف پریس کی طباعت واشاعت معیاری اور مثالی ہوتی تھی، انقلاب زمانہ سے اس کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی، مالی دشواریوں کی وجہ سے طباعت کا معیار مستقل گرتا چلا گیا اور اس کے باعث یہاں سے چھپنے والی کتابوں کا پڑھنا مشکل اور ان سے استفادہ دشوار ہوتا چلا گیا۔

دارالمصنفین نے جب تمام تر دشواریوں کے باوجود اپنی مطبوعات کے جدید اور خوبصورت ایڈیشن شائع کرنے کا فیصلہ کیا تو فطری طور پر علامہ شبلی کی کتابوں اور دوسری اہم مطبوعات کو اولیت دی گئی، المامون، الفاروق، سوانح مولانا روم، سفرنامہ روم ومصروشام اور خطبات کے نئے ایڈیشن اہتمام سے شائع کیے گئے، اب تک سو سے زیادہ کتابوں کے معیاری ایڈیشن شائع کیے جاچکے ہیں، ''گل رعنا'' کا یہ ایڈیشن بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔

یقین ہے کہ قدردانان دارالمصنفین اس نئے قالب میں یہاں کی مطبوعات کی پذیرائی کریں گے۔

اشتیاق احمد ظلی

ڈائریکٹر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

۳/اپریل ۲۰۱۵ء

بسم اللہ الرحمن الرحیم

پیش لفظ

ہندوستان میں انگریزوں کے اقتدار اور جدید نظام تعلیم کے رائج ہونے سے پہلے ایک ہی نظام تعلیم رائج تھا جو فارسی و عربی درسیات، زبان کے قواعد، ریاضی، منطق وفلسفہ، ادب (نثر و نظم)، بلاغت و فن عروض سے لے کر علوم دینیہ (فقہ و اصول وحدیث و تفسیر و علم کلام) پر مشتمل تھا، صدیوں تک ہندوستان میں ذہنی صلاحیتوں کے نشوونما، فطری جوہر و ملکات کے چمکانے اور اعلیٰ ثقافت (کلچر) پیدا کرنے کا یہی واحد ذریعہ تھا جس سے ملک کی انتظامیہ کے لیے اعلیٰ عہدہ دار یہاں تک کہ وزیر سلطنت، محاسب اعلیٰ (اکاؤنٹنٹ جنرل) جس کو عہد قدیم میں "مستوفی الممالک" کے نام سے یاد کرتے تھے، دبیر و منشی (انشاپرداز و سکریٹری) اور قاضی و مفتی یکساں طور پر پیدا ہوتے تھے، مستوفی الممالک مولانا شمس الدین خوارزمی (صدر و محاسب اعلیٰ بعہد غیاث الدین بلبن) خواجہ جہاں محمود گانواں گیلانی وزیر سلطنت بیدر دکن، جملۃ الملک سعد اللہ خاں علامی وزیر شاہجہاں بادشاہ اور تفضل حسین خاں علامہ وزیر سلطنت اودھ کے نام بطور نمونہ پیش کیے جاسکتے ہیں جو سب اسی دور کی یادگار اور اسی طرز تعلیم کا نتیجہ تھے۔

اس عہد میں جس طرح ہر طرح کے باصلاحیت تعلیم یافتہ افراد پیدا کرنے کے لیے جو ہر طرح کی ذمہ داری سنبھال سکیں کوئی اور ذریعہ تعلیم اختیار نہیں کیا جاتا تھا، اسی طرح ادب وانشا، تحریر وتصنیف، نقد سخن اور شاعری اور سخن سنجی کا مذاق اور سلیقہ پیدا کرنے کے لیے بھی کوئی متوازی نظام تعلیم یا اختصاص پیدا کرنے کا کوئی شعبہ موجود نہ تھا جس طالب علم میں جس فن کی فطری صلاحیت اور خداداد مناسبت ہوتی تھی یا اس کے مخصوص محرکات جمع ہو جاتے تھے وہ اس میں امتیاز واختصاص پیدا کر لیتا تھا اور اس کو اپنی زندگی کا مشغلہ بنا لیتا تھا، فارسی ادبیات کا اتنا وافر حصہ اور اس کے ایسے دلکش ودلآویز نمونے نصاب تعلیم میں داخل تھے اور بالعموم اساتذہ ان کو ایسی دلچسپی ودل سوزی سے پڑھاتے تھے کہ (۱) بجز ان لوگوں کے جو فطری طور پر ذوق اور ادبی صلاحیت سے محروم ہوتے تھے عام طور پر فارسی کا ذوق اور شعر و ادب سے لطف لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی تھی اور چوں کہ فارسی اور اردو کا گہرا تعلق ہے اس لیے اردو میں بھی اس سے بیش قیمت مدد ملتی تھی، اس زمانہ میں نصاب تعلیم، زندگی، ملک کی زبان وادب اور مجالس ومعاشرت سے الگ تھلگ کوئی چیز نہ تھی جیسا کہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے واضح طریقہ پر نظر آنے لگا، یہی باکمال اساتذہ جو مسند درس پر بیٹھ کر منطق وفلسفہ کی خشک وبے مزہ کتابیں پڑھاتے تھے اور علمی مباحث اور دقیق مضامین میں بال کی کھال نکالتے تھے اور حدیث وتفسیر کے درس کے وقت وقار وتمکنت کی تصویر ہوتے، دوسرے وقت اپنے شہر وقریہ کی ادبی مجلسوں میں بے تکلف شریک ہوتے، اچھے شعر کی دل کھول کر داد دیتے، خود بھی طبع آزمائی کرتے اور شعر کا کھرا کھوٹا خوب پرکھتے بلکہ اکثر اوقات ان ہی کا قول اس بارے میں قول فیصل ہوتا، مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں اپنے استاذ ذوقؔ کے

(۱) عربی کے مقابلہ میں فارسی ادبیات کے نمونے اور اس کی نظم ونثر کا انتخاب بہتر تھا اس لیے اس نصاب سے فارسی کا جتنا اچھا مذاق پیدا ہوتا تھا اور اس میں انشا وتحریر کی جو صلاحیت پیدا ہوتی تھی وہ عربی میں عام طور پر مفقود تھی۔

حالات میں لکھا ہے کہ ذوقؔ نے اپنے استاد شاہ نصیر کی غزل پر غزل لکھی:

''شاہ صاحب کی طرف سے بجائے خود اس پر اعتراض ہوئے،
جشن قریب تھا، شیخ علیہ الرحمہ نے بادشاہ کی تعریف میں ایک قصیدہ اس
طرح میں لکھا مگر پہلے مولوی شاہ عبدالعزیز صاحب کے پاس لے گئے کہ
اس کے صحت وسقم سے آگاہ فرمائیں، انہوں نے سن کر پڑھنے کی اجازت
دی مگر ولی عہد بہادر نے اپنے شقہ کے ساتھ اسے پھر شاہ صاحب کے
پاس بھیجا، انہوں نے جو کچھ کہا تھا وہی جواب میں لکھ دیا اور یہ شعر بھی لکھا:

بود گفتۂ من حرف اعتراض چناں — کسے بدیدۂ بینا فرو برد انگشت

شیخ مرحوم کا دل اور بھی قوی ہو گیا اور بادشاہی میں جا کر قصیدہ سنایا۔''(۱)

۱۸۵۷ء اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک جب تک ملک میں نیا نظام تعلیم رائج ومقبول نہیں ہوا تھا، ادبی وعلمی محفلوں میں اسی قدیم نصاب کے ساختہ و پرداختہ فضلا صدر نشین ہوتے، وہی زبان وادب کی اس ملک میں سربراہی اور رہنمائی کا فرض انجام دیتے، ان ہی کا قول ان اصناف میں حجت مانا جاتا، ان ہی کے قلم سے ان مباحث پر بلند پایہ تصنیفات نکلتیں، اس لیے کہ پورے ملک میں یہی سب سے اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ تھا، ۱۸۵۷ء سے پہلے اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک بھی مولوی امام بخش صہبائی، مولانا عبداللہ خاں علوی، مفتی صدرالدین خان آزردہؔ اور مولانا فضل حق خیر آبادی جس طرح علوم معقول ومنقول میں اپنے دور کے امام مانے جاتے تھے اسی طرح نکتہ شناسی، دیدہ وری وسخن فہمی میں بھی معیار تسلیم کیے جاتے تھے اور ان کا قول حرف آخر اور زبان وادب کے بارہ میں بھی ''فتویٰ'' کی حیثیت رکھتا تھا، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ جن کی سخن فہمی اور نکتہ رسی ان کے دور میں ایک ایسی حقیقت بن گئی تھی کہ غالبؔ تک کو یہ کہنا پڑا۔

---

(۱) آب حیات، مطبع کریمی لاہور، ص ۴۵۴۔

غالبؔ بہ فن گفتگو نازد بہ ایں ارزش کہ او　　نہ نوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نکرد

اسی نظام تعلیم کے فیض یافتہ و پروردہ تھے، مولانا فضل حق خیر آبادی جو اس دور آخر میں علوم عقلیہ کے امام مانے جاتے ہیں اور جن کا سارا وقت منطق و فلسفہ کی اعلیٰ کتابوں کے درس و تدریس اور ان کی موشگافیوں میں گزرتا تھا، اس پایہ کے سخن فہم و سخن شناس تھے کہ غالبؔ نے ان کی خاطر اپنے اشعار (جو شاعر کے لیے اولاد کی طرح عزیز ہوتے ہیں) کے ایک بڑے حصہ پر خط نسخ پھیر دیا، مولانا حالیؔ لکھتے ہیں کہ "مولانا کی تحریک سے مرزا نے اپنے کلام سے دو ثلث کے قریب اشعار نکال ڈالے اور اس کے بعد اس روش پر چلنا چھوڑ دیا۔(۱)

اس دور کے بعد بھی اسی طبقہ کے ہاتھ میں ملک کی علمی و ادبی قیادت رہی، مولوی محمد حسین آزاد، خواجہ الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد دہلوی اور علامہ شبلی نعمانی جن کو دور آخر میں زبان و ادب کی عمارت کے چار ستون کہنا بجا ہوگا اسی طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان ہی کے قلم سے آب حیات، مقدمۂ شعر و شاعری اور موازنۂ انیس و دبیر جیسی معرکۃ الآرا ادبی کتابیں نکلیں۔

مولانا حکیم سید عبدالحی اسی دور واپسیں کی آخری یادگاروں میں تھے، انہوں نے جس عہد میں آنکھیں کھولیں اور ہوش سنبھالا اس میں گھر گھر شعر و سخن کے چرچے تھے، شہروں کو چھوڑ کر جہاں مشاعرہ لازمۂ تمدن بن گیا تھا، قصبات اور بڑے دیہاتوں میں بھی مشاعرہ کی محفلیں آراستہ ہوتیں اور نوجوان تو نوجوان بچے تک شعر موزون کرنے کی کوشش کرتے، ان کے والد مولوی سید فخر الدین صاحب خیالیؔ، پُر فکر شاعر اور کہنہ مشق نثار و ادیب تھے، مولانا سید عبدالحی جب لکھنؤ میں تحصیل علم میں مشغول تھے اس وقت منشی امیر احمد امیر مینائیؔ، حکیم ضامن علی جلالؔ، شیخ امیر اللہ تسلیمؔ اور مولوی محمد محسن محسنؔ کاکوروی کی شاعری کی دھوم مچی ہوئی تھی، ان میں سے بعض اساتذۂ سخن اگر چہ دربار رام پور سے متعلق ہو گئے تھے لیکن وطنیت کے تعلق سے

---

(۱) یادگار غالبؔ۔

لکھنؤ کے در و دیوار ان کے اشعار کی تعریف و تحسین کے شور سے گونج رہے تھے اور بچہ بچہ کی زبان پر ان کا نام اور کلام تھا، ادھر مرزا سلامت علی دبیر اور میر ببر علی انیس کے مراثی کی دھوم مچی ہوئی تھی اور سارا شہر ان کے کلام سے مست ہو رہا تھا، وہ خود درد مند دل اور موزوں طبیعت لے کر آئے تھے، اردو تو ان کی زبان تھی، عربی و فارسی ادب و زبان سے ان کو فطری مناسبت تھی، بھوپال گئے تو وہاں بھی والا جاہ نواب سید صدیق حسن خان بہادر (جو مفتی صدر الدین خاں آزردہ کے عزیز شاگرد تھے) کی جوہر شناسی اور قدر دانی سے شہر با کمال و صاحب ذوق علما و ادبا کا مرکز بنا ہوا تھا اور افتخار الشعرا حافظ محمد خان شہیرؔ، غلام احمد فروغیؔ اور متعدد نامی گرامی شعرا موجود تھے، اس ماحول اور اس انداز تعلیم و تربیت میں شعر و سخن کا ذوق سلیم اور سخن فہمی کا مذاق صحیح پیدا نہ ہونا تعجب ہے، چنانچہ یہ مذاق نہ صرف یہ کہ پیدا ہوا بلکہ اس نے اس حد تک ترقی کی کہ ان کے قلم سے اردو شعرا کا ایک تذکرہ مرتب ہوا جو ان کی زندگی کے بعد "گل رعنا" کے نام سے شائع ہوا۔

شعرائے اردو کے تذکرے: ہندوستان میں ترکی و افغانی النسل فاتحین اور حکمرانوں کے اثر سے فارسی ہی تصنیفی و دفتری زبان قرار پائی اور ۱۸۵۷ء کے کچھ بعد تک ہر قسم کا سنجیدہ و علمی و تحریری کام یہاں تک کہ مراسلت، باپ بیٹوں اور دوستوں کی خط و کتابت بھی بالعموم اسی زبان میں ہوتی تھی، اس کا ایک نمونہ یہ ہے کہ اردو شعرا کے تذکرے ۱۸۵۷ء تک فارسی ہی میں لکھے گئے، یہ سب تذکرے اردو شاعری کے خط و خال، اس کی زبان کے نکتوں، اشعار کی نوک پلک اور شعرا کی امتیازی خصوصیات اور ان کے طرز کلام کو ظاہر کرنے کے لیے لکھے گئے اور ان میں تمام تر ان کے اردو کلام کا نمونہ ہی پیش کیا گیا ہے لیکن تذکروں کی زبان فارسی ہی ہے، چنانچہ میر تقی کی نکات الشعرا، میر حسنؔ اور مصحفیؔ کے تذکرے، مولوی قدرت اللہ کا طبقات الشعرا، فتح علی شاہ کا تذکرہ، اسی طرح سے بزم سخن، مہر جہاں تاب اور حد یہ ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہؔ کا گلشن بے خار سب فارسی ہی میں ہیں۔

آب حیات: مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کا یہ بہت بڑا علمی وادبی کارنامہ اور اردو پر احسان ہے کہ آب حیات لکھ کر انہوں نے پہلی مرتبہ اردو والوں کو اردو شاعری کی کہانی اردو میں سنائی، وہ اردو زبان وادب وشاعری کے گہوارے میں پلے تھے اور اردوئے معلّٰی کے اجڑنے سے پہلے اس کی بہار دیکھی تھی، استاد ذوقؔ جیسے استاد کے عزیز شاگرد تھے، ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ، شیفتہؔ کی مجلسیں اور بے تکلف صحبتیں دیکھی تھیں، لکھنؤ بھی وہ اس وقت آئے تھے جب ناسخؔ وآتشؔ کے تذکروں سے محفلیں گرم اور دبیرؔ وانیسؔ کی خوشنوائی سے لکھنؤ کا چمن بول رہا تھا، سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ پیدائشی طور پر سخن فہم وسخن شناس تھے، ان کا خمیر شعرو ادب سے اٹھا تھا اور اس کا ذوق ان کے رگ وریشہ میں پیوست ہوگیا تھا، پھر وہ اس درجہ کے انشا پرداز ہیں کہ ان کی انشا پردازی دنیا کی دوسری ترقی یافتہ زبانوں کے کلاسیکل ادب اور ان کے ادبی شہ پاروں سے آنکھیں ملاتی ہے، ان کے بڑے ناقد مولانا حکیم سید عبدالحی نے ''گل رعنا'' میں ان کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اور ان کے اس یگانہ کمالی کا جس طرح اعتراف کیا ہے اس پر اضافہ مشکل ہے، وہ لکھتے ہیں:

> ''سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف ان کی آب حیات ہے جو اردو زبان اور ریختہ شعر کی تاریخ میں پہلی کتاب اور اردو انشا پردازی کا بہترین کارنامہ ہے، عبارت کی بے ساختگی اور برجستگی اور اس میں شاعرانہ تخیل، استعاروں کی دلفریبی کے ساتھ ایسی چیز ہے جس پر غزلوں کے سیکڑوں دیوان قربان کردینے کے قابل ہیں۔
>
> اس کتاب کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ جو غلط اور نادرست روایتیں مصنف کے جادو نگار قلم نے لکھ دی ہیں، وہ آج اردو کی انشا پردازی کے قالب میں روح کی طرح پیوست ہوگئی ہیں اور ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ گئی ہیں، جس طرح اقلیدس کے اصول موضوعہ بے چوں وچرا

مانے جاتے ہیں اسی طرح ان کو بے تکلف کام میں لایا جاتا ہے۔"(۱)

گل رعنا لکھنے کی ضرورت: لیکن کوئی موضوع کسی بڑے سے بڑے مصنف پر ختم اور اس کے لیے وقف نہیں ہوتا اور کوئی کتاب بھی (خواہ وہ کتنے ہی عظیم مصنف کے قلم سے نکلی ہو) اپنے فن وموضوع کی آخری کتاب قرار نہیں دی جاسکتی، علم وفن، فلسفہ وحکمت، شعرو ادب، صنائی ومعماری، مصوری ونقاشی، اختراع وایجاد سب کی وسعت وترقی کا راز اسی نکتہ میں ہے کہ ان کے کسی نقش کو نقش دوام اور ان کی تحقیق کو حرف آخر قرار نہیں دیا گیا اور حوصلہ مند مصنفین اور نیک نیت ماہرین فن اور علم وتحقیق کی سچی لگن رکھنے والے اہل قلم نے اپنے پیشروؤں کے فضل وکمال اور ان کی اولیت کا اعتراف کرتے ہوئے ان کا علمی محاسبہ بھی کیا اور تحقیق کا ایک قدم آگے بڑھانے اور ان کے معلومات کے اندوختہ میں اضافہ کرنے کی جرأت کی، یہ دنیا کی کسی زبان اور کسی علم وفن کی تاریخ میں کبھی بھی گناہ یا شوخی وگستاخی نہیں قرار دی گئی بلکہ ہر نئی نسل کے بساط علم وتحقیق کے تازہ واردوں کے کان میں ہمیشہ یہی غیبی آواز آتی اور ان کا دل بڑھاتی رہی ۔

گماں مبر کہ بہ پایاں رسید کار مغاں
ہزار بادۂ ناخوردہ در رگ تاک است

آب حیات بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں، وہ اپنی غیر معمولی مقبولیت اور اپنی اعلیٰ انشاپردازی ودقیق نکتہ سنجی بلکہ ذوق آفرینی اور ادب آموزی کے ساتھ ہر انسانی کام کی طرح نقائص سے یکسر مبرا اور غلطیوں اور فروگزاشتوں سے کلیۃً خالی نہ تھی، مولانا آزاد پیدائشی اور خلقی طور پر ادیب تھے اور ادب وحسن انشا ان کے تیغ قلم کا اصل جوہر ہے، ادبی مزاج اور تاریخی مزاج میں ایک طرح کا بعد اور ادبی تقاضوں اور تاریخی تقاضوں میں بعض اوقات تعارض پایا جاتا ہے، ادب تخیل پسند ہوتا ہے اور تاریخ حقیقت پسند، ادب اپنی پرواز کے لیے

---

(۱) گل رعنا، ص ۷۰۔۴، طبع چہارم ۱۳۷۰ھ/1951ء۔

آزاد اور بے قید فضا چاہتا ہے، تاریخ اپنے سفر کے لیے ایک محدود اور نپا تلا راستہ، ادب تشبیہ واستعارہ اور تخیل سے آب ورنگ پیدا کرتا ہے اور تاریخ حوالوں، واقعات اور قدیم تحریروں کی پابندی سے گراں بار ہوتی ہے، مولانا آزاد کا اصل مزاج اور رجحانِ طبیعت، ادب وانشا پردازی ہے، وہ خواہ کسی تاریخی موضوع پر قلم اٹھائیں یہ ذوق ان پر غالب آکر رہتا ہے، اس کی مثال دیکھنا ہو تو دربارِ اکبری کا مطالعہ کیا جائے۔

آب حیات کے ان تشنہ گوشوں کو جو ایک نئی تصنیف کے متقاضی تھے ہم تین قسموں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

ا۔ آب حیات میں جن شعرا کا تذکرہ ہے، بہت خوب ہے اور آزاد نے ان کے بارے میں اپنی سخن شناسی اور ذوق کی لطافت کا پورا ثبوت دیا ہے لیکن ہر دور کے شعرا کی ایک بڑی تعداد جن میں سے بہت سے ان شعرا کے ہم پایہ تھے جن کا تذکرہ آب حیات میں آیا ہے اور بعض اپنے ان خوش قسمت معاصرین سے جن کا آب حیات میں تذکرہ آگیا ہے بلند پایہ تھے، نظر انداز ہو گئی ہے، ان کے تذکرہ کے بغیر اردو شاعری کی مسلسل تاریخ میں بیچ بیچ میں خلا محسوس ہوتا ہے اور بعض اہم کڑیاں مفقود نظر آتی ہیں۔

مثلاً طبقۂ متقدمین میں سے مولانا نصرتیؔ، فقیر اللہ آرزوؔ، میر سراج الدین سراجؔ، مرزا داؤد داؤدؔ، میر عبد الولی عزلتؔ، عارف الدین خان عاجزؔ اور محمد حسین کلیمؔ نظر انداز ہو گئے ہیں، ان میں سے بعض کا کلام بالخصوص میر سراج الدین سراجؔ کے اشعار صفائی زبان کا نمونہ اور اردو شاعری کی ترقی و پیش رفت کے اظہار کے لیے سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں اور مرزا مظہر جانجاناں اور خواجہ میر دردؔ کے کلام سے لگا کھاتے ہیں، نیز دور متوسطین میں سے انعام اللہ خاں یقینؔ، میر محمد باقر حزیںؔ، میر محمد بیدارؔ، میر قدرت اللہ قدرتؔ، میر ضیاء الدین ضیاؔ، حکیم ثناء اللہ خان فراقؔ، میر نظام الدین ممنونؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ، کرامت علی شہیدیؔ کا تذکرہ موجود نہیں، شیخ قیام الدین قائمؔ اور شیخ بقاء اللہ بقاؔ کا تذکرہ

حاشیہ میں چند چند سطروں میں آیا ہے، ان میں سے یقینؔ، ممنونؔ، ظفرؔ، شیفتہؔ (۱) کسی طرح سے آزاد کے سے جوہر شناس اور کمال کے سچے قدرداں کی قدر دانی سے محروم ہونے کے لائق نہ تھے اور سہو یا تغافل کی توجیہ اس حالت میں آسان نہیں کہ اس تذکرہ میں میر ضاحکؔ، میر مستحسنؔ اور خلیقؔ جیسے شعرا موجود ہیں جن کے دو دو، چار چار شعر سے زیادہ آزاد کو نہ مل سکے اور نہ انہوں نے اپنے عہد اور ادبی رجحانات پر کوئی اثر ڈالا، متاخرین کے دور کو لو تو خواجہ محمد وزیر وزیرؔ، میر وزیر علی صباؔ، نواب سید محمد خان رندؔ، مرزا محمد رضا برقؔ، میر علی اوسط رشکؔ، مرزا اصغر علی خان نسیمؔ، میر مظفر علی اسیرؔ، شیخ امداد علی بحرؔ قلم انداز ہو گئے ہیں اور اسی طرح لکھنؤ کے ان نامی گرامی شعرا کے تذکرہ سے آب حیات خالی ہے جن کا اس عہد میں طوطی بولتا تھا اور جو دور دور شہرت و مقبولیت حاصل کر چکے تھے، اسی طرح منشی امیر احمد امیر مینائیؔ، نواب مرزا خان داغؔ، مرزا قربان علی سالکؔ، میر مہدی مجروحؔ اور حکیم ضامن علی جلالؔ اس بزم میں نظر نہیں آتے جن کی شاعری سے نہ صرف لکھنؤ بلکہ رام پور، حیدر آباد اور خود دہلی کی مجلسیں معمور مخمور تھیں، اس موقع پر یہ عذر نہیں کیا جا سکتا کہ ان کی شاعری کے شہباز نے آزاد کی وفات کے بعد بال و پر نکالے اور انہوں نے ارتقا کے منازل طے کیے، اس لیے کہ یہ سب وہ ہیں جو شاعری کی دنیا میں نام پیدا کر کے آزاد کی وفات (۱۳۲۷ھ/ ۱۹۰۸ء) سے کئی کئی سال پہلے اس دنیا سے سفر اختیار کر چکے تھے اور آزادؔ جیسا اردو ادب و شاعری کا قدر دان اور مبصر ان سے بے خبر نہیں ہو سکتا، اسی طرح سے آزادؔ نے انیسؔ و دبیرؔ کا تذکرہ دل لگا کر کیا ہے اور ان کی معنی آفرینی، نازک خیالی اور بلند پردازی اور شکوہ الفاظ کی دل کھول کر داد دی ہے لیکن ان ہی اوصاف میں مولوی محمد محسن محسنؔ کاکوروی جوان سے کسی طرح کم نہیں، جن کے متعلق امیر مینائیؔ کہتے ہیں:

---

(۱) نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ کا صرف نام اور ولدیت مومن خان کے تذکرہ میں آ گئی ہے اور اس کا ذکر ہے کہ وہ گلشن بے خار کے مصنف ہیں۔

"ان کا کلام ایک عالم ہے، خیالات نادرہ کا کہ اس کو دیکھ کر انسان
حیران ہو جاتا ہے اور ان کا ہر شعر معراج بلاغت ہے۔"(۱)

ان کی نظمیں صبح تجلی، چراغ کعبہ اور سراپا وغیرہ کے بند پڑھے جائیں، وہ نازک خیالی، مضمون آفرینی، تشبیہات واستعارات کی تازگی اور لطیف تلمیحات میں کسی طرح سے انیسؔ ودبیرؔ سے کم نہیں، فرق یہ ہے کہ انہوں نے اپنی ساری ذہانت ومحنت نعت نبویؐ اور مدیح خیر المرسلینؐ میں صرف کی، اور انیس ودبیر نے مرثیہ ومنقبت، مصائب اہل بیت اور واقعۂ کربلا کے بیان کرنے میں جس سے آزاد کے دل کو زیادہ لگاؤ اور وابستگی تھی، اپنی ذہانت اور قوت شاعری صرف کی۔

اسی طرح سے آب حیات اپنے مصنف کے دور تک بھی اردو شاعری کے تمام عہدوں کے باکمال شعرا کے پورے تذکروں پر حاوی نہ تھی اور بہت سے ایسے شعرا واساتذہ نظر انداز ہو گئے جو نظر انداز ہونے کے قابل نہ تھے۔

اسی طرح آزاد کی آخری زندگی اور ان کی وفات کے بعد خواجہ الطاف حسین حالیؔ، مولوی محمد اسماعیل میرٹھی، لسان العصر میر اکبر حسین الہٰ آبادی نے اردو شاعری میں ایک نیا رنگ اور نیا آہنگ پیدا کیا، خود مصنف آب حیات مولوی محمد حسین آزاد بھی اس کے مستحق تھے کہ ان کو اس بزم میں جگہ دی جائے اور اردو شعرا کا تذکرہ جو ان کی وفات کے بعد لکھا گیا ہو ان کے تذکرہ سے خالی نہ ہو، اس لیے ایک تصنیف کی ضرورت تھی جو اس کمی کو پورا کرے اور اس عہد تک کے لیے ایک جامع تذکرہ کہلانے کی مستحق ہو۔

۲۔ آب حیات میں متعدد تاریخی فروگزاشتیں پائی جاتی ہیں اور بعض ایسے بیانات ہیں جن کی تصدیق ان اصل کتابوں سے نہیں ہوتی جن کا حوالہ دیا گیا ہے، اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ آزاد نے ان کے بارے میں سنی سنائی روایات پر یا اپنے حافظہ پر اعتماد کیا اور کتاب کی

(۱) مقدمہ مکتوبات امیر مینائی۔

تصنیف کے وقت اصل مآخذ کی طرف رجوع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی، یا ان کتابوں کے کسی شوشہ اور نقطہ کو اپنے گوہر بار قلم اور قوت متخیلہ سے بڑھا چڑھا کر کہیں سے کہیں پہنچا دیا، وہ زمانہ کتابوں کی کمیابی کا تھا اس لیے کوئی حیرت و استعجاب کی بات نہیں کہ اردو کے بعض بنیادی تذکرے ان کی نظر سے نہ گزرے ہوں، مثلاً اب یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ میر تقی میر کا تذکرہ ''نکات الشعرا'' ان کی نظر سے نہیں گزرا اور اس کے لیے آب حیات میں داخلی شہادتیں موجود ہیں، غالباً سب سے پہلے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی نے ''نکات الشعرا'' (جس کو انجمن ترقی اردو نے نظامی پریس بدایوں سے شائع کیا) کے مقدمہ میں اس کو وضاحت اور قوت کے ساتھ ظاہر کیا (۱) اور آب حیات اور نکات الشعرا میں متعدد مقامات میں تضاد ظاہر کر کے آخر میں لکھا ہے:

> ''میری بدگمانی معاف ہو تو میں کہوں گا کہ ''نکات الشعرا'' آزاد کی نظر سے نہیں گزرا، قیاس کی بلند پروازی نے طوطے مینا بنا کر اڑا دیے ہیں اور ان کی سحر بیانی سے سامعین کو خوش کیا ہے۔'' (۲)

یہاں اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:

۱۔ آزاد کہتے ہیں کہ میر صاحب دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ ''یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے، اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو'' دیباچہ میں کہیں نہیں ہے کہ اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا، یہ بھی نہیں ہے کہ ان کا ذکر نہیں لکھوں گا جن سے دماغ پریشان ہو، ''نکات الشعرا'' کے مطبوعہ نسخہ میں صرف ایک سو دو شعرا کا تذکرہ ہے۔

۲۔ آزاد لکھتے ہیں کہ ان ہزار میں سے ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا، ''نکات الشعرا'' کے مطالعہ سے اس کی بالکل تصدیق نہیں ہوتی بلکہ اس کے خلاف

(۱) ملاحظہ ہو ''آب حیات'' اور ''نکات الشعرا''، نکات الشعرا، ص ۲۰-۲۴۔ (۲) نکات الشعرا (مقدمہ)، ص ۲۴۔

ان کی فراخ دلی، صاف دلی اور وسیع المشربی کا برملا ثبوت ملتا ہے، وہ اعتراف کمال، تحسین سخن شناس کی روشن مثالوں سے بھرا ہوا ہے۔

۳۔ آزاد نے لکھا ہے کہ ولی بنی نوع شعرا کا آدم ہے، اس کے حق میں فرماتے ہیں:

"وے شاعریست از شیطان مشہورتر۔" (آب حیات، ص ۱۹۵، مطبوعہ مفید عام پریس ۱۸۹۹ء)

یہ فقرہ "نکات الشعرا" میں کہیں موجود نہیں، اس کے بجائے نکات الشعرا میں یہ الفاظ پائے جاتے ہیں: "از کمال شہرت احتیاج تعریف ندارد۔"

۴۔ آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے میر سوز کو پاؤ شاعر مانا ہے، ایک خود، ایک مرزا رفیع، آدھے خواجہ میر درد، پاؤ میر سوز مصنف گل رعنا لکھتے ہیں کہ یہ آزاد کی صرف بذلہ سنجی ہے، نکات الشعرا میں خواجہ میر درد اور میر سوز کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ اس کے بالکل برخلاف ہے، اسی طرح ان کے تخلص کے متعلق جو لطیفہ آب حیات میں ہے، نکات الشعرا سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی، میر صاحب نے ان کے تخلص کی تبدیلی کے واقعہ کو ممنونیت اور بزرگانہ انداز سے بیان کیا ہے۔

اسی طرح آزاد نے میر صاحب کی بد دماغی و نازک مزاجی کی جو تصویر کھینچی ہے اور نواب سعادت علی خان کا سامنا ہو جانے اور ان کی بے پرواہی اور بے نیازی کا جو نقشہ بیان کیا ہے، پھر خلعت بحال کرنے اور دعوت کا ایک ہزار روپیہ بھیجنے اور ردوکد کے بعد قبول کرنے کا جو واقعہ بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے، اس کی واقعات سے تصدیق نہیں ہوتی، مصنف گل رعنا نے میر صاحب کے ایک ہم عصر مرزا لطف علی کی کتاب "گلشن ہند" کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ ان کا مشاہرہ کبھی موقوف نہیں ہوا اور ۱۲۱۵ھ تک ان کا یہی حال رہا، انہوں نے ثابت کیا ہے کہ ۱۲۱۵ھ میں جب میر صاحب کی تنخواہ جاری تھی، خود انشاء اللہ خان کی رسائی پہلی مرتبہ نواب سعادت علی خاں کے دربار میں ہوئی، اس لیے درایۃً بھی یہ واقعہ

صحیح نہیں، انہوں نے ان تمام واقعات پر جو میر صاحب کی طرف منسوب کیے گئے ہیں، تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے میر صاحب کی جو تصویر آب حیات میں کھینچی ہے وہ ان کے منہ پر کھلتی نہیں، کچھ شبہ نہیں میر صاحب نازک مزاج تھے مگر آزاد نے جو واقعات لکھے ہیں اگر آج وہ کسی میں پائے جائیں تو ہر شخص اس کو نازک مزاج نہیں ''خرد ماغ'' سمجھے گا۔''(۱)

آزاد کی واقفیت اودھ کی تاریخ سے زیادہ گہری اور وسیع نہیں اور یہ کوئی قابل تعجب بات نہیں کہ اودھ کی تاریخ کا مواد ان کو نہ ملا ہو، اس لیے ان کے قلم سے بعض ایسی روایتیں نکل گئی ہیں جو محض ناواقفیت اور سطحی معلومات پر مبنی ہیں، مصنف گل رعنا لکھتے ہیں:

''آزاد کہتے ہیں کہ ''سوداؔ ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے، نواب شجاع الدولہ نے بے تکلفی یا طنز سے کہا: مرزا تمہاری وہ رباعی اب تک میرے دل پر نقش ہے، یہ پاس وضعداری پھر دربار نہ گئے''، یہ سب افسانہ ہے، شجاع الدولہ فیض آباد میں رہتے تھے، لکھنؤ کی اس وقت ایک قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ تھی، یہ بھی غلط ہے کہ وہ دلی سے براہ راست یہاں آئے، یہ بھی غلط ہے کہ سوداؔ ایک بار کے سوا پھر دربار نہیں گئے، شجاع الدولہ جب تک جیتے رہے یہ ان کی ملازمت میں رہے، ان کے کلیات میں متعدد قصیدے شجاع الدولہ کی تعریف میں موجود ہیں، مصحفی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں ''ہر جا کہ می رفت عزت وحرمت تمام می یافت، نواب مرحوم ومغفور نیز بودن او را در سرکار خود غنیمت می دانستند۔''(۲)

صرف نکات الشعرا ہی نہیں، اندازہ ہوتا ہے کہ آزاد کی نظر سے مصحفؔی کا تذکرہ بھی

---

(۱) حاشیہ گل رعنا، ص ۱۵۹، ۱۶۰، طبع چہارم۔ (۲) گل رعنا، ص ۱۳۹، طبع چہارم۔

نہیں گزرا، یا کم سے کم آب حیات کی تصنیف کے وقت وہ پیش نظر نہیں تھا، انہوں نے سید انؔشا کے اس زمانہ کا نقشہ کھینچتے ہوئے جب اقبال نے ان سے منہ موڑ لیا تھا اور ان کے ولی نعمت (نواب سعادت علی خان) کی نگاہیں ان سے پھر گئی تھیں، مرزا سعادت یار خان رنگین سے نقل کیا ہے کہ تیسری بار گیا تو ان کو ایک مشاعرہ میں اس طرح دیکھا کہ ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے، سر پر ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں پیکوں کا توبڑا ڈالے، ایک ککڑ کا حقہ ہاتھ میں لیے آیا، توبڑہ میں سے ایک کاغذ نکالا، غزل پڑھی اور کاغذ پھینک چل دیا''، اس موقع پر آزاد نے انؔشا کی وہ غزل لکھی ہے جس کا مطلع ہے:

کمر باندھے ہوئے چلنے کو یاں سب یار بیٹھے ہیں
بہت آگے گئے باقی جو ہیں تیار بیٹھے ہیں

مصنف گل رعنا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''آزاد نے انؔشا کی وہ مشہور غزل اس جگہ نقل کی ہے جو اس موقع کے لیے نہایت موزوں ہے اور اس کا ایک شعر یہ ہے ؎

نہ چھیڑے اے نکہتِ بادِ بہاری راہ الگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں''

مگر واضح رہے کہ یہ غزل انؔشا کی اس زمانہ کی تصنیف نہیں جو ان کے جنون اور بے چارگی کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے، میں نے اس غزل کے چند اشعار تذکرۂ مصحفؔی میں پڑھے ہیں جو اس زمانہ میں لکھا گیا ہے جس وقت انشا لکھنؤ پہنچے بھی نہ تھے، مصحفؔی نے تذکرہ میں وہاں تک کا حال لکھا ہے کہ مرشد آباد سے دلی آچکے ہیں اور مرزا اعظم بیگ وغیرہ شعرائے دلی سے معرکے در پیش تھے۔ (۱)

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

(۱) حاشیہ گل رعنا ص ۲۶۲، طبع چہارم۔

"آزاد نے انشا کے مجنوں ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی ایسی درد انگیز تصویر کھینچی ہے کہ اس کو ان ہی الفاظ میں پڑھو تو دل بے قابو ہو جاتا ہے اور حقیقت میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزاد کی نری جادو طرازی ہے، حیات دبیر کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو میر انشا کے نواسے تھے کہ سید انشا نہ مجنون ہوئے، نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی، صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علی خان نے حکم دے دیا تھا کہ وہ سوا دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں اور دربار بھی اس وقت حاضر ہوں جب ان کو بلایا جائے، انشا نے اسی حبس بے جا کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے ؂

بدوں حکم وزیر الممالک اے آغا چساں کنم حرکت نوکری ست یا بازیست"(۱)

یہ ان چند تاریخی فروگزاشتوں اور غیر محتاط یا مبالغہ آمیز تصویر کشی کی چند مثالیں ہیں جو آب حیات کے صاف آئینہ پر دھبہ کی طرح نمایاں ہوتی ہیں اور ان کی تحقیق اور اصل واقعہ کا اظہار ہر اس دیانت دار مؤرخ کا فرض تھا جو اس موضوع پر آزاد کے بعد قلم اٹھاتا اور ہمارے علم میں گل رعنا میں سب سے پہلے اس فرض کو انجام دینے کی کوشش کی گئی۔

آب حیات میں اساتذۂ سخن کے تذکرے، ان کے محاسن و کمالات کا اعتراف و اظہار اور ان کے مرتبہ و مقام کے تعین نیز بعض ہم عصر اور باہم دیگر مقابل شعرا کے موازنہ کے بارہ میں کچھ ایسی خامیاں پائی جاتی ہیں جن کو ہم اگر آزاد کے احترام اور ان کے فضل و کمال کے اعتراف میں "ناانصافیاں" نہ کہیں تو "ناہمواریاں" ضرور کہہ سکتے ہیں، متعدد مقامات پر ان کے مذہبی جذبات یا ذاتی تعلقات غیر جانبدارانہ تاریخ نویسی کے تقاضوں پر غالب آگئے ہیں، اس بے اعتدالی کا سب سے زیادہ احساس مرزا مظہر جانجاناں کے تذکرہ کے موقع پر

(۱) گل رعنا، ص ۲۶۲، طبع چہارم۔

ہوتا ہے، مرزا صاحب ہندوستان کی ان باکمال ہستیوں میں ہیں جن کے وجود پر اس سرزمین کو فخر ہے، بہت سے اہل بصیرت کے نزدیک سلسلۂ نقش بندیہ مجددیہ میں مجدد الف ثانی حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کے بعد ان کے پایہ کا بزرگ نظر نہیں آتا، ان کے نامور اور صاحب نظر معاصر حضرت شاہ ولی اللہ صاحب دہلویؒ جو خود یگانہ روزگار تھے، ان کے متعلق لکھتے ہیں:

> "ہمارے اس دور میں ان ملکوں میں (جن سے ہم واقف ہیں) کسی ملک میں ان کا ہمسر پایا نہیں جاتا، دور ماضی اور بزرگان سلف میں اس کا سراغ لگ سکتا ہے بلکہ سچ پوچھو تو ہر زمانہ میں ایسے بزرگ زیادہ تعداد میں پائے نہیں جاتے، چہ جائیکہ ایسے زمانہ میں جو فتنہ وفساد سے پُر ہے۔"(۱)

آزاد نے ان کے تذکرہ میں نہ صرف ان کے مرتبہ ومقام کا لحاظ نہیں رکھا بلکہ ان ہزاروں، لاکھوں مسلمانوں کے جذبات کا بھی احترام نہیں کیا جو ان کے عقیدت مند اور حلقہ بگوش تھے، اول تو ان کی نازک مزاجی کو اس انداز سے پیش کیا جس سے نہ صرف ان کی غیر واقعی تصویر نگاہوں کے سامنے آتی ہے بلکہ میر صاحب سے بھی کچھ آگے بڑھ کر وہ ایک تنگ مزاج، مغلوب الغضب اور غیر مہذب انسان کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، اس میں آزاد نے صرف رنگ آمیزی ہی سے کام نہیں لیا بلکہ اس میں مذہبی جذبات کی بھی (جو افسوس ہے کہ اکثر حقائق پر پردہ ڈال دیتے ہیں) جھلک بھی پیدا ہو گئی ہے پھر ان کی طرف بعض ایسے واقعات منسوب کیے ہیں جو ان کے مرتبہ کے دینی پیشوا اور مقتدائے خلائق سے قطع نظر ایک خوش وضع اور ثقہ آدمی کے مرتبہ سے بھی مناسبت نہیں رکھتے۔

مصنف گل رعنا نے جو آزاد کے برخلاف تصوف وصوفیہ کی تاریخ، ان کے مزاج ومذاق سے زیادہ آشنا اور مراتب رجال سے زیادہ واقف ہیں اور جن کو براہ راست مرزا صاحب کے افادات وتحقیقات، ان کے علوم عالیہ ومضامین نادرہ پڑھنے اور ان کے متعلق ان کے معاصرین

(۱) کلمات طیبات، ص۱۶۴، ۱۶۵۔

کی شہادتوں سے واقف ہونے کا موقع ملا ہے، اس طرز نگارش پر احتجاج آمیز تنقید کی ہے جو ان ہی کی نہیں، ان لاکھوں مسلمانوں کے دلی جذبات کی ترجمانی کی ہے جو مرزا صاحب کے ہم عقیدہ اور عقیدت مند ہیں، وہ مرزا صاحب کے حالات و کمالات کا تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

> ''افسوس ہے کہ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نے حسب معمول ان کے حالات بیان کرنے میں چٹکیاں لی ہیں، کہیں واقعہ کی صورت ایسی بنائی ہے جس سے بجائے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں کہ ان کے باب میں بہت سے لطائف ایسے مشہور ہیں کہ اگر آج کسی میں پائے جائیں تو زمانہ کے لوگ اچھا نہ سمجھیں، کچھ تو اس اعتقاد سے
>
> خطائے بزرگان گرفتن خطاست
>
> اور کچھ میں سیاہ رو بزرگوں کی ہر بات کو چشم عقیدت کا سرمہ سمجھتا ہوں۔'' الخ (ص ۱۳۸)
>
> ''تاباں کا حال جیسا چکا کر لکھا ہے اور سرگوشیوں کا فسانہ جس طرح بیان کیا ہے وہ بھی ملاحظہ طلب ہے (ص ۱۳۹)، شعر مندرجہ (ص ۱۴۰) کو پڑھیے پھر مرزا صاحب جیسے مہذب کو اور آزاد کی معذرت کو دیکھیے، فرماتے ہیں کہ ''تہذیب آنکھ دکھاتی ہے مگر کیا کیجیے ایشیا کی شاعری کہتی ہے کہ یہ میری صفائی زبان اور طراری کا نمک ہے'' (ص ۱۴۰)، مرزا رفیع سودا کی ہجو پر حاشیہ چڑھاتے ہیں کہ ''ایک دھوبن گھر میں ڈالی تھی۔'' (۱)، (ص ۱۴۲)

اس کے بعد ان واقعات کی حقیقت بیان کرتے ہوئے جو آزاد نے دوسرے رنگ سے بیان کیے ہیں اور یہ ثابت کرنے کے بعد کہ واقعات کو غلط شکل میں پیش کیا گیا ہے، لکھتے ہیں:

---

(۱) گل رعنا، ص ۱۲۸، ۱۲۹۔

''اصل یہ ہے کہ مولانا آزادؔ نے مرزا صاحب کو آب حیات میں
ناخواستہ طبیعت جگہ دی ہے، جیسا کہ ان کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے،
وہ جوش وخروش اور کثرت کلام ڈھونڈتے ہیں جو یہاں نہیں ملتا۔'' (۱)

اس پر تبصرہ کرتے ہوئے حاشیہ میں لکھتے ہیں:

''یہاں تو نہیں مگر میر ضاحکؔ اور میر خلیقؔ کے یہاں کیا مل گیا،
میر ضاحکؔ کا ایک شعر اور میر خلیق کے دو شعر ہاتھ آئے مگر ان کے حالات
لکھنے کی بے چینی ملاحظہ ہو، میر ضاحکؔ کے حالات میں فرماتے ہیں:
ابتدا سے دل چاہتا تھا کہ اس خانوادۂ سیادت کا سلسلہ مسلسل لکھوں مگر پھول
نہ ہاتھ آئے، جو لڑی پروتا، اب کہ طبع ثانی کا موقع ہے، آرزوئے قدیم
پھر دل میں لہرائی، ناچار برسوں کے سوکھے مرجھائے پھول دل افسردہ کے
طاق میں پڑے ہوئے تھے ان ہی کا سہرا بنا کر سادات عظام کے روضوں پر
چڑھاتا ہوں۔'' (۲) (آب حیات، ص ۱۶۷)

اس کے بعد وہ مرزا صاحب کے بارہ میں میر صاحب اور مصحفیؔ جیسے نقادان سخن کی شہادتیں اور اعترافات نقل کرتے ہیں اور ان کے کلام پر تبصرہ کرتے ہیں، اسی افسردگی اور بے دلی کی وجہ سے آزادؔ نے مرزا صاحب کے صرف بیس اشعار نمونے کے طور پر پیش کیے ہیں، مصنف گل رعنا نے ان کے کلام کا زیادہ سے زیادہ نمونہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور غالباً مرزا صاحب کے اتنے اردو اشعار یکجا کسی تذکرہ میں نہیں آئے ہیں، یہ تعداد میں اکتالیس ہیں۔

مصحفیؔ اور انشاؔ کے تقابل میں پھر یہی اندرونی جذبہ ابھر کر سامنے آگیا ہے، آزادؔ سے نقاد، سخن فہم اور اردو شاعری کے اداشناس اور مزاج داں سے اس کی بالکل توقع نہیں تھی

(۱) گل رعنا، ص ۱۳۱۔ (۲) حاشیہ گل رعنا، ص ۱۳۱۔

کہ وہ مصحفی جیسے مسلم الثبوت استاد اور صاحب طرز شاعر پر جن کے کمالات و فتوحات کی سرحدیں بارہا میر و سودا کی سرحدوں سے مل گئی ہیں اور ان کے بعض اشعار صرف اردو شاعری میں نہیں بلکہ مطلق شاعری کی تاریخ میں اور اس کے منتخب اشعار میں جگہ پانے کے مستحق ہیں، سید انشا کو ترجیح دیں گے جن کے متعلق دور آخر کے سب سے بڑے مبصر نواب مصطفیٰ خان شیفتہ نے بجا طور پر لکھا ہے کہ ''ہیچ مصنف را بہ طریقۂ راسخۂ شعرانہ گفتہ'' اور جن کے متعلق انہوں نے خود لکھا ہے کہ ''ان کی بے اعتدالیاں کچھ جہالت کا سبب نہ تھیں بلکہ عمداً تھیں یا بے پروائی کی وجہ سے تھیں کہ اپنی طبع وقاد اور جامعیت استعداد کے سامنے قواعد اور اہل قواعد کو خاطر میں نہ لاتے تھے'' آگے لکھتے ہیں کہ ''انہوں نے الفاظ اور محاورات میں بہت سے تصرف کیے، یہ تصرف اگر صرف معدود مقاموں میں ہوتے تو شکایتیں نہ ہوتیں کیوں کہ اس زبان آور سے زیادہ قادر زبان اور زباں داں کون ہے؟ خصوصاً جب کہ استعداد علمی سے مسلح ہو لیکن افراط نے ہمیں بھی خاموش کر دیا ہے۔ (۱)

آخر وہی ہوا کہ زمانہ نے جس کے متعلق انہوں نے اپنے بلیغ انداز میں لکھا ہے کہ ''وقت حاکم جابر ہے اور پسند عام اس کا واضح قانون ہے'' زمانہ نے اپنا فیصلہ صادر کر دیا، سید انشا کی ہنگامہ خیزیاں، بزم آرائیاں اور بذلہ سنجیاں ان کے ساتھ گئیں اور ان کے کلام کا بیشتر حصہ بھی اپنے ساتھ لے گئیں، مصحفی کا کلام باقی ہے اور زمانہ جتنا گزرتا جاتا ہے اس کی آب و تاب بڑھتی جا رہی ہے اور تحقیق و تحسین کے نئے نئے گوشے پیدا ہوتے جا رہے ہیں، آب حیات کا وہ حصہ جس میں ان دونوں کا محاکمہ ہے اور لکھنؤ کی معرکہ آرائیوں کی موئے قلم سے تصویر کھینچی گئی ہے، ان کے ذاتی رجحان اور اندرونی جذبہ کی صرف غمازی نہیں آئینہ داری کرتا ہے جو آزاد جیسے بے لاگ جوہری کے شایان شان نہیں۔

اسی طرح صرف مرزا مظہر جان جاناں ہی نہیں مومن خاں جیسے استاد کا تذکرہ بھی

(۱) آب حیات، ص ۲۸۳، ۲۸۴، مطبع کریمی لاہور۔

جوایک مستقل دبستان کے بانی اور مسلم الثبوت استاد ہیں، انہوں نے بادل ناخواستہ اور غالباً لوگوں کے توجہ دلانے سے کیا ہے، چنانچہ آب حیات کے پہلے ایڈیشن میں مومن خاں کا تذکرہ نہ تھا، اس کی انہوں نے بعد کے ایڈیشن میں جو تاویل کی ہے وہ نظر میں جچتی نہیں، مومن خاں جیسے نامور شاعر کے اتنے حالات بھی آزاؔد کو نہ ملیں (جس نے ان کا زمانہ دیکھا اور ان کی مجلسوں میں شریک ہوا) جس سے اتنا تذکرہ بھی مرتب کیا جاسکے جتنا کم سے کم میر ضاحکؔ اور میر خلیقؔ کا آیا ہے سمجھ میں نہیں آتا، پھر تمہید کی سطریں بتاتی ہیں کہ انہیں مومن خاں کو ذوقؔ و غالبؔ کی بزم میں لانے اور ان کی صف میں بٹھانے میں تامل ہے، وہ لکھتے ہیں:

''پہلی دفعہ اس نسخہ میں مومن خاں صاحب کا حال نہ لکھا گیا، وجہ یہ تھی کہ دور پنجم جس سے ان کا تعلق تھا بلکہ دور سوم و چہارم کو بھی اہل نظر دیکھیں کہ جو اہل کمال اس میں بیٹھے ہیں کس لباس وسامان کے ساتھ ہیں، کسی مجلس میں بیٹھا ہوا انسان جبھی زیب دیتا ہے کہ اسی سامان وشان اور وضع ولباس کے ساتھ ہو جو اہل محفل کے لیے حاصل ہے، نہ ہو نا تو موزوں معلوم ہوتا ہے۔''(۱)

لیکن پھر زمانہ نے دوبارہ اپنا حاکمانہ فرمان صادر کیا اور ذوقؔ اور معلوم نہیں کتنے شعرا کے بجائے جن کا آزاؔد نے آب وتاب کے ساتھ ذکر کیا ہے، مومن خاں کو اہل ذوق اور اہل تحقیق کی توجہات کا مرکز بنا دیا اور ان کے کلام کو ایک نئی زندگی اور تابانی عطا کی۔

غالبؔ کے تذکرہ میں انہوں نے بے ضرورت ایسے لطیفے لکھے جس سے ان کے اثنا عشری رجحان اور صحابۂ کرامؓ پر طنز کا اظہار ہوتا ہے(۲) اس کے مقابلہ میں استاد ذوقؔ کا مذہب بیان کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا ہے، لکھتے ہیں:

''علما اور اساتذۂ سلف کو ہمیشہ باادب یاد کرتے تھے اور کبھی ان پر

---

(۱) آب حیات، ص ۴۲۰۔ (۲) ملاحظہ ہو آب حیات، ص ۵۲۸-۵۳۰۔

طعن وتشنیع نہ کرتے تھے، اس واسطے ان کے مذہب کا حال کسی پر نہ کھلا۔"(۱)

اپنے استاد و مربی سے عقیدت، حسن فطرت اور شرافت کا جوہر ہے، آزاد نے اپنے استاد کے حالات کو جس شیفتگی، دلی شغف اور ان کے کمالات شاعری کو جس جوش وخروش کے ساتھ بیان کیا ہے اس پر وہ قابل ملامت یا مستحق شکایت نہیں بلکہ تعریف واعتراف کے مستحق ہیں لیکن جب یہ چیز حدود سے آگے بڑھ جاتی ہے اور ایک کی حق شناسی کے ساتھ دوسرے کی حق تلفی شامل ہو جاتی ہے تو ضرور قابل شکایت ہے، آزاد نے بہادر شاہ ظفر کے کلام کے متعلق جو رائے دی ہے اور اس کو جس طرح استاد ہی کے پلہ میں ڈال دیا ہے، اس سے خود استاد کی روح خوش نہ ہوگی اور کلام کا فرق سمجھنے والا اس میں شاعر کی زندگی اور وارادات کا عکس دیکھنے والا مطمئن نہیں ہوگا، آزاد لکھتے ہیں:

"بادشاہ کے چار دیوان ہیں، پہلے کچھ غزلیں شاہ نصیر کی اصلاحی ہیں، کچھ میر کاظم حسین بیقرار کی ہیں، غرض پہلا دیوان نصف سے زیادہ اور باقی تین دیوان سرتاپا حضرت مرحوم کے ہیں، جن سنگلاخ زمینوں پر قلم چلنا مشکل ہے ان کا نظام وسرانجام اس خوبصورتی سے کیا ہے کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں، والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ بادشاہ تمہارا زمین کا بادشاہ ہے، طرحیں خوب نکالتا ہے مگر تم سرسبز کرتے ہو ورنہ شور زار ہو جائے، مسودۂ خاص میں کوئی شعر پورا، کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی ایک، کوئی آدھا مصرع، فقط بحر اور ردیف وقافیہ، باقی بخیر، یہ ان ہڈیوں پر گوشت وپوست چڑھا کر حسن وعشق کی پتلیاں بنادیتے تھے۔"(۲)

مصنف گل رعنا اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی سلطنت دادا کے وقت میں جا چکی تھی، ایک وظیفہ خوار

---

(۱) آب حیات، ص ۴۶۷۔ (۲) ایضاً ص ۴۹۱۔

کی حیثیت سے برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے اور ان کی حکومت دہلی میں قلعہ معلی کی چاردیواری کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھی۔

لیکن اقلیم سخن کی فرماں روائی دادا سے ترکہ میں ملی تھی اور اردوئے معلی ان کے زیر نگیں تھا، افسوس ہے کہ وہ بھی مولوی محمد حسین آزاد نے ظفر سے چھین کر استاد ذوق کو بخش دی۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بخال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را''(۱)

پھر آگے اس کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لطف یہ ہے کہ چاروں دیوان اس بدنصیب بادشاہ کے چھپ چکے ہیں اور حضرت ذوق کا بھی تھوڑا بہت جو کچھ کلام مل سکا ہے وہ ایک دیوان کے شکل میں شائع ہو چکا ہے، ان دونوں کو پڑھو اور ہر ایک کے انداز سخن پر غور کرو، پھر اپنی فطرت سلیم سے فتویٰ لو، دونوں کی حیثیتیں جداگانہ نظر آئیں گی، ذوق پھر بھی ذوق ہیں، ظفر کے استاد، ان کے کلام کی رنگینی، ترکیب کی چستی، مضمون کی بندش، جوش وخروش، ان کی باتیں ان کے ساتھ ہیں، ظفر کے ہاں جو سامان نظر آئے گا وہ اس سے ملتا جلتا ہوگا اور ہونا بھی چاہیے کیوں کہ استاد کا رنگ شاگرد میں آنا ضرور ہے مگر پھر بھی وہ دوسری طرح کا ہوگا، محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملے گی مگر جوش وخروش کی جگہ دل وجگر کے ٹکڑے حروف والفاظ بن کر آنسوؤں کی سیاہی اور آہِ جگر دوز کے قلم سے لکھے ہوئے تم کو ملیں گے، اب انہیں ظفر کا سمجھو یا ذوق کا۔''(۲)

اسی طرح ان کو اس سے بھی اختلاف ہے کہ نواب الٰہی بخش خان معروف کا کلام

(۱) گل رعنا، ص ۲۹۷۔ (۲) ایضاً۔

استاد ذوقؔ ہی کی طرح شاعری کا کارنامہ ہے، وہ لکھتے ہیں:

"آزادؔ نے آب حیات میں جس طرح ظفر مرحوم کی کاوش فکر پر پانی پھیرا ہے ان کے بھی نتائج فکر کو اپنے استاد ذوقؔ کے دامن کمال سے وابستہ کر دیا ہے، باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اس وقت چھیاسٹھ برس کی تھی اور ذوقؔ بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہوں گے۔ مگر جوش عقیدت میں اس کا خیال نہیں رہا۔"(۱)

ان فروگزاشتوں اور ناہمواریوں کے باوجود آب حیات کی "انفرادیت" قائم تھی اور رہے گی اور اس کی ادبی قدر و قیمت میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی، ضرورت اس کی تھی کہ اس کے اس تاریخی حصہ کو مکمل کر دیا جائے اور ان کی ان غلطیوں کی نشاندہی کر دی جائے جو مصنف کی ادبی افتاد طبع یا اس وجہ سے پیدا ہوئیں کہ مصنف کی نظر ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ پر وسیع اور گہری نہ تھی اور وہ اس کے بعض شعبوں (مثلاً تصوف و سلوک علما و مشائخ کے حالات، ملفوظات و مخطوطات) کا رمز شناس اور خصوصی طالب علم نہیں رہا تھا۔

مولانا سید عبدالحی صاحب نے اپنی عربی تصنیفات "نزہۃ الخواطر"، "معارف العوارف" اور "جنۃ المشرق" کی تالیف و ترتیب کے سلسلہ میں ہندوستان کی سیاسی، تمدنی، علمی اور ادبی تاریخ کا وسیع مطالعہ کیا تھا اور اس ضرورت سے انہوں نے سیکڑوں متعلق و غیر متعلق کتابیں اور ہزار ہا صفحات پڑھے تھے، ان میں بلا ارادہ بہت سا مواد ان کی نظر سے گزرا جس سے اردو زبان کے آغاز، اس کی شعر و شاعری کی تاریخ اور اردو شعرا کے حالات زندگی اور ان کے کمالات پر روشنی پڑتی تھی اور ان سے اردو زبان و شاعری کی تاریخ اور شعرا کا تذکرہ مرتب کرنے میں بیش قیمت مدد ملتی تھی، بہت سے نظریات کی جو اس وقت تک مشہور و مقبول تھے تردید ہوتی تھی اور بہت سے نئے حقائق سامنے آتے تھے، آب حیات میں جس کا

---

(۱) حاشیہ گل رعنا، ص ۲۸۸، طبع چہارم۔

مطالعہ انہوں نے اس کی اشاعت کے بعد ہی کرلیا ہوگا بہت سی چیزیں ان کے تاریخی ذوق کو کھٹکیں اور ان کی مؤرخانہ نظر میں چبھی ہوں گی اس لیے اس کا داعیہ پیدا ہونا ایک قدرتی امر تھا کہ وہ اس موضوع پر قلم اٹھائیں اور ان اغلاط کی تصحیح کریں جو نادانستہ آب حیات میں آ گئی ہیں اور یہ حق کسی صاحب قلم اور صاحب نظر سے چھینا نہیں جا سکتا۔

شاید ان کو اس کام کی تکمیل میں دیر لگتی، یا عربی تصنیفات کی تکمیل کا کام اور زندگی کے دوسرے مشاغل اس کی مہلت نہ دیتے کہ ۱۳۳۹ھ (مطابق ۱۹۲۱ء) میں وجع مفاصل کا ان پر حملہ ہوا اور نقل و حرکت ان کو دشوار ہو گئی، مریضوں کو دیکھنا، مطب میں جانا، ندوۃ العلما کے جلسوں میں شرکت سب ناممکن ہو گئی، تصنیفی و تحریری کام ان کی طبیعت ثانیہ بن گیا تھا اور وہ یکسر بیکار و معطل نہیں رہ سکتے تھے، اس حالت میں وقت گزاری اور تفریح کے لیے ان کو اپنی پرانی بیاض یاد آئی، اس کو نکالا تو معلوم ہوا کہ مشہور شاعروں کا کلام اس میں اتنا جمع ہو چکا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دے کر شائع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، اسی کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو ان کے مختصر مختصر حالات بھی لکھ دیے جائیں، تذکرے جمع کیے اور کام شروع کیا، بات میں بات نکل آئی اور وہ ایک خاصی کتاب بن گئی۔(۱)

یہ گل رعنا کی تصنیف کی مختصر کہانی ہے جو مصنف نے اس کتاب کی شان ورود کے سلسلہ میں خود سنائی ہے، اس کتاب کا مسودہ انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی ناظم دارالمصنفین کے پاس بھیج دیا جن سے ان کو عزیزانہ تعلق تھا، اس عرصہ میں ان کی وفات ہو گئی اور وہ کتاب کو مطبوعہ شکل میں نہ دیکھ سکے، غالباً جمادی الاولیٰ ۱۳۴۳ھ میں یہ کتاب دارالمصنفین سے چھپ کر شائع ہوئی، اس لیے کہ جمادی الثانیہ ۱۳۴۳ھ جنوری ۱۹۲۵ء کے معارف کے شذرات میں جو مولانا عبدالسلام صاحب ندوی مرحوم کے قلم سے ہیں، پہلی مرتبہ اس کتاب کا تعارف اور اس کی طباعت کا اعلان نظر آیا، اس وقت ان کے بہت سے دوستوں اور شناساؤں

---

(۱) پیش لفظ مصنف گل رعنا، ص ۳، طبع چہارم۔

کے لیے یہ انکشاف تھا کہ ان کو اس موضوع سے اس درجہ کا ذوق اور واقفیت ہے کہ اس موضوع پر ان کے قلم سے ایک ایسی وقیع تصنیف نکل سکتی ہے، رسالہ اردو (انجمن ترقی اردو اورنگ آباد) کے ذی الحجہ ۱۳۴۳ھ، جولائی ۱۹۲۵ء کے شمارہ میں اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب نے یہس صحیح لکھا:

''جو لوگ مولانائے مرحوم سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے انہیں ممکن ہے اس کا علم ہو، ورنہ عام طور پر لوگ اس سے لاعلم تھے کہ مولانا مرحوم اردو زبان و ادب کا ایسا اچھا ذوق رکھتے ہیں اور ایسا خیال کچھ بے جا بھی نہ تھا کیوں کہ مولوی صاحبان نے عموماً اردو زبان کی طرف سے غفلت برتی ہے۔''(۱)

''معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادبی ذوق مولانا کو اپنے والد ماجد سے ارثاً ملا ہے جو اردو و فارسی کے اچھے شاعر تھے اور جن کا حال اور کلام کا نمونہ انہوں نے کتاب کے آخر میں دیا ہے۔''(۲)

کسی تصنیفی کاوش کو اس زمانہ کے حدود، ماحول اور مصنف کے مقرر کیے ہوئے پیمانہ اور اس کے تصنیفی منصوبہ سے علاحدہ کر کے کسی دوسرے زمانہ کے حدود و ماحول میں رکھ کر اس زمانہ کے معیاروں، اصطلاحوں اور مقرر کردہ اصولوں سے جانچنا اور ناپنا صحیح نہیں ہوتا، مصنف ادب وشاعری کے ان تنقیدوں اصولوں سے واقفیت نہیں رکھتے تھے جو بیسیوں صدی کے وسط میں مغربی ممالک میں دریافت کیے گئے اور صدیوں کی کاوشوں کے بعد انہوں نے ارتقا کے منازل طے کیے، ان میں بھی ایک بڑا حصہ وہ ہے جو مغربی ماحول و معاشرہ کی آب و ہوا، مخصوص سیاسی و تمدنی عوامل کا نتیجہ اور مغربی زبانوں اور ان کے ادب وشاعری کے مخصوص

---

(۱) پچھلے دور کے فضلائے مدارس کے متعلق تو یہ کہنا کسی حد تک صحیح ہوگا لیکن ۱۸۵۷ء اور اس کے بعد تک کے علما پر یہ الزام صحیح نہیں جیسا کہ ہم نے اس مضمون کے آغاز میں ذکر کیا ہے۔ (۲) رسالہ اردو، بابت جولائی ۱۹۲۵ء، ص ۵۰۷۔

مزاج سے تعلق رکھتا ہے اور مشرقی زبانوں اور ان کے ادب و شاعری پر جوں کے توں ان کا انطباق نہیں کیا جا سکتا، مصنف گل رعنا نے کہیں بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ یہ کتاب تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اس میں وہ تنقید کے اعلیٰ معیاروں کی پیروی کریں گے جو اس وقت تک دریافت ہو چکے ہیں، انہوں نے پوری حقیقت پسندی اور سادگی کے ساتھ اس کتاب کی ترتیب کے محرکات و دواعی اور اس تصنیف کے اغراض و مقاصد اور اس کے پیمانہ اور رقبہ کا اپنے پیش لفظ میں اظہار کر دیا ہے، انہوں نے اردو زبان و ادب اور شاعری کی تاریخ کے طالب علموں کو اس کتاب کے ذریعہ بہت سی نئی معلومات دی ہیں، متعدد نئے ماخذوں کی طرف توجہ دلائی ہے، اردو زبان اور شاعری کے آغاز کو وہ آب حیات اور دوسرے قدیم تذکروں سے کئی قدم پیچھے لے گئے ہیں جب دکن و گجرات میں صوفیائے کرام کے ذریعہ اس عام فہم بولی کا اور سلاطین دکن اور ان کے عہد کے شعرا کے ذریعہ اس مرغوب طبع شاعری کا آغاز ہو گیا تھا، انہوں نے بہت سی تاریخی غلطیوں کی تصحیح کی اور بقول ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب:

> ''ہر شاعر کے کلام سے نمونہ بھی دیا گیا ہے جس سے فاضل مؤلف کی وسعت نظر کا ثبوت ملتا ہے، اگرچہ زبان و شعرا کے کلام پر اعلیٰ تنقید کا حق ادا نہیں کیا گیا، تاہم ہر شاعر کے کلام پر بہت ہی منصفانہ رائے کا اظہار کیا گیا ہے۔''(۱)

کتاب میں مفید حواشی کا اضافہ کیا گیا ہے جو بہت معلومات افزا، دلچسپ اور ان کی اردو انشا پردازی اور سیرت نگاری کا عمدہ نمونہ ہیں، چونکہ ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ اور تراجم رجال ان کا خاص موضوع رہا ہے اور ''نزہۃ الخواطر'' جیسی کتاب ان کے قلم سے نکل چکی ہے اس لیے ان کے حواشی میں تاریخ کے طالب علموں کو بہت سی نئی معلومات اور ضخیم کتابوں کا عطر مل جاتا ہے، اودھ چونکہ ان کا وطن ہے اور اس کی تاریخ کا انہوں نے بہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے، اس لیے اس صوبہ سے تعلق رکھنے والی شخصیتوں پر انہوں نے جو حواشی لکھے ہیں وہ

---

(۱) رسالہ اردو، جولائی ۱۹۲۵ء۔

بہت پُراز معلومات اور مبصرانہ ہیں اور ان میں ان شخصیتوں کی صحیح تصویر کشی اور سلطنت اودھ کے عہد کی بولتی ہوئی تصویر ہاتھ آ گئی ہے، علم کی سچی پیاس اور اپنی زبان سے بے لوث محبت کا ہمیشہ سے یہ خاصہ رہا ہے کہ اگر ہزاروں صفحات کی ورق گردانی سے کام کی کوئی ایک چیز ہاتھ آجائے تو اس کو آنکھوں سے لگایا جاتا ہے اور دل میں جگہ دی جاتی ہے اور اگر کوئی اجنبی اور بیگانہ بھی راستہ سے گزرے تو کوئی ایسی صدا لگا دیتا ہے جس سے منزل مقصود کی دریافت یا گوہر مقصود کے حصول میں ادنیٰ سی مدد ملتی ہے تو اس کو ہزار بار شکریہ کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے، علم وادب کی ترقی ہر زبان وادب اور ہر ملک وملت میں ان سب لوگوں کی رہین منت ہے جنھوں نے اس کے خرمن میں ایک دانہ کا بھی اضافہ کیا یا اس کے گیسو سنوارنے یا گرد وغبار اور خس وخاشاک دور کرنے میں ہاتھ کا بھی اشارہ کیا، خود مغربی ممالک کے ادب وزبان اور فن تنقید کی تاریخ تشکر وممنونیت اور اقرار واعتراف کے ان شریفانہ نمونوں سے لبریز ہے جس کی تقلید وپیروی ہمارے مشرقی ممالک کے لیے معراج کمال اور ہمارے ادیبوں اور ناقدوں کے لیے سدرۃ المنتہیٰ بنی ہوئی ہے۔

اردو میں آب حیات کے بعد کوئی ایسا مسلسل ومکمل شستہ وشائستہ تذکرہ موجود نہیں تھا جو سلجھے ہوئے انداز اور سادہ وشیریں زبان میں اردو شعرا کے متعلق ایک متوسط درجہ کے طالب علم اور شائق فن کو بنیادی اور ضروری معلومات مہیا کرتا ہو، اس لیے جیسے ہی گل رعنا ملک کے مؤقر علمی ادارہ دارالمصنفین سے شائع ہوئی وہ ہاتھوں ہاتھ لی گئی، ہندوستان کی متعدد یونیورسٹیوں کے اعلیٰ اردو نصاب میں داخل کی گئی، اس کے متعدد ایڈیشن نکل چکے ہیں اور ہندوستان وپاکستان میں یکساں طریقہ پر ایک اہم نصابی کتاب اور وقیع علمی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ اب اس کے چھٹے ایڈیشن کی نوبت آ گئی ہے، امید ہے کہ اس سے حسب سابق استفادہ کیا جائے گا اور اس کو اس کا صحیح مقام دیا جائے گا۔

ابوالحسن علی ندوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اللّٰھم صل علیٰ سیدنا محمد و عترتہ بعدد کل معلوم لک

اگلے زمانہ میں جن لوگوں کو کچھ بھی علمی مذاق ہوتا تھا وہ اپنے پاس ایک ایک بیاض رکھا کرتے تھے، کبھی اس کی تقطیع کتابی ہوتی جس کا شیرازہ عرض میں کاغذوں کو موڑ کر باندھا جاتا ہے، کبھی طول میں کاغذوں کو موڑ کر بہی کی طرح باندھتے، وہ ایک سادی کتاب ہوتی جو ہر وقت پاس رہتی، چھاپہ خانہ اس زمانہ میں نہیں تھا، کسی خوش قسمت کو خود لکھ کر یا لکھوا کر کتابیں مل بھی جاتیں تو اس زمانہ میں جب کہ ریل نہیں تھی اور اس طرح سفر آسان اور سہل نہیں تھا، کتابوں کو اپنے ساتھ ساتھ سفر میں رکھنا دشوار تھا اور رکھتے بھی تو سارا کتب خانہ کہاں کہاں لیے پھرتے، وہی ساری کتاب ساتھ رہتی، اسی وجہ سے اس بیاض کا ایک نام ”زادالسفر“ بھی تھا۔

مذاق علمی بھی ایک طرح کا نہ تھا جو طبیب ہوتے وہ بیاض پر اپنی مجربات یا کہیں سے کوئی مجرب نسخہ ہاتھ آتا، اس کو لکھتے جاتے، کوئی نادر کتاب طب کی کہیں مل جاتی تو اس میں سے ان نوادر کو جن کا محفوظ رکھنا ضروری سمجھتے اسی بیاض پر قلم بند کر لیتے، عربی کی مثل ہے ”العلم صید و الکتابۃ قید“ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک بات کتابوں میں پڑھ کر یاد ہو جاتی ہے مگر چند روز میں ایسا ذہول ہو جاتا ہے کہ وہی بات یاد کرنے سے بھی یاد نہیں آتی، اس واسطے

لکھ لینا آئندہ چل کر کام دیتا ہے۔

قاضیوں اور مفتیوں کے پاس جو بیاضیں ہوتیں اس میں مفتیٰ بہ مسئلے اور معتبر کتابوں کے حوالے لکھ لیتے تاکہ موقع پر جب ضرورت پڑے تو ان سے کام لے سکیں۔

شعرا کی بیاضوں میں شعر و سخن کے رموز، عروض و قافیہ کی ضروری ضروری یادداشتیں، قدما کے قصائد، غزلیں، رباعیاں، معمے، پہیلیاں، تاریخیں اور جہاں کوئی مزہ دار شعر سنا وہ اور اسی کے تمام متعلقات قلم بند ہوتے تھے۔

عام لوگ جو یک فنی نہیں ہوتے وہ بھی اپنے اپنے پاس بیاضیں رکھتے، مگر ان کی بیاضیں معجون مرکب ہوتی تھیں، ایک حصہ مجرب نسخوں کے لیے مخصوص ہے تو دوسرا دعاؤں اور تعویذوں کے واسطے، ایک برجستہ اشعار اور دلنشیں کلام کے لیے، نظم ہو یا نثر، ایک اپنے بزرگوں، دوستوں اور ناموران ملک کی تاریخہائے ولادت و وفات کے واسطے، غرض کہ وہ ایسی چیز ہوتی جس سے بیکاری کے وقت ہر مذاق کا آدمی اپنا دل بہلا سکتا اور ضرورت کے وقت ان یادداشتوں سے کام لے سکتا ہے۔

میں نے اپنے بچپن میں جن بزرگوں اور عزیزوں کو دیکھا ان میں کا ہر ایک، ایک ایک بیاض کا مالک تھا اور اس کو اپنی عمر بھر کی کمائی سمجھ کر اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا، سید عبدالجلیل مرحوم ایک سن رسیدہ بزرگ میرے رشتہ کے نانا تھے، ان کی بیاض اتنی دلچسپ تھی کہ لوگ دور دور سے اس کو دیکھنے کو آتے، وہ بیاض کیا تھی، جام جہاں نما تھا، ہندوستان کے عام انقلاب کی چشم دید تاریخ، ناموران ملک کی موت و حیات کا ابھرا ہوا خاکہ، فقہ و حدیث کے نوادر اور مشکلات کا حل، شعرا کے نتائج فکر کا بہترین نمونہ، غرض کہ وہ ایک ہی کتاب ہر مذاق کے لوگوں کے لیے دلچسپی کا بہت بڑا ذریعہ تھی۔

میں نے ان ہی بزرگوں کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی، مجھ کو بھی بیاض بنانے کا شوق پیدا ہوا اور تقریباً پچیس تیس برس کے سن تک رہا، جب زمانہ نے آنکھیں کھولیں

اوراور کاموں میں لگ گیا، پھر خبر نہیں رہی کہ وہ کہاں ہے اور کس حالت میں ہے۔

ندوۃ العلما کے کاموں سے جب فرصت ملتی تو تصنیف وتالیف میں لگ جاتا، دن کے اجالے اور راتوں کی تاریکی میں جو کام بن پڑتا وہ ان ہی دو چیزوں میں محدود تھا، جنۃ المشرق کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں ہندوستان کا جغرافیہ، ظہور اسلام سے لے کر غدر ۷۵ء تک کی اسلامی تاریخ، مسلمانوں کا طریقۂ حکمرانی اور امور نافعہ کا بہ قدر امکان تلاش وتحقیق سے ذکر کیا ہے، دوسری کتاب المعارف کے نام سے لکھی جس میں علوم وفنون کی تاریخ اور ہندوستان میں جس علم کی جیسی مسلمانوں نے خدمت کی ہے اور جو کتابیں ان علوم میں یہاں تصنیف ہوئی ہیں ان کی تفصیل دی ہے، تیسری کتاب نزہۃ الخواطر آٹھ جلدوں میں تصنیف کی، جس میں ہندوستان کے علما اور دوسرے ناموروں کے حالاتِ زندگی جنہوں نے علم کی خدمتیں کی ہیں، بڑی کاوشوں اور کاہشوں سے فراہم کیے ہیں، علاوہ ان کے چند کتابیں اور بھی لکھیں جو فقہ وحدیث سے تعلق رکھتی ہیں مگر بدقسمتی سے یہ سب کتابیں عربی میں تالیف کیں، جن کی اس ملک میں مانگ نہیں، یہ سودا ہنوز دماغ میں موجود تھا کہ سال گزشتہ میں صحت نے بیوفائی کی اور سال کا سال مرض کے الجھاؤ میں گزر گیا، اس سال کچھ کام کرنے لگا تھا کہ پھر مرض کا اعادہ ہوا، مدتوں کی عادت پڑی ہوئی کتاب بینی اور تصنیف و تالیف طبیعت ثانیہ بن چکی تھی، مجبوراً طبیعت کو ایسی کتابوں کے مطالعہ پر مائل ہونا پڑا جن سے دماغ پر زور نہ پڑے، ان ہی کتابوں میں وہ بیاض بھی نکل آئی جو کسی زمانہ میں ہر وقت پیشِ نظر رہتی تھی، دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مشہور مشہور شاعروں کا کلام اس میں اتنا جمع ہو چکا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دے کر شائع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے، اسی کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو، ان کے مختصر مختصر حالات بھی لکھ دیے جائیں، تذکرے جمع کیے اور کام شروع کیا، بات میں بات نکلتی آئی اور وہ ایک خاصی کتاب بن گئی جس کا نام ''گل رعنا'' میں نے رکھ دیا ہے۔

امید ہے کہ بزرگانِ سخن فہم اس کی قدر افزائی فرمائیں گے اور کیا عجب ہے کہ اس طریقہ سے جس سرزمین کی مختلف حیثیتوں سے میں نے اب تک خدمتیں کی ہیں اس کی ملکی زبان کی بھی یہ اچھی خدمت سمجھی جائے۔

غرض نقشے است کز ما یاد ماند
کہ ہستی را نمی بینم بقائے
مگر صاحب دلے روزے زرحمت
کند برحالِ ابن مسکین دعائے

عبدالحیؔ
۶/ ربیع الثانی ۱۳۴۰ھ لکھنؤ

مُقدّمۃ

اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ

انسان کے دل میں کسی چیز کے دیکھنے یا سننے یا کسی حالت یا واقعہ کے پیش آنے سے ذوق وشوق، عشق ومحبت، حیرت واستعجاب، طیش وغضب، رنج وغم وغیرہ کی جو کیفیتیں پیدا ہوتی ہیں، ان کو اس طرح سے موزوں کر کے ادا کرنا کہ جو اثر اس کے دل میں ہے وہی دوسروں پر چھا جائے، اس کا نام شاعری ہے۔

اگر ایک مضمون کو ایک سطر میں لکھو اور نثر میں پڑھو، پھر اسی مضمون کو فقط لفظوں کے ایک خاص پس وپیش کے ساتھ لکھ کر دیکھو تو کچھ اور ہی عالم ہو جائے گا، اول تو وہ موزوں ہو جاتا ہے، پھر کلام کا زور بڑھ جاتا ہے، تیسرے سیدھی سادی بات میں ایسا لطف پیدا ہو جاتا ہے کہ سب اس کو بار بار پڑھتے اور مزے لیتے ہیں۔

قدرتی شاعر ارادہ کر کے شعر کہنے کو خاص وقت میں بیٹھتا ہے مگر حقیقت میں اس کا دل اور اس کے خیالات ہر وقت اپنے کام میں لگے رہتے ہیں، قدرت کے کارخانہ میں جو چیز اس کے حواس میں محسوس ہوتی ہے اور اس سے جو کچھ اثر اس کی طبیعت اٹھاتی ہے وہ ہر شخص کو نصیب نہیں خواہ لطف وشگفتگی ہو خواہ آزردگی یا بیزاری۔

یہ ضرور ہے کہ جو کیفیت وہ آپ اٹھاتا ہے اس کے لیے ڈھونڈتا ہے کہ کیسے لفظ ہوں اور کس طرح ان کو ترکیب دوں تاکہ جو کیفیت اس کے دیکھنے سے میرے دل پر طاری ہے،

وہی کیفیت سننے والے کے دل پر چھا جائے اور وہ بات کہوں کہ جو اثر میرے دل پر ہوا ہے وہی اس پر بھی ہو، یا جس طرح کا لطف میں نے اٹھایا ہے اسی طرح کا لطف اسے بھی حاصل ہو۔(۱)

جس طرح کوئی زمین اپنی قابلیت کے موافق بے کچھ نہ کچھ روئیدگی کے نہیں رہ سکتی، اسی طرح کوئی زبان اپنے اہل زبان کی حیثیت کے موافق نظم سے خالی نہیں رہ سکتی، یا جس طرح سے روئیدگی کی رنگینی اور شادابی اپنی سرزمین کی خاصیت کو ظاہر کرتی ہے، اسی طرح زبانوں کے سلسلہ میں ہر ایک نظم اپنی زبان اور اہل زبان کی شائستگی اور تہذیب علمی کے ساتھ لطافت طبع کے درجے دکھاتی ہے۔

زبان اردو کے ظہور پر خیال کرو اور اس کی تصنیفات پڑھو تو اس میں نثر سے پہلے نظم آئے گی، جب ملکی زبانوں نے اپنی وسعت اخلاق سے عربی فارسی الفاظ کے مہمانوں کو جگہ دی تو طبیعتوں میں اس قدرتی روئیدگی نے بھی زور کیا لیکن وہ صدہا سال تک دوہروں کے رنگ میں ظہور کرتی رہی، یعنی فارسی کی بحریں اور فارسی کے خیالات ایک زمانہ تک اس میں گھسنے نہیں پائے۔(۲)

جہاں تک چھان بین کی گئی ہے، سب سے پہلے امیر خسرو نے جن کی طبیعت اختراع میں اعلیٰ درجہ صنعت و ایجاد کا رکھتی تھی، ملک سخن میں برج بھاشا کی ترکیب سے انشا پردازی کا ایک طلسم خانہ کھولا، مکرنی، انمل، دوسخنی، قسم قسم کے گیت اور پہیلیاں خاص ان کے آئینہ کمال کا جوہر ہیں، خالق باری کو بھی ان ہی کی طبع رسا کا نتیجہ سمجھو تو اس حیثیت سے اس کو اردو نظم کی داغ بیل قرار دینا ایک حد تک ٹھیک ہے مگر اس کی کیا سند ہے کہ یہ ان ہی کی تصنیف ہے، ایسی زبانی روایتوں سے جو مکتبوں کے مُلّا ایک دوسرے سے لیتے چلے آئے ہیں، تاریخ کی بنیاد نہیں پڑتی، پہیلیوں اور گیتوں کی حالت دوسری ہے، ان کی بنیاد مضبوط چٹان پر قائم ہے، ہر زمانہ میں ہزاروں مرد اور عورتوں نے نقل در نقل ان کو ہم تک پہنچایا ہے، اسی طرح امیر خسرو نے

---

(۱) آب حیات۔ (۲) ایضاً۔

جو اختراعیں موسیقی کے راگ اور راگنیوں میں کی ہیں، ان کی سند بڑی پکی ہے، بہر حال اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اس کی داغ بیل امیر خسرو کی ڈالی ہوئی ہے۔

خسرو کے بعد سلطان حسین شرقی نے جو فن موسیقی کا بے نظیر ماہر تھا، اس میں برگ و بار پیدا کیے، اس نے دھرپد میں تصرف کیا اور بجائے چار مصرعوں کے دو مصرعے کر دیے یا آہنگ میں تصرف کر کے اس کا خیال اور چٹکلہ نام رکھا یا حقیقت کے منہ سے نقاب ہٹا کر مجاز کو زیادہ کھول دیا، یہ اس کے تصرفات براہ راست موسیقی کے راگ اور راگنیوں میں تھے مگر ان کا اثر شاعری پر بھی پڑتا ہے، چو مصرعی ترکیب بھاشا کی خصوصیات میں سے ہے، اس کو دور کر کے اس نے گیتوں کو غزل کے قریب کر دیا۔

علاوہ اس کے امیر خسرو کے زمانہ میں جو زبان گیتوں کی تھی وہ شرقی زمانہ میں زیادہ منجھ گئی تھی اور عربی فارسی کی آمیزش اس میں زیادہ ہو گئی تھی، امیر خسرو ترک تھے، اس وقت ترکوں کی بادشاہت تھی، فتوحات کا سیلاب ہندوستان میں بہہ رہا تھا اور یہاں کے قدیم باشندوں سے سخت کشمکش ہو رہی تھی، اپنی ملکی زبان، ملکی رواج اور مذہب کو ہر ایک جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا، بادشاہ سے لے کر ایک سپاہی تک ترکی یا فارسی زبان بولتا تھا، اپنی زبان کو عزیز رکھتا تھا، پھر اس کو بھی دیکھو کہ ان میں اکثر تازہ وارد ہوتے تھے، بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جن کی دو پشتیں بھی یہاں گزری ہوں اس لیے ہندی کے بعض حروف کا تلفظ بھی وہ اچھی طرح سے ادا نہ کر سکتے ہوں گے، شرقی کی اصل و نسل ہندوستان کی سرزمین سے تھی، وہ بھی فی الجملہ اطمینان و فراغت کا تھا، اس کا لب و لہجہ اور زبان کی لوچ قدرتی طور پر ہندوستانی تھی اور اس کے ملازمین و رعایا بھی سب ہندوستانی تھے، اس لیے اپنی ملکی زبان سے ایک طرح کا انس ہونا ان کے واسطے قدرتی امر تھا۔

تھوڑے دنوں کے بعد سکندر لودی نے ملکی مصالح کے لحاظ سے ہندوؤں کو فارسی پڑھنے کی رغبت دلائی تا کہ وہ دفتری زبان سیکھ کر ملکی کاروبار میں حصہ لے سکیں، برہمن اور

راجپوت جیسی دھرماتما قوموں نے انکار کیا، صرف اس قدر کامیابی ہوئی کہ کایستھوں نے فارسی پڑھنے کی ٹھان لی اور وہی ایک مدت تک سرکاری عہدوں کے ٹھیکہ دار بنے رہے، جیسا کہ انگریزی سلطنت قائم ہونے پر مسلمانوں نے انگریزی زبان سیکھنے کی پرواہ نہیں کی اور ہندوؤں کی سب قوموں نے اس مرتبہ اپنے پرانے تجربہ کی بنا پر فائدہ اٹھایا، نتیجہ یہ ہوا کہ سرکار کمپنی کی حکومت اٹھنے اور قاضی، مفتی، صدر امین، صدر الصدور کے عہدوں کے ٹوٹنے یا نام اور کام بدل جانے کے بعد ہندوؤں سے سرکاری خدمتیں بھر گئیں اور مسلمان منہ دیکھتے رہ گئے، بہرحال سکندر لودی کا یہ حکم بھی اس بات کا ایک ذریعہ ہو گیا کہ خود ہندوؤں کی زبان پر عربی اور فارسی کے الفاظ چڑھ گئے، اسی طرح مسلمانوں کی زبانوں پر ملکی زبانوں نے قابو پا لیا اور باہمی میل جول کی وجہ سے ان میں روانی پیدا ہو گئی۔

بابر بادشاہ ہندوستان آتا ہے تو باوجودیکہ وہ ایک ٹھیٹ مغل ہے، ڈال کا ٹوٹا ہوا اور وہ بھی اس سے متاثر ہوتا ہے، اس کے ترکی دیوان کا جو نسخہ نواب رامپور کے کتب خانہ میں ہے وہ ۹۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے، اس میں ایک شعر ہے جس کا ایک پورا مصرع اور دوسرے مصرع کا ایک ٹکڑا اردو میں ہے، کتاب خط نسخ میں لکھی ہوئی ہے، اس کے رسم الخط کے موافق میں اس شعر کو نقل کرتا ہوں ۔

مجکانہ ہوا کج ہوس مانک و موتی

فقرا (۱) ہلیغہ بس بولغوسیدر پانی ورلی

بابر کے پوتے اکبر شاہ کے زمانہ میں یہ میل جول اور بھی بڑھ گیا، بادشاہ کی زمانہ سازی سے ہندو رانیاں گھر کی مالک بن بیٹھیں، ہندوؤں کے سارے رسم و رواج بادشاہ نے

---

(۱) جب میں رامپور گیا تھا، میرے معزز دوست حافظ احمد علی خان شوق سپرنٹنڈنٹ کارخانجات سرکار رامپور نے مہربانی سے سرکاری کتب خانہ کی سیر کرائی اور اس کتاب کو خصوصیت سے دکھایا، میں ترکی زبان نہیں جانتا، انہوں نے جو مطلب دوسرے مصرع کا بتایا وہ یہ تھا کہ ''فقرا کو پانی اور روٹی کافی ہے۔''

اختیار کر لیے، پیشانی پر قشقہ لگایا، ہاتھوں میں راکھی باندھی، راکھی بندھن کی رسم سال بسال دھوم دھام سے ہونے لگی، راجہ ٹوڈر مل دیوان اور بیربر مصاحب ہوئے، راجپوتانہ میں کسی جگہ سسرال بنائی گئی، کہیں سمدھیانہ قائم ہوا، فارسی شعرا کے دوش بدوش کبیشروں اور گویوں نے بھی جگہ پائی، ان کو اگر ملک الشعرا کا خطاب دیا گیا، تو ان کو کب راج اور کب رائے بنایا گیا، گھوڑوں، ہاتھیوں اور ہتھیاروں کے نام ہندی رکھے گئے۔

جو چیزیں ہندوستان کی پیداوار تھیں ان کے نام قدرتی طور پر ہندی تھے، وہ سب زبانوں پر چڑھ گئے اور فارسی عبارتوں میں بھی ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کیے جانے لگے، مثلاً جھروکہ، درشن، پھول کٹار، کھپورۂ مرصع، جم دھر، کٹار، تلوار، گھوڑا، ہاتھی، پالکی، نالکی، جھالر، کہار، ڈاک، چوکی، سرچوکی، دیسمکھ، دیس، پانڈیہ، پٹیل، پٹواری، رائے، راؤ، راجہ، مہاراجہ، چودھری، پہر، دوپہر، گھڑی، گھڑیال، ڈالی، گھاٹ، گھرواره، بیوپاری اور اسی طرح کے صدہا الفاظ سلاطین مغلیہ کی شاہی زبان میں ملے جلے نظر آتے ہیں۔

اکبر شاہ جہانگیر کو پیار سے شیخو جیو، مراد کو پہاڑی راجہ اور فیضی کو شیخ جیو کہتا تھا، ایک دن فیضی حسب الحکم حضور میں کچھ لکھ رہا تھا، بیربر بات کرنے لگا، اکبر شاہ نے آہستہ سے کہا ''حرف نز بند شیخ جیو می نویسد'' آرام بانو اس کی چہیتی بیٹی تھی، مرتے وقت جہانگیر سے وصیت کرتا ہے:

''بہ ایں خواہر خود کہ لاڈلۂ من است بعد از من باید بروشے سلوک
مکئی کہ من بادمی کنم۔''

جہانگیر بادشاہ کی رنگیلی طبیعت سے تم واقف ہو، اس نے شراب کا نام ''رام رنگی'' رکھا تھا، شاہجہاں بچپن میں باپ کو ''شاہ بھائی'' اور دادا کو ''شاہ بابا'' کہتا تھا، مراد بخش شاہ شجاع کو ''بھائی جیو'' کہتا تھا، ایک خط میں عالمگیر کو لکھتا ہے:

''اگر ایں طرز پسند خاطر افتد صاحب وقبلہ بھائی جیو رادر ہم دریں

باب متفق ساختہ دریک ساعت و یک وقت از جاہائے خود روانہ مطلب
می باید شد۔"

عالمگیر نے کلمات طیبات میں کثرت سے ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں، جستہ جستہ
فقرے اس کے بھی ملاحظہ ہوں، فرزند عالی جاہ (محمد اعظم) کو لکھتے ہیں:

"مزہ کھچڑی بریانی شما در زمستان یاد می آید.........ڈالی انبہ مرسلہ
آں فرزند بہ ذائقہ پدر پیر خوشگوار آمد برائے نام انبہ گمنام استدعا نمودہ اند،
چوں آں فرزند جودت طبع دارند، روادار تکلیف پدر پیر چرا می شوند، بہر حال
سدھارس درستا یلاس نامیدہ شد.........خود بدولت بنفس نفیس چہار گھڑی
آخر شب از خواب گاہ برآمدہ.........نماز صبح ادا کردہ بجھرو کہ درشن تشریف
می آورند و درشنیان را بہ سعادت دیدار فیض آثار نواختہ بعد برآمدن چہار
گھڑی روز دیوان عام می فرمودند.........تا قریب دوپہر ایں معاملات
در پیش می بود.........دریں ضمن کرسی کچکڑہ نیز بہ نظر گذشت.........
براسپ نیلوفر چوا چندن کہ بتواتر سوار می شوند، ظاہرا از سواری آنہا پر محظوظ
اند.........شادیانہ فتح بہ نوازاند و حرف ایام طفولیت یاد دارند کہ بابا جی
دھون دھون.........قلعہ پرنالہ بہ اسم نول تازہ موسوم شد.........از
توپ دربھلہ و بان و رام جنگی و جزائر و گھڑنال و شتر نال و گجنال و سواران
با براق و اسپان و فیلان با برگستوانہائے براق و دیگر ملوازمہ طمطراق آں
قدر کہ باید بلکہ نباید ملاحظہ شد.........حدود فوجداری خود چناں از قطاع
الطریق خالی و از امن پر سازد کہ مسافرین و مترددین و تاجر و بیوپاری بلاد
سواس آمد و رفت کنند۔"

اس مشتے نمونہ از خروارے سے تم سمجھ سکتے ہو کہ ہندی کے کتنے الفاظ ان کی زبان پر

چڑھ گئے تھے اور پیار و محبت کے موقعوں پر وہ کس بے تکلفی سے ان کو کام میں لاتے تھے۔

جہانگیر بادشاہ کے زمانہ میں غواصی ایک شاعر تھا، اس نے مولانا بخشی کے طوطی نامہ کو بکٹ کہانی کے طور پر نظم کیا تھا، اس زمانہ کے دستور کے موافق کچھ ہندی، کچھ فارسی ملی جلی نظم تھی، میر حسن شعرائے ریختہ کے تذکرے میں غواصی کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کو دیکھا تھا مگر کوئی شعر اس وقت یاد نہیں، اگر اس کے دو چار شعر بھی مل جاتے تو پتہ چل جاتا کہ اس زمانہ میں زبان کی کیا حالت تھی۔

میر حسن نے تذکرہ میں اسی عہد کے ایک اور شاعر کا ذکر کیا ہے جس کا تخلص خاکی تھا، وہ کہتے ہیں کہ یہ دلی میں درویشانہ زندگی بسر کرتا تھا، اس سے زیادہ اس کا کچھ حال معلوم نہیں مگر اس کا ایک شعر کسی پیر مرد سے سنا ہوا اب تک یاد ہے ؎

ٹھانی ہے اپنے من میں اب تو یہی سریجن
تجھ پیم کی گلی میں خاکی کو خاک ہونا

اگر درحقیقت یہ اسی زمانہ کا شاعر تھا اور یہ شعر اسی کا ہے جس کی شہادت کا توڑا ایک مجہول الحال پیر مرد پر ہوتا ہے تو خاکی کو دکن کا باشندہ ماننا پڑے گا جو خاک چھانتا ہوا دلی پہنچ گیا ہوگا۔

جہانگیر ابراہیم عادل شاہ کا ہم عصر ہے، اس وقت دلی میں اردو شاعری کا سراغ نہیں ملتا، دکن میں اس کی بنیادیں قائم ہو رہی تھیں مگر اس وقت زبان جس عالم طفولیت میں تھی اس کا نمونہ محمد قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ اور مولانا نصرتی کے اشعار پڑھنے سے معلوم ہو سکتا ہے۔

خاکی کا جو شعر میر حسن نے اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے اس کی زبان شمس ولی اللہ اور ان کے ہم عصر شعرا کی زبان ہے، اس وجہ سے میری قطعی رائے یہ ہے کہ میر حسن کو دھوکہ ہوا ہے یا کاتب کا سہو القلم ہے، بجائے جہانگیر کے عالمگیر ہونا چاہیے تھا۔(۱)

(۱) سید محمد بن جمال الدین قادری ایک بزرگ شمس ولی اللہ کے ہم عصر تھے، خاکی تخلص تھا، ان کا مکمل دیوان مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے کتب خانہ میں موجود ہے، یہ دیوان ردیف وار ہے (باقی اگلے صفحہ پر)

تاہم اس میں کچھ شبہ نہیں کہ اکبر و جہانگیر کے طرز حکومت سے کایستھوں کے سوا ہندوستان کی اور قوموں کی بھڑک بھی جاتی رہی تھی، وہ بھی فارسی پڑھنے لگے تھے، ان کا میل جول مسلمانوں سے بہت بڑھ گیا تھا، اسی میل جول کا نتیجہ ہے کہ مخلوط زبان نے ایک قدم اور آگے بڑھایا، پھر بھی وہ بازاروں اور بے لطف صحبتوں یا گیتوں تک محدود رہی۔

اس زمانہ میں شاہی زبان فارسی تھی، بادشاہی فرمانوں سے لے کر دفتروں کے احکام تک اسی زبان میں جاری ہوتے تھے، اسی میں عرائض اور مقدمے کے کل فرائض طے ہوتے تھے، اسی میں عام طور پر خط وکتابت ہوتی تھی، کیا ہندو کیا مسلمان، سب کے دلوں پر اس کا رعب واقتدار اس قدر چھایا ہوا تھا کہ ملکی زبان کو بے علمی کی علامت جانتے تھے۔

اس وجہ سے اردو زبان کو علمی زبان تک رسائی نہیں ہوئی اور مدت دراز تک دار الملک اور اس کے گرد و پیش کے شہروں اور قصبوں میں فارسی کا سکہ رواں رہا لیکن اطراف ملک کی

سابقہ حاشیہ: علاوہ غزلوں کے مثنوی اور مستزاد بھی ہے، ایک دو ریختیاں بھی ہیں جو ہندی شاعری کا نمونہ ہیں، مناجات بھی ہے، نعت بھی، اول سے آخر تک کلام عارفانہ رنگ میں ڈوبا ہوا ہے، مقطعوں میں کثرت سے اپنے پیر کا نام لیتے ہیں، زبان وہی ہے جو ولی کے دیگر ہم عصروں کی ہے، اس دیوان کے علاوہ ایک مثنوی ان کی فیض عام ہے جو ۱۱۴۱ھ میں لکھی ہے، جس سال ولی نے وہ مجلس لکھی تھی، یہ ساڑھے سولہ جز کی کتاب ہے اور سید عبدالرزاق چیف ٹرانسلیٹر ناگپور کے کتب خانہ میں موجود ہے، میرا گمان غالب یہ ہے کہ میر حسن نے خاکی کا جو شعر نقل کیا ہے وہ ان ہی کا ہے، علامہ شیروانی نے مہربانی کر کے ان کے دیوان سے کچھ اشعار منتخب کر کے بھیجے ہیں جو ملاحظہ طلب ہیں:

جائز نہیں تھی ہجر کے شب کی شکایتیں — مجکوں خصوص آج تو نقدِ وصال تھا

اپنے معشوق سنگ ہو رہنا — ایک دل ایک رنگ ہو رہنا
خوش یہی حال ہے فقیری کا — نفس و دل بیچ جنگ ہو رہنا

جن نے مے کو پیا کے نوش کیا — اس کے حق میں ہوا ہے شربت تلخ

یہ حالت نہیں تھی، وہاں کچھ ایسے اسباب پیدا ہوتے گئے کہ مخلوط زبان (اردو) کی جڑ مضبوط ہوتی گئی۔

دکن میں محمد شاہ تغلق کی بے عنوانیوں سے بہمنیوں کی جو عظیم الشان سلطنت قائم ہوگئی اور علاء الدین حسن گانگو(۱) کے نام قرعۂ سلطنت پڑا، اس نے شروع سے برہمنوں کو مالی و ملکی عہدے دے کر حکومت میں دخیل کر لیا، مال کا دفتر زبان میں ہونے سے بہت سرعت کے ساتھ ملکی اور فارسی زبانیں مخلوط ہوگئیں۔

---

(۱) حسن گانگو ایک مفلوک الحال امیر زادہ تھا، اپنے خاندان کی تباہی کے بعد ملتان سے دلی آیا، یہاں اس کا کوئی شناسا نہ تھا، اتفاق سے جمنا کے کنارے گانگو پنڈت جو دربار شاہی کا منجم تھا، اس کو مل گیا اور اس نے حسن کو پریشان اور خستہ پاکر اس کی سرپرستی کی اور چند روز اپنے گھر میں مہمان رکھ کر محمد شاہ تغلق کے دربار میں اس کو باریاب کر دیا، حسن میں وہ تمام صفتیں موجود تھیں جو اقبال مندوں میں ہوا کرتی ہیں، دربار شاہی امیرانِ سندھ میں اس کو جگہ مل گئی، چند روز کے بعد ہکری رائے باغ وغیرہ مقامات اس کو جاگیر میں ملے اور دکن کی تعیناتی ہوگئی، محمد شاہ تغلق کی سخت مزاجی سے امرائے شاہی سب ہی پریشان رہتے تھے، ایک بار کسی بات پر ناراض ہوکر دکن کے امرا نے بغاوت کر دی، بادشاہ نے بہت کوشش کی مگر وہ بغاوت کا استیصال نہ کر سکا، بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچی کہ علاء الدین حسن کو لوگوں نے اپنا بادشاہ بنا کر گلبرگہ میں ایک جداگانہ سلطنت قائم کر لی، حسن نے گانگو پنڈت کو بلا کر صدر محاسب (اکاؤنٹنٹ جنرل) کا عہدہ دیا اور اس خوبی سے ملک کا انتظام کیا کہ جو حصے اب تک اسلامی اقتدار سے باہر تھے وہ سب اس کی قلم رو میں داخل ہوگئے، اسی طرح گانگو پنڈت نے زراعت و محاصل ملک کی افزائش میں پوری تندہی اور محنت سے خدمتیں انجام دیں جس کی وجہ سے اہل ملک مرفہ الحال اور خزانہ شاہی مالا مال ہوگیا، حسن پہلا بادشاہ ہے جس نے برہمنوں کو مالی صیغے دے کر شریک دولت بنایا، جب تک سلطنت بہمنیہ قائم رہی اور اس کے بعد طوائف الملوکی کے زمانہ میں بھی برہمنوں کے متعلق یہ صیغے ہمیشہ رہتے تھے، اسی وجہ سے اس ملک میں برہمنوں کا رعب و اقتدار بہ نسبت دوسرے ملکوں کے زیادہ قائم ہوگیا ہے اور اب بھی صوبہ مدراس میں یہ اثر نمایاں ہے۔

فیروز شاہ کے بیٹوں کے زمانہ میں ظفر خاں (۱) گجرات بھیجے گئے، دلی کی سلطنت اس وقت مردہ لاش کی حیثیت رکھتی تھی، انہوں نے گجرات کو تسخیر کر کے ایک پائدار حکومت کی بنیاد ڈالی جو تقریباً دو سو برس تک ان کے خاندان میں رہی، بانی خاندان کی اصل و نسل ہندوستان کی سرزمین سے تھی اور ملکی زبان ان کی مادری زبان تھی مگر شاہی دفتر فارسی زبان میں تھا اور کاروبار بھی سب فارسی زبان میں ہوتے تھے۔

تاہم اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ملکیوں سے وہ ملکی زبان میں بات چیت کرتے اور بے تکلف صحبتوں میں وہ اسی کو کام میں لاتے تھے، مگر جس زبان میں گفتگو کرتے تھے وہ خالص گجراتی زبان نہیں ہوتی تھی۔

زیادہ چھان بین کرنے سے مشائخ کے ملفوظات اور بادشاہوں کے سوانح میں جستہ جستہ ایسے فقرے ملتے ہیں جو کسی کسی موقع پر ان کی زبان سے نکل گئے ہیں، ان کو تبرک سمجھ کر یا موقع کی اہمیت کے لحاظ سے ان ہی کے الفاظ میں نقل بہ نقل تاریخ نے ہم تک پہنچا دیا ہے، اگر ان سب کو تلاش کر کے یکجا کیا جائے تو زبان کی درجہ بدرجہ تبدیلی کا حال خوب معلوم ہو سکتا ہے، مثال کے طور پر چند نمونے میں پیش کرتا ہوں جو اس وقت پیش نظر ہیں۔

۱۔ سید جلال الدین حسین بخاری (مخدوم جہان جہانیان گشت) کے پوتے بارہ برس کے سن میں گجرات چلے آئے تھے اور یہیں بود و باش اختیار کر لی تھی، نام و لقب ان کا

---

(۱) ظفر خان کے باپ کا نام سہارن تھا، ٹانک ان کی قومیت تھی جس کو کہا جاتا ہے کہ کھتریوں کی ایک شاخ ہے، سہارن فیروز شاہ تغلق کے ہاتھ پر مشرف بہ اسلام ہوئے اور اپنی کارگزاری اور خوش قسمتی سے امارت کے درجہ تک پہنچے، وجیہ الملک ان کو خطاب ملا، ان کے بیٹے ظفر خان نے ان سے زیادہ ترقی کی، وہ ۷۹۳ھ میں گجرات کی حکومت پر سرفراز ہوئے، دلی کی سلطنت فیروز شاہ کے بیٹوں اور پوتوں کی نااہلیت کے سبب برباد ہوتی گئی اور گجرات میں ان کی حسن کارگزاری سے ان کی طاقت بڑھتی گئی، چند روز میں فیروز شاہ کی اولاد برباد ہو گئی اور ظفر خان کی اولاد نے تقریباً دو سو برس تک نہایت کروفر سے سلطنت کی۔

برہان الدین عبداللہ ابن محمود تھا مگر گجرات والے ان کو "قطب عالم" کہتے ہیں، ان کے بڑے بیٹے کا نام ولقب سراج الدین محمد بن عبداللہ تھا، ان کو "شاہ عالم" کہتے ہیں، یہ دونوں باپ بیٹے اپنی خاندانی وجاہت کے ساتھ بڑے پایہ کے بزرگ بھی تھے، اسی وجہ سے شاہانِ گجرات ہمیشہ ان کے سامنے سرِ نیاز خم رکھتے تھے، جام جانو حاکم سندھ نے اپنی دولڑکیوں میں سے ایک کی نسبت شاہ عالم سے کردی تھی اور دوسری کی محمد شاہ بادشاہِ گجرات سے۔

جس کی نسبت شاہ عالم سے ہوئی تھی وہ حسن و جمال میں اپنی بہن سے اچھی تھی، محمد شاہ کو اس کی خبر لگی تو اس پر زورِ زر کا دباؤ ڈال کر نسبت بدلوادی، شاہ عالم کو سن کر اس کا ملال ہوا، انہوں نے باپ سے جا کر شکایت کی، اس وقت قطب عالم ایک حالت میں تھے، سن کر ان کی زبان سے بے ساختہ یہ فقرہ نکلا جو ان ہی کے الفاظ میں ہم تک پہنچا ہے:

بیٹے تسا نصیب دھون دیجہ(۱)
تیرے دونوں

۲۔ قطب عالم ایک بار تہجد کی نماز کو اٹھے، پیشاب کرنے کے بعد کلوخ لے کر ٹہل رہے تھے کہ رات کے اندھیرے میں کسی لکڑی یا پتھر سے پاؤں ٹکرایا اور چوٹ آگئی،

(۱) خدا کی قدرت دیکھو محمد شاہ کے مرنے پر اس کا بیٹا احمد شاہ تخت نشین ہوا، محمد شاہ کا دوسرا بیٹا سندھ کی بیگم سے فتح خان تھا جو آگے چل کر محمود شاہ اول اور محمود شاہ بیکرہ کے نام سے مشہور ہوا ہے، اس کا سن اس وقت دس برس سے کم تھا، اس کی ماں کو احمد شاہ کی طرف سے خطرہ پیدا ہوا، وہ اس خیال سے کہ فتح خان یا کہو محمود کو بھائی سے گزند نہ پہنچے، اس کو لے کر اپنی بہن کے پاس شاہ عالم کی خانقاہ میں چلی آئی، چند روز کے بعد بہن کا انتقال ہوگیا، شاہ عالم نے اس کو پیغام بھیجا کہ جب تک تمہاری بہن زندہ تھی تم محرم تھیں اور ہمارے گھر میں رہ سکتی تھیں، اب کوئی دوسرا انتظام کرو، اس نے اپنے بھائی سے مشورہ کرنے کے بعد کہلا بھیجا کہ میری نسبت آپ ہی سے ہوئی تھی مگر بادشاہ نے میرے باپ پر دباؤ ڈال کر بدلوادی، اب آپ مجھ کو اپنی لونڈی بنا کر رکھیے، یہ سن کر شاہ عالم نے اس سے نکاح کرلیا اور قطب عالم کی پیشین گوئی حرف بحرف پوری ہوگئی، قطب عالم نے ۸۵۰ھ اور شاہ عالم نے ۸۸۰ھ میں وفات پائی۔

اس وقت آپ کی زبان سے بے ساختہ نکل پڑا:

لوہے یا لکڑ یا پتھر یا کیا ہے (۱)
لوہا لکڑی

۳۔ محمود شاہ اول کا سن دس برس کا تھا اور وہ شاہ عالم کے گھر میں اپنی خالہ کے پاس رہتا تھا، اس کا بھائی احمد شاہ دوم برسر حکومت تھا، وہ چاہتا تھا کہ محمود شاہ کو اپنے قابو میں کرلے مگر شاہ عالم کی وجاہت سے محل سرا میں داخل ہو کر اس کو نکال نہ سکتا تھا۔

ایک دن معلوم ہوا کہ محمود فلاں جگہ شاہ عالم کے پاس بیٹھا پڑھ رہا ہے، بادشاہ بنفس نفیس سوار ہو کر اس جگہ دفعۃً پہنچ گیا، خادموں نے بغیر اجازت اندر داخل ہونے سے روکنا چاہا مگر شاہ عالم نے آواز پہچان کر کہا آنے دو اور محمود کی طرف دیکھ کر فرمایا:

پڈھ ڈوکرے
پڑھ بڈھے

بادشاہ آکر دیکھتا ہے کہ ایک پیر مرد حضرت کے سامنے بیٹھا پڑھ رہا ہے، آکر مسند پر بیٹھ گیا اور اثنائے گفتگو میں ادھر ادھر دیکھتا بھی رہا، جب محمود کو نہ پایا تو اٹھ گیا اور جا کر جاسوسوں کو سرزنش کی۔

محمود شاہ اول (۲) کے عہد میں قاضی نجم الدین احمد آباد کے قاضی تھے، ایک دن

---

(۱) صبح کو دیکھا گیا تو وہ ایک ایسی چیز نکلی جس پر تینوں چیزوں کا شبہہ ہوتا تھا اور تینوں کی خاصیتیں اس میں پائی جاتی تھیں، اس کو لوگوں نے عجیب چیز یا قطب کی کرامت سمجھ کر مدتوں رکھ چھوڑا، اکبر شاہ نے جب گجرات فتح کیا ہے تو وہ بھی اس کے دیکھنے کو گیا، اس قصہ کو نظام الدین ابوالفضل اور فرشتہ نے اپنی اپنی تاریخوں میں نقل کیا ہے۔ (۲) محمود شاہ اول گجرات کا سب سے اچھا بادشاہ گزرا ہے، ۸۶۳ھ میں تخت نشین ہوا اور ۹۱۷ھ میں وفات پائی اور کچھ اوپر ۵۴ سال تک نہایت کامیابی کے ساتھ حکومت کی، یہ بادشاہ علوم وفنون کی سرپرستی میں اپنا آپ ہی نظیر تھا، شیراز و یمن سے علما و محدثین کثرت سے اس کے زمانہ میں آئے اور اس نے ہر ایک کے مرتبہ کے موافق وظائف مقرر کیے اور عہدے دیے، علاوہ اس کے (باقی اگلے صفحہ پر)

اثنائے راہ میں سنار کے ہاتھ میں ایک نہایت خوبصورت رباب دیکھا جو مرصع بہ جواہر تھا، پوچھا کس کا ہے، اس نے کہا بادشاہ کا، یہ سن کر اس کے ہاتھ سے لے لیا اور زمین پر پٹک کر ٹکڑے کر ڈالا، بادشاہ کو خبر ہوئی تو ہنس کر فرمایا:

نیچی بیری ہر کوئی جھورے

مقصد یہ تھا کہ احتساب کا سارا زور ہم پر صرف کیا جاتا ہے، شاہ عالم کے یہاں جا کر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہیں کرتے جو دھڑلے سے سماع سنتے ہیں۔

۵۔ بہادر شاہ ایام شاہزادگی میں شیخ جیو کا مرید ہو گیا تھا اور انہوں نے اس کو سلطنت کی بشارت دی تھی، سکندر خان کو جو ولی عہد اور صاحب اقتدار تھا یہ سن کر ملال ہوا، اس وقت بہادر شاہ کی جاگیر میں صرف دو گاؤں تھے جن سے اس کا خرچ چلتا نہ تھا، اپنے والد مظفر شاہ حلیم کی خدمت میں کئی بار عرضِ داشت کی مگر جب ان کو متوجہ نہ پایا تو بغیر اجازت و اطلاع کے قسمت آزمائی کے لیے نکل کھڑا ہوا، اس وقت دلی کی سلطنت کا ڈھچر ڈھیلا ہو رہا تھا، امرا میں بددلی پھیلی ہوئی تھی، وہ اس کے خواہش مند تھے کہ مضبوط ہاتھوں عنانِ سلطنت ہو۔

پنجاب کے بعض امرا بابر شاہ مغل سے ساز باز کر رہے تھے، جونپور کے لوگوں نے بہادر شاہ کو دعوت دی، یہ منچلا تو تھا ہی اسی امید پر جونپور کا قصد کر کے روانہ ہو گیا۔

سابقہ حاشیہ: دور دور سے صناع اور ہنرور لوگوں کو بلا کر کام پر لگایا اور ان کی حوصلہ افزائی کی، زراعت کو اتنی ترقی دی کہ گجرات کے سارے جنگل اور بیہڑ جت کر زمینیں آباد ہو گئیں، باغات خود بھی کثرت سے لگائے اور رعایا کو انعام دے کر حوصلہ دلایا کہ جس سے ہر طرف باغ ہی باغ نظر آنے لگے، محمد آباد، محمود آباد اور مصطفیٰ آباد کے نام سے کئی شہر آباد کیے، انصاف اور معدلت کے قوانین بنائے، ان تمام باتوں سے بالاتر یہ بات ہے جو میرے نزدیک اس کی زندگی کا پُر فخر کارنامہ ہے کہ اس نے توسیع سلطنت کے خیال سے اپنے ہمسایہ بادشاہ پر کبھی قوت آزمائی نہیں کی، جو آسودہ حالی اس کے زمانہ میں اور اس کے لائق جانشین مظفر شاہ حلیم کے عہد میں رعایا کو تھی وہ کبھی گجرات والوں کو نصیب نہیں ہوئی۔

ادھر بہادر شاہ نے وطن چھوڑ کر غربت اختیار کی، ادھر اس کے پیر و مرشد شیخ جیو کا انتقال ہو گیا، ان کے انتقال کی خبر سکندر رلوی کو پہنچی تو خوش ہو کے طنز کے لہجہ میں کہا:

پیر موا مرید جوگی ہوا (۱)

---

(۱) مطلب یہ ہے کہ اب میدان صاف ہے مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مظفر شاہ حلیم کا انتقال ہو گیا، ادھر سکندر خاں تخت نشین ہوا، ادھر امرائے بہادر شاہ کو اس واقعہ کی اطلاع دی، یہ وہ زمانہ ہے کہ بابر شاہ ہندوستان کی تسخیر کر چکا تھا اور ابراہیم لودی سے برسرِ پیکار تھا، بہادر شاہ اس تماشے کو دیکھتا ہوا لوٹ پڑا، ہنوز گجرات نہیں پہنچا تھا کہ بعض نمک حراموں نے سکندر شاہ کو صرف دو مہینہ سولہ دن بادشاہی کرنے کے بعد تخت سے کھینچ کر تختہ پر لٹا دیا اور ایک کمسن بچہ کو تخت نشین کر دیا، بہادر شاہ کو اس واقعہ کی بھی اثنائے راہ میں اطلاع ہوئی، وہ کوچ در کوچ کرتا ہوا گجرات پہنچا اور ۹۳۹ھ میں عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لی اور جس نمک حرام نے اس کے بھائی کو قتل کیا تھا اس کو بری طرح سے سزا دی۔

بہادر شاہ گجرات کے بادشاہوں میں سب سے زیادہ حوصلہ مند بادشاہ گزرا ہے، شجاعت اور بہادری کے لحاظ سے اسم با مسمیٰ تھا، مالوہ کا پورا ملک مع اس کے توابع اور ملحقات کے اس کے عہد دولت میں ممالک محروسہ گجرات میں داخل ہو گیا تھا اور دکن کی چار اسلامی سلطنتوں نے اس کے نام کا خطبہ اپنے اپنے ملکوں میں جاری کر دیا تھا۔

چتور اور رنتھور جیسے فلک فرسا قلعے اس نے بڑی آسانی سے فتح کر لیے تھے، راجپوتانہ میں کوہ آبو تک جو آج کل ایجنٹ گورنر جنرل راجپوتانہ کے رہنے کا مقام ہے، اس نے اپنی عمل داری کو بڑھا لیا تھا اور کوشش یہ تھی کہ دلی کی شہنشاہی پر ہاتھ مارے مگر افسوس ہے کہ رومی خان نے اس سے دغا بازی کی اور بنا بنایا کھیل بگاڑ دیا۔

رومی خان اصل میں قسطنطنیہ کا بادشاہ تھا، سواحل یمن میں اس نے اپنی قوت بازو سے بہت سے مقامات پر قبضہ کر لیا تھا، جب اس کو محسوس ہوا کہ سلطنت عثمانیہ کی جانب سے اس کی گیر و دار ہونے والی ہے تو بھاگ کر بہادر شاہ کے دامن میں پناہ لی، بہادر شاہ کو ہمیشہ پرتگیزوں سے مقابلہ کرنا پڑتا تھا، اس نے اس کو کام کا آدمی سمجھ کر ڈیو، ڈمن، تھانہ، مہائم، راندیر، سورت وغیرہ مقامات جو سواحل پر واقع ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

۶۔ بہادر شاہ کے پاس ایک طوطا تھا جس کی میٹھی میٹھی باتیں بادشاہ کو بہت پسند تھیں اور اس کو وہ اپنے پاس سے جدا نہ کرتا تھا۔

سابقہ حاشیہ: اس کی جاگیر میں دیے اور اپنے یہاں توپ خانہ قائم کر کے اس کو نواب ناظر بنایا، اصلی نام مصطفیٰ بن بہرام تھا، بہادر شاہ نے رومی خان خطاب دیا تھا۔

رومی خان کے خمیر میں بغاوت و سرکشی کا مادہ تھا، کسی بات پر ناخوش ہو کر اس نے دغابازی کی ٹھان لی، جب مالوہ میں ہمایوں بادشاہ سے جنگ کی ٹھہری تو اس نے بہادر شاہ کو مشورہ دیا کہ وہ تمام لشکر کو یکجا کر کے توپ خانہ کا قلعہ گھیر کر محصور ہو جائے، ہمایوں اس ملک میں اجنبی ہے، رسد نہ ملنے سے چند روز میں بھاگ کھڑا ہوگا، امرا و وزرا نے کوشش کی کہ اس غلط مشورہ کو نہ مانا جائے مگر بہادر شاہ کے دل میں اس نے اتنا اعتبار پیدا کر لیا تھا کہ اور کسی کی اس کے سامنے کچھ نہ چلی اور اس کے مشورہ پر عمل کیا گیا، اس نے جب دیکھا کہ یہ محصور ہو گئے ہیں تو ہمایوں سے نامہ و پیام شروع کر دیے جو رسد بہادر شاہ کے واسطے آتی وہ دشمن لوٹ لیتا، آخر کار ایک شب اس نے میگزین میں آگ لگوا دی، ہمایوں کو پہلے سے معلوم تھا، وہ اپنا لشکر لے کر ٹوٹ پڑا، یکایک اس واقعہ کے ہو جانے سے بہادر شاہ کا دل چھوٹ گیا اور اس کو وہاں سے بھاگنے کے سوا کوئی چارۂ کار نظر نہیں آیا، ہمایوں نے رفتہ رفتہ تمام گجرات پر قبضہ کر لیا مگر اس کا قدم گجرات میں اچھے طور پر جمانہ تھا کہ شیر شاہ ایسے دشمن اور بھائیوں ایسے مار آستین دوستوں کے ڈر سے وہ آگرہ واپس آیا اور بہادر شاہ نے امرائے ہمایونی کو گجرات سے نکال کر پھر اپنی کھوئی ہوئی سلطنت حاصل کی، مگر اس کی تقدیر نے اس کو چند روز کی مہلت بھی نہ دی، اب پرتگیزوں سے اس کو سابقہ پڑا اور یہ رومی خان سے بھی دغاباز نکلے۔

پرتگیزوں نے دعوت کے بہانہ سے بلا کر اس قصہ کو ۹۴۳ھ میں ہمیشہ کے لیے تمام کر دیا اور اس طریقہ سے ڈیو، ڈمن اور تھانہ وغیرہ ان کے قبضہ میں آگئے، جن میں سے ڈیو اور ڈمن اب بھی ان ہی کے قبضہ میں ہیں۔

رومی خان کا انجام یہ ہوا کہ ہمایوں بادشاہ نے اس کو چنار گڑھ کے فتح کرنے پر مامور کیا اور فتح ہو جانے پر اس کو اسی کی جاگیر میں دے دیا مگر تھوڑے دن نہیں گزرے تھے کہ زہر ہلاہل سے اس کا کام تمام کر دیا۔

جب مالوہ میں رومی خان کی نمک حرامی سے ہمایوں بادشاہ کے مقابلہ میں اس کو شکست ہوئی اور بہادر شاہ کو بے سروسامانی کے ساتھ گجرات بھاگنا پڑا تو اس کے طوطے کا پنجرا بھی مالِ غنیمت کے ساتھ ہمایوں بادشاہ کے سامنے پیش کیا گیا، طوطے کی حیرت انگیز باتوں کو سن کر بادشاہ دنگ ہو رہا تھا کہ رومی خان بھی حاضر ہوا، بادشاہ نے فرمایا ''بیائید رومی خان'' اس کا نام سننا تھا کہ طوطا چیخنے لگا:

پھٹ رومی خان حرام خور، پھٹ رومی خان حرام خور

قرینہ یہ ہے کہ رومی خان کی نمک حرامی سے بہادر شاہ کو شکست ہوئی ہوگی تو اس کے لشکر کے بچہ بچہ کی زبان پر یہ فقرہ چڑھ گیا ہوگا اور اس طوطے کو بھی سنتے سنتے یاد ہو گیا ہوگا جس وقت ہمایوں شاہ کی زبان پر رومی خان کا نام آیا، اس کو سن کر وہ فقرہ یاد آ گیا اور اس کو دہرانے لگا۔

میں نے یہ چند مثالیں صرف ایک کتاب مرأۃ سکندری سے لی ہیں اگر بزرگانِ دین کے ملفوظات میں جستجو کی جائے تو اردو کی درجہ بہ درجہ ترقی پر کافی روشنی پڑ سکتی ہے۔

□□□

اب اردو شاعری کی حقیقت سنو!

زیادہ چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری کا ظہور دکن سے ہوا ہے، اس کا ایک خاص سبب ہے جس کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کی حاجت ہے۔

دلی میں قطب الدین ایبک سے لے کر اکبر شاہ تیموری تک جتنے بادشاہ ہوئے، ترک ہوں یا افغان، سید ہوں یا مغل، ان میں بیشتر ولایت زادہ ہوئے اور اگر ان کی اولاد بھی برسر حکومت ہوئی تو وہ بھی آئین وقوانین میں اپنے اسلاف کی پیروی کرتی تھی۔

شاہی زبان ہمیشہ فارسی رہی اور اسی زبان میں شاعروں کو اپنے جوہر قابلیت کے چمکانے کا موقع ملتا رہا، جس طرح سے آج انگریزوں کو ہندوستانیوں سے الگ تھلگ رہنا پسند ہے، یہاں تک کہ اپنی چھاؤنیاں ہندوستانی آبادی سے دور تر مقاموں پر قائم کرتے ہیں اتنا تو وہ اپنی رعایا سے کھنچے نہیں رہتے تھے تاہم رعب وداب قائم رکھنے کو زیادہ میل جول بھی نہیں کرتے تھے۔

سب سے پہلے اکبر بادشاہ نے مصالح ملکی کے لحاظ سے قرابت و یگانگت ہندوؤں سے پیدا کی اور چاہا کہ جو پردہ بادشاہ اور رعایا میں بیگانگی کا حائل ہے وہ اٹھ جائے، تاہم شاہی زبان فارسی رہی اور چنگیزی و تیموری تورہ پر آئین وقوانین سلطنت کی بنیاد باقی رہی۔

بادشاہ و امرا سب کے سب فارسی بولتے اور ترکی زبان کے سیکھنے اور سمجھنے کی کوشش کرتے رہتے، تم دیکھتے ہو کہ محمد شاہ رنگیلے جن کی سات پشتوں نے ہندوستان کی آب

وہوا میں پرورش پائی ہے اوران میں سے ایک نے بھی ترکستان کی ہوا نہیں کھائی، وہ بھی ترکی زبان بولتے (۱) اور فارسی کو اپنی مادری زبان سمجھتے تھے، اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ ہندوستان کے نام برآوردہ فارسی شعرا میں امیر خسرو، میر حسن، فیضی، غنی، بیدل، غنیمت اور ناصر علی جیسے چند نفوس کے سوا تمام تر وہی اہل سخن ہیں جو وقتاً فوقتاً شاہانِ ہند کی فیاضیوں کا شہرہ سن کر ایران سے ہندوستان آئے اور یہیں کے ہو رہے اوران کی زبان فارسی، نتائج فکر فارسی، ان میں سے بیشتر ساری عمر ہندوستان میں رہ کر ملکی زبان سے ناآشنائے محض رہے لیکن ہندوستان میں بہت کم ایسا ہوا ہے کہ دور ترین صوبے شہنشاہی طاقت کے زیر اقتدار ہمیشہ رہے ہوں، کشمیر میں ظہور اسلام سے لے کر اکبر بادشاہ کے زمانہ تک ہمیشہ آزاد حکومت برسر اقتدار رہی، وہاں کے بادشاہوں نے شاہانِ دہلی کے سامنے کبھی سر نیاز نہیں جھکایا، بنگال اور سندھ کبھی آزاد اور کبھی ماتحت ہوتے رہے، دکن میں محمد شاہ تغلق کے ناروا تشدد سے ایسی عظیم الشان سلطنت قائم ہوئی جس کی یادگار عالمگیر مرحوم کے زمانہ تک باقی رہی، گجرات، مالوہ اور جون پور میں فیروز شاہ کے بعد آزاد سلطنتیں قائم ہوئیں جو سیکڑوں برس تک زندہ رہیں۔

یہ حکومتیں بیرونی حملوں سے ہمیشہ بے خوف رہیں، ایران و توران سے جو بادل گھر کر آتے تھے وہ دلی پر گرج برس کر نکل جاتے تھے، یا جو بجلی گرتی تھی وہ دلی پر گرتی تھی، آج غلاموں کی سلطنت ہے، کل خلجیوں کی، پرسوں تغلق کی، کبھی سید برسر حکومت ہیں، کبھی افغان، کبھی مغل، جو آیا اس نے پچھلوں کو مار ہٹایا اور خود تاج و سریر کا مالک بن بیٹھا، ایک تیموریوں نے کئی سو برس حکومت کی، باقی سب دو دو تین پشتوں سے زیادہ نہیں چلے۔

یہ حالت ان بادشاہوں کی نہ تھی جو اطراف ہند میں برسر حکومت تھے، جس خاندان

---

(۱) محمد شاہ جن روز ون سادات کے پنجہ میں گرفتار تھے اور سادات کی مرضی کے خلاف سانس بھی نہیں لے سکتے تھے، اس زمانہ میں اعتماد الدولہ محمد امین خان کو اگر کبھی موقع مل جاتا تو ترکی زبان میں گفتگو کر کے اپنا کام نکال لیتا تھا، دیکھو سیر المتاخرین، ص ۴۳۳ مطبوعہ نول کشور پریس۔

میں سلطنت آئی آخر تک اسی خاندان میں رہی، علاوہ اس کے کچھ خاندان ان میں ایسے تھے جو خالص ہندی النسل تھے اور نہیں بھی تھے تو دو چار پشتوں کے بعد ہندی ہو گئے تھے، خصوصاً دکن میں جہاں ملکی اور غیر ملکی کے جھگڑوں سے صفحات تاریخ بھرے پڑے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ اہل دکن میں عصبیت کا مادہ زیادہ تھا، ان کو غیر ملکیوں کی ہر چیز سے نفرت تھی، غریب کشی کا تماشا دیکھنا ہو تو تاریخ فرشتہ میں بیجاپور، احمد نگر اور گلکنڈہ کے حالات پڑھو، اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ اپنی مستقل ہستی قائم کرنے کو زبان اور شاعری میں بھی غیر ملکیوں سے الگ رہنا چاہتے تھے۔

افسوس ہے کہ ہم اس کا ٹھیک زمانہ متعین نہیں کر سکتے کہ دکنی زبان فارسی آمیز میں شعر و سخن کا آغاز کس وقت سے ہوا ہے مگر جیسا کہ قاعدہ ہے، ہندی دوہروں میں پہلے فارسی الفاظ اور فارسی ترکیبوں کی آمیزش ہوئی ہوگی اور اس کے بعد فارسی بحروں کو اختیار کیا گیا ہوگا اور سرکاری تقریبوں میں بادشاہوں کی تعزیت و تہنیت کا کام اس سے لیا گیا ہوگا، پھر رفتہ رفتہ دیگر اصناف سخن اس میں آ گئے ہوں گے، آخر کار رقص و سرود کی محفلوں اور عزاداری کی مجلسوں کی گرمی ہنگامہ اسی پر موقوف رہ گئی ہوگی۔

ابراہیم عادل شاہ بیجاپور کا بادشاہ تھا، اس کو ہندوستان کی موسیقی سے محبت نہیں عشق تھا اور اس میں ایسا کمال پیدا کیا تھا کہ اس زمانہ کے تمام گویّے اس کو جگت گرو کہتے تھے۔

ابراہیم ۹۸۸ھ میں تخت نشین ہوا، نو برس کی عمر تھی، دس برس تک دکنی امرا کی نگرانی میں رہا اور دکنیوں کے زور سے غیر ملکی اس کے گرد و پیش سے خس و خاشاک کی صرح نکال پھینکے گئے، ایرانیوں کا زور بہت کچھ گھٹ گیا، بادشاہ خود ہندوستان میں پیدا ہوا، ہندوستان میں پرورش پائی، ہندوستانیوں پر حکومت کرنے کا موقع ملا اور خدا جانے طبعی مناسبت یا اثر صحبت سے ہندوستان کی موسیقی کا شوق پیدا ہوا اور ایسا بڑھا کہ اطراف ہندوستان سے بلا کر تین ہزار گویّے بیجاپور میں جمع کر لیے۔

۱۰۰۸ھ میں بیجاپور کے قریب نورس پور کے نام سے ایک بڑا شہر آباد کیا جس میں گرو اور چیلوں کے لیے بڑی بڑی محل سرائیں، عمدہ عمدہ باغات، صاف اور ستھرے بازار، تھوڑے دنوں میں بن کر تیار ہو گئے، شاہی محل سرا کا نام نورس محل، شاہی مہر پر نورسی، سکہ پر نورس، علم و نشان کے نام نورسی، دھرپد میں ایک کتاب ملکی زبان میں لکھی تھی، اس کا نام نورس نامہ، ظہوری نے اس کا دیباچہ فارسی میں لکھا جو سہ نثر ظہوری کے نام سے مشہور ہے، اس کا نام دیباچۂ نورس نامہ قرار پایا۔

مثل ہے "الناس علی دین ملوکھم" بعض شاعروں نے اپنا تخلص بدل کر نورسی قرار دیا، ظہوری فارسی نژاد، فارسی زبان کا مشہور شاعر ہے، وہ بھی فارسی میں ہندی الفاظ بے تکلف استعمال کرتا ہے، نمونہ ملاحظہ ہو:

سپہر از سر افرا زیش در حساب
زچو کھنڈلیش سایہ بر آفتاب

ایک جگہ ساقی نامہ میں لکھتا ہے:

شود چہرۂ زر خورسند آل
دہندش اگر نازنینان اگال

ابراہیم کو خود راگ اور راگنیوں کو ترکیب دینے اور اپنی زبان میں شعر کہنے کا شوق تھا، جو کچھ تصنیف کرتا گویوں کو سناتا، وہ اس کو یاد کر کے پھیلاتے تھے، رفتہ رفتہ ملکی زبان میں جو نہ خالص ہندی تھی بلکہ عربی اور فارسی الفاظ کے امتزاج سے ایک نئی زبان ہو گئی تھی، طبع آزمائی کرنے کا شوق عام ہو گیا اور بڑھتا گیا، یہاں تک کہ فارسی بحروں میں کہنے لگے۔

گلکنڈہ میں محمد قلی قطب شاہ اسی ابراہیم کا معاصر، نہایت علم دوست، ہنر پرور بادشاہ تھا، علوم و فنون میں مہارت کلی رکھنے کے ساتھ رنگین مزاج بھی تھا، عنفوانِ شباب میں بھاگ متی نام ایک عورت پر ایسا شیفتہ ہوا کہ گلکنڈہ سے چھ میل کے فاصلہ پر اپنی معشوقہ کے

نام سے بھاگ نگر ایک شہر آباد کیا اور اس میں عمدہ عمدہ محل سرائیں اور باغات تیار کیے، بھاگ متی کے مرنے پر جوش محبت سرد ہوا تو بھاگ نگر کا نام بدل کر حیدر آباد رکھا جو آج دولت آصفیہ کا پایۂ تخت ہے۔

محمد قلی شاعر بھی تھا، فارسی اور اردو میں شعر کہتا تھا، اس کا مکمل دیوان نواب سالار جنگ بہادر کے کتب خانہ میں اور کتب خانہ آصفیہ میں اس کا ضخیم کلیاتِ اصنافِ سخن سے مملو موجود ہے جو قطب شاہی خاندان کا شاہی نسخہ ہے، کلام کا نمونہ اس لحاظ سے دیکھو کہ اردو کلام کا سب سے قدیم تر نمونہ جو ہم تک پہنچ سکا ہے وہ یہی ہے، اس سے پہلے کا کوئی شعر کم از کم میری نظر قاصر سے نہیں گزرا:

پیا ہوں حضرت کے ہت آب کوثر   تو شاہان اپر مجھ کلس کر بنایا
ہاتھ

سدا تو مدحِ نبیؐ و علیؑ کہ کہتا ہے   معانی شعر ترا تو لکھے ہیں دست بدست

خورشید کہ اُپر سے ابرو ہلال عید   اس ابروان کو سجدہ کیا ہے وصال عید

ہے محمد قطب شہ بارہ امامان کا غلام   میں سو عاجز و اس ٹھہرایا علیؑ سنج دستگیر
آیت قرآن نازل جیون ہوا حضرت کے تئیں   مرتضیؑ ہیں بس دو جگ میں جیون محمدؐ بے نظیر

محمد علی قطب شاہ نے ۱۰۲۲ھ میں وفات پائی، اس کے بعد اس کا بھتیجا اور داماد سلطان محمد قطب شاہ تخت و تاج کا مالک ہوا، یہ بھی شاعر تھا، فارسی میں ظل اللہ اور دکنی فارسی آمیز میں قطب شہ تخلص کرتا تھا، اس کا دیوان مکمل سالار جنگ کے کتب خانہ میں موجود ہے، ۱۰۳۵ھ میں اس نے وفات پائی، کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو:

پیاسا نولا من ہمارا بھولایا   نزاکت عجب سبز رنگ میں دکھایا

بے دام اس کا خدمت کرتا ہوں اپنے دل سوں   دیتے ہیں دام ان کو ہور کرتے ہیں عنایت

بکرید عید آیا صلوات بر محمدؐ آنند علم اجایا صلوات بر محمدؐ

انجانے میں جوانی گیا پند نا سنا قرآن اور حدیث سون ترکیب کر کلام

ساقیا اشراب ناب کہاں چندر کی پیالی میں آفتاب کہاں

سلطان محمد قطب شاہ کے بعد اس کا بیٹا عبداللہ قطب شاہ بادشاہ ہوا، وہ بھی شاعر تھا، ۱۰۸۳ھ میں اس نے وفات پائی، یہ بھی صاحب دیوان گزرا ہے ۔

گفتم کہ خان وزلفت کیا ہے سو بول منجکو گفتا کہ زلف دامت ہور خال سو ہے دانا

اے پری پیکر ترا مکھ آفتاب دیکھتا ہوں تو رہے نا منجہ میں تاب
قند اور نابات گلتا اجھون دے نہ سک تری مٹھی لب کا جواب

راز کیا باتان نبی کے صدقے پوچھے گا اگر شاہ عبداللہ کو پوچھ آکر کہ ہے حاضر جواب
کی

آب حیات تہی ہے زیادہ کہ لب ترا کرتے ہیں منجسوں خضر علیہ السلام بحث

یہ تینوں سرزمین دکن کی سلطنت کے ساتھ ملک سخن کی بھی حکومت رکھتے تھے، میں نے ان تینوں کا مندرجۂ بالا کلام آصفی کے تذکرہ سے نقل کیا ہے اور ظن غالب یہ ہے کہ ان کے زمانہ میں بہت سے باکمال شاعر ہوئے ہوں گے جو اسی زبان میں شعر کہتے ہوں گے، اس واسطے کہ بادشاہوں کا میلان جس جانب ہوتا ہے اسی جانب لوگوں کے خیالات متوجہ ہو جاتے ہیں اور نہ سہی مراثی یا بادشاہ وقت کی مدح میں قصیدے اسی زبان میں کہے جاتے ہوں گے مگر افسوس ہے کہ اس کے علم کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس نہیں۔

البتہ بیجاپور کے شعرا میں سے مولانا نصرتی، ملا ہاشمی اور میرزان مرثیہ گو کا ذکر بساتین السلاطین میں زبیری نے کیا ہے اور نصرتی کے کچھ اشعار بھی نقل کیے ہیں۔

نصرتی محمد عادل شاہ کے زمانہ کا شاعر ہے جو علی عادل شاہ کے اخیر زمانہ تک زندہ رہا،

اس کی تصنیفات میں گلشن عشق ایک مثنوی ہے، اردو میں منوہر کنور اور مدمالتی کا قصہ اس میں نظم کیا ہے، دوسری کتاب علی نامہ اردو میں ہے، شاہنامۂ فردوسی کا جواب، اس میں علی عادل شاہ بیجاپوری کے فتوحات بیان کیے ہیں، ایک مجموعہ قصائد ہے، ایک غزلوں کا دیوان ہے۔

ان کتابوں کے علاوہ ایک پرانی بیاض میری نظر سے گزری ہے، جس میں نصرتی کا معراج نامہ پورا نقل ہے، تاریخ کتابت ۲۲ محرم ۱۰۸۳ھ اس میں درج ہے اور اکبر آباد میں لکھا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نصرتی کا کلام ان ہی کی زندگی میں اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ اس کی نقلیں بیجاپور سے اکبر آباد پہنچ گئیں، معراج نامہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ محمد عادل شاہ متوفی ۱۰۶۳ھ کے عہد میں لکھا گیا ہے کیوں کہ اس کو اسی بادشاہ کے مدحیہ اشعار پر ختم کیا گیا ہے، نمونہ ملاحظہ ہو:

حمد ہے منعم کیرا خلق پہ اس دور کے ۔۔۔ ہے جو سمی رسولؐ خسرو ملکِ دکن

منبع لطف و عطا، حامی دیں باوفا ۔۔۔ معدنِ جود و سخا، ماحیِ کفرِ کہن

صاحب فضل و ہنر صف شکنِ بحر و بر ۔۔۔ ملجاء فتح و ظفر ہادیِ شمشیرِ زن

غازی صفدر کے دل بل سون نکلتے نہیں ۔۔۔ دھاک سون بھاری بہیاں ترت ترت تر بہن
(زور سے) (ہوئیں جلد جلد)

شہ سا لچھن تول کون ہے جگ میں کہو ۔۔۔ یاد سے جس رسم کے جائے کدورت محن
(اچھا) (دنیا)

راج سون شہ کے سدا حق تھا دعا امن پا ۔۔۔ جیو سے منگے ہت پسار دور کے سب مرد و زن
(دل) (مانگ، ہاتھ پھیلا کر)

لطف سون دہریا الہ شاہ کی شاہی تلک ۔۔۔ جگ میں چلک برا چھیں عیش دھرم کے پتن

جام سون عشرت جم بزم یہ معمور اچھو ۔۔۔ چرخ میں دن رین کے کرم ہیں جیون انجمن

شہ کی ثنا نصرتی نغز دنول یوں لکھی ۔۔۔ دور کے دفتر اوپر پر اچھے ہر یک بچن

اسی دور کے دوسرے شاعر ملا ہاشمی تھے جو سید ہاشم حسینی کے مرید اور نظر یافتہ تھے، یہ بھی صاحب دیوان ہیں اور یوسف زلیخا کا مشہور قصہ اردو کی ایک مثنوی میں انہوں نے نظم کیا

ہے مگر افسوس ہے کہ ان کے کلام کا نمونہ زبیری نے بساتین السلاطین میں نہیں دیا۔

آصفی نے محبوب الزمن میں ان کا تذکرہ کیا ہے مگر ان کا نام شاہ ہاشم بیجاپوری بتایا ہے اور سنہ وفات ۱۱۹۰ھ ظاہر کیا ہے، یہ دونوں باتیں میرے نزدیک صحیح نہیں، بیجاپور کی جو تاریخیں پیش نظر ہیں ان میں ان کا نام مذکور نہیں، سید ہاشم یا شاہ ہاشم ان کے پیر و مرشد کا نام تھا جو حضرت شاہ صبغۃ اللہ گجراتی مہاجر مدینہ طیبہ کی اولاد میں بہت عالی مرتبہ درویش تھے، سنہ وفات کی غلطی کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ یہ نصرتی کے معاصر اور علی عادل شاہ کے زمانہ کے شاعر اور سید ہاشم موصوف الصدر کے مرید ہیں، کیا عجب ہے کہ ۱۰۹۰ھ کی جگہ ۱۱۹۰ھ غلطی سے درج کر دیا گیا ہو۔

آصفی نے دو شعر بھی ایک جگہ نقل کیے ہیں جو بجائے ریختہ کے ریختی میں ہیں، ان شعروں کی زبان نصرتی کی زبان سے ٹکر نہیں کھاتی، اس لیے عجب نہیں کہ وہ شعر بھی کسی اور کے ہوں۔

اسی زمانہ کا ایک اور شاعر میرزا ن ہے جو صرف مرثیے کہتا تھا، حمد و نعت و منقبت کے سوا کبھی اپنی زبان کو دوسری چیزوں سے اس نے آلودہ نہیں کیا، اس نے علی عادل شاہ کے عہد میں وفات پائی اور افسوس کہ بساتین السلاطین میں زبیری نے اس کے کلام کا بھی نمونہ نہیں دیا۔

ان تینوں کے سوا بیجاپور میں اور بھی شعرا گزرے ہیں مگر افسوس ہے کہ ان کے اتنے حالات بھی نہیں ملتے جس سے بیان کا سلسلہ قائم رکھا جائے، بیجاپور کی تباہی سے ان سب کا نام بھی مٹ گیا اور بچے کھچے حیدرآباد آ بسے اور وہیں کے ہو گئے۔

ابوالحسن تاناشاہ کا زمانہ تھا جو عبداللہ قطب شاہ مذکور کا داماد اور جانشین اور شعر و سخن کا شیفتہ تھا، اس نے لوگوں کی سرپرستی کی، میر حسن اور مرزا علی لطف نے اپنے اپنے تذکروں میں صرف ایک ہی شعر تاناشاہ کا نقل کیا ہے جو پیش کرتا ہوں:

کس در کہوں جاؤں کہاں مجھ دل یہ بھل بچھڑات ہے
اک بات کے ہوں گے سجن یہاں جی بنی بارہ بات ہے

تاناشاہ(۱) کے مصاحبوں میں شاہ قلی خان شاہی ایک مرثیہ گوشاعر تھے، میر حسن کہتے ہیں کہ ان کے اشعار دکن سے ہندوستان بڑے شوق سے لوگ لایا کرتے تھے، ان کا بھی ایک شعر ملاحظہ ہو:

ملنا تمھنکا غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ مچھ کہے
کس کس کا منہ موندوں سجن، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

ابوالقاسم مرزا ایک شاعر تھے جو تاناشاہ کے مصاحب اور معزز طبقہ کے لوگوں میں تھے، حیدرآباد کی تباہی کے بعد لباس درویشانہ پہن کر گوشہ نشین ہو گئے تھے، عبداللہ گنج میں رہتے تھے اور وہیں زیر خاک سوتے ہیں، ان کا بھی ایک شعر میر حسن کی زبانی سنیے:

عارض نہیں چندر کا تری گال سون اچھا
سمجھیں ہمن کلف کو نہ تجھ خال سون اچھا

حیدرآباد کی تباہی کے بعد اورنگ آباد میں اکثر لوگوں نے پناہ لی، عالمگیر مرحوم کی عمر کا بیشتر حصہ وہیں بسر ہوا ہے اور اس تقریب سے دلی اور اکبرآباد کے ہر طبقہ کے امرا، علما، مشائخ جن کو شاہی دربار سے کسی قسم کا واسطہ اور تعلق تھا، اورنگ آباد آرہے تھے۔

ایک مدت تک اردو شاعری کا مرکز اورنگ آباد رہا، بہت سے شعرا وہاں جمع ہو گئے، شمس ولی اللہ کے عروج واقبال کا ستارہ بھی وہیں چمکا، ان کے سوا اور جو شاعر وہاں ہوئے ان میں سے پچیس تیس شاعروں کا ذکر میر تقی میرؔ نے اپنے تذکرہ میں سید عبدالولی عزلت کی بیاض سے نقل کر کے کیا ہے اور اس سے کچھ زیادہ میر حسن نے لکھا ہے مگر افسوس ہے کہ ان دونوں کو ان شاعروں کے حالات اور اشعار نہیں ملے، صرف ایک ایک، دو دو شعر لکھ دیے ہیں، میر صاحب کی رائے ان شعرا کے متعلق اچھی نہیں ہے مگر میں نے شعرائے دکن کے ذکر میں

---

(۱) تاناشاہ کی درسی کتابیں نکلی ہوئی تھیں، میں نے مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کے کتب خانہ میں جلالین کا ایک نسخہ دیکھا ہے جس میں دو ایک مقاموں پر تاناشاہ کے حاشیے چڑھے ہوئے ہیں۔

یہ بات ثابت کی ہے کہ میر صاحب کی یہ رائے ان کی ناواقفیت پر مبنی ہے۔(۱)

اس زمانہ میں اردو شاعری نے اتنا اعتبار پیدا کرلیا تھا کہ جو لوگ ولایت زا ہوتے تھے اور ان کو اردو زبان میں بولنا بھی نہیں آتا تھا وہ بھی اس میں طبع آزمائی کرنا فخر سمجھتے تھے۔

مرزا معز الدین فطرت عالمگیری امرا میں بڑے پایہ کے شاعر تھے، موسوی خان خطاب تھا، اسی مناسبت سے معز، فطرت اور موسوی تین تخلص اختیار کیے تھے، انہوں نے اردو میں شوق پورا کیا ہے، ملاحظہ ہو:

از زلف سیاہ تو بدل دھوم پری ہے
در خانۂ آئینہ گتا جھوم پری ہے

قزلباش خان امید اسی زمانہ کے بڑے نامور شاعر ہیں اور اہل ہند کے ساتھ ان کے جلسوں کی گرم جوشیاں مشہور ہیں مگر اردو میں جو اظہار کمال کیا ہے وہ یہ ہے۔(۲)

بامن کی بتی آج مری آنکھ مون پری
غصہ کیا و گالی دیا اور دگر لری

□□□

---

(۱) اب تک اورنگ آباد اور اس کے نواح کے قصبات کی زبان و شائستگی حیدرآباد و نواح حیدرآباد سے اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اس میں دہلویت زیادہ محسوس ہوتی ہے۔ (۲) قزلباش خان امید کا یہ شعر غالباً اس زمانہ کا ہے جب ان کا قیام اورنگ آباد میں تھا، اخیر عمر میں دلی آرہے تھے، وہاں جو طبع آزمائی کی ہے اس کا نمونہ آگے چل کر آئے گا۔

اردو شاعری کا مرکزِ ثقل دکن سے دلی کو منتقل ہوتا ہے

عالمگیر مرحوم کے جنت نصیب ہونے کے بعد بیٹوں اور پوتوں میں سلطنت کے حصے بخرے کرنے میں خون کی ندیاں بہنے لگیں اور اس کا سلسلہ بیس پچیس برس تک قائم رہا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ محمد شاہ کی مدتِ سلطنت کو چھوڑ کر آخر تک رہا اور اس نے سلطنت کا کھوج لگایا۔

بہادر شاہ عالمگیر کے بڑے بیٹے نے تقریباً پانچ برس تک اور فرخ سیر بہادر شاہ کے پوتے نے چھ برس سلطنت کی مگر بہادر شاہ ملّایانہ مزاج کے آدمی مذہب کی دھن میں ایسے لگے کہ ان کا سر پیرا سی سے نہیں چھوٹا، فرخ سیر بادشاہ گروں کے پنجۂ غضب میں گرفتار تھے، اس عرصہ میں کسی کو چین سے زندگی بسر کرنے کا موقع نہیں ملا، محمد شاہ کے زمانہ میں سادات کی قوت ٹوٹ جانے پر کچھ عافیت نصیب ہوئی، اس وقت ادھر ادھر سے سمٹ کر دلی میں سب لوگ مجتمع ہو گئے، محمد شاہ کی رنگیلی طبیعت نے رنگ دکھایا، امرائے دربار برسوں سے خانہ جنگیاں کرتے کرتے تھک چکے تھے، ہتھیار کھول کر سب عیش و عشرت میں پڑ گئے، ''شاعری اور بے فکری'' مثل مشہور ہے، قزلباش خان امیدؔ، سلیمان قلی خان ودادؔ، علی قلی خان ندیمؔ، شیخ سعد اللہ گلشنؔ، مرتضیٰ قلی خان فراقؔ، میر شمس الدین فقیرؔ، مرزا عبد القادر بیدلؔ، سراج الدین علی خان آرزوؔ ایسے بڑے بڑے صاحب فضل و کمال دلی میں مجتمع تھے، شمس ولی اللہ

دکن سے آ گئے، فراقی، فخری، آرزو وغیرہ بھی دکن سے آ گئے مگر واپس گئے، ولی کچھ دنوں کو رہ گئے اور ان کا رنگ دلی میں خوب جما، ہر طرف سے قدر دانی کی گئی، معرفت کی محفلوں میں قوال ان ہی کی غزلیں گانے لگے اور ارباب نشاط یاروں کو سنانے لگے، جو شعرا صرف فارسی میں اظہار خیال کرتے تھے ان کو اردو میں بھی شعر کہنے کا شوق پیدا ہوا، قزلباش خان امید کا ایک شعر تم اوپر دیکھ چکے، دو شعر ان کے اور سنو:

در و دیوار سے اب صحبت ہے ۔۔۔ یار بن گھر میں عجب صحبت ہے

تیری آنکھوں کو ڈرتا ہوں ۔۔۔ الحفیظ الحفیظ کہتا ہوں

ایک شعر پہلے پڑھ چکے، دو یہ ہیں، ان تینوں کو ملا کر دیکھو معلوم ہوتا ہے کہ پہلا شعر کسی اور کا ہے، یا پچھلے دو شعر امید کے نہیں ہیں مگر نہیں، یہ تینوں شعر ان ہی کے ہیں، پہلا شعر اس وقت کا ہے جب ان کو نیا نیا شوق پیدا ہوا تھا اور یہ دکن میں تھے، ہندوستان میں رہتے رہتے زبان اتنی صاف ہو گئی تھی کہ یہ دو شعر نہایت صاف اور سادہ کہہ سکے، میر تقی میر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں شعر دلی کی کمائی ہیں۔

مرزا عبدالقادر بیدل بھی دور عالمگیری کے شاعر ہیں، یہ بھی فارسی میں اظہار کمال کرتے تھے مگر جب اردو کی گرم بازاری دیکھی تو انہوں نے اس میں بھی شوق پورا کیا، ان کے بھی دو شعر نکات الشعرا سے نقل کرتا ہوں:

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے ہم میں
اس تخمِ بے نشان کا حاصل کہاں ہے ہم میں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے ہم میں

مرزا علی قلی خان ندیم بھی فارسی کے مشاق شاعر ہیں مگر اردو میں بھی کبھی کبھی طبع آزمائی کی ہے۔

جدائی میں تری ہم کیا کہیں کس طرح جلتے ہیں
بجائے مو بدن سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں

بیقرار عشق کو ہے زندگی نقص کمال
مرچکی سیماب تب کہتے ہیں یہ اکسیر ہے

مرزا مرتضیٰ قلی فراقؔ بھی فارسی کے کہنہ مشق شاعر ہیں، اردو میں فرماتے ہیں اور خوب فرماتے ہیں:

تماشا اس چمن کا کس کے دل کو شاد کرتا ہے
کہ یاں اک لب تبسم غنچہ کو برباد کرتا ہے
اسیروں کی قسم تجھ کو صبا سچ کہہ کہ گلشن میں
کوئی ان ہمنواؤں سے ہمیں بھی یاد کرتا ہے

میر شمس الدین فقیرؔ فرماتے ہیں ؎

زندگی موجِ آب ہے گویا
دم کا آنا حباب ہے گویا
خال اس کی بیاضِ گردن کا
نقطۂ انتخاب ہے گویا

سراج الدین علی خان آرزوؔ بھی فارسی کے قادرالکلام شاعر ہیں، میر تقی میرؔ نے ان ہی کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی ہے، وہ بھی کبھی کبھی اردو میں طبع آزمائی فرماتے تھے، آزادؔ نے ان کو دوسرے دور کے اردو شعرا میں جگہ دی ہے، مگر یہ آزادؔ کی زبردستی ہے (۱)

(۱) آزاد کی زبردستی اس پر ختم نہیں ہوتی بلکہ سب سے بڑا ظلم انہوں نے یہ کیا ہے کہ میرؔ، اثرؔ، قائمؔ، یقینؔ، ہدایتؔ، حزیںؔ، بیانؔ، بیدارؔ ایسے اردو کے مشاق شاعروں اور استادوں کو تو کہیں جگہ نہیں دی، باوجودیکہ قائمؔ کے ذکر میں خود فرماتے ہیں کہ "ان کا دیوان ہرگز میرؔ و مرزاؔ کے نیچے نہیں رکھ سکتے" پھر معلوم نہیں کہ اس غریب کو کیوں نظر انداز کیا، یہ عذر کہ قبول عام اور شے ہے، شہرت نہ پائی عذر بدتر از گناہ ہے۔

مزہ یہ ہے کہ میر غلام حسین ضاحکؔ کو میرؔ و مرزاؔ کی صف میں اور میر مستحسن خلیقؔ کو ذوقؔ و غالبؔ کے دور میں جگہ دی ہے، جن کے دو دو چار چار شعر بھی نہیں ملے کہ آب حیات میں درج کرتے، آزادؔ پر موقوف نہیں، ضاحکؔ کے فرزند رشید میر حسنؔ کو بھی اپنے تذکرہ میں درج کرنے کو باپ کے (باقی اگلے صفحہ پر)

مجھ کو آرزو کے فضل و کمال میں کلام نہیں مگر اردو کے دو چار شعر کہہ لینے یا شعرائے ریختہ کو عروض و قافیہ پڑھا لینے سے ان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اردو شعرا کی صف میں ان کو جگہ دی جائے، اگر ایسا ہو سکتا ہو تو مرزا عبدالقادر بیدلؔ، مرزا معزالدین فطرتؔ، قزلباش خان امیدؔ، میر شمس الدین فقیرؔ اور علی قلی قدیمؔ نے کیا قصور کیا ہے، انہوں نے بھی دو دو چار چار شعر اردو میں کہے ہیں اور اردو شعرا کے کلام میں اصلاح دی ہے اور ان کو شاعری کے گر بتائے ہیں۔

بہر حال سراج الدین علی خان آرزوؔ نے اردو میں طبع آزمائی فرمائی ہے جس کا نمونہ یہ ہے۔

کیا دن لگے ہیں دیکھو خورشید خاوری کو
ہر صبح آ وتا ہے تیری برابری کو

چمن میں آج گویا پھول ہیں تیر شہیدوں کے
رکھے سیپارۂ دل کھول آگے عندلیبوں کے

زاہد آج اپنے دل کے پھپھولے پھوڑے
میئ نے بیچ جا کر شیشے تمام توڑے

بیکار ہے اٹک نہ رہے دل تو کیا کرے
تجھ زلف میں لٹک نہ رہے دل تو کیا کرے

زندگانی کا کیا بھروسہ ہے
جان تجھ پر کچھ اعتماد نہیں

جن حضرات کا ذکر میں نے اس جگہ کیا ہے ان کے سوا اور بھی چند لوگ ہیں جو باوجود فارسی میں کہنہ مشق ہونے کے اردو میں بھی کبھی کبھی شوق پورا کرتے تھے مگر سب کا ذکر

سابقہ حاشیہ: صرف تین شعر ملے ہیں، بات یہ ہے کہ میر ضاحکؔ کی طبیعت جیسا کہ ان کے تخلص سے ظاہر ہے، ہجو اور ہزل پر فریفتہ تھی اور زبان ایسی نرالی ایجاد کی تھی جس کو وہ سمجھیں یا خدا سمجھے، میر حسن ان کے بیٹے بطور معذرت کے فرماتے ہیں کہ "باوجود قوت آں علم کہ در ہجو مولوی ساجد بکار بردہ چوں طبائع سامعان، در خور سخن خود نیافتند بقدر حوصلہ آنہا بہ طرف ہزل توسن قلم راندند لیکن زبان عجیب و غریب طرح کردہ اند کہ از آدم تا ایں دم کسے نہ گفتہ چنانچہ یک مطلع ترقیم می نماید۔"

کل تو پچی پرابیہ فرد بکاسرہ
یا ایہا اتسلانکہ کرد پیان جہلانکہ

طوالت سے خالی نہیں۔

مقصد اس تحریر کا یہ ہے کہ اردو شاعری کا آغاز بیجاپور یا حیدرآباد سے ہوا مگر بیجاپور کو راس نہیں آئی، سر منڈاتے اولے پڑ گئے، حیدرآباد نے کچھ دنوں اس کی پرورش کی، آخر کار اس کو بھی وہی روز بد دیکھنا پڑا جو بیجاپور دیکھ چکا تھا۔

حیدرآباد کی تباہی کے بعد ریختہ نے اورنگ آباد میں انہی مغلوں کے دامن میں پناہ لی جنھوں نے بیجاپور اور حیدرآباد سے اس کو نکالا تھا۔

عالمگیر مرحوم کے بعد چند دنوں ادھر ادھر آوارہ رہنے کے بعد دلی میں ریختہ سے اردوئے معلیٰ کا خطاب پا کر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی اور دلی کی آب و ہوا میں پرورش پا کر دن دونی رات چوگنی ترقی کی، دوسری چیز جو میرے مذکورۂ بالا بیان سے معلوم ہوئی ہو گی وہ یہ ہے کہ شمس ولی اللہ کے ظہور سے پہلے اردو میں قصیدہ خوانی اور غزل سرائی شروع ہو چکی تھی اور مثنویاں لکھی جا چکی تھیں، اس لیے اس بات کا افسوس کرنا پڑتا ہے کہ بعض تذکرہ نویسوں نے ولؔی کو اولیت کا تاج پہنایا ہے اور آزاؔد نے آب حیات میں زبانی حکایتوں اور کتابی روایتوں کی خاک چھان کر جو بات نکالی ہے کہ:

> ”شمس ولی اللہ نظم اردو کی نسل کا آدم جب ملک عدم سے چلا تو اس کے سر پر اولیت کا تاج رکھا گیا...... انہیں ہندوستان کی نظم میں وہی رتبہ ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسؔر شاعر کو اور فارسی میں رودکی کو اور عربی میں مہلہلؔ کو۔“

معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے اردو نظم کی تدریجی ترقی پر خوب غور نہیں فرمایا اور جن شاعروں نے دلی سے پہلے اردو زبان کو ترقی دینے میں جانکاہیاں کی ہیں، ان کی کاوشوں اور کاہشوں پر خاک ڈال دی ہے۔

□□□

اردو نثر کی تاریخ

زیادہ چھان بین کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فضلی شاعر نے ۱۱۴۵ھ میں وہ مجلس کے نام سے ایک کتاب نثر اردو میں لکھی ہے اور اس کا بیان ہے کہ اردو نثر میں یہ پہلی کتاب ہے۔

۱۱۴۱ھ میں شمس ولی اللہ نے ایک مثنوی شہدائے کربلا کے حالات میں لکھی تھی جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ؎

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال　　تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں ۱۱۴۱ سال
کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول　　ولی کا سخن ۱۱۴۱ھ سخن حق پاس مقبول

فضلی نے جب وہ مجلس لکھی ہے اس وقت ولی زندہ تھے، لوگوں نے سمجھا کہ فضلی نے ولی کی مثنوی کو نثر کا جامہ پہنا دیا ہے مگر مجلس کے دیباچہ کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے کسی فارسی کتاب کا ترجمہ کیا ہے، یہ بھی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے پہلے کسی نے نثر میں کوئی کتاب نہیں لکھی، یا لکھی ہو، فضلی کی نظر سے نہ گزری ہو، نمونہ اس کی عبارت کا ملاحظہ ہو:

"پھر دل میں گزرا کہ ایسے کام کو عقل چاہیے کامل اور مدد کسو طرف کی ہوئے شامل کیونکہ بے تائید صمدی اور بے مدد جناب احدی یہ مشکل صورت پذیر نہ ہووے اور گوہر مراد رشتۂ امید میں نہ آوے، لہٰذا کوئی اس صنعت کا نہیں ہوا مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نہیں ہوا

مستمع، پس اس اندیشۂ عمیق میں غوطہ کھایا اور بیابان تامل وتدبر میں سرگشتہ ہوا لیکن راہ مقصود کی نہ پائی، ناگاہ نسیم عنایت الٰہی دل افگار پر اہترا زمیں آیہ، بات آئینہ خاطر میں منہ دکھائی۔"

اس تصنیف کے چند دنوں بعد میر محمد حسین دہلوی کلیم تخلص نے احمد شاہ بادشاہ دلی کے زمانہ میں فصوص الحکم کا اردو میں ترجمہ کیا اور ایک کتاب اردو نثر میں لکھی جس کی نسبت میر حسن تذکرۂ شعرا میں فرماتے ہیں کہ "در ہندی نثر کتاب ایجاد کردہ"، معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں نثر نویسی کا اس وقت تک رواج نہیں ہوا تھا، اسی وجہ سے میر حسن اس کو ایجاد سے تعبیر کرتے ہیں، ایک فقرہ بطور نمونہ کے میر حسن نے پیش کیا ہے، احمد شاہ کو مکحول کرنے کے ذکر میں کلیم نے لکھا ہے:

کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر   آج کے دن اندھے ہو بیٹھے بصیر
ایسی دولت سے زنہار زنہار   فاعتبروا یااولی الابصار

تھوڑے دنوں بعد میر عطا حسین تحسین باشندہ اٹاوہ نے چار درویش کا قصہ امیر خسرو کی کتاب سے اردو میں ترجمہ کر کے نوطرز مرصع نام رکھا، ۱۲۱۳ھ میں تصنیف و ترجمہ سے فراغت پائی، اس کتاب کے نام سے بھی اس بات کا پہلو نکلتا ہے کہ اس زمانہ میں یہ بھی نیا طرز سمجھا جاتا تھا۔

۱۲۱۵ھ میں مرزا لطف علی نے گلزار ابراہیم مصنفہ مرزا علی ابراہیم خان بہاری کا ترجمہ اردو مسٹر گلگرسٹ کی فرمائش سے کیا اور گلشن ہند نام رکھا، اس تذکرہ کو مولوی عبداللہ خاں نے چھپوا کر حیدر آباد سے شائع کر دیا ہے۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ کلکتہ میں حکام کو اپنے مصالح ملکی کے لحاظ سے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ جو انگریز ولایت سے تازہ وارد ہوتے ہیں ان کو اردو زبان سکھائی جائے، اردو میں اس وقت تک ایسی کتابیں موجود نہ تھیں اس لیے ڈاکٹر جان گلگرسٹ کے

زیر اہتمام اس کام کو شروع کیا گیا۔

دلی اور لکھنؤ سے زبان داں مجتمع کیے گئے اور اردو زبان کو وسعت اور ترقی دینے کے لیے قصوں اور کہانیوں کی کتابیں اردو میں لکھوائی گئیں۔

سید حیدر بخش نے طوطا کہانی لکھی جس میں ابن نشاطی کی طوطی نامہ کو اپنے زمانہ کی اردو زبان کا جامہ پہنایا ہے اور اصل میں اس کا ماخذ سنسکرت کی ایک کتاب ہے، ایک کتاب گلِ مغفرت یا وہ مجلس اولیاء اللہ کے حالات میں لکھی، بہار دانش کا ترجمہ کر کے گلزار دانش نام رکھا، ایک اور کتاب تاریخ نادری لکھی جو کسی فارسی کتاب کا ترجمہ ہے، آرائش محفل کے نام سے ایک کتاب لکھی جس میں حاتم طائی کا قصہ بیان کیا ہے۔

میر بہادر علی حسینی نے میر حسن کی مثنوی سحر البیان کو نثر میں لکھا اور اس کا نام نثر بے نظیر رکھا اور ایک کتاب اخلاق ہندی کے نام سے لکھی جو فارسی کی مفرح القلوب کا ترجمہ ہے اور اس کا ماخذ سنسکرت کی کوئی کتاب ہے۔

میر امن دہلوی نے باغ و بہار آراستہ کیا، اس کا ماخذ امیر خسرو کی چہار درویش نہیں بلکہ نوطرز مرصع ہے، یہ کتاب اس زبان کا اعلیٰ نمونہ ہے جو انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں دلی میں بولی جاتی تھی، ایک دوسری کتاب گنج خوبی کے نام سے لکھی تھی جس کو اخلاقِ محسنی کا ترجمہ کہو یا اسی طرز کی ایک کتاب سمجھو۔

مولوی حفیظ الدین پروفیسر فورٹ ولیم کالج نے ابوالفضل کی عیار دانش کا ترجمہ کیا اور خرد افروز اس کا نام رکھا، اس کتاب کا بھی اصل ماخذ سنسکرت ہے جو عربی میں کلیلہ دمنہ کے نام سے مشہور ہے۔

میر شیر علی افسوسؔ نے شیخ سعدی کی گلستاں کا ترجمہ کر کے باغ اردو نام رکھا اور ایک کتاب آرائش محفل لکھی جس میں ہندوستان کے مختلف حالات درج ہیں اور لالہ سجان رائے کی خلاصۃ التواریخ سے ماخوذ ہیں۔

کاظم علی جوان نے شکنتلا کا قصہ لکھا جو برج بھاشا کی کسی کتاب سے ماخوذ ہے اور دستور ہند کے نام سے بارہ ماسہ تصنیف کیا جس میں ہندو مسلمانوں کے تیوہاروں کا ذکر ہے۔

اکرام علی نے رسائل اخوان الصفا میں سے ایک رسالہ کا ترجمہ اخوان الصفا کے نام سے کیا ہے، اس میں انسان وحیوان کا جھگڑا بیان کیا ہے جو شاہ اجنہ کے سامنے پیش ہوا ہے، اصل کتاب عربی زبان میں ہے۔

سری لاو گجراتی نے پریم ساگر، راج منتی اور لطائف ہندی ترجمہ یا تالیف کیں اور کاظم علی جوان کی مدد سے سنگھاسن بتیسی لکھی جو آدھی ہندی اور آدھی اردو ہے۔

مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی جو مضمون اور زبان کے لحاظ سے سنگھاسن بتیسی کے مانند ہے اور خود ڈاکٹر جان گلکرسٹ نے اردو زبان کے قواعد قلم بند کیے اور اردو زبان کی لغت لکھی۔(۱)

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اردو زبان کی ہر دلعزیزی اتنی بڑھ گئی تھی کہ علما کو اسی زبان میں مذہبی کتاب لکھنے کا خیال پیدا ہو گیا اور حضرت شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ نے ۱۲۲۲ھ میں قرآن شریف کا اردو میں بامحاورہ ترجمہ کیا اور ان کے بھائی شاہ رفیع الدین نے تحت اللفظ ترجمہ لکھا اور ان کے بھتیجے مولانا محمد اسماعیلؒ نے اپنی کتاب رد الاشراک کے باب اول کا ترجمہ اردو میں تقویۃ الایمان کے نام سے کیا اور انصاف یہ ہے کہ شاہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کا موضح القرآن اور محمد اسماعیل کی تقویۃ الایمان زبان کی صفائی اور سادگی میں اب تک بے نظیر ہیں، ان بزرگوں کے بابرکت ہاتھوں کے لگ جانے سے اردو زبان کا سکہ ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک رائج ہو گیا۔

□□□

---

(۱) مقدمہ گلشن ہند۔

اردو شاعری پر تبصرہ

میں نے امتیاز کے لیے اس کتاب کے تین حصے کر دیے ہیں، پہلا طبقہ متقدمین کے لیے مخصوص ہے اور اس میں تین دور ہیں، دور اول کے شعرا میں سے صرف ایک شاعر کا میں ذکر کر سکا ہوں، دوسرے دور میں شعرائے دکن اور تیسرے میں شعرائے دلی کا بیان ہے۔

دوسرا حصہ متوسطین سے مخصوص ہے اور اس میں بھی تین دور ہیں، پہلا دور میر و مرزا کا، دوسرا مصحفی اور میر حسن کا، تیسرا ذوق و غالب کا۔

تیسرا حصہ متاخرین کے ساتھ مخصوص ہے اور اس میں بھی تین دور ہیں، پہلا دور ناسخ و آتش کا، دوسرا امیر و داغ کا، تیسرا حالی و اکبر کا جنہوں نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی ہے۔

□□□

طبقۂ متقدمین

اس طبقہ میں پہلا دوران شاعروں کا ہے جن کی نشو ونما حیدر آباد اور بیجا پور میں ہوئی ہے، اس دور میں جو شعرا صاحب دیوان ہوئے ہیں ان میں سے محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، مولانا نصرتی اور مولانا ہاشمی کے نام اب تک معلوم ہو سکے ہیں۔

ان لوگوں میں سے اول الذکر تین نام خاندانِ قطب شاہیہ کے تین بادشاہوں کے ہیں جن کے دیوان حیدر آباد میں موجود ہیں اور ان کے کلام کا بیشتر حصہ آصفی ملکاپوری نے تذکرۂ شعرائے دکن میں نقل کیا ہے، ان کے زمانہ میں اردو زبان عالمِ طفولیت میں تھی، دکنی الفاظ کثرت سے اس میں پائے جاتے ہیں اور میرا خیال ہے کہ شمالی ہندوستان کے رہنے والوں کو ان کے اشعار کا بیشتر حصہ سمجھ میں نہیں آ سکتا۔

طریقۂ بیان میں بھی کوئی ندرت نہیں ہے، سیدھے سادے انداز سے پیش پا افتادہ مضامین کو نظم کر دیا ہے، تاہم اگر کوشش کر کے ان کا صاف اور سادہ کلام یکجا کر دیا جائے تو اردو زبان کی تاریخ کا سلسلہ مکمل ہو جائے گا۔

دوسرے دور کے شعرا کا نشو ونما اورنگ آباد میں ہوا ہے، ان کی زبان منجھتے منجھتے بہت صاف ہو گئی ہے، تاہم دکن کا لب ولہجہ اور کہیں کہیں الفاظ و روابط جو اہل دکن کے ساتھ مخصوص ہیں، ان لوگوں کے کلام میں پائے جاتے ہیں مثلاً نکو بجائے نہیں کے، سین بجائے

ڈالیں، سٹ دیے بجائے ملادیے، ہیگی بجائے جلدی، دستا دیکھتا کے معنوں میں، آپس اپنے کی جگہ، سنگات ہمراہ، دہانچہ دہن، باتاں باتیں، ان کے سوا اور الفاظ و روابط ہیں جو اس دور کے ساتھ مخصوص نہیں، شعرائے دلی کے کلام میں بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً سوں سیتی بجائے سے کون، واو معروف کے ساتھ بجائے کو ہمن کو بجائے ہم کو، نمن بجائے طرح موہن، سریجن، پی پیتم بجائے معشوق، جگ منے دنیا میں، بر منے بر میں یعنی گود میں، مجھ دل میرا دل، تجھ لب تیرا لب، جگ دنیا، بچن کلام، نت ہمیشہ، مکھ منہ، بھیتر اندر، بھواں بھویں، پلکاں پلکیں، بو یہ بگانہ بیگانہ، دوانہ دیوانہ، مرض سکونِ رے کے ساتھ بجائے مرض کے جس کی رے کو فتحہ ہے، تسبی تسبیح، سہی صحیح ہیں، کہا میں نے کہا، ان کے سوا اور بھی الفاظ ہیں جو طبقۂ متوسطین کے شعرا بھی کام میں لائے ہیں، ان کا ذکر وہاں آئے گا۔

ان دونوں دور کے شاعروں کا انداز بیان بہت صاف و سادہ ہے، جو کچھ آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں اور اس سے جو خیالات گزرتے ہیں وہی زبان سے کہہ دیتے ہیں، انیچ پیچ کے خیالات، دور دور کی تشبیہیں، نازک استعارے نہیں بولتے، اسی واسطے اشعار صاف و بے تکلف ہیں۔

مگر چونکہ اردو شاعری کی ابتدا فارسی کی انتہا سے جا ملی ہے لہٰذا بہت سے خیالات جو خاص ملک فارس سے علاقہ رکھتے ہیں اس میں خود بخود آ گئے، مثلاً بجائے عورتوں کے لڑکوں کا عشق، ان کے خط کی تعریف، شمشاد، نرگس، سنبل، سوسن، بنفشہ وغیرہ کی تشبیہیں، لیلیٰ، شیریں، شمع، گل سرو وغیرہ کا حسن، مجنوں، فرہاد، بلبل، قمری، پروانہ کا عشق، مانی و بہزاد کی مصوری، رستم و اسفندیار کی بہادری، زحل کی نحوست، سہیل یمن کی رنگ افشانی، نوروز کا جشن، جام جم، خم افلاطوں، راہ ہفت خواں، کوہ الوند، کوہ بے ستوں، جوئے شیر، قصر شیریں، جیحوں، سیحوں اور خدا جانے کیا کیا الفاظ، ترکیبیں اور خیالات فارسی سے اردو میں آ گئے۔

ان خیالوں اور اشاروں نے اردو شاعری کو سنگلاخ بنا دیا، جس کی ماں بھاشا سی

شیریں زبان تھی، جو ہم کو وہ چیزیں بتاتی ہے جن کی کیفیت ان کے دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے یا چھونے سے حاصل ہوتی ہے، مثال کے طور پر خیال کرو، بارش کا موسم ہندوستان میں بہار کا موسم ہے، بادلوں کا گھر گھر کر آنا، سرد ہواؤں کا چلنا، سرسبز اور شاداب درختوں کا جھومنا، ہلکی ہلکی پھوہاروں کا پڑنا، کوئل کا کوکنا، پپیہوں کا پی کہاں پی کہاں کی صدا لگانا، یہ اور اسی قسم کی بہت سی دلکش باتیں ہیں جن کو دیکھ کر دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوتا ہے اور انہی باتوں کو اگر شعر کے قالب میں ایک خاص انداز سے ڈھالا جائے تو اس کو سن کر دلوں میں جوش اور طبیعتوں میں اتنی امنگ پیدا ہو سکتی ہے جو بہار فارس کو خواب میں نصیب نہیں۔

مگر بدقسمتی سے اردو شاعری میں گل و بلبل کا دخل ہوا جو متقدمین کے ہاں کم کم متوسطین کے ہاں کچھ زیادہ پایا جاتا ہے اور متاخرین کی شاعری کا دارومدار اسی پر ٹھہر گیا، تحسین و آفریں کی ہوس میں کبھی صفت در صفت، کبھی استعارہ در استعارہ سے اسے اتنا تنگ و تاریک کر دیا کہ شاعری گورکھ دھندا بن کر رہ گئی۔

بہر حال متقدمین کے خیال میں ندرت نہیں ہے تو نہ ہو مگر ان کا انداز بیان بہت بے تکلف اور سیدھا سادا ہے، اس میں شعرائے دکن و دلی میں باہم امتیاز نہیں، البتہ یہ حیرت کی بات ہے کہ شمس الدین ولی نے اپنے کلام میں ایہام اور ذو معنیین سے اتنا کام نہیں لیا جتنا شاہ مبارک آبرو اور ان کے معاصرین کام لیتے ہیں، خدا جانے ان بزرگوں کو اس کا شوق کیوں کر پیدا ہوا، میرے خیال میں آزاد کی یہ رائے صحیح ہے کہ دوہروں کے انداز نے جو ہندوستان کا سبزۂ خودرو تھا اردو کو بھی اپنے رنگ میں رنگ دیا۔

□□□

طبقۂ متوسطین

میں نے اس حصہ کو تین دور پر تقسیم کیا ہے، دور اول میں مرزا مظہر، مرزا رفیع، میر تقی میر، خواجہ میر درد، میر سوز، قائم، یقین، بیان، حزیں، ہدایت، قدرت، بیدار، ضیا جو اس دور کے ان ممتاز شاعروں میں ہیں جنہوں نے زبان کی صحت وصفائی اور طرز بیان کی خوبی اور پاکیزگی میں نمایاں حصہ لیا ہے۔

دوسرے دور میں میر اثر، بقا، حسرت، راسخ، میر حسن، جرأت، انشا، مصحفی، رنگین اور فراق کا ذکر ہے جنہوں نے زبان کو پہلے سے زیادہ صاف کیا ہے اور طرز بیان میں بھی کسی کسی نے نیا انداز پیدا کر دیا ہے۔

تیسرے دور میں نصیر، ممنون، ذوق، ظفر، مومن، غالب، تسکین اور شیفتہ کا ذکر ہے، جنہوں نے زبان کو بہت زیادہ صاف دستھرا کر کے کلام کو گلہائے رنگا رنگ سے آراستہ کر دیا ہے اور لطف یہ ہے کہ صفائی اور سادگی کو بھی ایک حد تک قائم رکھا ہے۔

دور اول: ۱۔ سب سے پہلا کارنامہ اس دور کے شعرا کا یہ ہے کہ زبان کی صفائی اور صحت میں پوری کوشش کی اور بہت سے الفاظ و روابط جنہیں ولی اور اس کے ہمعصر بے تکلف کام میں لاتے تھے، نکال ڈالے، تاہم کچھ الفاظ ایسے رہ گئے جو ان کے زمانہ میں فصیح سمجھے جاتے ہوں مگر آج ہم کو اجنبی اور نامانوس معلوم ہوتے ہیں، مثلاً کیا کیا بجائے کس کس، ان نے جن نے بجائے اس نے جس نے، بھر نظر بجائے نظر بھر کے، دل اپنے کے بجائے اپنے دل

کے، مجھ آنسو بجائے میرے آنسو کے، جس تس نے بجائے جس کسی نے، ایدھر اودھر بجائے ادھر ادھر، کہنے لاگا بجائے کہنے لگا، دوانہ بیگانہ بجائے دیوانہ و بیگانہ، رقیباں بجائے رقیبوں کے، انکھڑیاں آنکھوں کی جگہ، سجن معشوق کے معنوں میں، بیچ اندر کے معنوں میں، دم کھارہو سانس نہ لو یعنی چپکے رہو، کنے پاس، آپ ہیں نا میں، نہ آپ ہیں نہ میں، میں کہا میں نے کہا، اسی طرح کے اور چند الفاظ ہیں جو زیادہ تتبع کرنے سے مل سکتے ہیں۔

تاہم زبان کے صاف اور ستھرا کرنے میں اس دور کے شعرا نے جو کوششیں کی ہیں وہ نہایت قابل قدر ہیں۔

۲۔ دلپذیر اور دلکش اور پسندیدہ محاورات جو فارسی میں دیکھے انہیں کہیں ترجمہ کر کے اور کہیں بجنسہٖ لے لیا ہے، مثلاً تر دامن، پنبہ دہن، آتش زیر پا، کمر کوہ، دامن کوہ، گردن مینا، دست سبو، سرو آزاد، سوسن دہ زباں، نرگس شہلا، داغ جنوں، طفل اشک، یاد ایام، برآمدن، درآمدن، بہ سر آمدن، گوش کردن، بو کردن، چراغ کشتن، دل دادن، دل از دست رفتن، از جاں گزشتن، از سر چیزے گذشتن، عرق عرق شدن، پیانہ پُر شدن، از جامہ بیروں شدن، دامن افشاندہ برخاستن، خوشا بحال کسانیکہ حیف اناں یا حیف کسانیکہ اور اسی طرح کے سیکڑوں الفاظ اور محاورے ہیں جنہیں اردو میں ایسی بے تکلفی سے کھپایا ہے کہ کہیں سے جوڑ نہیں کھلتا۔

آزاد نے آب حیات میں اس بحث کو بہت پھیلا کر بیان کیا ہے اور ہر ایک کی مثالیں شعرا کے کلام سے نکال کر پیش کی ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں۔

۳۔ انہوں نے یہ بھی بڑا کام کیا ہے کہ جو عاشقانہ مضامین غزلوں میں بہت پہلے سے بندھتے چلے آتے ہیں ان کو بہ تبدیل الفاظ اور بہ تغیر اسالیب معمولی بول چال اور روزمرہ میں اس خوبصورتی سے ادا کیا ہے کہ بار بار پڑھیے اور مزے لیجیے، ان کی بندشیں اگلی بندشوں سے زیادہ چست اور لطیف اور ان کے محاورے اگلے محاوروں سے زیادہ دلآویز و دلکش ہیں،

علاوہ اس کے قدیم جذبات وخیالات میں اپنے مبلغ فکر کے موافق جونزاکتیں اور لطافتیں انہوں نے پیدا کی ہیں وہ باوجود پرانے روزمرہ اور محاروں کے بدل جانے کے اب تک ایسی ہیں کہ لوگ ان کو پڑھتے اور سر دھنتے ہیں، میں نے اس کتاب میں ہر ایک کے اشعار اسی قسم کے انتخاب کیے ہیں جو اپنے اپنے موقع اور محل پر آئیں گے، تاہم جی نہیں مانتا، یہاں بھی چند اشعار مثال کے طور پر نقل کرتا ہوں۔

مرزا مظہر علیہ الرحمہ

ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک
جی نکل جاتا ہے جب سنتے ہیں آئی ہے بہار

مرا جی جلتا ہے اس بلبل بے کس کی غربت پر
کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا

کیا جوان مارا گیا خوباں کے ہاتھ
"لاکھ حسرت کھیت آئیں" جس کے ساتھ

مرزا رفیع

اے لالہ گو فلک نے دیے تجکو چار داغ
چھاتی مری سراہ کہ اک دل ہزار داغ

تو نے سودا کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں
یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ
ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

سوداؔ خدا کے واسطے کر قصہ مختصر
اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا ہمیں
اے الفتِ چمن ترا خانہ خراب ہو

سوداؔ تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات
آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں بھی مر

میر تقی میرؔ

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر
تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں دم نکل گیا

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم
کاہے کو میرؔ کوئی دبے جب بگڑ گئی

کعبہ میں جاں بلب تھے ہم دوری بتاں سے
آئے ہیں ابکی یارو پھر کر خدا کے ہاں سے

واعظ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میرؔ
آؤ میخانے چلو تم کس کی باتوں پر گئے

آشیانے میں رات بلبل کے
آتش گل سے راپ پھول پڑا

خواجہ میر درد

اس طرح سے یک لخت جو آنسو نہیں تھمتے
معلوم ہوا درد کہیں آنکھ لڑی ہے
تیری گلی میں میں نہ چلوں اور صبا چلے
یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کی کیا چلے

نزع میں تو ہوں ولے تیرا گلہ کرتا نہیں
دل میں ہے وہ بھی وفا پر جی وفا کرتا نہیں

قائم

قائم ضرور کیا ہے اب اس جنگجو سے صلح
مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دھو چکا

طوفان گریہ کی ہے مرے حد عمر نوح
دریا نہیں کہ آج چڑھا کل اتر گیا

یقین

شب ہجراں کی وحشت کو تو اے ہمدرد کیا جانے
جو دن پڑتے ہیں راتوں کو مجھے تیری بلا جانے
گریباں چاک کرنے سے کسی کے کیا تجھے ناصح
ہمارے ہاتھ جانیں اور ہمارا پیرہن جانے

۴۔ ان بزرگوں نے تشبیہ واستعارہ سے بھی کام لیا ہے مگر اعتدال کے ساتھ، متاخرین کی طرح صفت در صفت اور استعارہ در استعارہ کر کے کلام میں پیچیدگی نہیں پیدا کی۔

تشبیہ واستعارہ کو محاروں کی رنگینی سے اس طرح کھپایا ہے کہ شعر سن کر اس کی گرمی اور جوش وخروش میں انسان ایسا محو ہو جاتا ہے کہ تشبیہ واستعارہ کی طرف فوراً ذہن منتقل نہیں ہوتا اور یہی بات ان کی شاعری کی جان ہے۔

تشبیہ واستعارہ ایک فطری چیز ہے، ایک عامی بھی جوش وخروش میں غیظ وغضب کی حالت ہو یا رنج وغم کی جب کوئی بات کہتا ہے تو بے ساختہ اس کے منہ سے تشبیہ واستعارہ کے قالب میں ڈھل کر بات نکلتی ہے اور وہ سننے والے کے دل پر وہی اثر پیدا کرتی ہے جو کہنے والے کے دل پر اس وقت طاری ہے۔

اگر شاعر اسی نکتہ کو پیش نظر رکھے گا تو اس سے سلیقہ مندی ظاہر ہوگی اور اگر وہ بے اعتدالی سے کام لیگا تو اس شعر کو سن کر بجائے اس کے کہ اس کے جوش وخروش کا دل پر اثر ہو تشبیہ واستعارہ کی پیچیدگی اپنی طرف متوجہ کر لے گی اور اس طرح سے اس کا مقصود فوت ہو جائے گا۔

اگر تم یہ کہنا چاہو کہ فلاں شخص بہادر ہے اور اسی لفظ سے اس کو ادا کر دو تو ادائے مطلب کا یہ ایک معمولی طریقہ ہوگا اور اگر اسی بات کو یوں کہو کہ وہ شیر کے مانند ہے تو یہ تشبیہ ہوگی اور اس میں زور پیدا ہو جائے گا اور یوں کہو کہ وہ شیر ہے تو زور اور بھی بڑھ جائے گا اور اگر اس شخص کا نام نہ لو اور یوں کہو کہ میں نے ایک شیر دیکھا اور اس سے مراد اسی شخص کو لو تو یہ استعارہ ہے اور اسی مقصد کو حاصل کرنے کا ایک طریقہ اور بھی ہے کہ شیر کا نام ہی نہ لیا جائے بلکہ اس کے جو مخصوص اوصاف ہیں اس شخص کی نسبت استعمال کیے جائیں، مثلاً یوں کہا جائے کہ وہ جب میدان جنگ میں ڈکارتا ہوا نکلا تو ہل چل پڑ گئی تو یہ بھی استعارہ ہے اور پہلے کی نسبت زیادہ لطیف ہے۔

تشبیہ میں مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان اور استعارہ میں مستعار لہٗ اور مستعار منہ میں کسی قسم کی مناسبت کا ہونا ضروری ہے، خواہ ایک صفت میں ہو یا چند اوصاف میں، حواس ظاہری سے محسوس ہوتی ہو یا عقل سے اس کا ادراک ہوتا ہو، یہی ایک چیز ہے جس میں سلیقہ سے کام لینے کی حاجت ہے اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ طبقۂ متوسطین کے شعرا نے عموماً اور اس کے دور اول نے خصوصاً بہت سلیقہ سے کام لیا ہے، میں چند اشعار پیش کرتا ہوں، کچھ ضرور نہیں کہ اپنی طرف سے حواشی چڑھاؤں، تم اپنے مذاق سلیم کی مدد سے ان پر غور کرو اور یہ دیکھو کہ جو کچھ میں نے کہا ہے وہ ان میں ہے یا نہیں۔

میرزا مظہر

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے
قدم سنبھال کے رکھیو تیرا یہ باغ نہیں

آتش کہو، شرارہ کہو، کوئلا کہو
مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

مرزا رفیع

چھیڑ مت باد بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل
پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا

ساقی ہے ایک تبسم گل، فرصت بہار
ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

میر تقی میر

صیاد دل ہے داغ جدائی سے رشک باغ
تجھ کو بھی نصیب یہ گلزار دیکھنا

فلک کو منہ نہیں اس فتنے کے اٹھانے کا
ستم شریک ترا ناز ہے زمانے کا

خواجہ میر درد

مثلِ نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا
ہم رو سیاہ جاتے رہے نام رہ گیا

دل بھی اے درد قطرۂ خون تھا
آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

قائم

مجھ سا جہان میں کوئی آشفتہ سر نہیں
ہے یوں تو زلف یار مگر اس قدر نہیں

دل ڈھونڈتا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے
اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

یقیں

نظر آتا نہیں ثابت گریباں ایک غنچے کا
چمن میں یہ ستم کرتا ہے اے باد صبا کوئی

یقیں ہوا مجھے قطرہ سے اشک کے معلوم
نہ اٹھ سکے جو کوئی آنکھ سے گرا ہووے

بیان

ہم سرگزشت کیا کہیں اپنی کی مثل خار
پامال ہوگئے ترے دامن سے چھوٹ کر

فرشتوں کی عبادت کا مصلی ہے مرا دامن
اگر آلودگی دنیا کی اس کو پاک رہنے دے

۵۔ اس دورس ے پہلے شعرائے ریختہ، غزل، مثنوی، رباعی، قطعہ وغیرہ سب کچھ کہتے آئے ہیں اور قصیدے بھی برائے نام لکھے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان کو قصیدہ نہیں کہہ سکتے، دو چار شعر میں کسی کی مدح کر دینے یا تشبیب، گریز، مدح اور دعا جو قصیدہ کے لوازم قرار پا گئے ہیں، ان سے تعرض نہ کرنے سے کوئی کلام قصیدہ نہیں بن سکتا۔

سب سے پہلے اسی دور کے شعرا نے قصائد دھوم دھام سے لکھے اور ان کو اعلیٰ درجۂ فصاحت و بلاغت پر پہنچایا، خصوصاً مرزا رفیع سودا اس میدان میں فارسی شعرا سے بھی بعض باتوں میں آگے بڑھ گئے ہیں، ان کے کلام کا زور و شور انوری کے کلام سے نہیں دبتا اور نزاکتِ مضمون میں عرفی کو بھی شرماتا ہے۔

مثنویاں ولیؔ اور ان کے متبعین نے لکھی ہیں مگر عاشقانہ مثنویاں جس شان کی میر تقی میرؔ نے لکھی ہیں ان کی نظیر اس دور سے پہلے نہیں ملتی۔

مرثیہ کے متعلق میرا یہ خیال ہے اور صحیح خیال ہے کہ اردو شاعری کی ابتدا اسی سے ہوئی ہے، حیدر آباد اور بیجاپور کے شعرا اکثر مرثیہ گو تھے اور ان میں سے بعض ایسے خوش گو تھے جن کے مرثیے آگرہ اور دلی تک قدر دانوں کے ہاتھ پہنچتے تھے مگر اس زمانے میں چو مصرع کہنے کا رواج تھا، سب سے پہلے اسی دور کے ملک الشعرا مرزا رفیع سوداؔ نے اسے مسدس کیا جس سے اس میں وسعت پیدا ہوگئی۔

واسوخت قدما کے ہاں دیکھنے میں نہیں آیا، سب سے پہلے اسی دور کے شاعر بے نظیر میر محمد تقی میرؔ نے اس میں طبع آزمائی کی اور اس کوچہ میں جو کمال دکھایا اس کا طرۂ افتخار ہمیشہ ان ہی کے سر رہے گا۔

ہجو گوئی شاعری کے گلشن کا ایک خاردار پھل ہے مگر جس طرح سے گل کے ساتھ کانٹوں کا ہونا ضروری ہے اسی طرح شاعرانہ جوش وخروش کی تکمیل میں اس کو بہت کچھ دخل ہے، اسی وجہ سے عربی اور فارسی کی شاعری بھی اس سے نہیں بچ سکی مگر ریختہ گو شعرا کے اول طبقہ میں اس کا سراغ نہیں ملتا، اگر کہیں ایک دو شعر ہوں تو وہ شاعرانہ نوک جھونک سے زیادہ نہیں، اس دور کے شعرا میں مرزا رفیع اس کے بھی مرد میدان ہیں، گرمیِ کلام کے ساتھ شوخی اور ظرافت ان کے حصہ میں آئی ہے، اس کی نظیر دوسری جگہ نہیں مل سکتی۔

ان کے ہم عصروں میں سے میر تقی میرؔ، میر ضاحکؔ، فدویؔ، ندرتؔ اور بقاؔ نے بھی اس کوچہ کی خاک اڑائی ہے ؎

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی

علاوہ ان چیزوں کے مخمس، مربع، مثلث اور مستزاد، غرض کہ جتنے اصناف سخن ہیں سب میں ان لوگوں نے طبع آزمائی کی ہے اور اردو شاعری کو ہر طرح سے مکمل کر دیا ہے۔

۶۔ ایک بڑا کارنامہ اس دور کے شعرا کا یہ ہے کہ تناسب لفظی اور صنائع وبدائع کی دوسری قسمیں خصوصاً ایہام اور ذو معنیین جو قدما کی شاعری کا مایہ ناز ہیں، ان کے دور کرنے میں انہوں نے بڑی کوشش کی، خصوصاً مرزا مظہر جان جاناں رحمۃ اللہ علیہ نے اس خارزار کو ایسا چھانٹا کہ شاعری ساحری بن گئی، پھر اپنے زور طبع اور خداداد قابلیت سے اچھوتے مضمونوں اور فارسی ترکیبوں اور اردو کے دلکش محاوروں کو اس طرح پر ترتیب دیا اور وہ خوبی پیدا کی ایہام اور تجنیس وغیرہ صنائع لفظی جو ہندی دوہروں کی بنیاد تھے اسے سب بھول گئے، یقین، حزین، بیان، حسرت اور فقیہ درد مند نے ان کے سامنے زانوے تلمذ تہ کر کے اور میر و مرزا وغیرہ نے ان کا تتبع کر کے اردو شاعری کو معراج کمال پر پہنچا دیا، یہ اردو شاعری کے مؤرخ کی سخت بے انصافی ہے کہ اس نے مرزا صاحب کے اس احسان کا اعتراف نہیں کیا بلکہ ان کے کمال شاعری کو دبانے کی ہر جگہ بے سود کوشش کی ہے۔

مولوی قدرت اللہ شوق طبقات الشعرا میں لکھتے ہیں:

> ''اول کسی کے طرز ایہام گوئی را ترک نمودہ ریختہ در زبان اردوے معلیٰ شاہجہاں آباد کہ الحال پسند خاطر عوام وخواص گردیدہ مروج ساختہ زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین، واقف رموز جناب اکبر، کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا جان جاناں متخلص بہ مظہر مردے است فرشتہ صفت'' الخ

شیخ غلام ہمدانی مصحفی اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں:

> ''درابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصۂ وجود نیامدہ بود و در دور ایہام گویان بود اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست۔''

کچھ دور آگے چل کر کہتے ہیں:

> ''فی الحقیقۃ نقاش اول زبان ریختہ بہ اعتقاد فقیر مرزا است بعدہ تتبعش بدیگراں رسیدہ۔''

بہر حال ایہام گوئی کو ترک کر کے شعر کو بلند مضامین اور لطیف خیالات کے قابل بنانا اس دور کے شعرا کا بہترین کارنامہ ہے جو بھولنے کے قابل نہیں۔

۷۔ سلسلۂ بیان میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اصناف سخن میں ہر چیز کو جس سلیقہ سے اس دور کے بزرگوں نے بیان کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے، قصیدوں میں پر شوکت الفاظ، بلند مضامین اور چست ترکیبیں استعمال کیں، غزلوں میں بے تکلف زبان میں نرم نرم باتیں، عاشق و معشوق کے خیالات، وصل کا ارمان، فراق کی المناک کیفیت اور جذباتِ انسانی کی صحیح ترجمانی جیسی انہوں نے کی، اس کی نظیر قدما کے کلام میں نہیں مل سکتی، میر تقی، میر درد، یقین، بیان، حزین، ہدایت اور بیدار کی غزلیں پڑھو اور اپنے دل پر ہاتھ دھر کر دیکھو۔

یا جوش و خروش، کلام کی گرمی اور دلآویزی، دلچسپ اور دل پسند بحروں میں جن میں سے اب تک بہت سی اردو میں نہیں آئی تھیں، پھر سنگلاخ زمینوں اور مشکل ردیف اور قافیوں میں شعر کی آب و تاب دیکھنا چاہو تو مرزا رفیع، سودا اور قائم کا کلام دیکھو اور انصاف کرو، اس کا دھندلا سا عکس بھی قدما کے کلام پر نہیں پڑتا، اگر روزمرہ اور محاورے میں بیان کی بے تکلفی اور سادگی دیکھنا ہو تو میر تقی، میر درد اور میر سوز کی غزلیں پڑھو جس پر ہزاروں طرح کی بناوٹیں قربان ہوتی نظر آئیں گی۔

تصوف کا رنگ جو شعر کی جان ہے اور جس کے بغیر کلام روکھا پھیکا نظر آتا ہے، اس کو خواجہ میر درد سے پہلے سراج کے سوا کسی نے چھوا ہی نہیں، اس کی آمیزش سے جو تڑپ ان کے کلام میں پیدا ہوگئی ہے اس کا اترا ہوا خاکہ بھی ان کے پیشروؤں میں نظر نہیں آتا۔

بسا ہے کون ترے دل میں گلبدن اے درد
کہ بو گلاب کی آئی ترے پسینے سے

اس کے خیال زلف نے سب سے چھڑا دیا
گرچہ پھنسے ہیں دام میں دل کو فروغ ہے

گزرا ہے صبا کون بتا آج ادھر سے
گلشن میں ترے پھولوں کی یہ باس نہیں ہے

قاصد ترا یہ کام نہیں اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

ایک ہی جست میں لی منزلِ مقصود اس نے
رہروو! رشک کی جا ہے سفرِ پروانہ
اے دردؔ یاں کسو سے نہ دل کو لگائیو
لگ چلیو سب سے یوں تو پہ جی مت پھنسائیو

دور دوم: ۱۔ سب سے نمایاں کارنامہ اس دور کے شعرا کا یہ ہے کہ انہوں نے زبان کی صحت اور صفائی میں ایک قدم اور آگے بڑھایا اور بہت سے ناگوار الفاظ و روابط جن کو دور اول کے شعرا نے قدم سے ترکہ میں پایا تھا، انہوں نے نکال ڈالے اور وہ ایک حد تک صاف و شستہ ہوگئی، تاہم انکھڑیاں، جھگڑا، مکھڑا، ٹک، نت، زور، آتیاں، جاتیاں، جاوَن ہوں، کھینچوں ہوں، اپنے سے کہتا تھا، ایدھر، اودھر، تسپر، کنے اور اسی قسم کے اور الفاظ باقی رہ گئے۔

سید انشا کے کلام میں کچھ ناگوار الفاظ اپنے ہم عصروں سے زیادہ ملتے ہیں، مثلاً وا چھڑے، بھلا رے، مگر ان کی سند نہیں، وہ ہر جگہ دھینگا مشتی کرتے ہیں، کہیں آزادوں کے لہجہ میں بولنے لگتے ہیں، کہیں رنڈیوں کی زبان میں گفتگو کرتے ہیں، کبھی پورب میں ہیں، کبھی پچھان میں اور کسی جگہ ان کا رفیق زندگی یعنی تمسخر ان سے جدا نہیں ہوتے۔

۲۔ طرز بیان میں کوئی حسن و خوبی اس دور کے شعرا نے نہیں پیدا کی، ان ہی پھولوں سے گلدستے تیار کیے جو ان کے پیشرو جمع کر چکے تھے، صرف اتنا کیا کہ شوخی اور ظرافت کے ساتھ عاشقانہ شاعری میں حقیقت کے منہ سے نقاب کو ہٹا کر مجاز کو زیادہ نمایاں کر دیا۔

اس کی حقیقت یہ ہے کہ عاشقانہ شاعری کی دو قسمیں ہیں، اول وہ جس میں عاشقانہ جذبات کی صحیح کیفیت حق شناس آنکھوں میں خدا نمائی کا جلوہ دکھاتی ہے، اس کی حد ایک طرف تصوف یا معرفت یا عشق حقیقی سے ملتی ہے، دوسری طرف پاک محبت اور عشق مجازی سے ڈانڈا مل جاتا ہے۔

پہلی صنف میں خواجہ میر درد اور دوسری میں میر تقی میر نے نمایاں حصہ لیا اور اس دور کے شعرمیں۔ سے سودا، قائم، ہدایت، یقین اور بیان وغیرہ زیادہ نہیں تو کچھ کچھ اسی راستہ پر چلے ہیں۔

اس دور کے شعرا میں سے میر اثر اور راسخ خواجہ میر درد کا تتبع کرتے ہیں، میر حسن، مرزا رفیع وغیرہ کے راستہ پر چلتے ہیں اور مصحفی کا انداز کہیں کہیں پر میر سے ملتا ہے۔

دوسری قسم وہ ہے جس میں پاک اور بے لوث عشق کی جگہ پر ہوس پرستی کے جذبات کی تصویر کھینچی گئی ہو، اس کا افسوس ہے کہ اس دور میں جرأت، انشا اور رنگین نے ترقی دے کر اس ناپاک طریقہ کی بنیاد ڈال دی جس پر متاخرین نے بلند عمارتیں کھڑی کر دیں اور یہ رنگ اتنا مقبول ہوا کہ سنجیدہ اور پاکیزہ خیال دم بخود ہو کر رہ گئے، تھوڑی دیر سنجیدگی کو بالائے طاق کر ان کا بھی اندازہ دیکھ لو۔

پہلے جرأت کی دلیری دیکھو:

در تک اب چھوڑ دیا گھر سے نکل کر آنا یا وہ راتوں کو سدا بھیس بدل کر آنا

کیا کیا وہ خفا مجھ سے ہوا گھر سے نکل کر جب میں نے پکارا اسے آواز بدل کے

چھینٹے غیروں سے جو کل آپ لڑے پانی کے پڑ گئے سیکڑوں بس ہم پہ گھڑے پانی کے

کل واقف راز اپنے سے کہتا تھا وہ یہ بات جرأت کے یہاں رات جو مہمان گئے ہم
کیا جانیے کمبخت نے کیا ہم پہ کیا سحر جو بات نہ تھی ماننے کی مان گئے ہم

سید صاحب کی گل افشانی کچھ ان سے بھی بڑھ کر ہے:

اب تو اگلی سی طرح کا نہیں گہرا پردہ   رہ گیا آپ میں اور ہم میں اکہرا پردہ

کچھ اشارہ جو کیا ہم نے ملاقات کے وقت   ٹال کر کہنے لگے دن ہے ابھی رات کے وقت

نہ لگی مجھ کو جو شوخ طرح دار کی گیند   اس نے محرم کو سنبھال اور ہی تیار کی گیند

جاڑے میں کیا مزہ ہو وہ تو سمٹ رہے ہوں   اور کھول کر رضائی ہم بھی لپٹ رہے ہوں
جی چاہتا ہے اے دل اک رات ایسی آوے   مطلع ہو صاف ستھرا بادل بھی پھٹ رہے ہوں
سوتے ہوں چاندنی میں وہ منھ لپیٹے اور ہم   شبنم کا وہ دوپٹہ بیٹھے الٹ رہے ہوں

۳۔ ان لوگوں کی طبیعت کی رنگینی نے اسی پر قناعت نہیں کی بلکہ ریختہ سے ریختی کے شاخسانے کھڑے کر دیے، آزاد کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ رنگین اور انشا اس کے موجد ہیں، کیوں کہ قدما کے ہاں بھی اس کا سراغ ملتا ہے، مولانا ہاشمی بیجاپوری طبقۂ متقدمین کے دور اول کے مشہور شاعر ہیں جنھوں نے یوسف زلیخا ریختہ میں لکھی ہے، ان کے یہ دو شعر آصفی ملکاپوری اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں:

رضا گر مجھ کو دیتی ہے کروں گی گھر میں جا وارد
اگر مجھ ہووے گی فرصت صبح پھر آؤں گی چھوڑو
اگر کوئی آ کے دیکھے گا تو دل میں کیا کہے گا
مجھے بدنام کیا کرتے کہیں میں جاؤں گی چھوڑو

مولانا ہاشمی کے بعد سید محمد قادری ایک باکمال شاعر گزرے ہیں جو غالباً ولی کے ہم عصر تھے، ان کا تخلص خاکی تھا اور ان کا مکمل دیوان ۱۱۸۲ھ کا لکھا ہوا مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی کے کتب خانہ میں موجود ہے، ان میں ایک دور ریختیاں بھی ہیں جو ہندی شاعری کا نمونہ ہیں مگر اس میں شک نہیں کہ ان کے سوا اور کسی کا کلام اس طرح کا نظر سے نہیں گزرا،

اس کے زندہ کرنے اور رواج دینے کا طرۂ افتخار مرزا سعادت یار خان رنگین اور ان کے دوست سید انشاء اللہ خان کے حصہ کا تھا جو انہیں حاصل ہوا، انشاء اللہ خان ارشاد فرماتے ہیں:

میں ترے صدقے نہ رکھ اے مری پیاری روزہ
بندی رکھ لے گی ترے بدلے ہزاری روزہ

چبھتی ہے یہ نگوڑی مسلسل کی اوڑھنی لادے وہی دوا مجھے ململ کی اوڑھنی

رنگین

میں وہ تو اوڑھنے کی نہیں کل کی اوڑھنی باجی! مجھے منگا دے جھلا جھل کی اوڑھنی
آئی لچک کمر میں مری لوگو دوڑیو گھٹنے تلک تو سر سے مرے ڈھلکی اوڑھنی
گرمی کے مارے ناک میں آئی ہے میری جان تہ کر کے رکھ پٹاری میں آنچل کی اوڑھنی

ذرا گھر کو رنگین کے تحقیق کرلو یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

۴۔ اس عہد کا بہترین کارنامہ میر اثر کی مثنوی خواب وخیال اور میر حسن کی مثنوی گلزار ارم اور اس سے بھی بہتر ان کی دوسری مثنوی سحر البیان ہے، جس نے اتنی قبولیت حاصل کرلی تھی کہ آج تک کسی مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی۔

اس مثنوی میں روزمرہ اور محاورہ کی صفائی، قافیوں کی نشست، ترکیبوں کی چستی اور مصرعوں کی برجستگی کے علاوہ ربط کلام کی خوبی اور ہر بیت کو دوسری بیت سے ایسا گہرا تعلق ہے جیسا زنجیر کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے ہوتا ہے اور مطالب ایسی صفائی سے ادا کیے ہیں کہ اگر ان ہی کو نثر کر دیا جائے تو نثر کا بیان نظم سے کچھ زیادہ صاف اور مربوط نہ ہوگا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا مکان کی بیان کی ہے وہ لفظاً و معنیً اس قدر عادت کے موافق ہے جیسی فی الواقع ہوا کرتی ہے۔

وقت عاشق و معشوق اتفاقاً ایک دوسرے روشناس ہوتے ہیں پھر جب ان میں جدائی ہو جاتی ہے، پھر جب وہ ملتے ہیں، غرض کہ جس جس واقعہ کی تصویر کھینچی ہے وہ صفائی اور سادگی کے ساتھ اس قدر مؤثر اور دلگداز ہے جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔

میں نے اس مثنوی کی دو ایک داستان میر حسن کے ذکر میں انتخاب کی ہیں، اس لیے یہاں ان کا دہرانا ضروری نہیں، انتخاب کے وقت میں نے بہت کوشش کی کہ ہر داستان میں سے بہت بہت سے اشعار نکال کر اس کو مختصر کر دوں مگر ربط کلام کی خوبی نے مجھ کو کامیاب نہیں ہونے دیا۔

دور سوم: اس دور میں نصیر، ممنون، ذوق، ظفر، مومن، غالب، تسکین اور شیفتہ کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔ ان لوگوں کا سب سے بڑا کارنامہ زبان کی اصلاح اور درستی ہے جو نامانوس الفاظ دور دوم تک باقی رہ گئے تھے ان کو انہوں نے دور کر کے روزمرہ اور محاوروں کے ساتھ فارسی زبان کی نہایت لطیف اور خوشنما ترکیبوں سے اردو میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا کر دی جو دیکھنے کے قابل ہے۔

نصیر کی شاعری کی ابتدا دور دوم کی شاعری کی انتہا سے جا ملی ہے، اس واسطے ان کے کلام میں آتیاں، جاتیاں، ٹک، نت اور بعض جگہ اسی طرح کی اکھڑی اکھڑی بندشیں ہیں جو مصحفی اور انشا کے کلام میں پائی جاتی ہیں مگر اخیر اخیر میں ان کا کلام بھی صاف ہو گیا ہے۔

اس گروہ میں ذوق اور ظفر روزمرہ اور محاورہ بندی میں سب سے فائق ہیں، مومن اور غالب کے ہاں خیال آفرینی کے ساتھ فارسی ترکیبیں زیادہ داخل ہو گئی ہیں اور بول چال کا لطف ذوق و ظفر کے نسبت ان کے ہاں کم ہے، تاہم اور لوگوں کے کلام میں کسو، کبھو، تئیں، آن کے، سمیت، مت، آئے ہے، جائے ہے، دیکھیو، کیجیو، لیجیو، ورے، پرے، پنھانا، بٹھانا، سدا بمعنی ہمیشہ، زور بمعنی عجیب یا نہایت بہت بے تکلفی سے کام میں لائے گئے ہیں۔

۲۔ ولی سے لے کر مصحفی تک عموماً انداز بیان میں صفائی، سادگی، روزمرہ کی پابندی، بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں لچک پائی جاتی ہے، اس دور میں نصیر نے مضمون آفرینی کی بنیاد ڈالی اور بعید الفہم استعاروں سے کام لے کر اور مشکل وسنگلاخ زمینوں میں شعر کہہ کر اس کو تنگ وتاریک کر دیا ہے، اگر چہ ان کے ہاں بھی محاورہ جہاں آ جاتا ہے شعر میں تڑپ پیدا کر دیتا ہے مگر بیشتر حصہ ان کے کلام کا بے لطف و بے رنگ ہے۔

ذوق کے کلام میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین سے زیادہ ہے، مگر وہ بھی جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں، صفائی سے دور جا پڑتے ہیں، ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔

ممنون، مومن، غالب اور ان کے متبعین تسکین و شیفتہ کے ہاں تازگی خیالات کے ساتھ فارسی ترکیبوں کا اثر غالب ہے، خصوصاً مومن اور غالب نے جہاں بے اعتدالی سے کام لیا وہاں ان کا کلام رتبہ سے بہت گر گیا ہے، نمونہ کے طور پر چند اشعار اس دور کے شعرا کے میں پیش کرتا ہوں جس میں روزمرہ اور محاورہ بہت خوبصورتی سے کام میں لایا گیا ہے۔

ذوق

کہے ہے خنجر قاتل سے یوں گلو میرا　　کمی جو مجھ سے کرے تو پیے لہو میرا

سینہ و دل پہ مرے زخم جگر ہنستے ہیں　　ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں

عبث تم اپنا رکاوٹ سے منہ بناتے ہو　　وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ　　ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی　　چلی تھی برچھی کسی پر کسی کے آن لگی

ظفرؔ

سر تلک دست ستم جوں ہی ترا قاتل بڑھا خون جسم ناتواں تل تل گھٹا، تل تل بڑھا

برسوں گزرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد اب تو اس کوچے میں اے بادِ سحر خاک نہیں

ہمارے ہی آگے ہے ذکر اگلے دوستداروں کا پرانے مردوں کی وہ ہڈیاں اکھاڑتے ہیں

جنوں میں کیا مرے پیوند پیرہن کو لگے کہ ایک تار بھی چھوڑا ہو تو کفن کو لگے
نعل شکل مہ نو جب ترے توسن کو لگے چار چاند اور فلک پر مہ روشن کو لگے

ممنونؔ

رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت صلح کیجیے بس لڑائی ہو چکی
بس حنا زور آزمائی ہو چکی دلبروں سے ہاتھا پائی ہو چکی

اس مرگ پہ سو جان مری صدقے کہ دم نزع گھبرا کے کہے تو کہ بس اب دیکھیے کیا ہو

نصیرؔ

نصیر اس کج ادا کی کج ادائی کوئی جاتی ہے مثل مشہور ہے رسی جلی لیکن نہ بل نکلا

خیال زلف بتاں میں نصیر پیٹا کر گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

سر مژگاں سے وقت نالہ آنسو کو ترستے ہیں یہ سچ ہے جو گرجتے ہیں وہ بادل کم برستے ہیں

مومن

کیسے گلے رقیب کے، کیا طعن اقربا　　تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

تسلی دم واپسیں ہوچکی　　ہمیں ہوچکے جب نہیں ہوچکی

کل تم جو بزم غیر میں آنکھیں چرا گئے　　کھوئے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے

غالب

رونے سے اور عشق میں بیباک ہوگئے　　دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہوگئے

گرچہ ہے طرز تغافل پردہ دار راز عشق　　پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا　　لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

شیفتہ

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ　　ہے آگ سی جو سینہ کے اندر لگی ہوئی

یوں وفا اٹھ گئی زمانے سے　　کبھی گویا جہاں میں تھی ہی نہیں

۳۔ بعض مضامین ایسے دلچسپ و دلکش ہوتے ہیں کہ ان کو محض صفائی اور سادگی سے بیان کردینا کافی ہوتا ہے مگر بہت سے خیالات ایسے ہوتے ہیں کہ معمولی زبان ان کو نہیں ادا کرسکتی اور معمولی اسلوب ان میں اثر پیدا کرنے سے قاصر ہوتے ہیں، ایسے موقعوں پر تشبیہ اور استعارہ یا کنایہ اور تمثیل سے کام لینے کی ضرورت پڑتی ہے، اگر ایسا نہ کیا جائے تو شعر شعر نہیں رہتا، معمولی بات چیت ہوجاتی ہے۔

اس میں شاعر کی سلیقہ مندی کی سخت ضرورت ہے کہ وہ اس کو صفت در صفت یا استعارہ در استعارہ کر کے بعید الفہم نہ کر دے، دوسرے یہ کہ جس چیز کے ساتھ تشبیہ دی جائے یا استعارہ کیا جائے وہ اس خاص صفت میں جس میں تشبیہ یا استعارہ مقصود ہے کمال رکھتا ہوتا کہ اس کے ذکر کرتے ہی سننے والے کی طبیعت میں جوش اور اثر پیدا ہو، تیسرے یہ کہ ان دونوں میں مناسبت پوری پوری پائی جائے۔

نصیر دہلوی کا شعر ہے جو اس دور کے استاذ الاساتذہ ہیں:

چرائی چادر مہتاب جب میکش نے جیحوں پر　　کٹورہ صبح دوڑانے لگا خورشید گردوں پر

اس میں چاندنی کے لطف اٹھانے کو چادر مہتاب کے چرانے سے استعارہ کیا ہے مگر بعید الفہم ہونے کی وجہ سے شعر میں کوئی لطف نہیں، نہ اس کے پڑھنے یا سننے سے دل میں کوئی اثر پیدا ہوتا ہے۔

نصیر مرحوم کے کلام میں اس طرح کی بہت سی مثالیں مل سکتی ہیں بلکہ بعض مقاموں پر ان کے استعارہ یا تمثیل پر پھبتی کا دھوکہ ہوتا ہے، البتہ ذوق نے خیال آفرینی کے ساتھ اچھی اچھی تشبیہیں اور استعارے پیدا کیے ہیں اور ان سے بہت زیادہ حکیم مومن خاںؔ اور مرزا غالب نے اس میں کاوش کی ہے اور بعض مقاموں پر جدت سے بھی کام لیا ہے۔

میں اس دور کے شعرا کے دو دو چار چار شعر نقل کرتا ہوں جس سے ناظرین کتاب خود اس کا اندازہ کر سکیں گے کہ اس خاص انداز میں ان لوگوں نے کیا کیا کام کیے ہیں اور باوجود اس کے شعر کی لطافت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

مرزا غالب

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے　　خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

غم ہستی کا اسد کس سے ہو جز مرگ علاج — شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک
دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کام نہنگ — دیکھیں کیا گزرے ہے قطرہ پہ گہر ہونے تک

ہیں زوال آمادہ اجزا آفرینش کے تمام — مہر گردوں ہے چراغ اک رہ گزار باد میں

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

درماندگی میں غالب کچھ بن پڑے تو جانوں — جب رشتہ بے گرہ تھا ناخن گرہ کشا تھا

تھی وطن میں شان کیا غالب کہ ہو غربت میں قدر
بے تکلف ہوں وہ مشت خس کہ گلخن میں نہیں

مومن خاں

جوں شاخ گل اے جوش جنوں زار ہوں یعنی — جب چاک ہوا جامہ تو بس ٹوٹ گئے ہاتھ

میرا تعلق بھی قبلہ نما سے نہیں ہے کم — باور نہیں تجھے تو ذرا منہ کو موڑ دیکھ

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی — ناصح یہ پند غم نہیں قید حیات ہے

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں — اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے

کیوں ہے رنگ زرد پر گلگونہ اشک سرخ کا — کس لیے ملنے لگی رنگ ہماری آپ کی

ان کو گمان ہے گلہ چین زلف کا — خوشبو دہان زخم جو مشک ختن سے ہے

شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

ذوق

مجھ میں اس میں ربط ہے گویا بہ رنگ بوئے گل　　　وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

سب کو دیکھا اس نے اور اس کو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

ریش سفید شیخ میں ہے ظلمتِ فریب　　　اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمانِ صبح

فلک کیا فتنہ سازی میں ہے ہمسر چشم فتاں سے
گرا تھا یہ بھی اشک سرمہ آلود اس کی مژگاں سے

نگہ کیا اور مژہ کیا ہم تو دونوں کو بلا سمجھے　　　اسے تیر قضا اس کو پر تیر قضا سمجھے

دانہ خرمن ہے ہمیں قطرہ ہے دریا ہم کو　　　آئے جز میں نظر کل کا تماشا ہم کو

ہر اک گردش میں سو انداز نار فتنہ زا سمجھے　　　فلک کو ہم کسی کافر کی چشم سرمہ سا سمجھے

۴۔ میر و مرزا سے لے کر مصحفی تک جتنے شعرا گزرے ہیں ان کا ایک محدود دائرہ ہے جس سے وہ بہت کم نکلتے ہیں، ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو مضمون پہلے کسی طور پر بندھ چکا ہے اسے ایسے بلیغ اسلوب سے ادا کیا جائے کہ اگلی بندشوں سے بڑھ جائے، برخلاف اس کے اس دور کے شعرا میں سے مومن و غالب اور ان کے متبعین نے معمولی معمولی مضمونوں کو اس طریقہ سے ادا کیا ہے جو سب سے نرالا ہے۔

علاوہ اس کے ان کے طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے ہاں کم دیکھی جاتی ہے، ان کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں اس سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں

مگر غور کرنے کے بعد ایک دوسرے ہی نہایت لطیف معنی پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے اور اس کے بار بار پڑھنے سے طبیعت نہیں اکتاتی۔

ان دونوں کے طرز ادا میں ایک خاص بات اور بھی ہے کہ اکثر موقعوں پر مضمونوں کے بعض اجزا کو چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ مواقع ہوتے ہیں جہاں سننے والوں کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں کبھی بے اعتدالی بھی ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے۔

مومن خاں کے بعض اشعار کی پیچیدگی اکثر اسی پر مبنی ہوتی ہے، مثلاً

ڈرتا ہوں آسمان سے بجلی نہ گر پڑے　　صیاد کی نگاہ سوئے آشیاں نہیں

کہنا یہ ہے کہ اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضرور ہے، اس لیے جب کبھی میں ایک بلا سے محفوظ ہوتا ہوں تو دوسری بلا کا منتظر رہتا ہوں مگر جب تک یہ جملہ کہ اہل دنیا کا ایک نہ ایک بلا میں مبتلا رہنا ضرور ہے، بڑھایا نہ جائے، عام ذہن معنی مقصود کی طرف منتقل نہیں ہوتا، مگر شاعر نے اس کے ذکر نہ کرنے میں لطافت رکھی ہے کہ اس نے گویا قصداً ذکر نہیں کیا، اس لیے کہ یہ بات ایسی بدیہی ہے کہ اس کے جتانے کی کچھ ضرورت نہیں۔

اب میں ان لوگوں کے چند اشعار ایسے نقل کرتا ہوں جن سے معلوم ہو سکے گا کہ انہوں نے طرز ادا میں کیسے کیسے اسلوب پیدا کیے ہیں اور ان میں کیا کیا جدتیں کی ہیں:

مرزا غالبؔ

توفیق بہ اندازۂ ہمت ہے ازل سے　　آنکھوں میں وہ قطرہ ہے کہ گوہر نہ ہوا تھا

گرتی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر　　دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

مجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دور رکھ لی مرے خدا نے مری بے کسی کی شرم

رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

ضد کی ہے اور بات مگر خو بری نہیں بھولے سے اس نے سینکڑوں وعدے وفا کیے

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی ہی سہی

حکیم مومن خاں

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

نو فلک ہیں کیا کرے یہ نالۂ آتش فشاں ایک دشمن سر سے کھویا دوسرا پیدا ہوا

اے روز حشر کچھ شب ہجراں بھی کم نہیں بدنام ہو جہاں میں تیری بلا عبث

ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں

چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

ذوق

ہاں تامل دم ناوک فگنی خوب نہیں ابھی چھاتی مری تیروں سے چھنی خوب نہیں

اسی باعث سے دایہ طفل کو افیون دیتی ہے کہ تا ہو جائے لذت آشنا تلخی دوراں سے

ذکر کچھ چاک جگر سینے کا سن سن اپنے کر کے میں ضبط ہنسی دیکھوں ہوں ناخن اپنے

طبقۂ متاخرین

اس طبقہ کو میں نے تین دور پر تقسیم کیا ہے، دور اول ناسخ و آتش اور ان کے متبعین کا، دوسرا دور امیر و داغ اور ان کے معاصرین کا، تیسرا دور حالی و اکبر کا جنہوں نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی ہے۔

دور اول: ۱۔ دور اول کے شعرا کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے زبان میں تراش خراش کر کے بدمزہ اور ناگوار الفاظ کو نکال دیا جو ان کے مذاق سلیم میں گراں اور ثقیل معلوم ہوتے تھے، مثلاً آئے ہے، جائے ہے، کہے ہے، کھوے ہے، دوں ہوں، لوں ہوں، ٹک، نت، کبھو، کسو، تئیں، آن کے، سمیت مت، زور بمعنی بہت یا عجیب یا جمع مؤنث کے معنوں کو الف نون کے ساتھ آئیاں، جائیاں، اسی طرح موصوف جمع ہو اور صفت لفظ ہندی تو موصوف کی مناسبت سے صفت کو جمع بولنا، جیسے بھاریاں۔

مگر ناسخ کے کلام میں کہیں کہیں زور کا لفظ بمعنی ''بہت'' یا ''عجیب'' پایا جاتا ہے اور آتش کے ہاں بعض بعض موقعوں پر رقیباں، خوباں، انکھڑیاں، زور، بل بے، بن بجائے بغیر، میرے شامل بجائے میرے ساتھ، پسارے بجائے پھیلائے، شراکت بجائے شرکت، فی الواقعی بجائے فی الواقع، ایک آدھ جگہ موصوف کی مناسب سے صفت کو جمع بھی کر دیا ہے مثلاً ع

بیڑیاں منت کی بھی پہنیں تو میں نے بھاریاں

اسی قسم کے اور بھی الفاظ پائے جاتے ہیں جن میں سے بعضے پرانے روزمرہ کے جرم میں نکالے جا چکے ہیں اور بعضے غلط ہیں، کچھ عجب نہیں کہ یہ ان کا ابتدائی کلام ہو۔

۲۔ افسوس ہے کہ ان لوگوں نے زبان کو صاف کرنے پر بھی غزل میں سادگی کا خیال نہیں رکھا، اس کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں دولت و ثروت کے ساتھ علوم قدیمہ نے بھی ایک حد تک ترقی کی تھی، منطق، حکمت، طب اور علم کلام کی گرم بازاری میں عربی الفاظ زبانوں پر کثرت سے چڑھ گئے تھے۔

ادھر اس بات کا حوصلہ تھا کہ قدما سے بڑھ کر کام کیا جائے تا کہ اپنا انداز ان سے نرالا ہو، نتیجہ یہ ہوا کہ غزل ایسی صنف لطیف میں عربی الفاظ رفتہ رفتہ کثرت سے داخل ہو گئے اور بجائے اس کے کہ پہلے سے زبان میں شیرینی اور گھلاوٹ پیدا ہوتی زیادہ ثقیل ہو گئی اور سیدھی سادی زبان بازاریوں کی زبان قرار پا گئی، ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں نے اصناف سخن میں سے صرف غزل کو پسند کیا، اگر یہ لوگ قصیدے بھی لکھتے ہوتے تو ان کا حوصلہ بہت کچھ اس میں نکل جاتا اور وہ ایسے ثقیل الفاظ کے متحمل نہ ہو جاتے، اگر تم جرأت اور ناسخ کے دیوان کو ملا کر دیکھو تو اس کا کافی ثبوت ملے گا کہ ان دونوں کی زبانوں میں کتنا فرق ہے، چوں کہ شیخ امام بخش ناسخ اس دور کے بہترین شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں، اس لیے میں انھی کے کلام کو مشتے نمونہ از خروارے پیش کرتا ہوں:

تن پروروں کی تیغ زباں سے نہ تھی پناہ　　گو درعہ تھا دراعہ نقوش حصیر کا

کیوں کرائے ناسخ خوار عجل دشمن نہ ہو خوار　　کیسے موسیٰؑ کا علیؓ شیر خدا ہارونؑ ہوا

زیست بھر سوجھا نہ مجھ کو چارۂ سودائے عشق　　بارے کافور حنوط اب داغ کو مرہم ہوا

بے خطر یوں ہاتھ دوڑاتا ہوں زلف یار پر　　دوڑتا تھا جس طرح ثعبانِ موسیٰؑ مار پر

دیکھیو ناسخ سر شیخ معمم کی طرف　　کیا کلس مسواک کا ہے گنبد دستار پر

قمر ہی کیا ترے آگے محاق میں آیا | کہ آفتاب بھی تو احتراق میں آیا

مل گیا ہے عشق کا آزار قسمت سے مجھے | ہوں جو عیسیٰؑ بھی ارادہ ہو نہ استعلاج کا

سوئے کعبہ تیرے عاشق سجدہ کرتے ہیں کوئی | تیری ابرو کی طرف قبلہ محول ہو گیا

بڑا اکال ہے ناسخ غم عالم فراہم کر | ارادہ ہے اگر اے چرخ اس کی میہمانی کا

غیر کوثر کسی دریا کا میں سیاح نہیں | بیشۂ شیر خدا بن کہیں سیاح نہیں

ظلم طول شب فرقت کے تطاول نے کیا | داد رس کوئی بجز فالق الاصباح نہیں

سکان خرابات ہیں مطلق متواضع | ثابت مژۂ نرگس میگوں کے ہے خم سے

۳۔ بدنصیبی سے اس زمانہ میں قابلیت کا معیار صنائع و بدائع اور اس میں مخصوص صنعت اور مراعات النظیر پر آ کر ٹھہر گیا تھا اور بعضوں نے اس رعایت لفظی کا پردہ اتنا باریک کر دیا تھا کہ وہ ہوا کے جھونکے سے ضلع جگت کی حد میں پہنچ گئے اور شاعری اچھا خاصہ سوانگ بن گئی۔

اس میں ایک بڑی خرابی یہ بھی ہے کہ اگر نازک خیالی کی بنیاد کسی لفظی تناسب پر ہوگی اور اسی لفظ کے تمام اوصاف ولوازم پر عمارت کھڑی کی جائے گی، وہ عمارت یقیناً ناپائدار ہوگی اور اگر اس شعر کا ترجمہ کسی دوسری زبان میں کر دیا جائے تو ساری نکتہ آفرینیاں بیکار ہو جائیں گی۔

افسوس ہے کہ شیخ امام بخش ناسخ اس میں بھی سب سے آگے ہیں اور ان کے بعض شاگردوں نے اس میں اپنی تمام قوت صرف کی ہے۔

شیخ صاحب فرماتے ہیں:

مشرق خورشید تیرے نور سے ہے، دور نہیں　　کون ہے بارہ دری میں آج جو ششدر نہیں
جس جگہ چلتا ہے میٹھی پوئیوں تیرا فرس　　ذائقہ میں واں برابر خاک ہے شکر نہیں
وہ بت شیریں ادا کرتا ہے مجھ کو سنگسار　　یہ شکر پارے برستے ہیں جنوں پتھر نہیں

کیا ہے اے طفل پری تاب کمر کا ہے اثر　　تیری ٹکڑی کے کبوتر بھی کمر کرتے ہیں

بس نہ ترسا بہت اے کافر ترسا مجھ کو　　لب جاں بخش دکھا بہر مسیحا مجھ کو

چنپا کلی کے پھول نہ گل کی کلی میں بو　　جیسی ترے گلے کی ہے چنپا کلی میں بو

خواجہ وزیر شاگرد ناسخ

سوکھ کر کانٹا ہوا دست جنوں　　خار دار اب ہاتھ کی مچھلی ہوئی
بے ہوا اڑنے لگا مشت غبار　　طبع اپنی خاک کی بادی ہوئی

دیکھ پچھتائے گا او بت مرے ترسانے سے　　اٹھ کے کعبہ کو چلا جاؤں گا بت خانے سے

زلف کی چال صبا چلتی ہے　　کیا پریشان ہوا چلتی ہے

کھا گیا مجھ ناتواں کو غم مرے خوش چشم کا　　ہو کے کاہیدہ اسی آہو کا چارہ ہو گیا

الفت چاہِ زنخداں میں وہ لاغر ہوں وزیر　　روزن مور مری نظروں میں اندارے ہیں

بھر دے عوض شراب کے ساغر کو بھنگ سے　　گاڑھی چھنی ہے ساقی اب اک سبز رنگ سے

میر وزیر علی صبا شاگرد آتش

کولھو میں گردش نگہ یار سے پسا　　تل تیل ہو کے بہ گیا چشم غزال کا

کھائیں گے زہران کے خط سبز فام پر　　سر سبز ہوں گے خضر علیہ السلام پر

بک گئے ہیں آپ تو غیروں کے ہاتھ　　بندہ پرور اب غلام آزاد ہو

مرزا دبیر

شامی کباب تھے یہ ہوئی جب شرر فشاں　　اہل تتار بن کے ہرن رن سے تھے رواں

مصری نہ بات کر سکے سب بولے الاماں　　بت بن کے گبر رہ گئے پتھرائیں پتلیاں

زردار زرد ہو کے گل اشرفی بنے　　نصرانی خاک ہو کے گل ارمنی بنے

امانت کی شاعری کا دارومدار اسی ضلع جگت پر ہے، مشکل سے کوئی صاف شعر ان کے ہاں مل سکتا ہے، خصوصاً واسوخت کی شہرت کی بنیاد اسی پر ہے جس کی ہمارے بچپن میں بڑی دھوم تھی، نمونہ کے طور پر صرف ایک بند اس کا بھی سن لو:

چکنی باتوں سے اسے چھالیا سب نے ایسا　　حال دہرایا کوئی میں نے تو منہ پھیر لیا

جی میں کتنا رہا کچھ صاف زباں سے نہ کہا　　بات کی ایسی چبا کر کہ ہوا دل چورا

عطر کی بو سے معطر ہوئے گھر گلیوں کے

خاصدان آنے لگے عطر لگی ڈلیوں کے

یہ داستان بہت دراز ہے، ان لوگوں میں سے جس کا دیوان جی چاہے اٹھا کر دیکھو، بغیر کاوش کے بہت سے اشعار اسی قسم کے رہیں گے، میں دو چار شعر اور نقل کر کے اس قصہ کو ختم کرتا ہوں۔

رشک

مرغ دل کو توڑے گی بلی اگر دروازے کے　　رخت تن کو کترے گا چوہا تمہاری ناک کا

مہندی نے شعلہ پاؤں تمہارا بنادیا کیا گرم ہے کہ بونٹ کو ہولا بنادیا

عید بھی وصل سی گئی خالی کچھ گلے لگنے کا لگاؤ نہیں

ع بیریوں میں بھی مرا نازک بدن ملتا نہیں

ع بھیڑیے ملتے ہیں آنکھیں تری گرگابی پر

۴۔ تشبیہ یا استعارہ بجائے خود نہایت عمدہ چیز ہے، جس وقت گفتگو کا معمولی انداز جوش پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے تو اسی کے ذریعہ سے کلام میں زور اور قوت پیدا کرنی پڑتی ہے، علاوہ اس کے یہ چیزیں کلام کو خوبصورت بھی کر دیتی ہیں جیسا کہ زیور سے حسینوں کے جمال میں آب وتاب پیدا ہو جاتی ہے مگر بقول آزاد یہ رنگ اگر اس حد تک رہے جیسا کہ چہرہ پر غازہ یا آنکھوں میں سرمہ تو خوشنمائی اور بینائی دونوں کو مفید ہے اور اگر حد اعتدال سے گزر جائے تو اس کی شدت سے زبان خیالی باتوں سے فقط توہمات کا سوانگ بن جاتی ہے۔

ایک بات اور بھی ہے کہ تشبیہیں اور استعارے قریب المآخذ ہوں یعنی پاس پاس کے ہوں اور آنکھوں کے سامنے ہوں تو کلام میں لطافت ونزاکت پیدا ہو جائے گی اور اگر دور پڑ جائیں اور بہت باریک پڑ جائیں تو دقت پیدا ہو جائے گی، اسی طرح اگر اس خاص صفت یا ان مخصوص اوصاف میں جن میں کسی چیز کو کسی سے تشبیہ دی گئی ہے، یا استعارہ کیا گیا ہے، پوری پوری مناسبت نہ ہوگی تو کلام بدرنگ اور بے مزہ ہو جائے گا۔

افسوس ہے کہ متاخرین نے استعاروں اور تشبیہوں سے کلام میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی مگر اس میں وہ حد اعتدال سے گزر گئے ہیں اور ان باتوں کا لحاظ بہت کم رکھا ہے، صفت در صفت اور استعارہ در استعارہ کر کے کلام کو اتنے اینچ پیچ میں ڈال دیا ہے کہ اس گورکھ دھندے کو کھولتے کھولتے مطلب غائب ہو جاتا ہے اور اکثر کوہ کندن وکاہ برآوردن کی مثل اس پر ٹھیک اترتی ہے۔

میں پہلے صاف تشبیہوں اور استعاروں کے نمونے پیش کرتا ہوں، اس کے بعد

ان کی پیچیدہ تشبیہوں اور استعاروں کی گرہیں کھولنے کی کوشش کروں گا۔

خواجہ حیدر علی آتش

صبح بہار ہے مجھے ساقی پلا شراب
سب جانتے ہیں عید کا روزہ حرام ہے

نیلوفر آنکھ ہے مرے دریائے حسن کی
شبرنگ مردمک نہیں بھنورا کنول میں

غنچے شگفتہ ہوتے ہیں آئی ہے فصل گل
کپڑوں کے پھاڑنے کی بہار آج کل میں ہے

زیر زمیں سے آتا ہے جو گل، سو زر بکف
قاروں نے راستہ میں لٹایا خزانہ کیا
ترچھی نگہ سے طائر دل ہو چکا شکار
جب تیر کج پڑے گا اوڑے گا نشانہ کیا

مے گلرنگ سے چھلکی جو سرخی پان کی اس میں
گلوے یار پر عالم ہوا شیشہ کی گردن کا

صیاد حسن کھیلتا ہے جب شکار عشق
بلبل کو پھانستا ہے رگ گل کے دام سے

اے مرغ دل ہے فاصلہ اس زلف و خال میں
دانہ ترے نصیب کا باہر ہے دام سے

فصل بہار آئی مبارک ہو اے جنوں
خار اور آبلہ سے ملاقات راہ کی

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے

خواجہ آتش کے دیوان میں اس طرح کی صاف تشبیہیں، استعارے اور حسن تعلیل کی مثالیں کثرت سے مل سکتی ہیں مگر ان کے حریف شیخ امام بخش ناسخ جو اپنی دقت پسندی کی وجہ سے بال کی کھال نکالنے کے عادی ہیں، سیدھی بات بہت کم کہتے ہیں، کہتے بھی ہیں تو بے مزہ بات کہتے ہیں، مثلاً

ابھی ہر چند وہ بت نوجواں ہے سفید اس کا مگر موئے میاں ہے

حسب معمول کمر کو بال سے تشبیہ دی، پھر بال کے اوصاف اس کے لیے ثابت کر کے بدن کے لحاظ سے کمر کو سفید قرار دیا، پھر کمر کا بال سے استعارہ کر کے اس کی سفیدی پر اظہار تعجب کر دیا، ان نکتہ آفرینیوں کے بعد مطلب یہ نکلا کہ بال بڑھاپے میں سفید ہوا کرتے ہیں، مگر تعجب ہے کہ معشوق کا بال جوانی میں سفید ہو گیا۔

اس بدمزہ مضمون کو دیوان میں بیسیوں جگہ متعدد طریقے سے ادا کیا ہے، مثلاً ایک جگہ یوں فرماتے ہیں:

آرائش جمال خداداد عیب ہے موے کمر کو ذوق نہیں ہے خضاب کا

ایک جگہ چاند کو کہ سات سیاروں میں سے ایک وہ بھی ہے، خانہ نشین بنا کر اس کو ثابت فرض کیا، پھر گھر سے نکال کر اس کے سیارہ ہونے پر اظہار تعجب کرتے ہیں:

وہ مہ خانہ نشین گلیوں میں آوارہ ہوا اے منجم دیکھنا ثابت بھی سیارہ ہوا

معشوق کی آنکھ کو بہ لحاظ وحشت چشم غزال سے تشبیہ دی جاتی ہے، انہوں نے ستم ظریفی یہ کی کہ پہلے تو آنکھ کا استعارہ غزال چشم سے کیا، چوں کہ وہ جانور ہے اس لیے اس کے واسطے چارے کی بھی فکر کرنی پڑی:

چشم بددور آج آتے ہیں نظر کیا گال صاف سبزۂ خط کیا غزال چشم کا چارہ ہوا

اسی مضمون کو خواجہ آتش نے بھی باندھا ہے مگر طرز ادا نے ان کے شعر کو کسی قدر مزے دار کر دیا:

خط پر جو آئینہ میں پڑے ہے نگاہ یار آہوئے چشم مست ہیں سبزہ چرے ہوئے

رنگ اڑنے کو طیر اور رنگ حنا کو طائر سے تشبیہ دینا ایک معمولی بات ہے، شیخ صاحب نے اس سے یہ بات نکالی ہے کہ طائر بھی تو جانور ہے، ذبح ہوتے وقت تڑپنا، لوٹنا اس کا خاص وصف ہے، یہ وصف انہوں نے طائر رنگ کے لیے بھی ثابت کر چھوڑا:

اس ادا سے باڑھ دیکھی آپ نے تلوار کی　　طائر رنگ حنا بھی طائر بسمل ہوا

اس قسم کی نکتہ آفرینیوں سے ان کا دیوان بھرا پڑا ہے، تاہم ع

انصاف شیوہ ایست کہ بالائے طاعت ست

جہاں کہیں دقت آفرینی سے کام نہیں لیتے تشبیہ و تمثیل میں اچھے اچھے شعر بھی نکالتے ہیں، مثلاً

آزاد ہیں قیود سے افتادگانِ خاک　　اڑتا پھرا شجر سے جو برگ خزاں گرا

خاکساروں سے ملا کرتے ہیں جھک کر سر بلند　　آسماں پیش زمیں بہر تواضع خم ہوا

طرفہ گل اس باغ میں ہیں اور شبنم ہے عجیب　　ہنس کے بیٹھا جو تری محفل میں وہ رو کر اٹھا

کیا روز بد میں ساتھ رہے کوئی ہم نشیں　　پتے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دور

مشک میں خوشبو ہے پیچ و تاب مثل مو نہیں　　پیچ ہیں سنبل ہیں مثل مو مگر خوشبو نہیں

عشق میں بدمست ہوں میں پر کوئی واقف نہیں
نشہ ہے جام مئے الفت میں لیکن بو نہیں

مستی آلودہ لب پر رنگ پان ہے　　تماشا ہے تہِ آتش دھواں ہے

۵۔ سب سے بدنصیبی کی بات یہ ہے کہ شاعری کے اس فطرتی جذبہ کو جس کا تہذیب و تمدن سے اس قدر مضبوط تعلق ہے کہ جس قوم میں کوئی روشن خیال اور باریک بیں شاعر نہ ہو تو وہ متمدن نہیں کہی جا سکتی، اس کو ضلع جگت کے ساتھ فحش اور گندے مضامین سے اس دور کے شعرا پاک نہیں رکھ سکے، عشق کو فسق اور آوارگی کا مرادف بنا دیا گیا، گویا ہماری اخلاقی حالت پستی کی انتہائی حد تک پہنچ گئی، نیکی و بدی میں تمیز کرنے کی قوت باقی نہ رہی، ملک و قوم کا مذاق

سرے سے بگڑ گیا اور قبول عام حاصل کرنے کو جامۂ عریانی اختیار کر کے بے پردہ مضامین، سوقیانہ محاورے اور مبتذل الفاظ سے کلام کو ناپاک کر دیا اور انگیا چوٹی میں پھنس گئے۔

متوسطین میں جرأت، انشا اور رنگین نے جس کام کی ابتدا کی تھی اور کھل کر نہ کر سکے تھے اس کو طبقہ متاخرین کے شعرا نے پورا کر دکھایا، زمانہ بھی ان کو بدقسمتی سے ناہموار ملا، غازی الدین حیدر نواب وزیر سے بادشاہوں کو باپ کی جمع کی ہوئی دولت ملی، اس سے جن مشاغل کی بنیاد ڈالی، اس پر نصیر الدین حیدر اور واجد علی شاہ نے شاندار عمارتیں کھڑی کر دیں اور ایسا رنگ اچھلا کہ ہولی کا سوانگ اور گنواروں کی کبیر مات ہو گئی۔

شیخ امام بخش ناسخ کی گل افشانی ملاحظہ ہو:

دانے ہیں انگیا کی چڑیا کو بنت کی چنیاں — پلتی ہیں بالے کی مچھلی موتیوں کی آب میں

دمکتا ہے جو کندن سا بدن ہر ایک حلقے سے — تری جالی کی کرتی میں ہے عالم کامدانی کا

اے پری تو نے جو پہنی ہے سنہری انگیا — آج آئی ہے نظر سونے کی چڑیا مجکو

اڑ نہیں سکتی تری انگیا کی چڑیا اے پری — جالی کی کرتی کا اس پر اے پری وجال ہے

تصور میں ہے اک انگیا کی چڑیا — یہ دل کنجشک کا اب آشیاں ہے

رات کو چوری چھپے پہنچا جو میں — غل مچایا اس نے دوڑو چور ہے

یہ التجا ہے پیر مغاں کی جناب میں — رکھوں میں ساق ساقی گلفام دوش پر

نواب سید محمد خاں رند

یوں تو جایا کے ہر سال مہینوں لیکن — اب کی نوچندی میں ایک چاند سا مکھڑا دیکھا

کھولیے شوق سے بند انگیا کے لیٹ کر ساتھ نہ شرمایئے آپ

کیوں کر نبھے گی ہم سے ملاقات آپ کی واللہ کیا ذلیل ہے اوقات آپ کی
یاں ہم ہیں اور داغ غم وحسرت وصال کٹتی ہے عیش باغ میں اوقات آپ کی
کیا آسمان پھاڑ کے تھگلی لگائے گی صاحب ابھر چلی ہے بہت گات آپ کی

مرزا محمد رضا برقؔ

اودی کرتی لال چکن اور اس پہ سنہری گوٹ لگی
ابر سے نکلا چاند کا ٹکڑا برق کے دل کو چوٹ لگی

خیر گزری کہ چلے آئے کہا مان لیا ورنہ تم دیکھتے اس وقت کہ پھر کیا ہوتا

عشق اگر منظور ہے اس سیم تن سے آپ کو پہلے رکھ لیجیے منگا کر برق توڑے زر کے پاس

حکیم مسیحاؔ

ہاتھ میں انگیا کی چڑیا آگئی آج ہم عنقا کو لائے دام میں

تیرے پستاں پر نظر آتا ہے عالم نور کا اے پری روشن ہے گویا قمقمہ بلور کا

امداد علی بحرؔ

ڈوپٹے کو آگے سے دُہرا نہ اوڑھو نمودار چیزیں چھپانے سے حاصل

۶۔اس دور کی نسبت جو کچھ اب تک کہا گیا ہے، اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ اس دور کے شعرا نے اردو کی کسی حیثیت سے بھی کوئی مفید خدمت نہیں کی، میں نے خود نمبرا

میں اصلاح زبان کے متعلق ان کی مساعی جمیلہ کا جو ذکر کیا ہے وہ ان کے افتخار کے لیے کچھ کم نہیں ہے۔

علاوہ اس کے اس دور میں کچھ لوگ ایسے بھی ہوئے ہیں جنہوں نے ایک دوسرے میدان میں طبع آزمائی کر کے زبان میں زیادہ گھلاوٹ اور لوچ اور وسعت وصفائی پیدا کر دی ہے۔

مرزا دبیر اور میر انیس کا ذکر میں نے ضمیمہ نمبر ۱ میں کیا ہے اس لیے کہ ان کی شاعری کی جولان گاہ ایک دوسرا میدان ہے مگر حقیقت میں وہ اسی دور کے شاعر ہیں۔

ان دونوں نے مرثیہ گوئی کی صنف میں ایسی ترقی کی ہے کہ جس کے آگے قدم بڑھانا نظر بحالات موجودہ دشوار معلوم ہوتا ہے، ان لوگوں نے بھی تشبیہوں اور استعاروں سے کام لیا ہے اور مبالغہ کی تو حد کر دی ہے مگر باوجود اس کے زبان میں وہ لوچ اور وسعت پیدا کی ہے جو انہی کا حصہ ہے، ایک ایک مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا ہے اور ہر قسم کے خیال کا ایسا طلسم باندھا ہے کہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، صبح کا عالم دیکھو، رات کی رخصت، سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع، مرغزار کی بہار، شام ہے تو شام غریباں، رات کا سناٹا، کبھی تاروں کی چھاؤں، کبھی اندھیری راتوں کی ظلمت، دن کو کڑاکے کی دھوپ، لوؤں کی لپٹ، آفتاب کی آتش فشانی، غرض کہ قوت تخیّل سے ایک نیا عالم پیدا کر دیا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اپنی شاعری سے اردو زبان کو گلہائے رنگارنگ سے مالا مال کر دیا ہے جس کی وجہ سے اردو زبان ہمیشہ ان کی منت پذیر رہے گی۔

نواب مرزا شوق خواجہ آتش کے شاگرد اور اسی دور کے شاعر ہیں، انہوں نے زہر عشق، بہار عشق وغیرہ چند مثنویاں اس صفائی اور سادگی سے لکھی ہیں جو اخلاقی حیثیت سے کتنی ہی کم رتبہ ہوں مگر زبان اور بیان کے لحاظ سے اردو کی بہترین مثنویوں میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔

مرزا نسیم دہلوی کو بھی میں نے اسی دور کے شعرا میں شمار کیا ہے، اس واسطے کہ جو زبان اس دور کے شعرا کی ہے وہی ان کی بھی ہے، انہوں نے اپنے استاد حکیم مومن خاں کی دقت پسندی کو دور کر کے ان کی نادر ترکیبوں کی مینا کاری کو اس قدر صاف اور روشن کر دیا ہے جو قابل تحسین ہے۔

دور دوم: اس دور میں جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہے ان میں سے بیشتر شعرائے دور اول کے منت پذیر ہیں، زبان اور بیان دونوں چیزوں کو انہی سے سیکھا ہے اور انہی کے کلام کا تتبع کیا ہے، اس وجہ سے ان کا انداز وہی ہے جو ان بزرگوں کا تھا۔

تاہم انہوں نے اپنے اساتذہ کی زبان میں زیادہ صفائی اور سادگی پیدا کر دی ہے اور جو قوانین ان لوگوں نے وضع کیے تھے ان پر عمل درآمد پورے طور پر ان کے زمانہ میں نہیں ہوا تھا، ان کو انہوں نے اچھی طرح سے نباہا، جس کثرت سے ثقیل لفظوں اور فارسی ترکیبوں پر ان لوگوں نے شاعری کی بنیاد رکھ دی تھی، یا تشبیہوں اور استعاروں میں جو پیچیدگیاں ڈال دی تھیں ان سے بہت کچھ انہوں نے اپنا دامن بچایا ہے۔

اس دور میں بھی خصوصیت کے ساتھ نواب مرزا خان داغؔ کو اول درجہ پر رکھنا چاہیے جنہوں نے غزل کی زبان میں نہایت وسعت، صفائی اور بانکپن پیدا کر دیا ہے، ان کے ہم عصروں میں کوئی بھی زبان کی صفائی، روزمرہ کی خوبی اور محاوروں کی فراوانی میں ان کا مثل نہیں۔

دوسرے درجہ پر حکیم ضامن علی جلالؔ کا درجہ ہے جن کی زبان اور طرز ادا کو لکھنؤ کی روزمرہ اور طریقہ بیان کا بہترین نمونہ کہا جا سکتا ہے۔

۲۔ جیسا کہ ہر زمانہ میں ہوا کرتا ہے، اس دور کے شعرا میں ہر ایک کا رنگ اور انداز علاحدہ ہے، شکوہِ الفاظ، مضمون آفرینی اور ہر رنگ کے شعر کہنے میں منشی امیر احمد امیرؔ کو خاص قسم کی قدرت حاصل ہے، روزمرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ طرز ادا کی شوخی اور

بانکپن داغ کا حصہ ہے، طرز ادا میں ایک قسم کا لوچ جو اہل زبان کے ساتھ مخصوص ہوا کرتا ہے جلال کے ہاں زیادہ پایا جاتا ہے، الفاظ کی رنگینی اور مضمون کی دلآویزی میں تسلیم سب سے بڑھے ہوئے ہیں اور تشبیہوں اور استعاروں کی برجستگی میں محسن کا کوئی ہم پلہ نہیں، اصناف سخن کے لحاظ سے مثنوی کے سوا ہر صنف میں امیر کو قدرت حاصل ہے، مثنوی میں تسلیم کو جو مرتبہ حاصل ہے اس میں ان کے ہم عصروں میں سے کوئی بھی ان کا شریک وسہیم نہیں، قصیدے میں یہ دونوں بھی کچھ کم نہیں مگر محسن نے جس زور وشور کے قصیدے لکھے ہیں وہ ان ہی کا حصہ ہے، غزل میں داغ کو اور ان کے بعد جلال کو ان سب پر مزیت ہے۔

بات یہ ہے کہ اصل وضع کے لحاظ سے غزل کا موضوع عشق ومحبت کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے مگر شروع ہی سے شعرا نے اس کو جذبات انسانی کے ظاہر کرنے کا ایک ذریعہ بنالیا ہے خواہ ان کا منشا خوشی ہو یا غم، یا حسرت یا ندامت، یا دنیا کی بے ثباتی یا موت کا خیال یا اور کسی قسم کا جذبہ، یہاں تک کہ اخلاق ومواعظ کو بھی اس میں داخل کردیا ہے، اسی لحاظ سے جب تک غزل کو جذبات انسانی کے ظاہر کرنے کا آلہ بنائے رکھو گے غزل غزل رہے گی ورنہ نری لفاظی ہوگی۔

۳۔ خیالات کے اعتبار سے اس دور کے شعرا کا کلام پڑھو تو ان میں کسی طرح کی تازگی نہ پاؤ گے، وہی گل وبلبل کی داستان، شمع وپروانہ کا قصہ، لیلیٰ ومجنوں کی کہانی، جفائے یار، رشک اغیار، شوق وصل، رنج وفراق، زلف پریشان، چشم فتاں، نرگس بیمار، سیب زنخداں، رندی وبادہ خواری اور زاہدوں پر طعن وتعریض کے مضامین کو الفاظ کی الٹ پھیر اور ردیف وقافیہ کے ادل بدل سے باندھ کر مختلف شکلیں پیدا کرلی ہیں۔

چاہو تو اسی کو ان کی شاعری کا کمال سمجھ لو کہ ان کے اساتذہ نے جن مضمونوں کو اپنے خاص انداز سے باندھا ہے، انہوں نے اس میں فی الجملہ صفائی اور سادگی پیدا کرکے شکل بدل دی ہے، یایوں سمجھو کہ سانچہ بدل دیا ہے، پہلے جو چیز ایک شکل پر ڈھلی تھی وہ اب

دوسری شکل پر ڈھل گئی ہے۔ جس میں بہ نسبت شعرائے دور اول کے کلام کے کسی قدر صفائی اور سادگی پائی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ متاخرین کے کلام میں کسی قسم کا ولولہ اور جوش بہت کم پایا جاتا ہے، اگر یہ لوگ اپنے کلام کو خود اپنے خیالات اور جذبات کا آرگن بناتے تو اس کا بہت عمدہ اثر پڑتا اور ان کو اپنے اساتذہ کی پیروی کرنے پر قناعت نہ کرنی پڑتی اور اسیرؔ کا یہ شعر ان کے حسب حال نہ ہوتا۔

شاعران حال کیا مضمون تو پائیں اسیر
ڈھونڈھتے ہیں پر تخلص بھی نیا ملتا نہیں

□□□

حصہ اول

طبقۂ متقدمین

اس طبقہ کے شعرا کو تین دور پر تقسیم کرنا چاہیے، پہلا دور قطب شاہ اور مولانا نصرتی وغیرہ کا جن کا نشو و نما حیدر آباد اور بیجاپور میں ہوا ہے، ان کی زبان عالم طفولیت میں ہے، دکنی زبان کے الفاظ و روابط کثرت کے ساتھ ان کے اشعار میں پائے جاتے ہیں۔

یہ دور ابوالحسن تانا شاہ اور اس کے معاصرین پر ختم ہو جاتا ہے، اس دور کے جن شاعروں کا حال مجھے معلوم ہوا ہے ان کا ذکر مقدمہ میں کر چکا ہوں۔

دوسرا دور ان شعرا کا ہے جن کا نشو و نما اورنگ آباد کی آب و ہوا میں ہوا ہے، جو عالمگیر مرحوم کے پایہ تخت ہونے کی وجہ سے اہل فضل و کمال کا مرکز ہو رہا تھا اور ہندوستان و ایران کے نامی گرامی خاندانوں کے لوگ وہاں مجتمع تھے، اسی وجہ سے ان کی زبان اور ان کے محاورے دور اول کے شعرا کی زبان اور محاوروں سے زیادہ صاف ہیں۔

تیسرا دور شعرائے دہلی کا ہے جو فرخ سیر کے عہد سے شروع ہو کر احمد شاہ کے زمانے پر ختم ہو جاتا ہے، اس چالیس پچاس برس میں ریختہ نے کافی طور پر ہر دلعزیزی پیدا کر لی تھی، خصوصاً محمد شاہ کے عہد دولت میں جو لوگ فارسی میں بجا طور پر شعر کہتے تھے وہ بھی تفنن کے خیال سے ریختہ میں طبع آزمائی کرنے لگے تھے۔

دور اول: دور اول کے شعرا کا ذکر مقدمہ میں کافی طور پر ہو چکا ہے مگر قصداً ان کے

وہی اشعار نقل کیے ہیں جو زیادہ صاف ہیں، زیادہ حصہ اس دور کے کلام کا ایسا ہے جس میں دکنی زبان شریک غالب ہے۔

یہاں پر صرف مولانا نصرتی کا ذکر کرنا میں مناسب سمجھتا ہوں جو اپنے زمانہ کے ملک الشعرا تھے، اگر مولانا ہاشمی یا ابوالحسن تانا شاہ کے زمانہ کے لوگوں کے حالات ملتے تو وہ بھی اس دور میں نمایاں جگہ لیتے مگر افسوس ہے کہ تاریخ اور تذکروں سے ان کے حالات کا کافی مواد بہم نہیں پہنچا، اس وجہ سے مجبوراً ان کو نظر انداز کرتا ہوں۔

☆☆☆

مولانا نصرتی

یہ محمد عادل شاہ اور اس کے بیٹے علی عادل شاہ کے زمانہ کے شاعر کے ہیں اور اپنے وقت کے ملک الشعرا تھے، افسوس ہے کہ ان کے حالات گمنامی کے پردہ میں چھپے ہوئے ہیں، نام ونسب تک کا ہم کو علم نہیں۔

زبیری نے بساتین السلاطین (تاریخ بیجاپور) میں ان کا ذکر کیا ہے، وہ کہتا ہے کہ ان کی تصنیفات میں گلشن عشق ایک مثنوی ہے جس میں منوہر کنور اور مدمالتی کی عشق بازی کا قصہ نظم کیا ہے، دوسری کتاب علی نامہ ہے، شاہنامہ فردوسی کا جواب جو ۱۰۷۶ھ میں لکھا تھا جس میں عادل شاہ کی فتوحات اور اس کے زمانے کے کارنامے نظم کیے ہیں، تیسرا مجموعہ قصائد کا ہے، چوتھا غزلوں کا دیوان ہے۔

میری نظر سے ایک پرانی بیاض گزری ہے جس میں مولانا نصرتی کا معراج نامہ پورا نقل ہے، تاریخ کتابت ۲۲ محرم ۱۰۸۳ھ اس میں لکھی ہے اور اکبر آباد میں یہ لکھا گیا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کا کلام اس وقت اتنا مقبول ہو چکا تھا کہ اس کی نقلیں انہی کی زندگی میں اکبر آباد پہنچیں اور شائقین نے اپنی اپنی بیاضوں پر اتار لیا، میرے نزدیک کسی کلام کی مقبولیت کی اس سے بہتر مثال نہیں مل سکتی۔

معراج نامہ کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ یہ محمد عادل شاہ کے عہد میں لکھا گیا ہے، ایک سو اکتیس شعر اس میں ہیں، بحر ایسی ہے جو فارسی اور ہندی میں مشترک ہے۔

زبان اس کی زیادہ سخت ہے کیوں کہ دکنی زبان کے الفاظ بکثرت اس میں

استعمال کیے ہیں، زبیری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے عیب جوان کی زبان پر ہنستے اور اعتراض کرتے تھے، نصرتی نے علی نامہ میں اس کا جواب دیا ہے:

خریدار کو خوب سودے سے کام   نہ دوکان کا دیکھنا سقف و بام

مضامین سوں (سے) جابجا بات بول   دکھایا سکت (طاقت) فیض کا حق کے کھول
یلک (ایک ایک) فن میں سحر کی بہت چھند (بات)   خبیثاں (خبیثوں) کے جیباں (زبانوں) کو کینا (کیا) ہوں بند
کیا ہوں سخن مختصر بے گماں   کہ یہ شاہنامہ دکن کا تو جاں
کہ ہر اک زباں حضرت غیب داں   سکھایا سب آدمؑ کو سو تھے نہاں
ہوئی تسپہ جو نسل آدم کی اصل   کلاماں ان ہی کے ہوئے فصل فصل
انو (ان) میں جو تھے شہر کے اوستاد   گیا وہ زمانہ رہے شعر یاد
سخن بن نزاکت کے نا دیکھ بھول   کہ خوش باس (بو) سوں (سے) قدر پاتا ہے پھول
نہ کہتا ہوں میں بے وقوفوں کی بات   نہ کم ہوں مثالیں تو حاسد نے ہات
ولے جو سخنداں ہیں صاحب تمیز   کہ ریجھ (پسند کرکے) اس سخن کو رکھیں نت (ہمیشہ) عزیز

نقل: ایک دن علی عادل شاہ خاص محل میں فوارہ کے چھوٹنے کا تماشا دیکھ رہا تھا، اس وقت پانی کے قطرے موتی کی طرح چمک رہے تھے، بادشاہ کے دل پر اس نظارہ کا ایسا اثر پڑا کہ اس کے منہ سے بے ساختہ یہ مصرع نکل گیا ع

اپرا (ابھرا) سو یو (یہ) فوارہ پانی پہ پر کیا (صاف) نچھل ہے

مولانا نصرتی حاضر تھے، انہوں نے فی البدیہہ دوسرا مصرع پہنچایا:

تجھ شہ اوپر اڑانے کا ایک مورچھل ہے

علی نامہ کا ایک قلمی نسخہ نواب عماد الملک کے کتب خانہ میں موجود ہے، آصفی نے محبوب الزمن میں لکھا ہے کہ نصرتی نے ۱۰۹۵ھ میں وفات پائی ہے۔

دور دوم

شعرائے دکن

میر محمد تقی میرؔ نے نکات الشعرا میں شعرائے دکن کا ذکر میر عبدالولی عزلتؔ کی بیاض سے نقل کیا ہے، حال تو کچھ نہیں لکھا، کسی کے ایک دو شعر، کسی کے کچھ زیادہ لکھے ہیں اور ان کی نسبت جو رائے قائم کی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں سننے کے قابل ہے:

"یکے ازیں شاعران سمت دکن کہ پر بی رتبہ اند مگر بعض، چنانچہ ولیؔ و سید عبدالولیؔ و سراجؔ و آزادؔ کہ معاصر ولیؔ بود سر رشتہ مضبوط گوئی بدست ایشاں یافتہ می شود، باقی سر کلافہ داشت، اھ۔"

میر صاحب نے جن شاعروں کا ذکر کیا ہے اور جو کلام ان کا انہیں ملا ہے اس کے لحاظ سے یہ رائے ان کی صحیح ہو تو ہو مگر اصلیت اور واقعہ کے اعتبار سے غلط اور بالکل غلط ہے، میر صاحب نے دکن کے سیکڑوں شعرا میں سے کم و بیش پچیس شاعروں کا ذکر کیا ہے، ان سیکڑوں میں بیسیوں ایسے ہیں جو میر عبدالولی عزلت سے بہتر شعر کہتے ہیں۔

کسی کے ایک دو شعر پڑھ کر اس کی نسبت جو رائے قائم کی جائے گی وہ اصلیت سے دور ہوگی، مرزا داؤد کا صرف ایک شعر میر صاحب کو ملا ہے، حالاں کہ ان کے دیوان میں پانسو شعر سے کم نہیں، اگر تم اسی ایک شعر کو پڑھ کر سارے دیوان کو خرافات کہہ دو تو اس سے زیادہ زبردستی کیا ہو سکتی ہے۔

جن لوگوں کی خبر میر صاحب کو نہیں ہوئی ان میں سے میر عاشق علی خاں ایما، میر غلام علی ارشد، مرزا علی نقی خاں ایجاد، میر عبدالحی خاں صارم، عارف الدین خاں عاجز، میر اولاد محمد ذکا، لچھمی نراین شفیق اور بہت سے ایسے شعرا ہیں جن کے ہاں زبان کی صفائی، خیالات کی رنگینی اور پختگی کلام کے تمام لوازم موجود ہیں۔

افسوس ہے کہ اس زمانہ میں جب کہ چھاپہ خانوں کی کثرت سے نایاب کتابیں کوڑیوں کے مول بک رہی ہیں، ان کے دواوین اور پرانے تذکرے اب تک گمنامی کے پردے میں چھپے ہوئے ہیں۔

شمس الدین ولی (۱)

شمس الدین لقب، ولی اللہ نام، ولی تخلص، اورنگ آباد میں تقریباً ۱۰۷۹ھ میں پیدا ہوئے، خاندان کا حال معلوم نہیں، آزاد نے آب حیات میں ان کو گجرات کا باشندہ اور علامہ وجیہ الدین علوی کی نسل سے بتایا ہے مگر اس کی کوئی تاریخی سند نہیں بتائی، صرف تذکرۂ حکیم قدرت اللہ خاں قاسم کا حوالہ دیا ہے، یہ تذکرہ میری نظر سے نہیں گزرا مگر میر محمد تقی میر اور میر حسن کے تذکرے پیش نظر ہیں، وہ ان کو اورنگ آباد کا باشندہ ظاہر کرتے ہیں۔

آصفی ملکاپوری نے حال میں ایک بسیط تذکرہ شعرائے دکن کا شائع کیا ہے، اس میں بھی ولی کو اورنگ آباد کا ظاہر کیا ہے اور خود ان کے کلام اور ان کے لب ولہجہ سے اس کی سند بہم پہنچائی ہے کہ وہ دکن کے رہنے والے تھے۔

علامہ وجیہ الدین کا خاندان گجرات میں اپنے فضل وکمال اور فیض رسانی کے لحاظ سے بہت معزز سمجھا جاتا تھا، گجرات پر مغلوں کے قبضہ ہو جانے کے بعد اچھے اچھے گھرانوں کے لوگ پریشان ہو کر بیجاپور، احمد نگر، برار اور برہان پور کو چلے گئے تھے، انہی نقل مکان کرنے والوں میں شاہ اسد اللہ علامہ وجیہ الدین کے پوتے بھی تھے جنہوں نے بیجاپور میں بود وباش اختیار کی تھی، اگر یہ صحیح ہے کہ ولی کو علامہ وجیہ الدین کے خاندان سے نسبت تھی تو کیا عجب ہے

---

(۱) اختلاف است دریں کہ اول کسے کہ بہ ریختہ سخن کردہ اوست یا پیشتر ہم فکر دریں زبان شائع بود بہ تحقیق قدیم ثانی بر اول است و توفیق آن است کہ تا زمانش دیگرے بہ رتبہ او نہ رسیدہ و موجد گفتنش را علت ہمیں باشد، اھ گلشن بیخار۔

کہ یہ شاہ اسد اللہ سے کوئی واسطہ رکھتے ہوں۔

آصفی کہتے ہیں کہ بیس برس کے سن میں تحصیل علم کے لیے گجرات گئے اور علاقۂ مذکور کے مدرسہ میں تعلیم حاصل کی، چند روز کے بعد اسی خاندان کے ایک سجادہ نشین کے ہاتھ پر "طریقہ قادریہ شطاریہ" میں بیعت کی۔

سید ابو المعالی احمد آباد میں گجرات کے ایک بزرگ۔ زادے سے ولی کو ایسی محبت ہوگئی تھی کہ اس کو دیکھنے والے عشق سے تعبیر کرتے تھے، انہوں نے بزرگان دین کی زیارت کی نیت سے دلی، سرہند کا سفر اختیار کیا، وؔلی بھی ان کے ساتھ ہولیے۔

دلی میں شاہ سعد اللہ گلشن نقش بندیہ سلسلہ کے ایک نامور بزرگ اور بہت پُر گو شاعر تھے، ولی نے ان کے فیض صحبت سے فائدہ اٹھایا اور اپنے شعر سنائے، میر تقی میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں کہ شاہ سعد اللہ گلشن نے ان کے شعر کو سن کر فرمایا کہ "ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ خود بکار ببیر از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت۔"

آزاد کہتے ہیں کہ خود ولی نے ایک رسالہ نور المعرفۃ تصوف میں لکھا ہے، اس میں کہتے ہیں کہ میں نور الدین محمد صدیقی سہروردی کے مریدوں کا خاک پا اور شاہ سعد اللہ گلشن کا شاگرد ہوں۔

وؔلی محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں دلی آئے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ دلی میں ان کا جی لگ گیا تھا، چنانچہ ولی کی تصنیفات میں سے ایک غزل میں کہتے ہیں ؎

دل وؔلی کا لے لیا دلی نے چھین　　جا کہو کوئی محمد شاہ سوں

دلی سے اورنگ آباد واپس آئے، یہاں ۱۱۴۱ھ میں مجلس شہدائے کربلا کے حال میں ایک مثنوی لکھی، اس کے خاتمہ میں کہتے ہیں ؎

ہوا ہے ختم جب یو درد کا حال　　تھا گیارہ سو پہ اکتالیسواں سال
کہا ہاتف نے یو تاریخ معقول　　وؔلی کا ہے سخن حق پاس مقبول

ایک چھوٹی سی مثنوی ان کی سورت کی تعریف میں بھی ہے، قیامِ گجرات کے زمانہ میں یہ سورت گئے تھے وہیں یہ مثنوی تصنیف کی، اس کے دو تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

عجب شہرواں میں ہے پرنور یک شہر — بلا شک ہے وہ جگ میں مقصد دہر

رہے مشہور اس کا نام سورت — کہ جاوے جس کے دیکھے سب کدورت

بھری ہے سیرت وصورت سوں سورت — ہر ایک صورت ہے واں انمول صورت

ولی کو گجرات سے بہت دلچسپی ہوگئی تھی، اورنگ آباد میں کچھ دنوں رہ کر اپنے پیرو مرشد اور اساتذہ کی زیارت کو پھر احمد آباد چلے گئے اور تقریباً ۱۱۵۵ھ میں وہی وفات پائی۔

ان کا دیوان یورپ میں بھی چھپ گیا ہے، اس میں علاوہ ردیف وار غزلوں کے رباعیاں، قطعے، دو تین مخمس، قصیدے اور دو چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں۔

ناواقفیت کی وجہ سے عام طور پر یہ خیال چلا آتا ہے کہ ریختہ میں سب سے پہلے ولی نے دیوان مرتب کیا ہے، اسی بنا پر مولوی محمد حسین آزاد نے اردو نظم کی اولیت کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا ہے اور اردو شاعری کی نسل کا آدم ان کو تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اردو میں ان کو وہ رتبہ حاصل ہے جو انگریزی کی نظم میں چاسر شاعر کو، فارسی میں رودکی اور عربی میں مہلہل کو حاصل ہے، حالاں کہ ان سے سوا سو برس پہلے ریختہ میں شاعری اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ اس میں بے تکلف دیوان مرتب ہونے لگے تھے، محمد قلی قطب شاہ، محمد قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ کے دیوان حیدرآباد میں اب تک موجود ہیں، مولانا نصرتی کا دیوان مفقود ہے مگر زبیری نے بساتین السلاطین میں اس کا ذکر کیا ہے۔

قصائد میں مولانا نصرتی کا قصیدہ میری نظر سے گزرا ہے جس پر تاریخ کتابت ۲۲ر محرم ۱۰۸۳ھ لکھی تھی اور قصیدے کے پڑھنے سے معلوم ہوا کہ وہ محمد عادل شاہ (متوفی ۱۰۶۳ھ) کے عہد حکومت میں تصنیف کیا گیا ہے۔

مثنویوں میں مولانا نصرتی کا شاہنامہ، مولانا ہاشمی کی یوسف زلیخا اور ولی کے ایک

ہم عصر مولوی سید محمد کی فیض عام جو ۱۱۴۱ھ میں لکھی گئی ہے جس سال ولی نے وہ مجلس لکھی تھی۔

مراثی میں میرزان مولانا نصرتی کا ہمعصر اور شاہ قلی وغیرہ ابوالحسن تانا شاہ کے زمانہ میں ایسے خوشگو شاعر تھے کہ ان کے مرثیے ہاتھوں ہاتھ دلی اور آگرہ پہنچے اور لوگ ان کو شوق سے پڑھتے تھے۔

غرض کہ اصناف سخن میں سے ہر ایک صنف ولی سے سوسوا سو برس پہلے ریختہ میں آچکی تھی مگر زبان کی حیثیت سے دستور کے موافق عالم طفولیت میں تھی۔

ولؔی کے زمانہ تک منجتے منجتے زیادہ صاف ہوگئی، ولؔی، آزادؔ، سراجؔ اور داؤدؔ کے اشعار دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سب کی زبان ایک ہے۔

تاہم اس میں کچھ شبہہ نہیں کہ ولؔی اپنے ہمعصر شاعروں میں سب سے زیادہ ممتاز ہے اور اس کے کلام کو قبول عام حاصل ہوجانا اس کی شاعری کا طرۂ افتخار ہے۔

کلام کا رنگ ملاحظہ ہو:

جس وقت اے سریجن تو بے حجاب ہوگا — ہر ذرہ تجھ (تری) جھلک سوں جوں آفتاب ہوگا
مت جا چمن میں لالہ بلبل پہ مت ستم کر — گرمی سوں تجھ نگہ کے گل گل گلاب ہوگا
مت آئینہ کو ن دکھلانا اپنا جمال روشن — تجھ مکھ کی تاب دیکھے آئینہ آب ہوگا
مجکو ہوا ہے معلوم اے مست جام خونیں — تجھ انکھڑیاں کے دیکھے عالم خراب ہوگا
ہاتف نے یوں دیا ہے مجکو ولؔی بشارت — اس کی گلی میں جا تو مقصد شتاب ہوگا

یاد کرنا ہر گھڑی تجھ یار کا — ہے وظیفہ مجھ دل بیمار کا
آرزوئے چشمۂ کوثر نہیں — تشنہ لب ہوں شربت دیدار کا
کیا کہے تعریف دل ہے بے نظیر — حرف حرف اس مخزن اسرار کا
گر ہوا ہے طالب آزادگی — بند مت ہو سبحہ و زنار کا
مسند گل منزل شبنم ہوئی — دیکھ رتبہ دیدۂ بیدار کا

خوبی اعجاز یار گر انشا کروں — بے تکلف صفحۂ کاغذ ید بیضا کروں
کیا کہوں تجھ قد کی خوبی سرد عریاں کے حضور — خود بخود رسوا ہے اس کو اور کیا رسوا کروں
سر کروں جب وصف تیرے جامۂ گلرنگ کا — جامۂ زیبا کو کو رنگ جامۂ دیبا کروں
رات کو آؤں اگر تیری گلی میں اے حبیب — زیور لب ذکر "سبحان الذی اسریٰ" کروں
آرزو دل میں یہی ہے وقت مرنے کے ولیؔ — سرو قد کو دیکھ کر سیر عالم بالا کروں

مت تصور کرو مجھ دل کو کہ ہرجائی ہے — چمن حسن پری رو کا تماشائی ہے
گل رخاں کیوں نہ کہیں تجھ کو سکندر طالع — جلوہ گر بر میں ترے جامۂ دارائی ہے
شیخ مت گھر سوں نکل آج تو خوباں کے حضور — گول دستار ترا باعث رسوائی ہے
اے ولی رہنے کوں دنیا میں مقام عاشق — کوچۂ یار ہے یا گوشۂ تنہائی ہے

تا حشر رہے بوئے گلاب اس کے عرق سے — جس بر منے یک بار وہ گل پیرہن آوے
سایہ ہو مرا سبز بہ رنگ پرِ طوطی — گر خواب میں وہ نو خط شیریں بچن آوے

آغوش میں آنے کی کہاں تاب ہے اس کو — کرتی ہے نگہ جس قدر نازک پہ گرانی

کہاں ہے آج یارب جلوۂ مستانہ ساقی
کہ دل سے تاب، جی سے صبر، سر سے ہوش لے جاوے

دیکھنا تجھ قد کا اے نازک بدن — باعث خمیازۂ آغوش ہے

دشمن دین کا دین دشمن ہے — راہزن کا چراغ رہزن ہے

☆☆☆

فقیراللہ آزاد

حیدرآباد دکن کے رہنے والے تھے، بچپن میں یتیم ہوگئے، مزاج میں اہلیت و غربت اتنی تھی کہ اہل محلہ ان کو اپنے بچوں کی طرح عزیز رکھتے تھے۔

کچھ معلوم نہیں کہ کس خاندان کے چشم و چراغ تھے اور تعلیم و تربیت کیسی ہوئی، قرینہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے رواج کے مطابق فارسی کی پوری اور عربی کی بقدر ضرورت کتابیں پڑھی ہوں گی۔

تعلیم پوری نہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہوا کہ جوان ہوتے ہی کسی پری پیکر کو دل دے بیٹھے اور تنکے چننے لگے، ایک حال اور ایک مقام پر قرار نہیں آتا تھا، بیتابانہ ادھر ادھر مارے مارے پھرتے تھے، اسی حالت میں اپنے دوست و ہم وطن فراقؔی کے ساتھ دلی آئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی نہیں ٹھہرے۔

میر محمد تقی میر نے نکات الشعرا میں ان کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے کہ ''ہمعصر ولی بود بسیار بہ صفا حرف میزد'' میر حسن نے بھی اس کی تصدیق کی ہے مگر دونوں نے ایک ہی شعر ان کا نقل کیا ہے۔

ولؔی نے ان کی غزل پر غزل کہی ہے اور ان کی غزل کے ایک مصرع کو تضمین کیا ہے اور اپنے معمول کے موافق ان پر نوک جھونک نہیں کی، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ آزاد کی شاعری کا ایک حد تک معترف ہے ؎

آزاد سے سنا ہوں یہ مصرع مناسب　　جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

آزاد کا یہ شعر ہے ؎

آئیں جہاں کی ساری آزاد صنعتیں پر　　جس سے کہ یار ملتا ایسا ہنر نہ آیا

میر سراج الدین سراؔج

''از مردم اورنگ آباد در وقت عالمگیر اول بود، از شاگردان سید حمزہ علی دکنی روشن طبع معلوم می شود، خدا ایش بیامرزد۔'' (اھ، تذکرۂ میر حسن)

سراج الدین نام، سراج تخلص اورنگ آباد کے سادات صحیح النسب سے تھے، اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں ان کا نشو و نما ہوا، اس زمانہ کا اورنگ آباد آج کا ایسا نہ تھا، عالمگیر مرحوم کے پایہ تخت ہونے کی وجہ سے مرجع اہل کمال بنا ہوا تھا، ہر علم وفن کے اہل فضل وکمال وہاں جمع تھے، ان کے دامن تربیت میں پرورش پائی۔

میر محمد تقی میر نے نکات الشعرا میں اور میر حسن نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سید حمزہ کے شاگرد تھے مگر اس کی تصدیق اہل دکن نہیں کرتے، خود سراج نے شعرائے فارس کے دیوانوں کا انتخاب کیا ہے، اس کے دیباچہ میں کچھ اپنے خیالات بھی لکھے ہیں مگر اس میں بھی اس کا ذکر نہیں کیا۔

عنفوان شباب میں غلبۂ شوق سے از خود رفتگی کی کیفیت پیدا ہوئی، سات برس تک برہنہ پا و برہنہ سر مولانا برہان الدین غریب کے روضہ کے اطراف میں چکر کاٹتے رہے اور اسی حالت مستی میں فارسی شعر کہتے مگر لکھتے نہیں تھے، خود فرماتے ہیں کہ اس زمانہ کے اشعار جمع کیے جاتے تو ایک ضخیم دیوان تیار ہو جاتا۔

سات برس گزرنے پر سید عبدالرحمٰن چشتی (متوفی ۱۱۶۱ھ) کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ان کے ہاتھ پر طریقۂ چشتیہ میں بیعت کی اور عرصۂ دراز تک ان کی صحبت سے مستفید ہوتے رہے۔

اپنے پیر بھائی عبدالرسول خاں کے کہنے سے ریختہ کی طرف توجہ کی اور عرصہ تک ریختہ میں فکرِ سخن کرتے رہے، عبدالرسول خاں نے دیوان مرتب کیا جو پانچ ہزار شعروں پر مشتمل ہے۔

اس دیوان کی اشاعت سے دکن میں ان کی دھوم مچ گئی اور اس پر اتفاق ہوگیا کہ ولی کے بعد دکن میں اس پایہ کا کوئی شاعر نہیں ہوا، خود سراج کو بھی اس کا دعویٰ تھا، فرماتے ہیں۔

تجھ بنا اے سراج بعد ولی کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا

اے سراج آرزوے قند نہیں شعر تیرا ہے جوں بنات لذیذ

شاید کہ بعد مرگ کریں خاص و عام یاد مشہور نہیں سراج کا شیریں سخن ہنوز

مصنفین دکن نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ ریختہ گوئی میں سراج ولی کا قائم مقام تھا۔

ولؔی نے زمین شعر پر جو پودے لگائے تھے ان کو سراج نے سرسبز و شاداب کیا اور اہل دکن نے مزے لے لے کر ان کے پھل کھائے۔

اورنگ آباد کی محفلوں میں سراج ہی صدر نشین ہوتے تھے اور خود اپنے یہاں بھی ہفتہ میں دو بار مجلس سماع منعقد کرتے، اس میں شہر کے علما و مشائخ اور ہر طبقہ کے لوگ شریک ہوتے تھے، قوال انہی کی غزلیں گاتے اور وجد و حال کا ہنگامہ دیر تک گرم رہتا۔

فارسی میں بھی اچھے اور صاف شعر کہتے تھے، نمونہ ملاحظہ ہو۔

گل بےرنگ حقیقت کہ بہ دامانم بود ہمچو اشک از مژہ خویش چکیدم دیدم

نماز عشق ادا کردنی است عاشق را خوشم کہ دست زجاں شستم و وضو کردم

آتشی در دل واسوختہ افتاد سراؔج باز سیماب ز خاکستر اکسیر چکید

سراج بہت خوش فکر، سنجیدہ مزاج، شگفتہ پیشانی، صاحب دل اور پاکیزہ مشرب

بزرگ تھے، آخر عمر میں شعر گوئی ترک کردی تھی اور ہمہ تن تزکیۂ باطن کی طرف متوجہ ہو گئے تھے مگر احباب سے بے تکلف ملتے اور لطف صحبت حاصل کرتے تھے، مولانا غلام علی آزاد سے زیادہ رسم تھی۔

ایک دیوان فارسی کا، ایک ریختہ کا جس میں پانچ ہزار شعر ہیں، ایک منتخب فارسی شعرا کے دیوانوں کا ۱۱۶۱ھ میں تیار کیا تھا، اس کا تاریخی نام منتخب دیوانہا ہے، ایک مثنوی ۱۱۷۳ھ میں لکھی تھی جس میں گل وبلبل کے افسانے میں جذبات معرفت کی ترجمانی کی ہے۔

ان کے شاگردوں میں خواجہ ابوالبرکات عشرت، خواجہ عنایت اللہ فتوت، اشرف علی خان فغاں، مرزا محمد جان نثار، مرزا عطا، ضیا تخلص، جے کشن داس بیجان بہت خوشگو شاعر ہوئے ہیں۔

۴ر شوال روز جمعہ ۱۱۷۷ھ میں وفات پائی، میر غلام علی آزاد، میر اولاد محمد ذکا اور لچھمی نراین شفیق نے تاریخیں لکھیں، میر اولاد محمد کی تاریخ نقل کرتا ہوں ۔

چراغ دودہ و آل عبا سراج الدین — کہ بود روشن ازو محفل سخن دانی
نمود چارم شوال و صبح آدینہ — بہ شمع انجمن عمر دامن افشانی
ز تیرہ بزم جہان فنا بہ دار بقا — فروغ ناصیۂ خویش کرد ارزانی
کشید شعلہ تاریخ سر ز طبع ذکا — سراج بزم ارم را نمودہ نورانی

کلام کا رنگ ملاحظہ ہو ۔

ڈورے نہیں ہیں سرخ تری چشم مست میں — شاید چڑھا ہے خون کسی بے گناہ کا

شکر للہ ان دنوں تیرا کرم ہونے لگا — شیوۂ جور و ستم فی الجملہ کم ہونے لگا

آہ سوزاں سے مرے دامن صحرا میں سراج — قبر مجنوں پہ چراغاں نہ ہوا تھا سو ہوا

نہیں ہے تاب مجھے سامنے ترے جاناں — کہاں سراج کہاں آفتاب عالم تاب

نہیں حقیقت میں حسن و عشق جدا	طوقِ قمری ہے طرۂ شمشاد

ہائے رہ گئی دل میں دامنگیر یوں کی آرزو	سبزۂ تربت مرا ہے پنجۂ گیرا ہنوز

عجب وہ سرو گلزار ادا خوش قد ہوا واقع	پر بلبل نہال گل کو دست رو ہوا واقع

شعلہ خو جب سے نظر آتا نہیں	لوٹتا ہے تب سے انگاروں پہ دل

مجھ نگین داغ دل پر نقش ہے حرف وفا	عشق کی امت میں ہوں مہر نبوت کی قسم

نہ پوچھو خود بخود کرتا ہوں تعریف اس کے قامت کی
کہ یہ مضموں مجکو عالم بالا سے آتے ہیں

یاد رکھ اے دل خوں گشتہ کہ جوں تکمۂ لعل	جامہ زیبوں کے گریباں کا گلوگیر نہ ہو

مدت سے گم ہوا دل بیگانہ اے سراج	شاید کہ جالگا ہے کسی آشنا کے ہاتھ

تم پر فدا ہیں سارے حسن و جمال والے	کیا خط و خال والے کیا صاف گال والے

بہار ساقی ہے بزم گلشن میں مطربانِ چمن شرابی
پیالہ گل، سرو شیشہ، شراب بو اور گل گلابی

خبر تحیرِ عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی
نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا، جو رہی سو بے خبری رہی
شہ بے خودی نے عطا کیا، مجھے اب لباس برہنگی
نہ خرد کی بخیہ گری رہی، نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سے اک ہوا کہ چمن سرو کا جل گیا
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سے بیاں کروں
کہ شراب حسرت و آرزو غم دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا
کہ کتاب عقل کی طاق پر جو دھری تھی سو دھری رہی

ترے جوش حیرت حسن کا اثر اس قدر ہے یہاں ہوا
کہ نہ آئینہ میں جلا رہی، نہ پری میں جلوہ گری رہی

کیا خاک آتشِ عشق نے دل بینوائے سراؔج کو
نہ خطر رہا، نہ حذر رہا، جو رہی سو بے خطری رہی

☆☆☆

مرزا داؤد داؤد

مرزا داؤد نام، داؤد تخلص، اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور وہیں نشو ونما پائی، اس زمانہ میں اورنگ آباد فضل وکمال کا گہوارہ تھا، علما وشعرا کی صحبت میں داؤد نے علمی استعداد ایسی پیدا کر لی تھی کہ شعر وسخن کی ضرورتوں سے پورے طور پر آگاہ ہو گئے تھے۔

یہ معلوم نہیں کہ وہ کس کے شاگرد تھے، میر محمد تقی میر نے نکات الشعرا میں لکھا ہے "شاگرد سید" خدا جانے سید سے مراد سید حمزہ ہیں یا سید عبدالولی عزلت۔

عزلت نے اورنگ آباد میں مستقل بود وباش جس زمانہ میں اختیار کی ہے، اس سے بہت پہلے داؤد کی شاعری زوروں پر تھی، اس لیے عزلت کی شاگردی قیاس میں نہیں آتی۔

آصفی نے لکھا ہے کہ یہ ولی کا تتبع کرتے تھے، خود بھی جا بجا اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

کہتے ہیں سب اہل سخن اس شعر کو سن کر تجھ طبع میں داؤد ولی کا اثر آیا

کم وبیش پانسو شعروں کا ان کا دیوان ہے، ۱۱۶۸ھ میں وفات پائی، لچھمی نراین شفیق نے تاریخ کہی ؎

بلبل گلزار معنی طوطی رنگیں زباں ازغم آباد جہاں بگذشت چوں تیر از کماں

مصرع تاریخ فوتش گفت با من ہاتفے گو برفتہ میرزا داؤد فانی از جہاں

داؤد کے کلام کا انتخاب:

عزیزاں خواب میں دیکھا ہوں آج اس سرو قامت کو

ہوا معلوم وقت آیا ہے میری سرفرازی کا

قانونِ شفا نطق میں ہے یار کے موجود اے دل نہ ہو محتاج طبیبانِ دوا کا

ہوا ہے ابر گریاں دیکھ میری چشم گریاں کو پڑا ہے شور دریا میں مرے اس اشک جاری کا

مجھ بزم میں رقیب عبث سرکشی نہ کر شعلہ پڑا ہے شمع پہ مجھ سوز آہ کا

اس صنم کے خیال ابرو نے ناتواں مجکو جوں ہلال کیا

دست رنگیں کو دیکھ کر تیرے رنگ مہدی چھپا ہو پاتوں پات

کہتے ہیں عاشقان مرا حال دیکھ کر شاید تو دل دیا ہے کسی بے وفا کے ہات

مجھ برسوں بوے مے اگر آوے عجب نہیں اس چشم پُر خمار کو دیکھا ہوں خواب میں

تیمم ان کا اوروں کے وضو کرنے سے افضل ہے
کیا ہے جن نے حاصل خاکساری کی عبادت کو

مرا احوال چشم یار سے پوچھ حقیقت درد کی بیمار سے پوچھ

مرے حال پریشاں کی حقیقت صنم کی زلف کے ہر تار سے پوچھ

آئے زاہدان اٹھاؤ! جبیں کو زمیں سے جو سرنوشت ہے اسے کاں تک مٹاؤ گے

☆☆☆

میر عبدالولی عزلت

''نسبتے تمام بہ سخن دارند از اسالیب کلام شاں واضح می گردد کہ بہرۂ بسیارے از دردمندی دارند، اھ۔'' (نکات الشعرا)

میر عبدالولی نام، عزلت تخلص، سید سعداللہ سلونی کے بیٹے، وہ شاہ پیر محمد سلونی کے نواسے تھے، سلون ضلع رائے بریلی میں ایک مردم خیز قصبہ ہے، شاہی زمانہ میں صوبہ اللہ آباد میں شامل تھا، اب اودھ میں اس کا شمار ہے۔

سید سعداللہ علوم وفنون میں فاضل یگانہ اور علامۂ وقت تھے، سفر حج سے واپس ہوتے وقت سورت میں بود و باش اختیار کرلی تھی، میر عبدالولی کا نشو ونما سورت میں ہوا، اپنے والد سے علوم وفنون کی تعلیم پائی اور مدتوں درس دیتے رہے، طبیعت میں تیزی وچالاکی خداداد تھی، اول فارسی میں شعر کہنے کا شوق ہوا، اس کے بعد ریختہ پر طبیعت مائل ہوئی اور اس میں ایسی ترقی کی کہ استاد سمجھے جانے لگے۔

بھاشا میں بھی فکر کرتے تھے، دوہے، کبت، جھولنے، سوال وجواب، بارہ ماسے، مکرنیاں، پہیلیاں سبھی چیزوں میں طبع آزمائی کی اور ہر ایک چیز کو سلیقہ سے کہا۔

موسیقی کا شوق ہوا تو زیر و بم اور تال وسر میں مہارت پیدا کی، ساز وقانون وسرود وغیرہ میں سب سے آگے نکل گئے اور اس زمانہ کے اچھے اچھے گوئیے ان کے سامنے کان پکڑتے تھے۔

مصوری میں وہ کمال دکھایا اور رنگ وروغن میں ایسی صفائی پیدا کی کہ اس فن کے

مبصران کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر محو حیرت ہو جاتے تھے۔

غرض کہ جامعیت اور ہمہ دانی میں اپنے بہت سے ہم عصروں سے ممتاز تھے، اسی وجہ سے جہاں جاتے قدر شناس ان کی عزت کرتے تھے۔

۱۱۶۴ھ میں دلی آئے، سراج الدین علی خاں آرزو کا زمانہ تھا، ان سے ملے اور عرصہ تک دلی میں رہے، میر محمد تقی میر سے زیادہ رسم ہو گئی تھی، میر صاحب نے نکات الشعرا میں شعرائے دکن کا کلام انہی کی بیاض سے نقل کیا ہے اور ان کا ذکر خوبی سے کیا ہے۔

دلی سے مرشد آباد گئے، نواب مہابت جنگ علی وردی خاں کا زمانہ تھا، نواب تپاک سے ملے اور جب تک زندہ رہے ان کی عزت کرتے رہے۔

نواب کے مرنے کے بعد دکن گئے اور اورنگ آباد میں بود و باش اختیار کی، نواب ناصر جنگ نظام الدولہ بہادر کا زمانہ تھا، انہوں نے تنخواہ مقرر کر دی، ان کی شہادت کے بعد حیدر آباد گئے، نواب صلابت جنگ آصف الدولہ بہادر نے دونوں گاؤں جاگیر میں عنایت فرمائے، غرض کہ جب تک جیتے رہے فارغ البالی اور اطمینان کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے، میر غلام علی آزاد، میر اولاد محمد ذکا، مرزا علی نقی خاں ایجاد، عبدالقادر سامی اور لچھمی نرائن شفیق سے صحبتیں گرم رہتی تھیں۔

۱۶/رجب ۱۱۸۹ھ میں وفات پائی، حیدر آباد میر مومن کے دائرے میں مدفون ہوئے۔

جلایا مصحف دل تو نے کیوں برق تغافل سے
جو سچ بولوں تجھے جھوٹی قسم کھانے کے کام آتا

سیہ روزی میں میری قدر کو احباب کیا جانیں
اندھیری رات میں کس کو کوئی پہچانتا ہیگا

اس کو پہنچی خبر کہ مرتا ہوں کسی دشمن سے سنا ہوگا

عزلت گمان یوں تھا کہ جل کر ہوا ہے راکھ پھر درد آہ دل میں مرا دیدہ تر کیا

بجز رفاقت تنہائی آسرا نہ رہا سوائے بے کسی اب اور آشنا نہ رہا

جس خوش نگہ کو پہنچوں غفلت کی نیند لیوے
میں خفتہ بخت شب کا افسانہ ہو رہا ہوں

تری زلف کی شب کا بیدار میں ہوں تجھ آنکھوں کے ساغر کا میخوار میں ہوں
کدھر بہتا پھرتا ہے اے گریۂ غم کہ آنکھوں سے تیرا خریدار میں ہوں

صبح اپنا مرض الفت کا جب میں عرض کرتا ہوں
جلے دل کی تشفی کو مجھے آنکھیں دکھاتا ہے

چین ابروے سجن میں مرا دل الجھا ہے دل کھلے گر کبھی دونوں میں گرہ پڑ جائے

سدھارے گل کہاں سونے پڑے ہیں گلستاں اپنے
گئی ہیں بلبلیں کیدھر جلا کر آشیاں اپنا

دیکھ مت رنگیں چمن کو دل مرا غم ناک ہے
گل کے ہاتھوں خونِ بلبل کا گریباں چاک ہے

خاطر یاراں میں ہے ہم خاکساروں کا غبار
صاف ہے شکوہ دلوں میں کیا محبت خاک ہے

اے بلبل اتنی رو کے دعا ہر سحر تو مانگ حق تیری آہ سرد چمن کی صبا کرے

☆☆☆

عارف الدین خاں عاجز(۱)

عارف الدین نام، عاجز تخلص تھا، باپ دادا بلخ کے باشندے تھے، عالمگیر مرحوم کے عہد دولت میں ان کے والد ہندوستان آئے، نواب فیروز جنگ کی عنایت سے شاہی منصب حاصل ہوا۔

عاجز ہندوستان میں پیدا ہوئے، بہت چھوٹی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا مگر خدا کے فضل نے دستگیری کی، نواب لشکر خاں (رکن الدولہ نصیر جنگ) نے ان کو اپنی سرپرستی میں لے لیا، ان کے سایۂ عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی اور انہی کے ساتھ اورنگ آباد آ کر نواب آصف جاہ اول کی سرکار میں منصب و خطاب سے سرفراز ہوئے۔

منصب زیادہ نہیں تھا مگر مزاج میں قناعت تھی اور نواب لشکر خاں نے رسالہ کی بخشی گیری کو منصب کا ضمیمہ کر دیا تھا اس لیے اطمینان و فراغت سے زندگی بسر کرتے تھے۔

مزاج میں ظرافت اور شعر و سخن سے قدرتی لگاؤ تھا، اورنگ آباد پہنچ کر شوق بڑھ گیا، فارسی اور اردو میں طبع آزمائی کرتے کرتے دونوں زبانوں میں بہت اچھا شعر کہنے لگے۔

تاریخ کہنے میں بھی سلیقہ تھا، ایک روز مرزا افضل قاقشال مؤلف تحفۃ الشعرا کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے، وہ مکان نیا بن کر تیار ہوا تھا، افضل نے کہا کہ آپ کو تاریخ گوئی میں دعویٰ ہے، اس مکان کی فی البدیہہ تاریخ کہیے، کہا کہ آپ کیا دیں گے، انہوں نے کہا،

(۱) دہ دوازدہ سال باشد کہ در شاہجہاں آباد تشریف داشت، بندہ شور او شنیدہ بودم، از چندیں بسمت دکن رفتہ، اکنوں از زبان سید مذکور بوضوح می پیوندد کہ در برہان پور است۔ (اھ، نکات الشعرا)

جو کچھ کہیے حاضر ہے، تھوڑی دیر نہیں گزری تھی کہ یہ تاریخ کہہ کر سنادی ۔

منزلِ عیش بہ از چار محل کرد بنیاد چو مرزا افضل
گفت تاریخ بنائش ہاتف منزل جاہ و مکانِ افضل

کبر سنی میں ایک مرتبہ سخت بیمار ہوئے، نواب موسوی خاں سے کہلا بھیجا کہ میں مرتا ہوں تاریخ کی فکر کیجیے، انہوں نے جواب دیا کہ تاریخ گوئی میں خود آپ کو مہارت ہے، آپ ہی تکلیف کیجیے، یہ سن کر مسکرائے اور اپنے نام و تخلص کے اعداد جمع کیے، ایک عدد بڑھتا تھا، فرمایا کہ کاش ایک سال کی مہلت اور مل جاتی تو نام کا نام اور تاریخ کی تاریخ ہو جاتی، خدا کی قدرت دیکھو دو چار روز کے بعد اچھے ہو گئے۔

اچھے ہو کر کسی ضرورت سے نانديڑ گئے، وہاں چند روز رہے تھے کہ وعدہ پورا ہو گیا اور نانديڑ میں مدفون ہوئے، میر اولاد محمد ذکا کو توارد ہوا، انہوں نے "عارف الدین خاں عاجز" سے تاریخ وفات نکالی جس سے ۱۱۷۸ھ نکلتے ہیں، یہی سنہ ان کی وفات کا ہے۔

ایک دیوان فارسی میں، ایک اردو میں یادگار چھوڑا، ایک مثنوی لکھی ہے، جس میں لال و گوہر کا قصہ نظم کیا ہے، ایہام اور ذو معنیین کا شوق تھا مگر مثنوی بہت صاف و سادہ ہے، چند اشعار اس کے ملاحظہ ہوں:

الٰہی دے مجھے رنگیں بیانی عطا کر مجکو یاقوت بیانی
سخن کے در کا مجکو جوہری کر سخن سنجوں کو میرا مشتری کر
سخن کا لال دے میری زباں کو در معنی سے بھر میرے بیاں کو

جنوں کے دشت کا بن کر بگولا خرد کی راہ کو وحشت سے بھولا
سحر سے شام تک مانند خورشید طلب کے فرق پر رکھ پائے امید
غزالوں کی طرح سرگرم رم تھا بیاباں اس کو گلزار ارم تھا
برس دو جب چلا جب راہ میں آہ نظر میں اس کے آیا دشت جانکاہ

کروں اس دشت کی کیوں کر صفت کو　　زباں پر کس طرح ڈالوں لغت کو
وہاں ہرگز نہ تھا پانی کا آثار　　اجل کا کھیت تھا وہ دشتِ خونخوار
بیابانِ عدم کے تھا برابر　　وہاں تھا جانِ عزرائیل کو ڈر
وہاں کی ریت ہیرے کی کنی تھی　　وہاں کے کانٹے بھالوں کی انی تھی
وہاں کی گرد تھی پانوں کی دارو　　وہاں کی خاک تھی دوزخ کی بالو

غزلوں کے منتخب اشعار:

دیکھ کر دامن گیر محشر میں ترے ہوئیں گے ہم
خوں ہمارا اپنے دامن سے نہ اے قاتل چھڑا

عاجز ہوں شاہِ ملک جنوں میرے واسطے　　سورج کلاہ و چتر فلک ہے زمیں ہے تخت

ہے ہمارے بت کا دل پتھر کے چہرے کی طرح
کیا کروں اس کی صفت ہے سخت ہیرے کی طرح

ہر سحر کیا دیکھتی ہو آرسی اے سادہ رو
ہے تمہارے حسن کی دفتر کی دونوں صاف فرد

جب سے اے رنگیں ادا تیرا ہے رنگ گل میں نقش
تب سے میری آہ کا ہے سینۂ بلبل میں نقش

عاجزؔ بھی شمع آہ جلاتا ہے باغ میں
روشن اگر گلوں سے ہوا ہے چراغ باغ

باغ میں اس لالہ رو کے آہ جب جاتے ہیں ہم
دل کے داغوں کو گلوں کے تازہ کر آتے ہیں ہم

عشق سے خوش قامتوں کی سبز پوشی کر پسند
سرو کے بوٹے قبا پر اپنی چھپواتے ہیں ہم

خوش نگہ کی یاد میں ساغر کو جب گرداں کروں
بے تکلف گردنِ مینا کو نرگس داں کروں
اس حنائی ہاتھ کی تعریف خونِ دل سے لکھ
ریشۂ نخلِ قلم کو پنجۂ مژگاں کروں

چمن میں جا کے وہ رنگیں ادا جب مسکراتا ہے
گلوں سے رنگ اڑ کر لال سا جنگل کو جاتا ہے
ہمارا اشک خونیں یاد میں گلرو کے بہ بہ کر
نگہ کو رشتۂ تسبیح یاقوتی بناتا ہے

☆☆☆

تیسرا دور

متقدمین شعرائے اردو کا

شاہ مبارک آبرو

''شاعر نادرہ گوئے ریختہ، می گویند کہ طبعی شوخی داشت، غرض مستغنی وقت خود بود کہ عہد محمد شاہ باشد۔'' (اھ، نکات الشعرا)

''نبیرۂ حضرت محمد غوث گوالیاری نور اللہ مرقدہ از ابتدائے جوانی مشق سخن می کرد، شاعر خوش گو در وقت خود بود۔'' (اھ، تذکرۂ میر حسن)

آبرو تخلص، نجم الدین نام، شاہ مبارک لقب تھا اور اسی لقب سے مشہور تھے، حضرت محمد غوث گوالیاری کی اولاد میں اور سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار، باوجودیکہ بڈھے شاعر اور کہنہ مشق تھے مگر خان آرزو کو اپنا کلام ہمیشہ دکھاتے رہے۔

عملی استعداد کا حال معلوم نہیں، کلام سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں کے لیے جن معلومات کی ضرورت ہے ان سے بے بہرہ نہ تھے، عنفوانِ شباب میں یہ دلی آ گئے تھے اور ساری عمر یہیں بسر کر دی۔

ایک آنکھ ان کی جاتی رہی تھی مگر جو کمال ان کو خدا نے عنایت فرمایا تھا، اس عیب کی پردہ پوشی کر دی تھی، ابنائے وطن نے دل کھول کر ان کی قدردانی کی اور حق یہ ہے کہ دلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز انہی سے ہوا ہے۔

طبیعت رسا اور فکر معنی یاب تھی، اس زمانہ کے دستور کے موافق تشبیہ اور ایہام میں کلام الجھا ہوا ہے مگر محاوروں کی چاشنی نے اس کو بامزہ کر دیا ہے، دیوان ان کا غدر میں ضائع ہو گیا، ایک مختصر دیوان اب بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے، شاید اسی کا انتخاب ہو۔

کلام ملاحظہ ہو:

آیا ہے صبح نیند سے، اٹھ رسمسا ہوا　　جامہ گلے میں رات کا پھولوں بسا ہوا

کم مت گنو یہ بخت سیاہوں کا رنگ زرد　　سونا وہ ہے جو ہووے کسوٹی کسا ہوا
انداز سے سیں زیادہ نپٹ ناز خوش نہیں　　جو خال اپنی حد سے سیں بڑھا سو مسا ہوا

جدائی کے زمانے کی سجن کیا زیادتی کہیے　　کہ اس ظالم کی جو ہم پر گھڑی گزری سو جگ بیتا

یہ سبزہ، یہ آب رواں اور ابر یہ گہرا　　دیوانہ نہیں گھر میں رہوں چھوڑ کے صحرا

قول آبرو کا تھا کہ نہ جاؤں گا اس گلی　　ہو کر کے بے قرار دیکھو آج پھر آ گیا

دل تو دیکھو آدم بے باک کا　　عشق سے پتلا بھرا ہے خاک کا

کچھ ٹھہرتی نہیں کہ کیا ہوئے گی　　اس دل بے قرار کی صورت

نہ تھا کچھ اور میرے شوق کا حسن وصفا باعث
یہی پیاری طرح موجب، یہی کا فرادا باعث

مجلس رنداں میں مت لے جا دل بے شوق کو
شیشۂ خالی کی کیا عزت ہے میخواروں کے بیچ

جلتا ہے اب تلک ترے مکھڑے کے رشک سے
ہر چند ہوگیا ہے چمن کا چراغ گل

نکلے تم آ، صبا کی طرح جب چمن میں بھول
گلشن کے دیکھ تجکو گئے ہاتھ پانوں پھول

حسن ہے پر خوبرویوں میں وفا کی خو نہیں
پھول ہیں یہ سب پر ان پھولوں میں ہرگز بو نہیں

کریں جو بندگی ہوویں گنہگار بتوں کی کچھ نرالی ہے خدائی

کیا ہوا مرگیا اگر فرہاد روح پتھر سے سر پٹکتی ہے

پھرتے تھے دشت دشت دوانے کدھر گئے وہ ہائے عاشقی کے زمانے کدھر گئے

لٹک چلنا سجن کا بھولتا اب تک نہیں مجکوں
طرح وہ پانوں رکھنے کی مری آنکھوں میں پھرتی ہے

☆☆☆

شیخ شرف الدین مضمونؔ

''حریف ظریف ہشاش بشاش ہنگامہ گرم کن مجلسہا، ہر چند کم گو بود لیکن بسیار خوش فکر و تلاش لفظ تازہ زیادہ، دیوانش بہ ہمہ جہت دو صد بیت خواہد بود۔'' (نکات الشعرا)

شیخ شرف الدین مضمونؔ جاج مئو صوبہ اکبر آباد کے رہنے والے، حضرت شیخ فرید الدین مسعود اجودھنیؒ کی اولاد میں تھے، عنفوان شباب میں دلی آ گئے اور زینۃ المساجد میں قیام کیا، اس زمانہ میں جیسا دستور تھا کہ اکثر شریف زادے پڑھنے کو باہر نکل جاتے تھے، یہ دلی ایسے گئے کہ وہیں کے ہو رہے اور مر کر بھی نہ نکلے۔

ساری عمر زینۃ المساجد میں بسر کر دی، سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے شاگرد تھے، نزلہ سے ان کے دانت گر گئے تھے اس لیے خان آرزوؔ ان کو شاعر بے دانہ کہتے تھے۔

مرزا رفیع سوداؔ ان کے حق میں فرماتے ہیں:

بنائیں اٹھ گئیں یارو! غزل کے خوب کہنے کی
گیا مضمونؔ دنیا سے رہا سوداؔ سو دیوانہ

مضمون کا کلام ملاحظہ ہو:

ہم نے کیا کیا نہ ترے عشق میں محبوب کیا　　صبر ایوبؑ کیا گریۂ یعقوبؑ کیا

افسوس یار جھٹ پٹ لیتے ہیں دل کو اٹکا
کن ساحروں سے سیکھا زلفوں نے تیری لٹکا
چھپ کر مخالفوں سے اس طرح آ پلنگ پر
کوئی سنے نہ پیارے تیرے قدم کا کھٹکا

ہوا منصور سے یہ نکتہ حل آج   کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج

نہیں ہیں ہونٹھ تیرے پان سے سرخ   ہوا ہے خون میرا آکے لبریز

تیر مژگاں برستے ہیں مجھ پر   آبِ پیکاں کا اس طرف ہے ڈھال

کیا سمجھ بلبل نے باندھا ہے چمن میں آشیاں
ایک تو گل بے وفا اور تس پہ جورِ باغباں

میرا پیغام وصل اے قاصد   کہیو سب سے اسے جدا کر کے

چلا کشتی میں آگے سے جو وہ محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی جی ڈوب جاتا ہے

☆☆☆

میر محمد شاکر ناجی

"مردے ظریف طبع بود، اکثر از لطائف وظرائف مردماں را بہ خندہ
می آوردو خود نمی خندید مگر تبسمے می کرد، متوطن شاہ جہاں آباد بود، تلاش
صنعت ایہام بسیار داشت ـ" (اھ، تذکرہ میر حسن)

سید محمد شاکر ناجی عمدۃ الملک امیر خاں (۱) محمد شاہی کے نعمت خانہ کے داروغہ تھے،

(۱) عمدۃ الملک نواب امیر خاں محمد شاہی عمدۃ الملک نواب امیر خاں عالمگیری کے بیٹے تھے، امیر خاں عالمگیری نواب علی مردان کے داماد اور میر میران شاہ نعمت اللہ ولی کے اولاد میں تھے، ان کے ایک بھائی روح اللہ خاں عالمگیر بادشاہ مرحوم کے مصاحب خاص تھے، امیر خاں محمد شاہی کا نام سید اسحاق، والد کا نام سید میر میران تھا، ان کے والد عالمگیر مرحوم کے زمانہ میں بائیس برس کابل کے صوبہ دار رہے اور وہیں وفات پائی، انہوں نے خود ترقی کرتے کرتے محمد شاہ بادشاہ کے زمانہ میں بخشی گیری کے کام تک ترقی کی اور اپنی لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کی وجہ سے بادشاہ سے ایسے شیر وشکر ہوئے کہ بادشاہ کو ان کے سوا کسی کی بات میں مزہ ہی نہ آتا تھا۔

۱۱۵۲ھ میں محمد شاہ بادشاہ کی کچھ آنکھیں کھلیں تو آصف جاہ اول نظام الملک میر قمر الدین خاں بہادر یاد آئے، ان کا آنا اس بات پر موقوف تھا کہ نواب امیر خاں دربار سے دور رہیں، چاروناچار بادشاہ نے ان کو الہ آباد کی صوبہ داری دے کر رخصت کر دیا مگر جب آصف جاہ واپس گئے تو پھر امیر خاں دلی آگئے، ان کی طبیعت نہایت بذلہ سنج ولطیفہ گو واقع ہوئی تھی، وقت پر ان کو ایسی سوجھتی تھی کہ دوسروں کو پہروں کاوش کرنے سے وہ مضمون ہاتھ نہ آتا تھا۔

یہ شاعر بھی تھے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے اور انجام (باقی اگلے صفحہ پر)

تیز مزاج، شوخ طبع، راہ چلتے سے الجھتے اور جس کے گرد ہوتے اسے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا تھا۔
میر صاحب فرماتے ہیں ''مزاجش بیشتر مائل بہ ہزل بود، بندہ با او یک دو ملاقات کردہ بودم، ہزل خود می خواند و مردماں را بخندہ می آورد'' افسوس ہے میر شاکر ناجی کا نوجوانی میں انتقال ہو گیا، طبیعت ان کی شعر و سخن سے بہت مناسب تھی، اگر عمر طبعی کو پہنچتے تو تبدیلی مزاج کے ساتھ کلام کی گرمی بہت بڑھ جاتی۔

نہ پوچھو خود بخود ہے عارض خورشید کی خوبی　　لیا ہے ذرہ ذرہ حسن مہرویاں سے کر چندا

مجکو باتوں میں لگا کیا جانیے کیا کہہ گیا　　لے چلا جب دل تئیں منہ دیکھتا میں رہ گیا

دیکھ ہم صحبت کی دولت سے نہ رکھ چشم کرم
لب صدف کے تر نہیں ہر چند ہے گوہر میں آب

اغنیا کے در بدر مقدور جب تک ہو نہ جا　　سخت حاجت ہو تو جالا چارگی ہے جا ضرور

سابقہ حاشیہ: تخلص تھا، افسوس ہے کہ ۱۱۵۶ھ میں ایک سنگ دل نے ایوانِ شاہی میں ان کو قتل کر دیا۔

دور سے آئے تھے ساقی سن کے میخانے کو ہم　　پر ترستے ہی چلے اب ایک پیمانے کو ہم
کیوں نہیں لیتا ہماری تو خبر اے بے خبر　　کیا ترے عاشق ہوئے تھے درد و غم کھانے کو ہم

ٹک تو فرصت دے کہ رخصت ہو چلیں صیاد ہم　　مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آباد ہم
ساتھ اپنے سر کے تھا انجام پاس تمکنت　　شکر ہے تڑپے نہ زیر خنجر جلاد ہم

میں بلائے بھیڑ میں یہ مجھ سے نادانی ہوئی　　دختر رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی
نقش میری دیکھ کے مقتل میں یوں کہنے لگے　　کچھ تو یہ صورت نظر آتی ہے پہچانی ہوئی

چاک کو تقدیر کے ممکن نہیں ہرگز رفو　　سوزن تدبیر بھی گو سو برس سیتی رہے

انگوٹھی لعل کی کرتی قیامت آج اگر ہوتی جنہوں کی آن پہنچے لر موے وہ ایک چھلے پر

نرگس کے تیئں میں ہرگز لاتا نہیں نظر میں دیکھی ہیں میں نے آخر پیاری تمہاری آنکھیں

نہ سیر باغ، نہ ملنا نہ میٹھی باتیں ہیں یہ دن بہار کے اے جان مفت جاتے ہیں

عید ہوتی جو کوئی افطار کرتا جس کے گھر اب بتاویں طے کا روزہ دیکھ کر مہمان کو

آج تو ناجی سجن سے کرلے اپنا عرض حال مرنے جینے کا نہ کر سواس ہوئی ہو سو ہو

نادر شاہ کی چڑھائی کے وقت موجود تھے، اس وقت دربار دہلی کا رنگ شرفا کی خواری، پاجیوں کی گرم بازاری اور ہندوستانیوں کی آرام طلبی و ناز پروری کو ایک طولانی مخمس میں دکھایا ہے، آزاد کو صرف دو بند ہاتھ آئے ہیں انہی کو ضیافت طبع سمجھو۔

لڑے ہوئے تو برس بیس ان کو بیتے تھے دعا کے زور سے دائی دوا کے جیتے تھے

شرابیں گھر کی نکالے مزے سے پیتے تھے نگار و نقش میں ظاہر گویا کہ جیتے تھے

گلے میں ہنسیاں بازو اوپر طلا کی تال

قضا سے بچ گیا مرنا نہیں تو ٹھانا تھا کہ میں نشان کے ہاتھی اوپر نشانہ تھا

نہ پانی پینے کو پایا دہاں نہ کھانا تھا ملے تھے وہاں جو لشکر تمام چھانا تھا

نہ ظرف و مطبخ و مکاں نہ غلہ و بقال

☆☆☆

مصطفیٰ خاں یکرنگ

''شاعر ریختہ، معاصر میاں آبرو، می گویند کہ بسیار چسپاں اختلاط و آشنائے درست بود۔'' (از نکات الشعرا)

کہن سال اور کہنہ مشق تھے، مگر باوجود اس کے حضرت مرزا مظہر رحمۃ اللہ علیہ کو اپنا کلام دکھاتے اور ان سے مشورۂ سخن کرتے تھے، مصحفی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ایک قول کے موافق وہ خان آرزو کے اور ایک قول کی بنا پر شاہ مبارک آبرو کے شاگرد سمجھے جاتے ہیں مگر خود ان کے فحوائے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ مرزا صاحب کے شاگرد تھے۔

آزاد کہتے ہیں بزرگوں سے سنا اور تذکروں میں بھی دیکھا، بڑے مشاق تھے اور اپنے وقت میں سب انہیں خوش فکر و باکمال مانتے تھے اور لطف یہ ہے کہ تخلص کی طرح عالمِ آشنائی میں بھی یکرنگ یکتا تھے ؎

اس قدر کیا ہے حمایت غیر کی　　ہم بھی تو تم سے کبھی تھے آشنا

خلق یکرنگ کی ہوئی دشمن　　جب سے تیرا وہ دوست دار ہوا

سنتا نہیں بات کسی کی تو اے سجن　　تجکو ترا غرور نہ جانوں کرے گا کیا

کم نہیں کچھ بوئے گل سیتی فغانِ عندلیب　　برگ گل سے ہیگی نازک تر زبان عندلیب

سچ کہے جو کوئی تو مارا جائے　　راستی ہے گی دار کی صورت

پھر گیا ہائے ہم سے وہ مہرو سرد مہری سہی ہوا کی طرح

کہتے ہیں ہم پکار سنو کان دھر سجن گر غیر سے ملو گے تو دیکھو گے ہم نہیں

ہرگز تم اب کسو کے سخن آشنا نہیں سب خوبیاں ہیں تم میں ولے اک وفا نہیں
یکرنگ نے تلاش کیا ہے بہت ولے مظہر سا اس جہاں میں کوئی میرزا نہیں

نہ کہو یہ کہ یار جاتا ہے میرا صبر و قرار جاتا ہے
گر خبر لینی ہے تو لے صیاد ہاتھ سے شکار جاتا ہے

کیا جانیے کہ وصل ترا کس کے ہو نصیب ہم تو ترے فراق میں اے یار مر گئے

☆☆☆

محمد حسین کلیمؔ

''اگرچہ کلیم در فارسی گزشتہ است، اما کلیم ریختہ پیش فقیر اینست،
قطع نظر بندہ را بخدمت او قرابت قریبہ است یک اخلاص تہ دلی دارم و
اکثر بہ حال ایں ہیچ مداں شفقت می فرماید۔'' (از نکات الشعرا)

''در فن شعر و شاعری استاد سخن، بحر ذخار طبعش در نثر و نظم موجزن، رسالہ
در عروض و قافیہ ہندی تصنیف فرمودہ و فصوص را کہ کتاب عربی است بہ زبان
ریختہ ترجمہ کردو ما کتابے در نثر ہندی نیز ایجاد نمودہ۔'' (تذکرہ میر حسن)

میر محمد حسین کلیم دلی کے رہنے والے تھے، نظم و نثر دونوں میں ان کو قدرت تھی،
میر محمد تقی میر ان سے قرابت قریبہ رکھتے تھے۔

میر حسن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ فصوص کا انہوں نے اردو میں ترجمہ کیا ہے،
فصوص الحکم شیخ محی الدین بن عربی کی حقائق و معارف میں بڑی دقیق اور مشکل کتاب ہے
جس کا سمجھنا معمولی مولویوں کے بس کی بات نہیں، انہوں نے اردو میں اس کا ترجمہ کیا تو معلوم
ہوتا ہے کہ علوم عربیہ میں مہارت کے ساتھ حقائق و معارف میں بھی بہت بلند پایہ شخص تھے۔

عروض و قافیہ میں بھی ایک رسالہ لکھا ہے، غالباً ہندی عروض و قافیہ کا یہ پہلا رسالہ
ہوگا، اسی طرح اردو نثر میں بھی ایک کتاب لکھی ہے، اس کی نسبت میر حسنؔ کہتے ہیں کہ ''در ہندی
نثر کتابے نیز ایجاد کردہ'' اس سے شبہہ ہوتا ہے کہ ان سے پہلے کسی نے نثر اردو میں کوئی کتاب

نہیں لکھی مگر یہ صحیح نہیں، مقدمہ میں میں نے بیان کیا ہے کہ فضلی نے وہ مجلس ۱۱۴۵ھ میں لکھی تھی، ان کی کتاب کا سنہ تصنیف معلوم نہیں مگر یقیناً احمد شاہ بادشاہ دہلی کے نابینا کیے جانے کے بعد لکھی گئی ہے جیسا کہ مندرجہ ذیل فقرہ سے معلوم ہوتا ہے جس کو میر حسن نے نقل کیا ہے ۔

کل کے دن تھے بادشاہ اور وزیر آج کے دن بیٹھے ہیں اندھے ہو بصیر
ایسی دولت سے زنہار فاعتبروا یا اولی الابصار

میر حسن کی رائے ہے کہ ان کے کلام میں نمک نہیں تھا، اسی وجہ سے اس کو شرف قبول حاصل نہیں ہوا، میر محمد تقی میر فرماتے ہیں کہ میرزا عبدالقادر بیدل کی روش پر شعر کہتے تھے، اسی وجہ سے ان کے تہ دار شعر سمجھنے سے لوگ عاجز رہتے، وہ اپنے طرز کے آپ مالک ہیں، ان کے قصیدوں، غزلوں، رباعیوں اور مخمس کا رنگ کسی کے رنگ سے ملتا نہ تھا۔

صاحب دیوان تھے مگر افسوس ہے کہ ان کا دیوان نظر سے نہیں گزرا، تذکروں میں ان کے چیدہ و برگزیدہ اشعار درج ہیں، ان کو پڑھ کر اس کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔

سب سے زیادہ افسوس مجھے اس بات کا ہے کہ ایسے بڑے فاضل شخص کے حالات اب تک نہ تذکرۂ مشائخ میں ملے نہ اور کسی کتاب میں معلوم، معلوم نہیں کہ کس خاندان میں پیدا ہوئے، کب پیدا ہوئے، کس سے تعلیم پائی، کس کی صحبت میں حقائق و معارف کا چسکا پڑا، کس سے مشورۂ سخن کرتے تھے اور کس سنہ میں وفات پائی۔

حقیقت یہ ہے کہ دلی عجب مردم خیز جگہ تھی جہاں سے ایسے بڑے بڑے محدث، فقیہ، صوفی اور شاعر اٹھے کہ جس زمانہ میں آج کا ایسا قحط الرجال نہیں تھا، اس وقت دوسری جگہ ان کا نظیر ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا تھا۔

کلیم کا کلام ملاحظہ ہو:

کس پریشاں نے قدم رکھا ہے پیچ و تاب سے
جادہ آتا ہے نظر جوں زلف کج برہم ہوا

عمرِ رفتہ کا نہ پایا کھوج ہرگز اے کلیم　　آپ کو جوں شمع میں ہر انجمن میں گم کیا

لگتی ہے اب تو قلقلِ مینا سے دل کو ٹھیس　　وہ دن گئے کلیم کہ یہ شیشہ سنگ تھا

پاس ناموسِ محبت ہے مجھے ان سے کلیم　　باغ میں جاؤں نہ ہرگز بے رضائے عندلیب

رکھتا ہے زلف یار کا کوچہ ہزار پیچ　　اے دل سمجھ کے جائیو ہے راہ مار پیچ

زلف کو خواب میں دیکھا تھا جنوں نے شب کو　　صبح بیدار ہوا پائی گلے میں زنجیر

سو زخم کھا چکا ہے دل اس پر جگر جلا　　کہتا ہے زخم مجکو ہے اک آرزو ہنوز

ہو گیا حشر، گئی دوزخ و جنت کو خلق　　رہ گیا میں ترے کوچہ میں گرفتار ہنوز

ہم ہو گئے ہیں ضعف سے جوں بو میانِ باغ　　پھرتا ہے رنگ گل کہ ہمارا کرے سراغ

طریق عشق میں مجنوں و کوہکن کو نہ کہہ　　ہزاروں ہو گئے غارت سو ایک دو معلوم

درازیِ شبِ ہجران زلفِ یار کلیم　　نہ مجھ سے پوچھ کہ کاٹی ہے رات آنکھوں میں

مانند سرو ہوں کہ نہ گل ہے نہ بر مجھے　　بیکار باغ ہوں نہ سزاوار باغ ہوں

نے اور طنبور میں یہ سوز تو معلوم اے مطرب　　کسی کا دل ہوا ہے شاید اس پردہ میں آنالاں

غرورِ حسن ممکن کیا کسی کی داد کو پہنچے　　غرض تم سن چکے احوال ہم فریاد کو پہنچے

تجھے میں آنکھوں میں کیوں کر رکھوں کہ ہے برسات
پھر ایسا گھر کہ یہ خانہ خراب ٹپکے ہے

☆☆☆

شاہ ظہور الدین حاتم

"صاحب کمال و پسندیدہ افعال، عالی فطرت و بلند ہمت، معاصر میاں آبرو دو دیوان ترتیب دادہ، یکے بہ زبان قدیم بہ طور ایہام و دوم بہ زبان حال ادائیہ، شہرۂ اشعارش بسیار ست، اکثر غزلہائے او را نغمہ سرایان ہند می خوانند۔" (اھ تذکرۂ میر حسن)

ظہور الدین نام، حاتم تخلص، والد کا نام فتح الدین تھا، عمدۃ الملک نواب امیر خاں محمد شاہی کی سرکار میں ملازم تھے اور فارغ البالی سے زندگی بسر کرتے تھے۔

میر بادل علی شاہ کا تکیہ دلی میں قدم شریف کے پاس رند مشرب لوگوں کا ٹھکانا تھا، یہ بھی وہاں جایا کرتے اور پہر دو پہر دل بہلا کر چلے آتے تھے، کچھ فقیر کی صحبت، کچھ زمانہ کے انقلاب کا پھیر، وہاں آتے جاتے یہ بھی فقرائے آزاد منش میں شامل ہو گئے۔

شعر و سخن کا شوق شروع ہی سے تھا، مشق سخن کرتے کرتے استاد بن گئے، پہلے رمز تخلص کرتے تھے، پھر حاتم ہو گئے، کلیات ان کا بہت بڑا ہے جو قصائد، غزلیات، رباعی اور مثنوی پر مشتمل ہے، آخر عمر میں کلیات مذکور سے منتخب کر کے ایک دیوان مرتب کیا، اس کا نام دیوان زادہ رکھا، آزاد کہتے ہیں کہ "وہ صاحبزادہ بھی پانچ ہزار سے زیادہ کا مال بغل میں دبائے بیٹھا ہے۔"

ولادت ان کی بقول آزاد ۱۱۱۱ھ میں اور وفات ۱۲۰۷ھ اور بقول مصحفی ۱۱۹۶ھ میں ہوئی ہے، دیوان زادہ عزیز الدین عالمگیر ثانی کے زمانہ میں مرتب کیا ہے۔

میر محمد تقی میر حسب معمول ان سے سخت ناخوش ہیں، نکات الشعرا میں ارشاد فرماتے ہیں:

"مردیست جاہل و متمکن و مقطع وضع، دیر آشنا غنانہ دارد، در یافتہ نمی شود کہ ایں رگ کہن بسبب شاعری است کہ ہچومن دیگرے نیست یا وضع او ہمین است۔"

چوں کہ مرزا رفیع حاتم کے شاگرد تھے اور وہ میر صاحب کے حریف تھے، کیا عجب ہے کہ شاہ حاتم میر صاحب کو خاطر میں نہ لاتے ہوں۔

آبِ حیات جا کے کسو نے پیا تو کیا　　مانند خضر جگ میں اکیلا جیا تو کیا
ناسور کی صفت ہے نہ ہوگا کبھی وہ بند　　جراح زخم عشق کا آکر سیا تو کیا
محتاجگی سیوں مجکو نہیں ایک دم فراغ　　حق نے جہاں میں نام کو حاتم کیا تو کیا

زندگی درد سر ہوئی حاتم　　کب ملے گا مجھے پیا میرا

ہجر کی زندگی سے موت بھلی　　کہ جہاں سب کہیں وصال ہوا

ستم سے تیرے میں جاتا ہوں پھر نہ کہیو تو　　کہ آشنائی کا حاتم نباہ بھی نہ کیا

ایک دن ہاتھ لگایا تھا تیرے دامن کو　　آج تک سر ہے خجالت سے گریباں کے بیچ

جب سے تیری نظر پڑی ہے جھلک　　تب سے لگتی نہیں پلک سے پلک

دلوں کی راہ خطرناک ہوگئی آیا　　کہ چند روز سے موقوف ہے سلام پیام

تو اذیت پیشہ دشمن ہے بغل میں دل نہیں　　دور ہو پہلو سے صحبت کے مرے قابل نہیں

پیری میں حاتم اب نہ جوانی کو یاد کر
سوکھے درخت بھی کہیں ہوتے ہیں پھر ہرے

بے مدد زلفوں کے اس کے حسن نے قیدی کیا
صیدِ دل بے دام کرنا صنعت استاد ہے

اے خرد مندو! مبارک ہو تمہیں فرزانگی
ہم ہوں اور صحرا ہو اور وحشت ہو اور دیوانگی

☆☆☆

اشرف علی خاں فغاںؔ

''بسیار جوان قابل وہنگامہ آرا، شعر ریختہ را بہ خوبی می گوید وگاہے
فکرِ غزل فارسی می کند، شاگرد قزلباش خاں امید مرحوم است۔''

(نکات الشعرا)

''شعر را بہ صفائی می گوید ونسبت شاگردی می فرمانید یم می رساند، چنانچہ
خود گفتہ ۔

ہر چند اب ندیم کا شاگرد ہے فغاںؔ دو دن کے بعد دیکھیو استاد ہووے گا
(تذکرۂ مصحفی)''

اشرف علی خاں فغاں احمد شاہ بادشاہ کے کوکہ تھے، علی قلی ندیم سے مشق سخن کی، آزاد نے آب حیات میں تذکرہ مصحفی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قزلباش خاں کے شاگرد تھے، میں سمجھتا ہوں کہ آزاد نے مصحفی کا تذکرہ نہیں دیکھا۔

میر تقی میر نے بھی ان کو قزلباش خاں امید کا شاگرد لکھا ہے ممکن ہے کہ پہلے ان سے اصلاح لیتے ہوں، پھر ندیم کے شاگرد ہوئے ہوں، یا فارسی میں ان کے شاگرد ہوں اور اردو میں ندیم کے، جو کچھ بھی ہو مصحفی نے ان کو ندیم ہی کا شاگرد بتایا ہے اس لیے آزاد کا حوالہ غلط ہے۔

فغاںؔ شعر و سخن ہی کے ماہر نہ تھے بلکہ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں یکتائے زمانہ تھے، احمد شاہ نے اسی لیے ان کو ''ظریف الملک'' کا خطاب دیا تھا، درانیوں کے حملوں نے دلی کیا

ہندوستان کو تہ و بالا کر رکھا تھا، یہ پریشان ہو کر اپنے چچا ایرج خاں کے پاس مرشد آباد چلے گئے، وہاں سے لوٹتے ہوئے فیض آباد ٹھہر گئے، نواب شجاع الدولہ نے اعزاز و اکرام سے لیا مگر ایک دفعہ جوش اختلاط میں گرم پیسے سے ان کا ہاتھ جلا ڈالا، یہ جل کر عظیم آباد چلے گئے، راجہ شتاب رائے نے ان کی قدر دانی کی، یہ وہیں رہ پڑے اور باقی عمر کو خوشحالی سے بسر کر کے ۱۱۸۶ھ میں دنیا سے انتقال کیا۔

آزاد کہتے ہیں کہ ''ایک دن اختلاط میں نواب کے ہاتھ سے ان کا کپڑا جل گیا، یہ نازک مزاج بہت تھے، رنجیدہ ہو کر عظیم آباد چلے گئے'' معلوم نہیں کپڑے جلنے کی روایت کہاں سے لی ہے، مصحفی نے ہاتھ جلنے کا ذکر کیا ہے اور یہی صحیح ہے۔

مت قصد کر صبا تو دل داغدار کا ظالم ہے یہ چراغ کسی کے مزار کا

اس کے وصال و ہجر میں یوں ہی گزر گئی دیکھا تو ہنس دیا، جو نہ دیکھا تو رو دیا

کیا پوچھتے ہو حال فغاںؔ کا سنا نہیں خانہ خرابِ عشق نے دنیا سے کھو دیا

دلبستگی قفس میں یہاں تک ہوئی مجھے گویا مرا چمن میں کہیں آشیاں نہ تھا

کیا تو شب فراق میں جیتا رہا فغاںؔ یاں تک گماں نہ تھا ترے صبر و قرار کا

تا حشر کم نہ ہووے گی ظالم تپشِ دل کافر ہوں اگر گور میں آرام کروں میں

نے زندگی میں وصل میسر نہ بعد مرگ عاجز ہوا ہوں اے دل ناشاد کیا کروں

خط دیجیو چھپا کے ملے وہ اگر کہیں لینا نہ میرے نام کو اے نامہ بر کہیں

صیاد راہ باغ فراموش ہو گئی کنجِ قفس سے مت مجھے آزاد کیجیو

آخر فغاں وہی ہے اسے کیوں بھلا دیا　　وہ کیا ہوا تپاک وہ الفت کدھر گئی
مجھ سے جو پوچھیے تو بہر حال شکر ہے　　یوں بھی گزر گئی مری دوں بھی گزر گئی

صنم نامہرباں ہے اس قدر اے میرے رب کیا ہے
مری تقصیر کچھ ثابت نہیں وجہِ غضب کیا ہے
قدم پر جب ہاتھ رکھتا ہے یوں کہتا ہے جھنجھلا کر
یہ گستاخی مجھے بھاتی نہیں اے بے ادب کیا ہے

بھر لیجیو دامن میں فغاںؔ لختِ جگر کو　　ہم خانہ بدوشوں کا سر انجام یہی ہے

تیرے ہی دل سے پوچھیے اس غم کو ہاں فغاںؔ　　الفت بری بلا ہے کسی کو خدا نہ دے

☆☆☆

حصہ دوم

طبقۂ متوسطین

دور اول

حضرت مرزا مظہر جانجاناںؒ

''می گویند کہ اول کسے کہ طرز ایہام گوئی را ترک نمودہ ریختہ را در زبانِ اردوے معلیٰ شاہجہاں آباد کہ الحال پسند خاطر عوام و خواص گردیدہ مروج ساختہ زبدۃ العارفین، قدوۃ الواصلین، واقف رموز جناب اکبر، کاشف کنوز طریقہ پیغمبر مرزا جانجاناںؒ متخلص بہ مظہرؔ، مردے است فرشتہ صفت، علوی نسب، ہندی مولد، حنفی مذہب، نقش بندی مشرب۔''

(از طبقات الشعرا مصنفہ مولوی قدرت اللہ صدیقی، تالیف ۱۱۸۸ھ)

''در ابتدائے شوق شعر کہ ہنوز از میر و مرزا کسے در عرصہ نیامدہ بود، و دور دور ایہام گویاں بود، اول کسی کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست، چوں دراں روزہا میر عبدالحی تاباں دوستی بہ شدت داشت، چند غزلیات متعددہ از خامہ فکر ایشاں بر صفحہ کاغذ ریختہ بودند کہ مشار الیہ مانع آمدہ، آخر ایشاں را قرار شعر گفتن بر زبان فارسی دادند و بعد ازیں بر ریختہ زبان نیا......؟ مگر

ہماں قدر کہ بہ اصلاح دوسہ شاگرداں بکار آید، چنانچہ تربیت انعام اللہ خان یقینؔ، نسبت بہ محمد فقیہ دردمند کہ ساقی نامہ ایشاں شہرت دارد متوجہ بودند در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان استاد جلوۂ ظہوری دہد، فی الحقیقۃ نقاش اول زبان ریختہ بہ اعتبار فقیر مرزا است بعدہ تتبعش بہ دیگراں رسیدہ۔"

(اھ، تذکرۂ مصحفی تالیف ۱۲۰۹ھ)

"لطافت مزاج اور نزاکت طبع کا نتیجہ ہے کہ زبان کی طرف توجہ کی اور اسے ایسا تراشا کہ جو شعرا پہلے گزرے تھے انہیں پیچھے ہی چھوڑ کر اپنے عہد کا طبقہ الگ کر دیا اور اہل زبان کو نیا نمونہ تراش کر دیا جس سے پرانا رستہ ایہام گوئی کا زمین شعر سے مٹ گیا، ان کے کلام میں مضامین عاشقانہ عجب تڑپ دکھاتے ہیں اور یہ مقام تعجب نہیں کیوں کہ وہ قدرتی عاشق مزاج تھے، اوروں کے کلام میں یہ مضامین خیالی ہیں، ان کے اصل حال۔"

(اھ، آب حیات، ص ۱۳۰)

شمس الدین جانجاناں نام، مظہر تخلص، والد کا نام مرزا جان تھا، عالمگیر مرحوم کے دربار میں صاحب منصب تھے، نسب ان کا باپ کی طرف سے محمد بن حنفیہ سے ملتا ہے، ماں بیجاپور کے شریف گھرانے سے تھیں، دادا بھی دربار شاہی میں صاحب منصب تھے، دادی اسد خاں وزیر کی خالہ زاد بہن تھیں، پرداداسے اکبر شاہ کی بیٹی منسوب ہوئی تھیں، ان رشتوں سے تیموری خاندان کے نواسے تھے، کالا باغ علاقۂ مالوہ میں ۱۱ر رمضان ۱۱۱۱ھ کو پیدا ہوئے، عالمگیر مرحوم کو خبر ہوئی تو فرمایا کہ "پسر جان پدر می باشد" اس کا نام ہم نے جان جاناں رکھا، کثرت استعمال سے جانجاناں ہو گیا۔

اٹھارہ برس کی عمر تھی کہ باپ مر گئے، منصب کے حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا مگر توفیق خداوندی نے رہبری کی اور سعی بے حاصل کو چھوڑ کر مدرسوں اور خانقاہوں کی جاروب کشی

شروع کی، شیخ محمد افضل سیالکوٹی سے جو اس زمانہ کے شیخ المحدثین تھے باقاعدہ حدیث پڑھی اور تیس برس تک مشائخ نقشبندیہ سے کسب کمال کیا۔

خدا نے مرزا صاحب کی طبیعت عجب باغ و بہار بنائی تھی، مشیخت و ارشاد سے اس وقت بحث نہیں، ان کے اوضاع واطوار اور ادب وآداب پر غور کرو، کتنے سنجیدہ و برجستہ تھے، جو شخص ان کی صحبت میں بیٹھتا تھا ہوشیار ہو کر بیٹھتا تھا، لطافت مزاج اور سلامتی طبع کی نقلیں ایسی ہیں کہ آج سن کر تعجب آتا ہے، خوش تقریر ایسے تھے کہ بات کہتے وقت منہ سے پھول جھڑتے تھے، ان کے کمالات گوناگوں کی وجہ سے ہر ایک کو ان سے ملنے کی تمنا رہتی تھی، میر صاحب نکات الشعرا میں فرماتے ہیں "بندہ بخدمت او رفتہ سعادت اندوز گشتہ است...... خوش تقریر بہ مرتبہ است کہ در تحریر نمی گنجد" انشاء اللہ خاں دریائے لطافت میں لکھتے ہیں "از بسکہ آوازۂ فصاحت و بلاغت جناب فیض مآب مرزا جانجاناں مظہر علیہ الرحمہ گوش راقم را مقر خود می داشت دل با دیدۂ مستعد ستیزہ شد کہ چرا از دیدار مرزا صاحب خود را ایں ہمہ محروم می پسندی از دولت جاودانی و عیش روحانی کہ در کلام معجز نظام آنحضرت است باز میداری۔"

شیخ علی حزیں ہندوستان میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے، ایک بار دلی میں لب سڑک ایک کوٹھے پر بیٹھے ہوئے تھے، مرزا صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر اسی سڑک سے گزرے، شیخ علی حزیں نے دیکھ کر پوچھا "ایں کدام جوان است" سامع ایک شاعر ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے انہوں نے کہا مرزا جانجاناں، شیخ نے کہا "چشم بد دور ہمہ دانی و ہمہ جانی۔"(1)

استغنا اور بے تعلقی کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر کسی بادشاہ یا وزیر کے سامنے سر نیاز خم نہیں کیا، ایک بار محمد شاہ نے نواب اعتماد الدولہ قمر الدین خاں کو بھیج کر کہلا بھیجا کہ اتنا بڑا ملک خدا نے مجھ کو دیا ہے اس میں سے جو کچھ چاہیے قبول فرمایئے، ہنس کر فرمایا "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيْلٌ" "خدا نے ہفت اقلیم کو قلیل فرمایا ہے، پھر ایک اقلیم میں سے ایک ولایت آپ کے حصہ

(1) معمولات مظہریہ۔

میں آئی ہے، وہ کتنی ہے کہ فقیر اس کی طرف طمع کا ہاتھ بڑھائے۔(۱)

نواب فیروز جنگ نے خانقاہ، مسجد، کنواں، یومیہ اور گاؤں فقرا کے لیے پیشکش کیے، قبول نہ کیے اور فرمایا کہ موت قریب آ پہنچی ہے، اس کی تدبیر کرنا ضروری ہے، معلوم نہیں کہ شب تک حیات وفا کرے یا نہ کرے۔(۲)

نواب آصف جاہ نے ایک بار تیس ہزار روپیہ نذر کیا، آپ نے قبول نہیں فرمایا، نواب نے کہا کہ لے کر محتاجوں کو بانٹ دیجیے، فرمایا کہ مجکو اس کا سلیقہ نہیں، یہاں سے نکل کر بانٹتے چلے جایئے، گھر تک پہنچتے پہنچتے تقسیم ہو جائے گا، نہ ہو تو وہاں ہو رہے گا۔(۳)

حقیقت یہ ہے کہ مرزا صاحب جس طرح زندگی بسر کرتے تھے اس کے لیے اس دردسر کو گوارا کرنے کی ضرورت بھی نہ تھی، انہوں نے زندگی بھر کہیں گھر نہیں بنایا، کسی دوست کے گھر یا کرایہ کے مکان میں رہتے، ایک جوڑے سے زیادہ کپڑا نہ رکھتے، کھانا کسی کے گھر نہ کھاتے نہ پکواتے، وقت کے وقت بازار سے منگوا کر کھا لیتے، عام دعوتوں کو قبول نہ فرماتے دوسرے مشائخ کی طرح عرس اور فاتحہ نہ کرتے جس کے لیے روپیہ کی ضرورت پڑتی۔(۴)

نذر و نیاز کے لیے ایسی کڑی شرطیں لگا رکھی تھیں کہ مشکل سے پوری ہوتی ہونگی:
۱۔ یہ کہ پیش کرنے والا شریف و نجیب ہو ۲۔ دنیا داروں سے اختلاط نہ رکھتا ہو ۳۔ فی الجملہ صالح و پرہیزگار ہو ۴۔ حلال و حرام میں تمیز کرنے کا علم رکھتا ہو ۵۔ ایسے ملک سے تازہ وارد نہ ہو جہاں لوٹ مار ہوتی ہو ۶۔ اخلاص و عقیدت سے پیش کرتا ہو۔(۵)

سچ یہ ہے کہ نازک مزاجی اور مرزائیت کے ساتھ درویشی کا بلند پایہ پر قائم رکھنا ہر کسی کا کام نہیں، مولانا نعیم اللہ نے ٹھیک کہا ہے کہ ''احوال اجتماع اوضاع آں مشکل پسند باوجود مرزائیت و نازک مزاجی کہ بہ اطوار درویشی موافقت نہ دارد بمیزان تقریر نمی سنجد۔''

خود مرزا صاحب نے بھی جا بجا اس کی طرف اشارہ کیا ہے ؎

---

(۱) مقامات مظہریہ۔ (۲) ایضاً۔ (۳) ایضاً۔ (۴) ایضاً۔ (۵) معمولات مظہریہ۔

درجنوں ہم میرزائی از دماغ ما بہ رفت　　　کہ برائے خویش حمامے زگلخن داشتیم

بجائے سنگ طفلاں پارہ ہائے شیشہ باید زد　　　چو مظہر میرزا دیوانہ نازک طبیعت را

مظہر زما برید و دگر یا ما نہ کرد　　　دیوانہ خوش نہ بود ز وضع کرخت ما

افسوس ہے کہ شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نے حسب معمول ان کے حالات بیان کرنے میں چٹکیاں لی ہیں، کہیں واقعہ کی صورت ایسی بنائی ہے جس میں بجائے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے، ایک جگہ فرماتے ہیں کہ "ان کے باب میں بہت سے لطائف ایسے مشہور ہیں کہ اگر آج کسی میں پائے جائیں تو زمانہ کے لوگ اچھا نہ سمجھیں.......... کچھ تو اس اعتقاد سے ع

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

اور کچھ...... میں روسیاہ بزرگوں کی ہر بات کو چشم عقیدت کا سرمہ سمجھتا ہوں، الخ (ص ۱۳۸)

تاباں (۱) کا حال جیسا چمکا کر لکھا ہے اور سرگوشیوں کا فسانہ جس طرح سے بیان کیا ہے وہ بھی ملاحظہ طلب ہے (ص ۱۳۹) شعر مندرجہ ذیل ۱۰۴ کو پڑھیے، پھر مرزا صاحب جیسے مہذب کو

(۱) میر عبدالحیٔ تاباں رضوی سید تھے، دلی میں پیدا ہوئے، ایسے حسین وجمیل تھے کہ لوگ ان کو یوسف ثانی کہتے تھے، اس حسن وجمال کے ساتھ عاشق مزاج بھی تھے اور شعر وسخن سے ان کو خداداد مناسبت تھی، شاہ حاتم نے اپنے دیوان کے دیباچہ میں ان کو اپنا شاگرد لکھا ہے اور شیفتہ نے گلشن بے خار میں ان کو مرزا رفیع سودا کا شاگرد لکھا ہے مگر خود تاباں کے کلام سے پایا جاتا ہے کہ وہ میر محمد علی حشمت کے شاگرد تھے، میر صاحب نکات الشعرا میں فرماتے ہیں "نسبت بہ شعرا استاد اور رتبہ شاگردی او نبود" اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حشمت ہی کے شاگرد تھے، ممکن ہے کہ شاہ حاتم سے بھی اصلاح لی ہو، سودا کی شاگردی صحیح معلوم نہیں ہوتی، تاباں مرحوم کو عنفوان شباب میں مے گساری کی عادت پڑ گئی تھی اور وہ اتنی بڑھی کہ ان کے لیے بلائے جان ہوگئی، ہر وقت مدہوش رہنے کی وجہ سے دوستوں نے ان سے ملنا جلنا چھوڑ دیا تھا، میر صاحب (باقی اگلے صفحہ پر)

اور آزاد کی معذرت کو دیکھیے، فرماتے ہیں کہ "تہذیب آنکھ دکھاتی ہے، مگر کیا کیجیے، ایشیا کی شاعری کہتی ہے کہ یہ میری صفائی زبان اور طراری کا نمک ہے" (ص ۱۴۰) مرزا رفیع سودا کی ہجو پر حاشیہ چڑھاتے ہیں کہ "ایک دھوبن گھر میں ڈال لی تھی۔" (ص ۱۴۲)

کسی واقعہ کی صورت بنانے کا نمونہ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ "ایک نواب صاحب ان کے خاندان کے مرید تھے، ملاقات کو آئے اور خود صراحی لے کر پانی پیا، اتفاقاً جو آب خورہ

سابقہ حاشیہ: فرماتے ہیں کہ مرنے سے سات آٹھ روز پہلے یک بارگی اس کو چھوڑ دیا اور اپنے دوستوں کو اس مضمون کے رقعے لکھ بھیجے "عزیزان من توبہ کردم شما شاہد وخبر گیران من باشید، چرا کہ شراب بہ سبب کثرت استعمال مزاج من شدہ بود، از گزاشتن ایں از خود گزشتن من پر نزدیک می نماید، غافل از احوال من بودن از عقل بسیار دور است" آخر کار وہی ہوا کہ وہ جانبر نہ ہو سکے۔

میر تقی میر اور میر حسن نے ان کے اور مرزا مظہر علیہ الرحمہ کے تعلقات کا کچھ ذکر نہیں کیا، تاہم کچھ شبہ نہیں کہ تاباں کو مرزا صاحب سے عقیدت اور مرزا صاحب کو ان سے محبت تھی، بعضوں نے لکھا ہے کہ مرزا صاحب کے مرید ہو گئے تھے مگر جو شخص پیر و مرید کے تعلقات خصوصاً مرزا صاحب کے انداز اور اطوار و طریقہ سے واقف ہوگا، وہ کبھی ان خرافات باتوں کو تسلیم نہیں کر سکتا جن کو آزاد نے آب حیات میں بیان کیا ہے۔

تاباں مرحوم کے چند اشعار:

کس کس طرح کی دل میں گزرتی ہیں حسرتیں ۔۔۔ ہے وصل سے زیادہ مزہ انتظار کا

ہنستا ہے گل چمن میں تو نالاں ہے عندلیب ۔۔۔ دو دل خوشی نہ دیکھے کبھی ہیں جہاں کے بیچ

انجان ہو تو اس سے کوئی درد دل کہے ۔۔۔ جو جانتا ہو، میں اسے آگاہ کیا کروں

اے باغباں اب تو جاتے ہیں ہم قفس میں ۔۔۔ چھوٹے تو پھر ملیں گے گر بال و پر رہیں گے
جاتی ہے عمر ہر دم ہم کو خبر نہیں ہے ۔۔۔ کیا جانیے کہ کب تک ہم بے خبر رہیں گے

رکھا ٹیڑھا رکھا، مرزا صاحب کا مزاج اس قدر برہم ہوا کہ ہرگز ضبط نہ ہوسکا اور بگڑ کر کہا کہ عجب بیوقوف احمق تھا جس نے تمہیں نواب بنا دیا، آب خورہ بھی صراحی پر رکھنا نہیں آتا، میں پوچھتا ہوں کہ اس میں لطیفہ کیا ہوا، جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس میں بجائے مدح کے ذم کا پہلو نکلتا ہے، مرزا صاحب کی نازک مزاجی نہیں آتش مزاجی، ضبط و تحمل کی کمی اور بدتہذیبی کی بین مثال ہوسکتا ہے، نواب کے قصور پر بادشاہ کو بیوقوف اور احمق مرزا صاحب کی زبان سے کہلانا کتنی دور از قیاس بات ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک نواب زادے ملنے کو آئے جن کا تمام خاندان مرزا صاحب سے عقیدت رکھتا تھا اور خود یہ صاحب زادے مرزا صاحب کے شاگرد تھے، ان کو پیاس معلوم ہوئی، ادھر ادھر دیکھنے لگے، کوئی آدمی نظر نہیں آیا، مرزا صاحب سمجھ گئے، فرمایا کہ پیاس ہو تو خود اٹھ کر پی لو، گھڑا اور آب خورہ قرینہ سے ایک طرف کو رکھا ہوا تھا، انہوں نے اٹھ کر پانی پیا اور آب خورہ جو رکھا ٹیڑھا رکھا، گھڑے کو بھی سیدھا نہیں کیا اور آ کر بیٹھ گئے اور جوشِ عقیدت میں آ کر عرض کیا کہ بغیر کسی پیش خدمت کے آپ کو تکلیف ہوتی ہوگی، اگر ارشاد ہو تو دو ایک خدمت گار میں متعین کر دوں، مرزا صاحب نے ہنس کر گھڑے کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ تم کو آب خورہ رکھنے کا سلیقہ نہیں تو تمہارے خدمت گار کو کیا ہوگا۔

اصل یہ ہے کہ مولانا آزاد نے مرزا صاحب کو آب حیات میں ناخواستہ طبیعت جگہ دی ہے، جیسا کہ ان کے انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے، وہ جوش و خروش اور کثرت کلام ڈھونڈھتے ہیں جو یہاں نہیں ملتا (۱) اس کا حال مصحفی سے سنو، وہ کہتے ہیں ''ہنوز از میر و مرزا

---

(۱) یہاں تو نہیں مگر میر ضاحک اور میر خلیق کے یہاں کیا مل گیا، میر ضاحک کا ایک شعر اور میر خلیق کے دو شعر ہاتھ آئے مگر ان کے حالات لکھنے کی بے چینی ملاحظہ ہو، میر ضاحک کے حالات میں فرماتے ہیں ''ابتدا سے دل چاہتا تھا کہ اس خانوادۂ سیادت کا سلسلہ مسلسل لکھوں مگر پھول نہ ہاتھ آئے جو لڑی پروتا...... اب کہ طبع ثانی کا موقع ہے، آرزوئے قدیم پھر دل میں لہرائی، ناچار برسوں کے سوکھے مرجھائے پھول (باقی اگلے صفحہ پر)

کسے در عرصۂ وجود نیامدہ بود و در دور ایہام گویاں بود، اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ اوست" آگے بڑھ کر کہتے ہیں "نقاش اول زبان ریختہ بہ اعتقاد فقیر مرزا است۔"

مرزا صاحب کا دیوان ریختہ کوئی موجود نہیں، یقینؔ کا دیوان اٹھا کر دیکھو اور انصاف کرو، مصحفیؔ کہتے ہیں "در تمام دیوانش فصاحت و بلاغت زبان استاد جلوۂ ظہور می دہد۔"

مرزا صاحب کا ایک دیوان فارسی ہے، ساٹھ برس کی عمر ۱۱۷۰ھ میں ۲۰/ہزار شعر میں سے ایک ہزار شعر انتخاب کیے تھے، اسی واسطے اکثر غزلیں ناتمام ہیں، فارسی کلام کے متعلق میر تقی میر کی رائے ہے کہ وہ سلیمؔ و کلیمؔ کے کلام سے کم پایہ نہیں، میرؔ صاحب کے الفاظ یہ ہیں "دیوان مختصر فارسی او بہ نظر فقیر مؤلف آمدہ است، از سلیم و کلیم پائے کمی نہ دارد، اگرچہ شعر گفتن دوں مرتبۂ اوست لیکن گاہے متوجہ ایں فن بے حاصل می شود۔"

خریطۂ جواہر ایک مختصر انتخاب اساتذۂ فارسی کے اشعار کا ہے کہ اپنے پسند کے موافق لکھتے گئے تھے، وہ حقیقت میں خریطۂ جواہر ہے اور فارسی دیوان کے ساتھ یہ بھی چھپ گیا ہے۔

اردو میں پورا دیوان نہیں، غزلیں اور اشعار ہیں جو سوداؔ اور میرؔ کی زبان ہے، وہی ان کی ہے، شاگردوں میں انعام اللہ خاں یقینؔ، میر محمد باقر حزیںؔ، خواجہ احسن اللہ خاں بیاںؔ، مصطفیٰ خاں یکرنگ، بساون لعل بیدارؔ، ہیبت قلی خاں حسرتؔ، محمد فقیہ دردمندؔ صاحب دیوان اور اچھے شاعر ہوئے ہیں۔

ساتویں محرم کی رات تھی کہ رات کے وقت ایک شخص آیا، دروازہ بند تھا، اس نے آواز دی، باہر نکلے تو ایک قرابین ماری، وہ تو بھاگ گیا مگر حضرت کو زخم کاری لگا، تین دن تک استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ زندہ رہے، عالم اضطراب میں لوٹتے تھے اور اپنے ہی

سابقہ حاشیہ: دل افسردہ کے طاق میں پڑے تھے، انھی کا سہرا بنا کر سادات عظام کے روضوں پر چڑھاتا ہوں۔ (اھ، آب حیات، ص ۱۶۷)

اشعار پڑھتے تھے۔

بنا کردند خوش رسمے بخون وخاک غلطیدن　　خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

سیلِ خوں از سینۂ گرمم رواں کردست عشق　　نازم اعجازش کہ طوفاں از تنور آوردہ است

زخم دل مظہر مبادا بہ شود آگاہ باش　　کایں جراحت یادگارِ ناوکِ مژگانِ اوست

بادشاہ نے کہلا بھیجا کہ قاتل نہیں ملتا، پتہ بتایئے تو ہم اس کو سزا دیں، جواب میں فرمایا کہ ''فقرا کشتۂ راہ خدا ہیں، مردہ کا مارنا قتل نہیں، قاتل ملے تو آپ سزا نہ دیں یہاں بھیج دیں'' آخر دسویں محرم ۱۱۹۵ھ کی شام کو اہل بیت کرام سے جا ملے، میر قمر الدین منّت کی تاریخ ہے جس کا مادہ خاص الفاظِ حدیث ہیں اور اتفاق یہ کہ موزوں ہیں، ''عاش حمیداً مات شہیداً'' لوحِ مزار پر خود حضرت کا یہ شعر کندہ ہے جو بالکل حسب حال ہے اور صحیح پیشین گوئی ہے۔

بلوح تربت من یافتند از غیب تحریرے　　کہ ایں مقتول را جز بے گناہی نیست تقصیرے

چونکہ اردو کلام حضرت کا نایاب ہے، لہٰذا جس قدر مجھ کو مل سکا ہے، بغیر انتخاب کے ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کرتا ہوں:

چلے اب گل کے ہاتھوں سے لٹا کر کارواں اپنا　　نہ چھوڑا ہائے بلبل نے چمن میں کچھ نشاں اپنا
یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سے زندگی کرتے　　اگر ہوتا چمن اپنا، گل اپنا، باغباں اپنا
الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہو گئیں رسوا　　ڈبویا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خانداں اپنا
رقیباں کی نہ کچھ تقصیر ثابت ہے نہ خوباں کی　　مجھے ناحق ستاتا ہے یہ عشقِ بدگماں اپنا
مرا جی جلتا ہے اس بلبل بے کس کی غربت پر　　کہ جس نے آسرے پر گل کے چھوڑا آشیاں اپنا
جو تو نے کی سو دشمن بھی نہیں دشمن سے کرتا ہے　　غلط تھا جانتے تھے تجھ کو جو ہم مہرباں اپنا
کوئی آزردہ کرتا ہے سجن اپنے کو اے ظالم　　کہ دولت خواہ اپنا، مظہر اپنا، جانِ جاں اپنا

گرچہ الطاف کے قابل یہ دل زار نہ تھا　　لیکن اس جور جفا کا بھی سزاوار نہ تھا

لوگ کہتے ہیں موا مظہر بیکس افسوس　　کیا ہوا اس کو کہ اتنا بھی وہ بیمار نہ تھا

نہیں کچھ غم کہ کیوں جلتا نہیں پیاں گسل میرا
کہ میں روتا ہوں دل کی بیکسی پر ہائے دل میرا

جواں مارا گیا خوباں کے اوپر میرزا مظہر　　بھلا تھا یا برا تھا زور کچھ تھا خوب کام آیا

زخمی تری نگہ کا اک پل جیا تو پھر کیا　　صیاد کی بغل میں ٹک دم لیا تو پھر کیا

ہم نے کی ہے توبہ اور دھومیں مچاتی ہیں بہار　　ہائے بس چلتا نہیں کیا مفت جاتی ہے بہار
لالہ و گل نے ہماری خاک پر ڈالا ہے شور　　کیا قیامت ہے، موؤں کو بھی ستاتی ہے بہار
نرگس و گل کی کھلی جاتی ہیں کلیاں دیکھو سب　　پھر ان خوابیدہ فتنوں کو جگاتی ہے بہار
ہم گرفتاروں کو اب کیا کام ہے گلشن میں لیک　　جی نکل جاتا ہے جب سننے میں آتی ہے بہار
شاخ گل ہلتی ہے پر بلبلوں کو باغ میں　　ہاتھ اپنے کے اشارے سے بلاتی ہے بہار

اتنی فرصت دے کہ ہولیں رخصت اے صیاد ہم
مدتوں اس باغ کے سایہ میں تھے آزاد ہم

گر گل کو گل کہوں تو ترے رو کو کیا کہوں　　بولوں نگہ کو تیغ تو ابرو کو کیا کہوں

توفیق دے کہ شور سے اک دم وہ چپ رہے　　آخر یہ میرا دل ہے الٰہی جرس نہیں

مت اختلاط کر اے نو بہار تو ہم سے　　چمن میں ہونے کا اس خاک کو دماغ نہیں

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہر　　فی الحقیقت میں گھر گیا مظہر

یہ بلبلوں کا صبا مشہد مقدس ہے　　قدم سنبھال کے رکھیو ترا یہ باغ نہیں

آج مت رنگِ حنا سے کفِ پا لال کرو　　اے بتاں اس دل پُر خون کو پامال کرو

کسی کے خون کا پیاسا کسی کی جان کا دشمن　　نہایت منھ لگایا ہے سجن نے بیڑۂ پان کو

آتش کہو شرارہ کہو کوئلا کہو　　مت اس ستارہ سوختہ کو دل کہا کرو

اس گل کو بھیجنا ہے مجھے خط صبا کے ہاتھ　　اس واسطے لگا ہوں چمن کی ہوا کے ساتھ
برگِ حنا اوپر لکھو احوال دل مرا　　شاید کہ جا لگے وہ کسی میرزا کے ہاتھ
آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سے　　مینا لگا ہے جب سے مجھ بے نوا کے ہاتھ
مرتا ہوں میرزایۓ گل دیکھ ہر سحر　　سورج کے ہاتھ چنوری تو پنکھا صبا کے ہاتھ
مظہر چھپا کے رکھ دلِ نازک کو اپنے تو　　یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہاتھ

الٰہی مت کسو کے پیش رنج انتظار آوے　　ہمارا دیکھیے کیا حال ہو جب تک بہار آوے

تجلی گر تری پست و بلند ان کو نہ دکھلاتی
فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی
حنا تیرے کفِ پا کو نہ اس شوخی سے سہلاتی
یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں انہوں کی نیند کیوں جاتی
اگر یہ سرد مہری تجھ کو آسائش نہ سکھلاتی
تو کیوں کر آفتابِ حسن کی گرمی میں نیند آتی
الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشم تر سے منھ نہ برساتی

یہ دل کب عشق کے قابل رہا ہے　　کہاں اس کو دماغ و دل رہا ہے
نہ تو ملنے کے اب قابل رہا ہے　　نہ مجھ کو وہ دماغ و دل رہا ہے

نہیں آتا کسی تکیہ اوپر خواب　　یہ سر پانوں سے تیرے ہل رہا ہے
خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو　　یہی ایک شہر میں قاتل رہا ہے

خدا کے اب تجھے سونپا ارے دل　　یہیں تک تھی ہماری زندگانی

☆☆☆

مرزا محمد رفیع سوؔدا

''جوانے است، خوش خلق و خوش خوئے، گرم جوش، یار باش، شگفتہ روائے، مولد او شاہجہاں آباد است، نوکر پیشہ، غزل و قصیدہ و مثنوی و قطعہ و مخمس و رباعی ہمہ را خوب می گوید، سرآمد شعرائے ہندی اوست، بسیار خوش گو است...... چنانچہ ملک الشعرائے ریختہ او را شاید۔''

(اھ، نکات الشعرا، میر تقی میرؔ)

''در فنون انواع سخن طاق و بہ جمیع کمالات سخنوری شہرۂ آفاق، در مضمار قصیدہ گوئی گوئے سبقت از عرفیؔ و خاقانیؔ ربودہ و در غزل گوئی سلیم و کلیم را پس پشت می گزارد و بسیار خوش گو و پر گو است، چند مدت بہ سبب ویرانگی دہلی در بلدۂ فرخ آباد ہمراہ مہربان خان ماندہ ارل بہ طرف لکھنؤ رفتہ نوکر شجاع الدولہ بہادر شدہ است۔'' (اھ، طبقات الشعراء)

''الحال در سرکار نواب شجاع الدولہ بہادر بہ وسیلۂ فن شاعری سرفراز است در علم موسیقی نیز ماہر است و تصانیف بسیار در نفیسہ ہم دارد تا حال مثل او در ہندوستان جنت نشاں کسے بر نہ خاستہ، اکثر فقیر در خدمت آں بزرگوار می رسد، بسیار کرم می فرمایند۔'' (اھ، تذکرۂ میر حسن)

''زعم بعضے آنکہ سرآمد شعرائے فصاحت مرزا محمد رفیع سوؔدا در غزل گوئی

بوے (میر تقی) نہ رسیدہ اما حق آن است کہ ع ہر گلے را رنگ و بوے دیگر است' مرزا دریاے است بیکراں و میر نہرے است عظیم الشان، در معلومات قواعد میر را بر مرزا بر تریست زور قوت شاعری مرزا بر میر سروری۔"

(اھ، تذکرہ حکیم قدرت اللہ خاں)

"بہ زعم فقیر غزلش بہ از قصیدہ است و قصیدہ اش بہ از غزل، اگر گوئی کہ غزل از اشعار پر کن مملواست و قصیدہ ازاں خالی زیادہ ازیں چہ تواں گفت کہ قباحت ایں تحقیق بر نظار گیاں دیوانش حالی۔" (اھ گلشن بیخار)

مرزا محمد رفیع سودا کے والد مرزا محمد شفیع میرزایان کابل سے تھے، بزرگوں کا پیشہ سپہ گری تھا، مرزا محمد شفیع بہ طریق تجارت ہندوستان آئے، ہند کی خاک دامن گیر ہوئی، یہیں کے ہو رہے، مرزا رفیع ۱۱۲۵ھ میں پیدا ہوئے، دلی میں تربیت و پرورش پائی، اول سلیمان قلی خاں وداد کے پھر شاہ حاتم کے شاگرد ہوئے، طبیعت شعر و سخن کے مناسب تھی، کثرت مشق نے اس میں جلا دے دی، استاد کی زندگی ہی میں ان کی استادی کو خاص و عام نے مان لیا اور ان کی غزلیں گھر گھر ہر ایک کی زبان پر چڑھ گئیں، شاہ عالم بادشاہ اپنا کلام اصلاح کے لیے ان کو دینے لگے اور دلی جیسے شہر میں ان کے فضل و کمال کو سب لوگوں نے مان لیا۔

یہ بھی جب تک ہو سکا دلی سے باہر نہیں نکلے، شاہ عالم کا جب کھیل بگڑا اور بسر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو بادل ناخواستہ نکلے، فرخ آباد میں نواب احمد خاں غالب جنگ برسر حکومت تھے، مہربان خاں رند ان کا دیوان تھا، وہ خود شاعر اور شاعروں کا قدردان تھا، اس زمانہ میں دلی سے جو نکلتا تھا اس کی پہلی منزل فرخ آباد ہوتی تھی، یہ بھی براہ راست فرخ آباد آئے اور مہربان خاں کی مہربانی سے چند سال تک اطمینان و فراغت سے زندگی بسر کی۔

۱۱۸۵ھ میں نواب احمد خاں کا انتقال ہو گیا، یہ برداشتہ خاطر ہو کر فیض آباد چلے آئے، اس وقت ان کا سن ساٹھ برس ہو چکا تھا، نواب شجاع الدولہ برسر حکومت تھے، وہ

بہت اعزاز سے ملے اوران کی تنخواہ مقرر کردی۔

شجاع الدولہ کے بعد نواب آصف الدولہ مسند نشین ہوئے، ان کا فیض آباد میں جی نہیں لگا، اپنی ماں بہو بیگم (۱) کی روک ٹوک سے گھبرا کر لکھنؤ چلے آئے اوراس کو مرکز حکومت قرار دیا تو مرزا رفیع بھی لکھنؤ آرہے اور جب تک جیتے رہے نواب اوراہل لکھنؤ کی قدردانی سے فارغ البال رہے۔

آزاد کہتے ہیں کہ ۱۱۸۵ھ میں لکھنؤ پہنچے، نواب شجاع الدولہ نے بے تکلفی سے

---

(۱) بہو بیگم کا اصلی نام امۃ الزہرا بیگم تھا، یہ موتمن الدولہ نواب محمد اسحاق خاں شوستری کی بیٹی تھیں، محمد شاہ بادشاہ نے ان کو اپنی بیٹی بنایا تھا اور شجاع الدولہ کے ساتھ شادی کی تھی، جہیز میں وہ کچھ دیا جو ایک شہزادی کو مل سکتا تھا، سسرال سے بہو بیگم اور خاص محل کا خطاب ملا، یہ بڑی فرزانہ اور دانش مند بیگم تھیں، فیاضی اور سیر چشمی میں ان کا کوئی نظیر نہیں تھا، جب دلی کی سلطنت بگڑی تو بھائیوں کو بھی سمیٹ لیا اور باپ بھائی کے ملنے والوں پر کیا موقوف ہے، دلی کا ادنیٰ اوراعلیٰ جو آجاتا اس کے ساتھ برادرانہ سلوک کرتی تھیں، ان کے حسن سلوک کی وجہ سے فیض آباد دلی کا ایک محلہ بن گیا تھا، نواب آصف الدولہ ان کے اکلوتے بیٹے تھے مگر ان میں نہ باپ کا سانچلا پن تھا نہ ماں کی سی فرزانگی، صرف ایک فیاضی ماں سے ترکہ میں ملی تھی، ماں ان کی خفیف حرکتوں سے ناخوش ہوتیں اور روک ٹوک کرتی تھیں اوران کو دل کھول کر اپنے ارمانوں کے نکالنے کا موقع نہ ملتا تھا، اس وجہ سے شکار کے بہانے فیض آباد سے لکھنؤ آگئے اور پھر یہیں محل سرا میں باغات اور بازار تیار کرا کے رہ پڑے، بہو بیگم کی جاگیر بہت بڑی تھی جو بجائے خود ایک چھوٹی سی ریاست تھی، علاوہ اس کے جواہرات کا ذخیرہ بھی ان کے پاس بہت کچھ تھا، ساری عمر دل کھول کر خرچ کیا، آصف الدولہ کے بعد سعادت علی خاں ہمیشہ ان کے مرنے اوراس دولت پر قابض ہونے کے متمنی رہے مگر بہو بیگم ان کو مار کر مریں اور مرتے مرتے ایک کرور کے روپئے اور کچھ اوپر چھپن لاکھ کا وثیقہ سرکار کمپنی کی تحویل میں دے کر دستاویز کردی کہ ان کے اعزہ اور متوسلین کی جو تنخواہیں انہوں نے کر رکھی ہیں ہمیشہ جاری رہیں چنانچہ ان لوگوں کی اولاد اس سے فائدہ اٹھا رہی ہے۔

یا طنز سے کہا مرزا تمہاری وہ رباعی اب تک میرے دل پر نقش ہے، یہ پاسِ وضع داری پھر دربار نہ گئے، یہ سب افسانہ ہے، شجاع الدولہ فیض آباد میں رہتے تھے، لکھنؤ کی اس وقت ایک قصبہ سے زیادہ حیثیت نہ تھی، یہ بھی غلط ہے کہ دلی سے براہ راست یہاں آئے، یہ بھی غلط ہے کہ سوداؔ ایک بار کے سوا پھر دربار نہیں گئے، شجاع الدولہ جب تک جیتے رہے یہ ان کی ملازمت میں رہے، ان کے کلیات میں متعدد قصیدے شجاع الدولہ کی تعریف میں موجود ہیں مصحفیؔ اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں "ہر جا کہ می رفت عزت وحرمت تمام می یافت نواب مرحوم مغفور نیز بودن اورا در سرکار خود بسیار غنیمت می دانستند۔"

آزاد نے دلی کے قدردانوں میں بسنت خاں کے ساتھ مہربان خاں کا نام بھی لیا ہے، وہاں بھی کوئی مہربان خاں ہوں تو مجھے اس سے کچھ بحث نہیں مگر کلیات میں جہاں جہاں مہربان خاں کا نام آیا ہے اس سے مراد مہربان خاں رند ہیں جو فرخ آباد میں دیوان (۱) تھے۔

---

(۱) نواب مہربان خاں رندؔ دیوان فرخ آباد بڑے مہمان نواز، آشنا پرور اور خوش اخلاق امیر تھے، باوجودیکہ علم نہیں رکھتے تھے مگر اہل کمال کی صحبت میں معلومات بہت وسیع ہوگئی تھیں، میر سوزؔ مدت تک ان کے پاس رہے، ان سے شاعری اور شمشیر شناسی وغیرہ کی مشق کی تھی، موسیقی میں بہت ماہر تھے، کبت بہت اچھے کہتے تھے، قیافہ شناسی اور قدردانی میں کمال رکھتے تھے، جب مرزا رفیع سوداؔ نے دلی چھوڑی ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور مدت تک فرخ آباد میں رکھا اور ان سے مشق سخن کرتے رہے، مصحفیؔ کہتے ہیں کہ "اگر چہ شخص جاہل بود اما سلیقہ صحبت شعرا اورا ہم بعرصۂ قلیل مرتبہ والائے شاعری رسانیدہ"، میر حسن فرماتے ہیں "از شاگردان میر سوزؔ و مرزا رفیع مشہور است، در تصانیف نفیسہ بہم دستے پیدا کردہ، چنانچہ اکثر اہل غنادل عشاق را بہ نغمۂ دلآویزی ادمی برند و بسیارے کلامش را چوں کلام میرزا سوداؔ و میر سوزؔ سر لوح دیوان می انگارند۔" کلام ملاحظہ ہو:

خلقت تمام گردشِ افلاک سے بنی | ماٹی ہزار رنگ کی اس چاک سے بنی

مجھ ساتھ تیری دوستی جب ہوگئی آخر | دنیا کی مرے دل سے طلب ہوگئی آخر
حاصل تو ہوا وصل ہمیں رات پر افسوس | اک پل میں شب عیش وطرب ہوگئی آخر

کلیات ان کا ہر جگہ مل سکتا ہے، اول اردو کے قصائد ہیں، پھر چوبیس چھوٹی مثنویاں ہیں، ایک مختصر دیوان فارسی کا ایک تمام وکمال دیوان ریختہ کا جس میں بہت سی غزلیں، مطلع، رباعیاں، قطعات، مستزاد، تاریخیں، پہیلیاں، ترجیع بند، مخمس اور ہر قسم کی نظم میں ہجویں ہیں۔

عبرۃ الغافلین نام ایک رسالہ ہے، بڑی کاوش اور تحقیق سے لکھا ہے، مرزا فاخر مکین کے اعتراضوں کا جواب جو انہوں نے فارسی کے شعرائے سلف پر کیے تھے اور ان کے کلام میں دخل بیجا کیا تھا اور خود مرزا فاخر کے کلام پر اعتراض کر کے اسے ناقص ٹھہرایا ہے۔

آزاد نے سچ کہا ہے کہ مرزا اس فن میں استاد مسلم الثبوت تھے، وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو شعر اور فن انشا ہی کے واسطے پیدا ہوئی تھی ...... ان کا کلام کہتا ہے کہ دل کا کنول ہر وقت کھلا رہتا تھا، اس پر سب رنگوں میں ہم رنگ اور ہر رنگ میں اتنی ترنگ، جب دیکھو طبیعت شورش سے بھری اور جوش وخروش سے لبریز، نظم کی ہر فرع میں طبع آزمائی کی ہے اور کہیں کہیں رکے نہیں، چند صفتیں خاص ہیں، جن سے کلام ان کا جملہ شعرا سے ممتاز معلوم ہوتا ہے، اول کہ زبان پر حاکمانہ قدرت رکھتے ہیں، کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ایسا دست وگریباں ہے جیسے آگ کے شعلہ میں گرمی اور روشنی، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستی سے لفظوں کو اس در وبست کے ساتھ پہلو بہ پہلو جڑتے ہیں، گویا ولایتی طپنچہ کی چانپیں جڑی ہوئی ہیں اور یہ خاص ان کا حصہ ہے، چنانچہ جب ان کے شعر میں سے کچھ بھول جائیں تو جب تک وہی لفظ وہاں نہ رکھے جائیں شعر مزا ہی نہیں دیتا، خیالات نازک اور مضامین تازہ باندھتے ہیں مگر اس باریک نقاشی پر ان کی فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے، تشبیہ و استعارے ان کے ہاں ہیں مگر اسی قدر کہ جتنا کھانے میں نمک یا گلاب کے پھول پر رنگ، رنگینی کے پردہ میں مطلب اصلی کو گم نہیں ہونے دیتے۔

مرزا نے تقریباً ستر برس کی عمر پائی، ۱۱۹۵ھ میں دنیا سے انتقال کیا اور آقا باقر

کے امام باڑے میں دفن ہوئے، مصحفی نے تاریخ کہی ع

سودا کجا وآں سخنِ دلفریبِ او

مرزا کے بہتر خنجر(۱) تلاش کرنے سے پیشتر ان کے قصیدوں اور ہجووں کا رنگ بھی دیکھ لینا چاہیے جس کے وہ مرد میدان ہیں اور اس میں کوئی ان کا حریف نہیں۔

شہر آشوب

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے — دعویٰ نہ کرے یہ کہ مرے منھ میں زباں ہے
میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو — اللہ رے اللہ رے کیا نظم بیاں ہے
اتنا میں کیا عرض کہ فرمایئے حضرت — آرام سے کٹنے کی طرح کوئی بھی یہاں ہے
سن کر یہ کہنے لگے کہ خاموش ہی رہ جا — اس امر میں قاصر تو فرشتوں کی زباں ہے
کیا کیا میں بتاؤں کہ زمانہ کی گئی شکل — ہے وجہ معاش اپنی سو جس کا یہ بیاں ہے

گھوڑا لے اگر نوکری کرتے ہیں کسو کی — تنخواہ کا پھر عالم بالا پہ نشاں ہے
گزرے ہے سدا یوں علف و دانہ کے خاطر — شمشیر جو گھر میں تو سپر بنیے کے یہاں ہے
ثابت ہو جو دگلا تو نہیں موزوں میں کچھ حال — تیروں میں ہے پر گیری تو بے چلہ کماں ہے
کہتا ہے نفر غرہ کو صراف سے جا کر — بی بی نے تو کچھ کھایا ہے فاقہ سے میاں ہے
یہ سن کے دیا کچھ تو ہوئی عید وگرنہ — شوال بی پھر ماہ مبارک رمضاں ہے

گر ہو جیے جا کر کسی عمدہ کے مصاحب — اس کی تو اذیت ہے بڑی آفت جاں ہے

---

(۱) اہل مذاق جس طرح میر تقی میر کے کلام میں بہتر نشتر بتاتے ہیں، سودا کے زبردست کلام میں سے بہتر نشتر تیار کرتے ہیں، اس کی نسبت آزاد کی رائے ٹھیک ہے کہ جو کلام آج کے طرز کے موافق ہے، وہ ایسے مرتبۂ عالی پر ہے جہاں ہماری تعریف کی پرواز نہیں پہنچ سکتی اور دل کی پوچھو تو جن اشعار کو پرانے محاوروں کے جرم میں ردی کرتے ہیں، آج کے ہزار محاورے ان پر قربان ہیں۔

وہ جاگے جو راتوں کو تو بیٹھے ہیں دوزانو — کیسا ہی اگر اپنے تئیں خواب گراں ہے
بے وقت خورش اس کی جو ہو اپنے تئیں بھوکھ — سو کیا کہوں تجھ سے کہ مصیبت کا بیاں ہے
گھڑیال کی چپ بیٹھے ہوئے گنتے ہیں گھڑیاں — اور رتبہ خلا رودوں میں جوں اسپ دواں ہے

صیغہ پہ طبابت کے بھلا آدمی نوکر — سو دو سو روپئے کا جو کسی عمدہ کے یہاں ہے
صحبت ہے یہ اس سے اگر آقا کے تئیں چھینک — آوے تو وہ اس کو بخشونت نگراں ہے
اور ما حضر اوپر جو وہ نواب کو دیکھے — کھانا تو یہ کھاتے ہیں پر اس کو خفقاں ہے
مطبوخ میں ہے خربزہ اور خربزہ پر دودھ — ہے دودھ اوپر مچھلی تس اوپر گاؤ زباں ہے
یہ بھی تو نہیں ہے کہ اسی پر ہو تسلی — اس سب پہ تفنن کے لیے بیسنی ناں ہے
اس میں جو کہیں درد اٹھا پیٹ میں اس کے — پھر بوعلی سینا ہے تو وہ ہیچمداں ہے
رکھتے ہیں غرض مرض سے لڑنے کو سپاہی — گر نوکری سمجھو یہ طبابت کی کہاں ہے

سوداگری کیجیے تو ہے اس میں یہ مشقت — دکھن میں بکے وہ جو خرید صفہاں ہے
ہر صبح یہ خطرہ ہے کہ طے کیجیے منزل — ہر شام بدل وسوسۂ سود و زیاں ہے
لیجا جو کسی عمدہ کی سرکار میں دے جنس — یہ درد جو سنیے تو عجب طرفہ بیاں ہے
قیمت جو چکاتے ہیں سو اس طرح کہ ثالث — سمجھے ہے فروشندہ پہ دزدی کا گماں ہے
جب مول مشخص ہوا مرضی کے موافق — پھر پیسوں کا جاگیر کے عامل پہ نشاں ہے
پروانہ لکھا کر گئے عامل کنے جس وقت — کہتا ہے وہ پیسا ابھی مجھ پاس کہاں ہے
اودھر سے پھر آئے تو کہا جنس ہی لے جا — دیوانِ بیوتات، یہ کہنے میں گراں ہے
آخر کو جو دیکھو تو نہ پیسے ہیں نہ وہ جنس — ہر اک متصدی سے میاں اور تیاں ہے

شاعر جو سنے جاتے ہیں مستغنی الاحوال — دیکھے جو کوئی فکر و تردد کو تو یہاں ہے

گر عید کا مسجد میں پڑھے جا کے دوگانہ — نیت قطعۂ تہنیت خان زماں ہے
تاریخ تولد کی رہے آٹھ پہر فکر — گر رحم میں بیگم کے سنے نطفۂ خاں ہے
اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا — پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

ملائی اگر کیجیے تو ملا کی ہے یہ قدر — ہوں دو روپے اس کے جو کوئی مثنوی خواں ہے
دن کو تو بچارا وہ پڑھایا کرے لڑکے — شب خرچ لکھے گھر کا اگر ہندسہ داں ہے
تس پر یہ ستم ہے کہ نہالی تلے اس کے — لڑکوں کی شرارت سے سدا خار نہاں ہے

چاہے جو کوئی شیخ بنے بہر فراغت — چھٹتے ہی تو شعرا کے وہ مطعونِ زباں ہے
دیتا ہے دم خر سے کوئی شملہ کو نسبت — گنبد سے کوئی پگڑی کو تشبیہ کناں ہے
اور اس کو جو دیکھے کوئی وہ بہر معیشت — اس فکر و تردد ہی میں ہر ایک زماں ہے
پوچھے ہے مریدوں سے یہ ہر صبح کو اٹھ کر — ہے آج کدھر عرس کی شب روز کہاں ہے
تحقیق ہوا عرس تو کر داڑھی کو کنگھی — بے خیل مریداں گئے وہ بزم جہاں ہے
ڈھولک جو لگی بجنے تو وہاں سب کو ہوا وجد — کودے ہے کوئی روئے کوئی نعرہ زناں ہے
اور ماحصل اس رنج و مشقت کا جو پوچھو — ڈالا ہوا وہاں دال نخود و قلیہ و ناں ہے

بالفرض اگر آپ ہوئے ہفت ہزاری — یہ شکل بھی مت سمجھیو تو راحت جاں ہے
ٹک دیکھنا منصور علی خاں جی کا احوال — چھاتی پہ کڑک بجلی ہے اور شیر وہاں ہے

آرام سے کٹنے کا سنا تو نے کچھ احوال — جمعیت دل کی کوئی صورت ہو کہاں ہے
دنیا میں تو آسودگی رکھتی ہے فقط نام — عقبیٰ میں یہ کہتا ہے کوئی اس کا نشاں ہے
سو اس پہ تیقن کسی کے دل کو نہیں ہے — یہ بات بھی گو بندہ ہی کا محض گماں ہے
یاں فکر معیشت ہے وہاں دغدغۂ حشر — آسودگی حرفیست یہاں ہے نہ وہاں ہے

تضحیک روزگار

ہجو اسپ بخیل

ہے چرخِ جب سے ابلق ایام پر سوار
رکھتا نہیں ہے دستِ عناں کا بیک قرار

جن کے طویلے بیچ کئی دن کی بات ہے
ہرگز عراقی و عربی کا نہ تھا شمار

اب دیکھتا ہوں میں کہ زمانہ کے ہاتھ سے
موچی سے کفش پا کو گٹھاتے ہیں وہ اودھار

تنہا ولے نہ دہر سے عالم خراب ہے
خسّت سے اکثروں نے اٹھایا ہے ننگ و عار

ہیں گے چنانچہ ایک ہمارے بھی مہرباں
پادے مزا جو ان کا کوئی نام لے نہار

نوکر ہیں سو روپے کے دیانت کی راہ سے
گھوڑا رکھے ہیں ایک پر اتنا ذلیل و خوار

نہ دانہ و نہ کاہ و نہ تیمار نے سئیس
رکھتا ہو جیسے اسپ گلی طفل شیر خوار

ناطاقتی کا اس کے کہاں تک کروں بیاں
فاقوں کا اس کے اب میں کہاں تک کروں شمار

مانند نقش نعل زمیں سے بجز فنا
ہرگز نہ اٹھ سکے وہ اگر بیٹھے ایک بار

اس مرتبہ کو بھوک کو پہنچا ہے اس کا حال
کرتا ہے راکب اس کا جو بازار میں گزار

قصاب پوچھتا ہے مجھے کب کرو گے یاد
امیدوار ہم بھی کہتے ہیں یوں چمار

دیکھے ہے جب وہ توبڑہ و تھان کی طرف
کھودے ہے اپنے سم سے کنویں ٹاپیں مار مار

فاقوں سے ہنہنانے کی طاقت نہیں رہی
گھوڑی کو دیکھتا ہے تو پادے ہے بار بار

ہے اس قدر ضعیف کہ اڑ جائے باد سے
میخیں گر اس کے تھان کی ہوویں نہ استوار

نہ استخواں نہ گوشت نہ کچھ اس کے پیٹ میں ۔۔۔ دھونکے ہے دم کو اپنے کہ جوں کھال کو لوہار
سمجھا نہ جائے یہ کہ وہ ابلق ہے یا سرنگ ۔۔۔ خارش سے زبسکہ ہے مجروح بے شمار
ہر زخم پر زبسکہ بھنکتی ہیں مکھیاں ۔۔۔ کہتے ہیں اس کے رنگ کو مگسی اس اعتبار
القصہ ایک دن مجھے کچھ کام تھا ضرور ۔۔۔ آیا یہ دل میں جایئے گھوڑے پہ ہو سوار
رہتے تھے گھر کے پاس قضا را وہ آشنا ۔۔۔ مشہور تھا جنہوں کنے وہ اسپ نابکار
خدمت میں ان کی میں نے کیا جا یہ التماس ۔۔۔ گھوڑا مجھے سواری کو دو اپنا مستعار
فرمایا تب انہوں نے کہ اے مہربانِ من ۔۔۔ ایسے ہزار گھوڑے کروں تم پہ میں نثار
لیکن کسی کے چڑھنے کے لائق نہیں یہ اسپ ۔۔۔ یہ واقعی ہے اس کو نہ جانو ہے انکسار

ہے پیر اس قدر کہ جو بتلاوے اس کا سن ۔۔۔ پہلے وہ لے کے ریگ بیاباں کرے شمار
لیکن مجھے زروئے تواریخ یاد ہے ۔۔۔ شیطاں اسی پہ نکلا تھا جنت سے ہو سوار

مٹھا تو اس قدر ہے کہ جو کچھ کہ تم سنا ۔۔۔ لیکن اب ایک دن کی حقیقت کہوں میں یار
دلی میں آن پہنچے تھا جس دن کہ مرہٹہ ۔۔۔ مجھ سے کہا نقیب نے آکر ہے وقت کار
مدت سے کوڑیوں کو اڑاتے ہو گھر میں بیٹھ ۔۔۔ ہو کر سوار اب کرو میدان میں کارزار
ناچار ہو کے تب تو بندھایا میں اس پہ زیں ۔۔۔ ہتھیار باندھ کر میں ہوا اس اوپر سوار
جس شکل سے سوار تھا اس دن میں اس اوپر ۔۔۔ دشمن کو بھی خدا نہ کرے یوں ذلیل و خوار
چابک تھے دونوں ہاتھ میں پکڑے تھا منہ میں باگ ۔۔۔ ٹخ ٹخ کی پاشنوں سے مرے پاؤں تھے فگار
آگے سے تو بڑھ اسے دکھلائے تھا نفر ۔۔۔ پیچھے نقیب ہانکے تھا لاٹھی سے مار مار
ہرگز وہ اس طرح بھی نہ لایا تھا رو براہ ۔۔۔ ہلتا نہ تھا جگہ ستی جوں میخ استوار
اس مضحکہ کو دیکھ ہوئے جمع خاص و عام ۔۔۔ اکثر مدبران میں کے کہتے تھے یوں پکار
پہیے اسے لگاؤ کہ تا ہووے یہ رواں ۔۔۔ یا بادبان باندھ پون کے دو اختیار

کہتا تھا کوئی ہے بز کو ہی نہیں یہ اسپ | کہتا تھا کوئی ہے گا ولایت کا یہ حمار
پوچھے تھا کوئی مجھ سے ہوا تجھ سے کیا گناہ | کتوال نے گدھے پہ کیا کیوں تجھے سوار
کہنے لگا یہ آکے اس اجماع میں ایک شخص | گھوڑا نہ یہ گدھا نہ یہ راکب گناہ گار
سمجھوں ہوں میں تو یہ کہ سپاہی کے بھیس میں | ڈائن چلی ہے سیر کو ہو چرخ پر سوار
اس مخمصے میں تھا ہی کہ ناگاہ ایک اور | فتنے کو آسماں نے کیا مجھ سے وہاں دوچار
دھوبی کمہار کے گدھے اس دن ہوئے تھے گم | اس ماجرے کو سن کیا دونوں نے وہاں گزار
ہر اک نے اس کو اپنے گدھے کا خیال کر | پکڑے تھا دھوبی کان تو کھینچے تھا دم کمھار

کتے بھی بھونکتے تھے کھڑے اس کے گرد و پیش
ساتھ اس سمند خرس نما کے ہو چشم چار
جھگڑوں میں دھوبیوں سے کہ لڑکوں کو دوں جواب
کتوں کو ماروں یا کہ مروں اپنا پیٹ مار

بارے دعا مری ہوئی اس وقت مستجاب | وہاں سے بہر نمط کیا جنگاہ تک گزار
یہ کہہ کے حق ستی میں ہوا مستعد بہ جنگ | اتنے میں مرہٹہ بھی ہوا مجھ سے آ دوچار
گھوڑا تھا بسکہ لاغر و پست و ضعیف و خشک | کرتا تھا یوں خفیف مجھے وقتِ کارزار
جاتا تھا جب ڈپٹ کے میں اس کو حریف پر | دوڑوں تھا اپنے پاؤں سے جو طفل بے سوار
جب میں نے دیکھا جنگ کی یاں تو بندھی یہ شکل | لے جوتیوں کو ہاتھ میں گھوڑا ابغل میں مار

مرزا ہجو کے بادشاہ تھے، قصیدہ، غزل، قطعہ، رباعی، مخمس، مسدس، ترجیع بند، مثنوی، غرض کہ کوئی صنف اصناف سخن سے نہیں چھوٹی جس میں انہوں نے اپنے دل کا بخار نکالا نہ ہو۔

یوں تو بہت کم لوگ ان کی شرر باری سے بچے ہوں گے مگر مکینؔ، ندرتؔ، فدویؔ،

مولوی ساجدؔ اور میر ضاحکؔ کی جیسی مٹی پلید کی ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے، یہ تمام ہجویں ان کے کلیات میں موقع موقع سے شامل ہیں، ان کو یکجا کرو تو خاصا زعفران کا کھیت نظر آئے گا جس کے دیکھنے سے ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جائیں گے۔

ان ہجووں کے پڑھنے سے جو خاص قسم کا اثر دل پر پڑتا ہے وہ ان کی قادر الکلامی اور گرمیِ کلام کے زور کا ہوتا ہے، قصیدوں میں وہ واقعات کو اس بے تکلفی اور سادگی سے نظم کرتے ہیں کہ دوسرا شخص مثنوی میں بھی اس طرح سے نظم نہیں کرسکتا۔

مگر افسوس ہے کہ وہ جی کھول کر اور آنکھیں بند کر کے ایسا منھ آئے ہیں کہ اس کا معمولی سا نمونہ بھی پیش کرنے سے طبیعت ہچکچاتی ہے، جس کو شوق ہو وہ کلیات اٹھا کر دیکھے، تغزل کا رنگ دیکھیے:

اس گلشنِ ہستی میں عجب دید ہے لیکن ۔۔۔ جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم ہے خزاں کا

بیکس کوئی مرے تو جلے اس پہ دل مرا ۔۔۔ گویا یہ ہے چراغ غریبوں کی گور کا

سوداؔ ہوئے جب عاشق کیا پاس آبرو کا ۔۔۔ سنتا ہے اے دوانے جب دل دیا تو پھر کیا

سوداؔ قمارِ عشق میں شیریں سے کوہ کن ۔۔۔ بازی اگرچہ پا نہ سکا سر تو کھو سکا

کس منھ سے پھر تو آپ کو کہتا ہے عشق باز ۔۔۔ اے روسیاہ تجھ سے تو یہ بھی نہ ہو سکا

رخصت ہو باغباں کہ ذرا دیکھ لیں چمن ۔۔۔ جاتے ہیں واں جہاں سے پھر آیا نہ جائے گا

چھیڑ مت بادِ بہاری کہ میں جوں نکہتِ گل ۔۔۔ پھاڑ کر کپڑے ابھی گھر سے نکل جاؤں گا
اس خرابی سے تو مت مجھ کو نکال اب گھر سے ۔۔۔ تو کہے آج نکل میں کہوں کل جاؤں گا

ہستی سے عدم تک نفس چند کی ہے راہ ۔۔۔ دنیا سے گزرنا سفر ایسا ہے کہاں کا

آدم کا جسم جب کہ عناصر سے مل بنا کچھ آگ بچ رہی تھی سو عاشق کا دل بنا

بہنا کچھ اپنی چشم کا دستور ہوگیا دی تھی خدا نے آنکھ سو ناسور ہوگیا

کہتے تھے ہم نہ دیکھ سکیں تجھ کو غیر پاس پر جو خدا دکھائے سو لاچار دیکھنا

کیا کروں گا ہاتھ سے حوروں کے واعظ لے کے جام
ہوں میں ساغر کش کسی کی نرگس مخمور کا

سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

کدھر کو چھوڑ گئے مجھ کو ہمسر ہاں تنہا پھروں ہوں دشت میں جوں گرد کارواں تنہا

ترا مجھ سے نہیں ملتا مرا دل رہ نہیں سکتا
غرض ایسی مصیبت ہے کہ میں کچھ کہہ نہیں سکتا

زباں ہے شکر میں قاصر شکستہ بالی کے کہ جس نے دل سے مٹایا خلش رہائی کا

یا تبسم یا نگہ یا وعدہ یا گاہے پیام
کچھ بھی اے خانہ خراب اس دل کے سمجھانے کی طرح

اے لالہ گو فلک نے دیے تجھ کو چار داغ چھاتی مری سراہ کہ اک دل ہزار داغ

نہ زر نہ زور نہ طالع نہ تیرے دل میں رحم جو چاہے تجھ سے یہ دل کامیاب ہو معلوم

قاتل کے دل سے آہ نہ نکلی ہوس تمام ذرہ بھی ہم تڑپنے نہ پائے کہ بس تمام

تو نے سوداؔ کے تئیں قتل کیا کہتے ہیں — یہ اگر سچ ہے تو ظالم اسے کیا کہتے ہیں

بوسہ ہنس کر نہ دیا اس نے سوائے دشنام — سو بھی یہ جب نہ ملا کوئی تو مجبور نہیں

کیفیت چشم اس کی مجھے یاد ہے سوداؔ — ساغر کو مرے ہاتھ سے لیجو کہ چلا میں

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑے زمانہ میں — تڑپے ہے مرغ قبلہ نما آشیانے میں

اے مرغ دل سمجھ کے تو چشم طمع کو کھول — تو نے سنا ہے دام جسے ہے وہ دانہ میں

سوداؔ خدا کے واسطے کر قصہ مختصر — اپنی تو نیند اڑ گئی تیرے فسانہ میں

کیا گلہ صیاد سے ہم کو یوں ہی گزری ہے عمر — اب اسیر دام ہیں تب تھے گرفتار چمن

جی تک تو دے کے لوں کہ تو ہو کار گر کہیں — اے آہ کیا کروں نہیں بکتا اثر کہیں
ہوتی نہیں ہے صبح نہ آتی ہے مجکو نیند — جس کو پکارتا ہوں وہ کہتا ہے مر کہیں
ساقی ہے یک تبسمِ گل فرصتِ بہار — ظالم بھرے ہے جام تو جلدی سے بھر کہیں

سخت مشکل ہے کہ ہر بات کنایہ سمجھو — ہے زباں میری بھی گفتار کروں یا نہ کروں

دل کو ہر طرح سے دلا سا دیا کروں — آنکھیں جو مانتی نہیں میں اس کو کیا کروں

عاشق کی بھی کٹتی ہیں کیا خوب طرح راتیں — دو چار گھڑی رونا دو چار گھڑی باتیں

یہ تو نہیں کہتا ہوں کہ سچ مچ کرو انصاف — جھوٹی بھی تسلی ہو تو جیتا ہی رہوں میں

کس کی ملت میں گنوں آپ کو بتلا اے شیخ — تو کہے گبر مجھے گبر مسلماں مجھ کو

اس کشمکش سے دام کے کیا کام تھا ہمیں   اے الفت چمن ترا خانہ خراب ہو

دل کو چاہا میں کہ خالی کروں مانند حباب   ہو گئی جان ہوا اک نفس سرد کے ساتھ

جو طبیب اپنا تھا اس کا دل کسی پر زار ہے   مژدہ باد اے مرگ! عیسیٰ آپ ہی بیمار ہے

اب تو میں چھوڑنے کا نہیں اس کو ناصحا   ہونی جو کچھ تھی قبلۂ حاجات ہو گئی
پیغامبر نے دیر لگائی تو ہے ولے   دھڑکے ہے دل کہ یہ نہ کہے رات ہو گئی
مستی سے اس نگاہ کی لے محتسب خبر   دنیا تمام بزم خرابات ہو گئی
سوداؔ کسی کو وہ تو ستائے نہ بے سبب   کیا جانیے کہ تجھ سے ہی کیا بات ہو گئی

سوداؔ جہاں میں آ کے کوئی کچھ نہ لے گیا   جاتا ہوں ایک میں دلِ پُر آرزو لیے

گل پھینکے ہے غیروں کی طرف بلکہ ثمر بھی   اے خانہ برانداز چمن کچھ تو ادھر بھی
دل اس نے لیا مجکو ملی دولت دیدار   کیا لوٹ کا سامان ادھر بھی ہے ادھر بھی
کیا ضد ہے مرے ساتھ خدا جانے وگرنہ   کافی ہے تسلی کو مرے ایک نظر بھی
سوداؔ تری فریاد سے آنکھوں میں کٹی رات   آئی ہے سحر ہونے کو ظالم کہیں مر بھی

نسیم بھی ترے کوچہ میں اور صبا بھی ہے   ہماری خاک سے کچھ دیکھو رہا بھی ہے
ترا غرور مرا عجز تا کجا ظالم   ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے
سمجھ کے رکھیو قدم دشت زار میں مجنوں   کہ اس جوار میں سوداؔ برہنہ پا بھی ہے

بدلا ترے ستم کا کوئی تجھ سے کیا کرے   اپنا ہی تو فریفتہ ہووے خدا کرے
گر ہو شراب و خلوت و محبوب و خوبرو   زاہد تجھے قسم ہے کہ تو ہو تو کیا کرے
قاتل ہماری نعش کے تشہیر ہے ضرور   آئندہ تا نہ کوئی کسی سے وفا کرے

فکرِ معاش و عشقِ بتاں، یادِ رفتگاں	اس زندگی میں اب کوئی کیا کیا کیا کرے

صورت میں میں کہتا نہیں ایسا کوئی کب ہے	اک دھج ہے کہ وہ قہر ہے، آفت ہے غضب ہے
کیا چیز ہے وہ دل جسے کہتے ہیں الٰہی	اک قطرۂ خوں سینہ میں آفات طلب ہے
دشنام کے دینے کی قسم کھائی ہے لیکن	جب دیکھے ہے وہ مجکو تو اک جنبشِ لب ہے

ہے قسم تجھ کو فلک دے تو جہاں تک چاہے	جلوۂ حسن اسے حسرتِ دیدار مجھے

جس روز کسی اور پہ بیداد کرو گے	یہ یاد رہے ہم کو بہت یاد کرو گے

عشرت سے دو جہاں کے یہ دل ہاتھ دھو سکے	تیرے قدم کو چھوڑ سکے یہ نہ ہو سکے

اثر ہے آہ میں ہر چند نے تاثیر نالے میں	پر اتنا ہے کہ ان دونوں سے میرا جی بہلتا ہے

خواہ کعبے میں تجھے خواہ میں بت خانے میں	اتنا سمجھوں ہوں مرے یار کہیں دیکھا ہے

بھر نظر تجکو نہ دیکھا کبھی ڈرتے ڈرتے
حسرتیں جی کی رہیں جی ہی میں مرتے مرتے

رستم سے بھلا کہہ تو سر تیغ تلے دھر دے
پیارے یہ ہمیں سے ہو ہر کارے و ہر مردے

رباعی

سوداؔ پئے دنیا تو بہر سو کب تک	آوارہ ازیں کوچہ بآں کو کب تک
حاصل یہی اس سے نہ کہ تا دنیا ہو	بالفعل ہوا یہ بھی تو پھر تو کب تک

☆☆☆

میر محمد تقی میر

''مجموعۂ قابلیت و ہنر، صاحب طبع خوش فکر، سر آمدِ مشہوران عصر، محاورہ دان و متین، متلاشی مضامین نو و رنگین، متجس الفاظ چرب و شیریں، در میدان غزل پردازی گوے فصاحت از معاصران می برد، ہر چند سادہ گو است اما در سادہ گوئی پر کار بیہا دارد۔'' (اھ، طبقات الشعرا)

اکثرے در فن شعر ریختہ او را در پلہ مرزا رفیع سودا گرفتہ اند و اکثرے در غزل و مثنوی بہتر از مرزا قیاس می کنند و مرزا را در ہجو و قصیدہ بر و فضیلت می دہند، غرض ہر چہ ہست استادی ریختہ برو مسلّم است۔'' (اھ، تذکرہ مصحفی)

محمد تقی نام، میر تخلص تھا، ان کے والد میر عبداللہ شرفائے اکبر آباد سے تھے، سراج الدین علی خاں آرزو کے رشتہ دار تھے، کسی نے میر صاحب کو خانِ آرزو کا بھتیجا، کسی نے بھانجا لکھا ہے، آزاد کہتے ہیں کہ میر صاحب میر عبداللہ کی پہلی بیوی سے تھے، وہ مر گئیں تو خانِ آرزو کی ہمشیرہ سے شادی کی تھی اس لیے سوتیلے بھانجے ہوئے، جو کچھ بھی ہو میر نے خانِ آرزو کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی۔

خود میر صاحب نے نکات الشعرا میں خانِ آرزو کا ذکر بہت محبت و ادب سے کیا ہے، ایک جگہ کہتے ہیں ''استاد و پیر مرشدِ بندہ است''، دوسری جگہ فرماتے ہیں ''ہمہ استادان مضبوط فن ریختہ ہم شاگردانِ آں بزرگوار اند''، ایک اور جگہ لکھا ہے ''تا حال ہمچوں ایشاں

بہ ہندوستان جنت نشان بہم نہ رسیدہ بلکہ بحث در ایران می رود۔" (۱)

میر صاحب کی تحصیل علمی کا حال معلوم نہیں مگر ان کی تصنیفات سے معلوم ہوتا ہے کہ فارسی میں استعداد اچھی تھی اور استاد کی تربیت کا پورا فیض حاصل کیا تھا۔

دلی میں میر صاحب کی بہن میر محمد حسین کلیم کو بیاہی تھیں، وہ اپنے بھائی کو بہت چاہتی تھیں اور ان کے لحاظ سے کلیم کو بھی میؔر سے بہت محبت تھی، میر نے نکات الشعرا میں کلیم کا جہاں کہیں ذکر کیا ہے اس سے ان دونوں کے باہمی اخلاص و محبت کا پتہ چلتا ہے۔

خواجہ محمد ناصر عندلیب کے یہاں بھی آمد و رفت تھی، ان کے یہاں ہر مہینہ کی پندرہویں کو مشاعرہ ہوا کرتا تھا، اس میں میر صاحب شریک ہوا کرتے تھے اور خواجہ میر دردؔ سے بہت خلوص تھا، نکات الشعرا میں فرماتے ہیں "فقیر بخدمت آں بزرگوار شرف اندوزمی شد، از زبان مبارکش فرمود، میر تقی میر تو میر مجلس خواہی شد، الحمد للہ والمنہ حرف آں سر سلسلۂ خدا پرستاں موثر افتادہ۔"

انقلابات زمانہ سے مشاعرہ کا سلسلہ خواجہ میر درد کے یہاں درہم برہم ہوگیا تو انہوں نے میر صاحب سے فرمایا کہ اپنے یہاں مشاعرہ کیا کرو، چنانچہ اس ارشاد کی تعمیل میں ہر مہینہ کی پندرہویں کو ان کے ہاں مشاعرہ ہونے لگا، خواجہ صاحب بھی اس میں شرکت فرماتے تھے، تذکرہ میں لکھتے ہیں "مجلس ریختہ کہ بخانہ بندہ تاریخ پانزدہم ہر ماہ مقرر است واللہ بذات ہمیں بزرگ است۔"

خوب معلوم نہیں کہ دلی میں ان کی گزراوقات کا کیا ذریعہ تھا مگر اتنا یقیناً معلوم ہے

---

(۱) آزاد کہتے ہیں کہ خان صاحب حنفی مذہب تھے اور میر صاحب شیعہ، اس پر نازک مزاجی غضب کی، کسی مسئلہ پر بگڑ کر الگ ہوگئے، تاریخی حیثیت سے اس واقعہ کی تصدیق یا تکذیب کرنا دشوار ہے، اس واسطے کہ جتنے پرانے تذکرے پیش نظر ہیں ان میں کہیں اس سے بحث نہیں، مگر میر صاحب نے جو کچھ خان صاحب کے متعلق خیالات ظاہر کیے ہیں ان میں دیکھتے ہوئے اس واقعہ کو باور کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

کہ سلطنت کی تباہی اور مرہٹہ گردی میں جس طرح شرفا مفلوک اور تباہ ہو گئے، میر بھی اسی کشمکش میں مبتلا تھے، تاہم ان کی وضع داری کی داد دینا چاہیے کہ مرزا رفیع سودا، میر سوز اور خدا جانے کتنے لوگ پریشان ہو کر دلی سے نکل کھڑے ہوئے، کوئی فرخ آباد گیا، کوئی لکھنؤ، کوئی اور آگے بڑھ گیا مگر جب تک ہو سکا میر صاحب دلی میں قدم جمائے بیٹھے رہے۔

جب پانی سر سے گزر گیا تو ساٹھ برس کے سن میں بقول مرزا لطف ۱۱۹۷ھ میں دلی چھوڑ کر لکھنؤ آئے، نواب آصف الدولہ (۱) کا زمانہ تھا، ان کی تعریف میں قصیدہ کہہ کر پیش کیا اور اس میں اپنی غربت اختیار کرنے کا پورا ماجرا بیان کیا، نواب نے اسی دن خلعتِ فاخرہ سے سرفراز کر کے تین سو روپئے ماہوار ان کے لیے مقرر کر دیے جو مرتے دم تک ان کو ملتے رہے۔

---

(۱) نواب آصف الدولہ یحییٰ علی خاں ہزبر جنگ لمۃ الزہرا بیگم کے بطن سے نواب شجاع الدولہ کے ایک ہی بیٹے تھے، ۱۱۸۷ھ میں باپ کے مرنے کے بعد مسندِ وزارت پر بیٹھے، اودھ، روہیل کھنڈ، صوبہ الٰہ آباد اور صوبہ اکبر آباد میں چکلہ کوڑا اور چکلہ اٹاوہ کا زرخیز علاقہ ترکہ میں پایا مگر ناقابلیت کے ساتھ مزاج میں عیش پرستی تھی، یہاں خواجہ سراؤں کے ہاتھ میں زمامِ حکومت، دوسری طرف حریف سلطنت مدبر اور زمانہ شناس، نتیجہ یہ ہوا کہ جونپور، بنارس، غازی پور کے تین سرسبز و شاداب ضلعے سرکار کمپنی بہادر نے وزیر سے برضا و رغبت لے لیے اور ان کے مرتے ہی آدھا ملک ان کے جانشین نواب سعادت علی خاں کی ہوسِ حکمرانی کے نذر ہو گیا، صرف اودھ کے اضلاع باقی رہے جس کا الحاق واجد علی شاہ کے زمانہ میں سرکار کمپنی کے ممالک محروسہ سے ہو گیا۔

نواب آصف الدولہ سات برس فیض آباد رہنے کے بعد لکھنؤ آ رہے اور اسی کو دار الحکومت بنایا، ان کے زمانہ کی عمارتوں میں عالیشان امام باڑہ اب تک قائم ہے جو لکھنؤ میں فنِ تعمیر کے لحاظ سے ایک ہی عمارت ہے، اس کو کفایت اللہ خاں دلی کے مشہور مہندس (انجینئر) نے تیار کیا تھا، اس کا رومی دروازہ، باولی، مسجد، امام باڑہ کے لداو کی تین چھتیں اور بھول بھلیاں دنیا کی عجیب و غریب عمارتوں میں گنی جاتی ہیں اور دور دور سے اس کے دیکھنے کو سیاح آ کر محوِ حیرت بن جاتے ہیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

آزاد کہتے ہیں کہ میر صاحب اپنی بددماغی اور نازک مزاجی سے کسی بات پر نواب سے بگڑ کر گھر بیٹھ رہے اور فقر و فاقہ میں زندگی گزار دی، ایک دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ جب سعادت علی خاں کا دور ہوا تو یہ دربار چھوڑ چکے تھے، وہاں سے کسی نے طلب نہ کیا، ایک دن

سابقہ حاشیہ: آصف الدولہ میں جہاں کچھ عیوب تھے، وہاں ایک صفت فیاضی اور سیر چشمی کی ایسی تھی جس سے وہ اپنے ملک میں نہایت ہر دلعزیز تھے، آج تک لکھنؤ کے دوکاندار ان کا نام لے کر صبح کو دوکان کھولتے ہیں اور یہ فقرہ بطور ضرب المثل کے بولا جاتا ہے کہ "جس کو نہ دلائے مولٰی اسے کیا دیں آصف الدولہ۔"

امام باڑہ وغیرہ جیسی نادر اور عالی شان عمارتوں پر پچاس لاکھ روپیہ صرف کیا، پچاس لاکھ روپئے سے نجف اشرف میں نہر آصفی تیار کرائی جس سے ان کا نام عراق میں بھی اسی نیکی سے لیا جاتا ہے جیسا کہ لکھنؤ میں۔

شعرا کی قدر دانی میں یہ اپنے پیشرو سے بھی آگے تھے، میر سوز ان کے استاد تھے، ان کی خدمت جو کچھ کرتے ہوں گے وہ معلوم نہیں، مرزا رفیع سودا کو چھ ہزار روپیہ کی سالانہ جاگیر دی تھی، میر تقی میر کو تین سو روپیہ ماہوار دیتے تھے، علاوہ اس کے داد و دہش میں جب ادنیٰ ادنیٰ نفروں کو ہزاروں کی خلعت ملتی تھی تو ان کا کیا پوچھنا۔

نواب آصف الدولہ کے زمانہ کا یہ کارنامہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ لہو ولعب میں مشغول ہونے کے ساتھ مذہب تشیع کی اشاعت میں انہوں نے دل سے کوشش کی، ان کے نائب حسن رضا خان بھی مذہبی آدمی تھے، وہ بھی اسی کوشش میں لگے رہتے تھے کہ ان کی کوششوں سے ہزاروں خاندان سنی سے شیعہ ہو گئے اور ان کو جاگیریں ملیں اور جو اپنی ضد پر قائم رہے ان کی جاگیریں جو شاہانِ مغلیہ کے وقت سے چلی آتی تھیں ضبط کی گئیں، شاہ علی اکبر مودودی کے مشورے اور ملا محمد علی فیض آبادی کی تحریک سے نواب حسن رضا خاں نے جمعہ و جماعت قائم کر کے سب سے پہلے مولوی سید دلدار علی نصیر آبادی کی اقتدا میں ۱۳ رجب ۱۲۰۰ھ کو نماز ادا کی، یہ پہلا دن ہے کہ وسط ہند میں شیعوں نے اپنا جمعہ و جماعت علاحدہ کر لیا، نائب امام کی حیثیت سے مجتہدین کے ہاتھ میں زمامِ مذہب دی۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

نواب کی سواری جاتی تھی، یہ تحسین کی مسجد میں برسرِ راہ بیٹھے تھے، سواری سامنے سے آئی، سب اٹھ کھڑے ہوئے یہ اسی طرح بیٹھے رہے، سید انشا خواصی میں بیٹھے ہوئے تھے، نواب نے پوچھا یہ کون شخص ہے، عرض کی یہ وہی گدائے متکبر ہے جس کا ذکر حضور میں اکثر آیا ہے، گزارہ کا وہ حال اور مزاج کا یہ عالم، آج بھی فاقہ ہی سے ہوگا، سعادت علی خاں نے خلعت بحالی اور ایک ہزار روپیہ دعوت کا بھیجا، میر صاحب نے واپس کر دیا، پھر سید انشا خود لے کر گئے اور سمجھا بجھا کر راضی کیا، کبھی کبھی دربار جانے لگے۔

میرے نزدیک کچھ عجب نہیں کہ کبرسنی کی وجہ سے یا خودداری کے خیال سے کہ بے بلائے نہ جائیں دربار کا آنا جانا چھوڑ دیا ہو، مگر یہ صحیح نہیں کہ گھر بیٹھ رہنے سے ان کی تنخواہ بند کر دی گئی اور فقر و فاقہ میں انہوں نے زندگی بسر کی، مرزا علی لطف میر صاحب کے

سابقہ حاشیہ: مگر افسوس ہے کہ نواب آصف الدولہ کو ان کی غفلت اور عیش پرستی نے انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا رکھا تھا اور اسی غم میں ان کی جان گئی، دانستہ انہوں نے ایسی تدبیریں اختیار کیں جن سے جلد بیمار ہوں اور ایسے بیمار ہوں کہ جانبر نہ ہوسکیں، حکیم شفائی خاں دلی کے نامور طبیب معالج تھے، ان سے پوچھا کرتے اور جو بتاتے اس کے خلاف عمل کرتے، نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی یہ آرزو ۱۲۱۲ھ میں پوری ہوگئی اور استسقا کی بیماری نے ان کا کام تمام کر دیا۔ (کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو)

آصفؔ نے چھٹے عشق بتاں دل سے ہمارے — سو بار اگر پھر بھی بنادیں اسے گھڑ کر

شوخی چشم کی شہرت کو تری سن سن کر — شرم سے باغ میں نرگس نے چھپائیں آنکھیں

جس جگہ آنسو گرے ہے آبلہ پڑ جائے ہے — آب سے آتش ہوئے کیوں کر بہم کیا جانیے

پوچھتے کیا ہو شب ہجر کی حالت یارو — میں ہوں اور رات ہے اور بستر تنہائی ہے

ترے کوچہ میں نقشِ پا کی طرح — ایسے بیٹھے کہ پھر وہاں سے نہ گئے

ہم عصر ہیں، وہ گلشنِ ہند میں لکھتے ہیں کہ:

''اگر چہ گرفتہ مزاجی سے ان کی روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہ ہوا اور نواب سعادت علی خاں بہادر کے عہد میں آج تک کہ ۱۲۱۵ھ ہے، وہی حال ہے۔''

اب تم غور کرو کہ بقول آزاد نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں میر صاحب گھر بیٹھ رہے تھے اور فقر و فاقہ میں مبتلا ہو چکے تھے، جب سعادت علی خاں نواب وزیر ہوئے تو انہوں نے ان کو پوچھا نہیں، چند دنوں کے بعد انشاء اللہ خاں کی مہربانی سے ان کو خلعتِ بحالی ملا، لطف یہ کہ ۱۲۱۵ھ میں خود انشاء اللہ خاں کی رسائی نواب سعادت علی کے دربار میں ہوئی ہے اور اس وقت تک بقول لطف ان کی تنخواہ جاری تھی، حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے میر صاحب کی جو تصویر آبِ حیات میں کھینچی ہے وہ ان کے منہ پر کھلتی نہیں، کچھ شبہ نہیں کہ میر صاحب نازک مزاج تھے مگر آزاد نے جو واقعات لکھے ہیں اگر آج وہ کسی میں پائے جائیں تو ہر شخص اس کو نازک مزاج نہیں خرد ماغ سمجھے گا۔

آزاد کہتے ہیں کہ ''جس زمانہ میں میر صاحب نواب...... سے بگڑ کر بیٹھ رہے تھے، ایک دن بازار چلے جاتے تھے، نواب کی سواری سامنے سے آ گئی، دیکھتے ہی نہایت محبت سے بولے کہ میر صاحب آپ نے بالکل ہمیں چھوڑ دیا، کبھی تشریف نہیں لاتے، میر صاحب نے کہا بازار میں باتیں کرنا آدابِ شرفا نہیں، یہ کیا گفتگو کا موقع ہے'' اگر تھوڑی دیر کے لیے اس واقعہ کو تسلیم کر لیا جائے تو میرے نزدیک جس کو خللِ دماغ ہو گا وہی اس کو نازک مزاجی سے تعبیر کر سکتا ہے، ورنہ جس کی نسبت بیان کیا گیا ہے اس کے پاگل ہونے میں کچھ شبہ نہیں۔

آزاد کہتے ہیں کہ ''افسوس یہ ہے کہ ان کو اوروں کے کمال بھی دکھائی نہ دیتے تھے اور یہ میر سے شخص کے دامن پر بدنما دھبہ ہے'' ایک جگہ اور کہتے ہیں کہ ''خواجہ حافظؒ اور شیخ سعدیؒ کی غزل پڑھی جائے تو وہ سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے، کسی اور کی حقیقت کیا ہے'' مگر جب

اس کی جانچ ہم ان کی کتاب نکات الشعرا سے کرتے ہیں تو حیرت کی کچھ انتہا نہیں رہتی کہ یہ بیان کس قدر واقعہ کے خلاف ہے، میر سجاد میر صاحب کے زمانہ میں ایک نوجوان شاعر تھے تاہم ان کی نسبت فرماتے ہیں ''سخن او پایۂ استادی رسیدہ'' ان کے ایک ایک شعر پر وجد کرتے ہیں اور سو جگہ لکھنے کی تمنا کرتے ہیں، سجاد کا شعر ہے ؎

عشق کی ناؤ پار کیا ہووے　　جو یہ کشتی تری تو بس ڈوبی

میر صاحب داد دیتے ہیں ''ہمہ شعر سبحان اللہ لیکن فقیر را از دیدن ایں شعر تواجد دست بہم می دہد از بسکہ از خواندن ایں شعر حظے بر می دارم می خواہم کہ بصد جا بنویسم۔''

آزاد کہتے ہیں کہ سوزؔ مرحوم پہلے میر تخلص کرتے تھے، جب میر تقی مرحوم میرؔ کے تخلص سے عالمگیر ہوئے تو انہوں نے سوزؔ اختیار کیا، دوسرے مقام پر کہتے ہیں کہ سوزؔ نے ایک مشاعرہ میں کہا تھا کہ ''فقیر نے تو تخلص میرؔ کیا تھا مگر وہ میر تقی صاحب نے پسند فرمایا، فقیر نے خیال کیا کہ ان کے کلام کے سامنے میرا نام نہ روشن ہو سکے گا، ناچار سوزؔ اختیار کیا۔''

ایک اور جگہ کہتے ہیں کہ میر سوزؔ کے ذکر پر میر تقی میرؔ نے کہا کہ شرفا میں ہم نے ایسے تخلص کبھی نہیں سنے، اب دیکھو کہ میر صاحب خود کیا کہتے ہیں ''محمد میر، میر تخلص جوانے است بسیار اہل خوش طبع ہر چند طرز علاحدہ دارد لیکن از خوش کردن تخلص من نصف دلم از و خوش است'' اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میر صاحب نے ان کا تخلص پسند نہیں کیا بلکہ میر سوزؔ نے پسند کیا، تاہم جس خوش دلی سے ان کا ذکر کرتے ہیں اس سے یہ بعید ہے کہ جب وہ میر صاحب کی بزرگی کا لحاظ کر کے اپنا تخلص بدل ڈالیں تو میر صاحب فرمائیں کہ شرفا میں ہم نے ایسے تخلص کبھی سنے نہیں۔

آزاد میر صاحب کے سلسلۂ تصنیفات میں نکات الشعرا کا ذکر کر کے لکھتے ہیں کہ وہاں بھی اپنا انداز قائم ہے، دیباچہ میں فرماتے ہیں کہ یہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے، اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو،

ان ہزار میں ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا، ولیؔ کہ بنی نوع شعرا کا آدم ہے، اس کے حق میں فرماتے ہیں ''ولے شاعریست از شیطان مشہور تر'' نکات الشعرا چھپ گیا ہے اور پیش نظر ہے، اس کے دیباچہ میں یہ کہیں نہیں ہے کہ اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا، یہ بھی نہیں ہے کہ ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو، ولیؔ کی نسبت فرماتے ہیں ''......از کمالِ شہرت احتیاجِ تعریف نہ دارد'' شیطان والا فقرہ سارے تذکرے میں کہیں نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کی نظر سے نکات الشعرا نہیں گزرا، نہ اس قسم کے مضامین جو آبِ حیات میں لکھے ہیں کسی مستند ماخذ سے لیے گئے ہیں، صرف قصے کہانیوں پر ان کی بنیاد ہے، یا بقول مولانا شروانی (۱) قیاس کی بلند پروازی نے طوطے مینا بنا کر اڑائے ہیں اور اپنی سحر بیانی سے سامعین کو خوش کیا ہے۔

---

(۱) مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی، حسرت تخلص، بھیکن پور ضلع علی گڑھ کے مقتدر رئیس، خوش رو، خوش خو، خوش گو، خوش اخلاق امیر ہیں، علوم وفنون عربیہ کی تعلیم مولوی عبدالغنی فرخ آبادی اور ان کے استاد مولانا لطف اللہ مرحوم سے پائی ہے، شعر و سخن کی مشق منشی امیر احمد مینائی سے کی ہے، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی فرماتے ہیں، فضیلت علمی کے ساتھ خدا نے ان کو ایسی صفتیں عنایت کی ہیں جن پر ہمیشہ مجھ کو رشک آتا ہے۔

سب سے نمایاں صفت ان کی متانت اور اصابت رائے ہے جس کی آزمائش نازک ترین مواقع پر ہو چکی ہے اور ہر موقع پر ایسے جوہر کھلے ہیں جس نے سب کو متحیر کر دیا ہے، دوسری صفت ان کی انتظامی قابلیت ہے جس کے لیے خدا نے ان کو نہایت موزوں دماغ عطا فرمایا ہے اور اس کا بہترین نمونہ ان کی ریاست کا انتظام ہے، جس وقت ان کے ہاتھ میں کام آیا ہے ریاست زیر بار قرض تھی، چند روز میں اپنی انتظامی قابلیت سے لاکھوں روپے کا قرض ادا کر کے زیر باری سے اس کو محفوظ کر دیا، یہ بھی تھوڑی بات نہیں کہ ان کا قیام حیدر آباد میں ہے، سال میں دو بار مہینے مہینے ڈیڑھ ڈیڑھ مہینے کو (باقی اگلے صفحہ پر)

نکات الشعرا کی مدد سے نیز تذکرہ نویسوں کی تحریر سے میر صاحب میں جو اوصاف ہمیں نظر آئے ہیں وہ یہ ہیں کہ وہ نہایت مہذب، زندہ دل، یار باش، انصاف پسند اور وضعدار آدمی تھے، میانہ قد، لاغر اندام، گندمی رنگ، ہر کام متانت اور آہستگی کے ساتھ کرتے، بات بہت کم کرتے اور وہ بھی آہستہ آواز میں، نرمی اور ملائمت، مزاج میں قناعت اور غیرت حد سے بڑھی ہوئی، صلاحیت و پرہیزگاری کے ساتھ عادات و اطوار نہایت سنجیدہ و متین،

سابقہ حاشیہ: آجاتے ہیں مگر انتظام کے ایسے عمدہ اصول بنا دیے ہیں کہ ہر کام ٹھیک وقت پر ہوتا رہتا ہے، تیسری صفت ان کی یہ ہے کہ باوجود نوجوانی اور رنگین مزاجی اور دولت مندی کے مذہبی جذبات کی پرورش و پرداخت سے غفلت نہیں کی، عنفوان شباب میں قبلہ ارشاد حضرت مولانا فضل الرحمٰن قدس سرہٗ سے بیعت کی اور شیخ الحدیث مولانا حسین بن محسن انصاری یمانی کو حبیب گنج میں تکلیف اقامت دے کر صحاح ستہ کی سند حاصل کی اور اپنے اوقات کا بہترین حصہ تفسیر و حدیث کی خدمت میں صرف کیا، چوتھی صفت یہ ہے کہ باوجود ان تمام مشغولیتوں کے اپنے اوقات کا بیشتر حصہ ایسے کاموں میں صرف کرتے رہے جن سے مسلمانوں کی فلاح و بہبود وابستہ ہے، ندوۃ العلما کی بنیاد ۱۳۱۱ھ میں پڑی، اسی سال اس کے رکن انتظامی منتخب ہوئے، اس وقت سے اب تک کہ ۳۰ سال کا زمانہ ہونے کو آیا ہے اس کے رکن رکین ہیں اور ہر ممکن ذریعہ سے مدد دینے میں پہلوتہی نہیں کرتے، علاوہ اس کے برسوں محمڈن کالج علی گڑھ کے ناظم امور مذہبی رہے اور کئی سال سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے آنریری سکریٹری ہیں اور ہر کام کو دلچسپی سے انجام دیتے ہیں۔

۱۳۳۶ھ میں اعلیٰ حضرت محی الملۃ والدین آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کی نگاہ دوربیں نے دولت آصفیہ دکن کی صدارت کے لیے ان کا انتخاب فرمایا، باوجودیکہ ان کو اس عزت و جاہ کے پیدا کرنے کی حاجت نہیں تھی مگر جہاں تک مجھے معلوم ہے صرف اس خیال سے کہ اس طریقہ سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کا نادر موقع ہاتھ آتا ہے، اپنی صحت اور انتظام ریاست کے بگڑنے کی پرواہ نہ کر کے اس کو قبول کر لیا، خدا سے دعا ہے کہ وہ ان کو اتنی ہمت و قوت عطا فرمائے کہ وہ اپنی دماغی قابلیتوں کے لحاظ سے دولت اسلامیہ دکن کے بہترین مشیر و وزیر ثابت ہوں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

ہر وقت محویت کا عالم طاری، اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے بیٹھے رہتے۔

سو برس کی عمر پائی تھی، آخر آخر میں بڑھاپے نے ان صفتوں کو اور بھی ابھار دیا تھا، اسی مناسبت سے ان کی دل گرفتگی بھی بڑھ گئی ہوگی مگر تم اس بات پر غور کرو کہ محمد شاہی دور کا ایک بوڑھا وضعدار شاعر جس کی عمر کا بیشتر حصہ ان لوگوں میں بسر ہو جن کی وضع قطع، عادات و اطوار غرضیکہ ہر چیز کی سند لی جاتی تھی، قزلباش خاں امیدؔ، سراج الدین علی خاں آرزوؔ، مرزا جانجاناں مظہرؔ، خواجہ محمد ناصر عندلیبؔ، خواجہ میر دردؔ، مرزا رفیع سوداؔ اور محمد حسین کلیمؔ جن میں کا ہر ایک مجموعۂ قابلیت و ہنر تھا، ان کے ساتھ ہر وقت کی صحبت، علمی مذاکرے اور جلسوں کی گرم جوشیاں مگر عفت و پرہیزگاری، شرم و حیا، مروت و ہمدردی، وضع داری اور دوستی کے اگلے آئین و قوانین کے ساتھ جو ہماری قومی زندگی کی علامتیں تھیں، ایک کا دوسرے سے میل جول ایسا بے نظیر اور قابل تقلید و عمل درآمد تھا جس کی تعریف کرنے سے زبان و قلم کا حوصلہ تنگ ہے۔

دیکھنے کی بات ہے کہ جب اسی شخص پر مصیبت پڑتی ہے تو یارانِ صحبت میں سے ایک ایک کر کے پیوندِ زمین اور کوئی آوارۂ دشتِ غربت ہو جاتا ہے اور مرہٹوں کی دست برد سے ایک عالم آشوب ہنگامہ برپا ہوتا ہے جس سے شہر میں خاک اڑنے لگتی ہے، اس وقت اس کے پائے ثبات کو بھی لغزش ہوتی ہے، وہ ایسے شہر میں وارد ہوتا ہے جہاں نئے انداز،

سابقہ حاشیہ: مجھ کو ممدوح الصدر کی خدمت میں تیس برس سے نیاز حاصل ہے، اس وجہ سے مجھ کو ان کے محاسن اخلاق کے دیکھنے اور جانچنے کا کافی موقع ملا ہے، اسی وجہ سے میں نے ان کے انہی اوصاف کا ذکر کیا ہے جن کا خاص طور پر میرے دل پر اثر ہے، ان کی علمی خدمتیں اتنی نمایاں ہیں کہ ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں، وہ علمائے سلف کے مصنف ہونے کی حیثیت سے نیز سیکڑوں اخلاقی اور تاریخی مضامین کے لحاظ سے جو برابر شائع ہوتے رہتے ہیں ہندوستان میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں اور امید ہے کہ آئندہ اس سے زیادہ حاصل کریں گے۔

نئی تراشیں، بانکے ٹیڑھے جوانوں کو دیکھتا ہے، ان کے مشغلوں (۱) کو دیکھتا ہے، ان کے جذبات و خیالات کو جانچتا ہے، ان کی طبیعتوں کی شوخی، زبانوں کی طرّاری، تراشوں اور ایجادوں کے انوکھے پن سے سابقہ پڑتا ہے، پھر تم ہی کہو کہ اس بیچارے بڈھے پر اتم پرانی لکیر کے فقیر کے دل پر کیا گزرتی ہوگی، اس سے یہ شبہہ نہ ہوسکتا ہوگا کہ وہ جرأت اور انشا کی

(۱) میر صاحب کے کلیات میں ایک مثنوی ہے جس میں لکھنؤ کی مرغ بازی کا خاکہ اڑایا ہے، یہ زمانہ نواب آصف الدولہ کا ہے اور نواب کو مرغ بازی کا بہت شوق تھا، اسی وجہ سے گھر گھر اسی کا چرچا تھا اور ہفتہ میں دوبار شہر میں پالیاں ہوتی تھیں، چند شعر اس مثنوی کے ملاحظہ ہوں، ان شعروں سے میر صاحب کی دلی کیفیات کا اندازہ ہوسکتا ہے:

دلی سے ہم جو لکھنؤ آئے — گرم پرخاش مرغ یاں پائے
جمع منگل کو پالی کی ہے دھوم — گلیوں میں روز حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش — جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
مرغ لڑتے ہیں ایک دو لاتیں — سینکڑوں ان سفیہوں کی باتیں
انی پر جھاڑے یہ پھڑکنے لگے — انی کی نوک پر کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج — ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج
مرغ کی ایک پرفشانی ہے — ان کی صد رنگ بدزبانی ہے
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ — ایک کہتا ہے کہ بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو چراتے ہیں — لاتیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں
ایک کے منھ میں مرغ کی منقار — ایک کے لب پہ ناسزا گفتار
منھ میں آیا جو کچھ سو بکنے لگے — تیکھی نظروں سے سب کو تکنے لگے
طرفہ ہنگامہ طرفہ صحبت ہے — بعد نصف النہار رخصت ہے
کھانچے سر پر بغل میں مارے مرغ — لے گئے جیتے ہارے سارے مرغ

شوخیوں اور مرزا سعادت یار خاں کی جدت پسند طبیعت کی رنگینیوں کو سن کر دادِ سخن دے اور قہقہوں کی آواز میں خود بھی آواز ملائے، اسی کو بد دماغی کہہ لو یا نازک مزاجی، جس سے خود میر صاحب بھی واقف تھے، چنانچہ ایک مخمس کے مقطع میں فرماتے ہیں ؎

حالت تو یہ ہے مجکو غموں سے نہیں فراغ دل سوزشِ درونی سے جلتا ہے جوں چراغ
سینہ تمام چاک ہے، سارا جگر ہے داغ ہے نام مجلسوں میں مرا میرِ بے دماغ
از بسکہ کم دماغی نے پایا ہے اشتہار

اگر جرأت و انشا کو تم خواجہ حافظ اور شیخ سعدی کا ہم رتبہ خیال کرتے ہو تو میر صاحب بے شبہہ اس بات کے گنہگار تھے کہ وہ ان کی شوخیوں پر سر ہلانا گناہ سمجھتے تھے، میں کہتا ہوں کہ ان میں فضل و کمال کے ساتھ خودداری نہ ہوتی تو ان نوجوانوں سے پگڑی بچانا مشکل پڑ جاتا جن میں سے ایک بھانڈوں سے برابر کی چوٹ لڑ سکتا ہو اور دوسرے کی زٹل اور فحش ہجووں کا ایک ایک مصرع ہزار قچی اور چابک کا تراقا ہو، پھر ان کی بھی وہی گت بنتی جو غریب مصحفی کی بن کر رہی۔ (۱)

---

(۱) انشاء اللہ خاں اور مصحفی میں جو چوٹیں چلیں وہاں تک تو غنیمت تھیں جس حد تک شاعری کو دخل تھا، اس کے بعد جو معرکے ہوئے اور آزاد نے نمک مرچ لگا کر بیان کیے ہیں ان کو آب حیات میں پڑھو، خلاصہ یہ کہ سید انشا نے بہت سی زٹل اور فحش ہجویں کہیں کہ جن کا ایک ایک مصرع بقول آزاد ہزار قچی اور چابک کا طراقہ تھا، بڈھا بیچارہ اپنی شیخی کی جریب اور عصائے غرور کے سہارے سے کھڑا ہو کر جتنا کمر میں بوتا تھا مقابلہ کرتا رہا، جب نوبت حد سے گزر گئی تو اس کے شاگردوں سے لکھنؤ بھرا پڑا تھا، منتظر اور گرم سب کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے، جو کچھ ہو سکا شاگردی کا حق ادا کیا، ایک دن شہدوں کا سوانگ بھر کے ہجو کے اشعار پڑھتے ہوئے سید انشا کی طرف روانہ ہوئے، ان کو خبر پہلے لگ گئی، اپنے یاروں کو لے کر استقبال کو نکلے اور ان کو مکان پر لائے، خود دوبارہ پڑھوایا، شیرینیاں کھلائیں، شربت پلائے، ہار پہنائے اور عزت و احترام سے رخصت کیا (آزاد نے کوئی شعر اس ہجو کا نقل نہیں کیا، یہ یاد رکھنے کی بات ہے) اب سنو، (باقی اگلے صفحہ پر)

مرزا علی لطف نے گلشن ہند میں یہ بات نئی لکھی ہے کہ جب کلکتہ میں جان گلکرسٹ صاحب کی کوشش سے حکام کو اردو زبان کی سرپرستی کا خیال ہوا تو لکھنؤ سے بھی زبان دانوں کی مانگ ہوئی تو سب سے پہلے کرنل اسکاٹ کے سامنے میر صاحب کی تقریب ہوئی مگر پیرانہ سالی کی وجہ سے ان کا انتخاب نہیں ہوا، میر شیر علی افسوؔس ایک نوجوان شخص بھیج دیے گئے۔

میر صاحب کی تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ چھ دیوان ریختہ غزلوں کے ہیں، چند صفحے ہیں جن میں فارسی کے عمدہ متفرق اشعار پر اردو مصرعے لگا کر مثلث اور مربع کیا ہے، رباعیاں، مستزاد چند صفحے، پانچ قصیدے، چند مخمس اور ترجیع بند، چند مخمس شکایت زمانہ میں، دو واسوخت، ایک ہفت بند، بہت سی مثنویاں، ایک دیوان فارسی کا ہے جس میں دو ہزار شعر ہیں۔

میر صاحب غزل کے بادشاہ ہیں، قصیدے کے مرد میدان نہیں، آزاد نے ٹھیک لکھا ہے کہ ان کے قصیدے کم ہیں اور اسی قدر درجہ میں کم ہیں، واسوخت لاجواب ہیں، فارسی میں فغانی یا وحشی، اردو میں میر صاحب کو واسوخت کا موجد تسلیم کیا گیا ہے۔

تذکرہ نکات الشعرا شعرائے ریختہ کے حال میں ہے، فارسی میں لکھا ہے، سنہ تصنیف

سابقہ حاشیہ: سید انشا نے جو اس کا جواب حاضر کیا وہ قیامت تھا، یعنی ایک انبوہ کثیر برات کے سامان کے ساتھ ترتیب دیا اور عجیب و غریب ہجویں تیار کر کے لوگوں کو دیں، کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے، کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے، ایک ہاتھ میں گڈا، ایک میں گڑیا، دونوں کو لڑاتے اور اشعار پڑھتے جاتے تھے، جن میں کا ایک شعر یہ ہے۔

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن　　لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفؔی و مصحفن

ان معرکوں میں مرزا سلیمان شکوہ بلکہ اکثر امرا نے سید انشا کا ساتھ دیا اور حریف کا سوانگ ایک دفعہ کوتوال سے کہہ کر رکوا دیا، اس بات نے مصحفؔی کو بہت شکستہ خاطر کر دیا جس کی جھلک ان کے کلام میں پائی جاتی ہے، ان میں سے ایک شعر یہ ہے۔

اے مصحفؔی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا　　سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

مجھے نہیں ملا، مگر معلوم ہوتا ہے کہ احمد شاہ کے زمانہ میں لکھا ہے اور انجمن ترقی اردو نے اس کو چھپوا دیا ہے، میر صاحب نے سو برس کی عمر پائی اور ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے، اب کوئی نہیں جانتا کہ لکھنؤ میں ان کا مزار کہاں پر ہے۔

کلام ملاحظہ ہو:

قاصد جو واں سے آیا تو شرمندہ میں ہوا　　بیچارہ گریہ ناک و گریباں دریدہ تھا

صیاد! دل ہے داغ جدائی سے رشک باغ　　تجھ کو بھی ہو نصیب یہ گلزار دیکھنا

لیتے ہی نام اس کا سوتے سے چونک اٹھے　　ہے خیر میر صاحب! کچھ تم نے خواب دیکھا

ہم خستہ دل ہیں تجھ سے بھی نازک مزاج تر　　تیوری چڑھائی تو نے کہ یاں جی نکل گیا

ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا　　دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میرؔ باز آ　　نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائے گا

چشم خوں بستہ سے کل رات لہو پھر ٹپکا　　ہم نے جانا تھا کہ بس اب یہ تو ناسور گیا

مسجد میں امام آکے ہوا آج وہاں سے　　کل تک تو یہی میرؔ خرابات نشیں تھا

الجھاؤ پڑ گیا جو ہمیں اس کے عشق میں　　دل سا عزیز جان کا جنجال ہو گیا

ہم نے جانا تھا لکھے گا تو کوئی حرف اے میرؔ　　پر ترا نامہ تو اک شوق کا دفتر نکلا

فلک کو منھ نہیں اس فتنے کے اٹھانے کا　　ستم شریک ترا ناز ہے زمانے کا

دل عشق کا ہمیشہ حریف نبرد تھا　　اب جس جگہ کہ داغ ہے یاں پہلے درد تھا

علاج کرتے ہیں سودائے عشق کا میرے خلل پذیر ہوا ہے دماغ یاروں کا

داغ فراق وحسرتِ وصل آرزوئے شوق میں ساتھ زیر خاک بھی ہنگامہ لے گیا

سخت کافر تھا جس نے پہلے میرؔ مذہب عشق اختیار کیا

جہاں کو فتنہ سے خالی کبھی نہیں پایا ہمارے وقت میں تو آفتِ زمانہ ہوا

اب تو جاتے ہیں بت کدے سے میرؔ پھر ملیں گے اگر خدا لایا

سمجھے تھے ہم تو میرؔ کو عاشق اسی گھڑی جب سن کے تیرا نام وہ بیتاب سا ہوا

کہتے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا کہنے کی ہیں سب باتیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

اتنی گزری جو مری ہجر میں سو اس کے سبب صبر مرحوم عجب مونسِ تنہائی تھا

عشق ہمارے خیال پڑا ہے خواب گیا آرام گیا
جی کا جانا ٹھہر رہا ہے صبح گیا یا شام گیا

یک قطرہ خون ہو کے مژہ سے ٹپک پڑا قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

دل و دماغ ہے اب کس کو زندگانی کا جو کچھ کہ یاں ہے سو افسوس ہے جوانی کا

میرؔ کے دین و مذہب کو کیا پوچھتے ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

کہتے ہیں آگے تھا بتوں میں رحم ہے خدا جانیے یہ کب کی بات

بہت روئے ہم اس کی رخصت کے بعد
نظر میرؔ نے کیسی حسرت سے کی

یعنی آگے چلیں گے دم لے کر
مرگ اک زندگی کا وقفہ ہے

جیتا مرنے کو رہا ہے یہ گنہگار ہنوز
منتظر قتل کے وعدہ کا ہوں اپنے یعنی

شیخ یاں ایسے تو ہنگامے ہوا کرتے ہیں
اس کے کوچے میں نہ کر شور قیامت کا ذکر

ابھی تو اس کی گلی سے پکار لایا ہوں
چلا نہ اٹھ کے وہیں چپکے چپکے پھر تو میرؔ

پوچھنے والے جدا جان کو کھا جاتے ہیں
ایک بیمار جدائی ہوں میں آپ ہی تس پر

وقت ملنے کا مگر داخل ایام نہیں
دن نہیں، رات نہیں، صبح نہیں، شام نہیں

اس پر بھی تری خاطرِ نازک پر گراں ہوں
اک وہم نہیں پیش مری ہستیِ موہوم

چپکے تم سنتے ہو بیٹھے اسے کیا کہتے ہیں
مدعی مجھ کو کھڑے صاف برا کہتے ہیں

ایک رکھتے ایک کھوتے عشق میں
کاشکے دو دل تو ہوتے عشق میں

ایسی جنت گئی جہنم میں
جائے ہے جی نجات کے غم میں

کچھ تو ہے میرؔ! کہ اک دم تجھے آرام نہیں
بے قراری جو کوئی دیکھے ہے کہتا ہے یہی

ہاں کہو اعتماد ہے ہم کو
کہتے ہو اتحاد ہے ہم کو
میرؔ کی وضع یاد ہے ہم کو
نامرادانہ زیست کرتا تھا

سمجھاؤں کب تک اس دل خانہ خراب کو
کہنے سے میرؔ اور بھی ہوتا ہے مضطرب

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو

یوں رفتہ اور بیخود کب تک رہا کرو گے تم اب بھی میرؔ صاحب اپنے تئیں سنبھالو

خطرے بہت ہیں میرؔ رہ صعب عشق میں ایسا نہ ہو کہیں کہ دل و دین کو کھو رہو

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم اب ہوئے خاک انتہا ہے یہ

ایک محروم چلے میرؔ ہمیں دنیا سے ورنہ عالم کو زمانہ نے دیا کیا کیا کچھ

زور و زر کچھ نہ تھا تو بارے میرؔ کس بھروسے پہ آشنائی کی

میں جو بولا کہا کہ یہ آواز اسی خانہ خراب کی سی ہے

باہم سلوک تھا تو اٹھاتے تھے نرم گرم کاہے کو میرؔ کوئی دبے جب بگڑ گئی

گھبرا نہ میرؔ عشق میں اس سہل زیست پر جب بس چلا نہ کچھ تو مرے یار مر گئے

پہنچا تو ہوگا سمع مبارک میں حال میرؔ اس پر بھی جی میں آئے تو دل کو لگائیے

پاس ناموس عشق تھا ورنہ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

بہت سعی کیجیے تو مر رہیے میرؔ بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

آتے کبھی جو واں سے تو یاں رہتے تھے اداس آخر کو میرؔ اس کی گلی ہی میں جا رہے

کعبہ میں جاں بلب تھے ہم دوریِ بتاں سے
آئے ہیں پھر کے یارو اب کی خدا کے ہاں سے

پیدا کہاں ہیں ایسے پراگندہ طبع لوگ　　افسوس تم کو میرؔ سے صحبت نہیں رہی

مقدور تک تو ضبط کروں پر میں کیا کروں　　منہ سے نکل ہی جاتی ہے اک بات پیار کی

واعظِ ناکس کی باتوں پر کوئی جاتا ہے میرؔ　　آؤ میخانے چلو تم کس کی باتوں پر گئے

پتھر کی چھاتی چاہیے ہے میرؔ عشق میں　　جی جانتا ہے اس کا جو کوئی وفا کرے

جب نام ترا لیجیے تو چشم بھر آوے　　اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

اس کا غضب سے نامہ نہ لکھنا تو سہل ہے　　لوگوں کے پوچھنے کا کوئی کیا جواب دے

شرط سلیقہ ہے ہر اک امر میں　　عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے

سرمگیں آنکھیں شرم آلودہ خاک میں ہم کو ملائیں گی
کیا یہ نگاہیں نیچی نیچی اوپر اوپر جائیں گی

پھرتے ہیں میرؔ خوار کوئی پوچھتا نہیں　　اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

اوداسیاں تھیں مری خانقہ میں قابل سیر　　صنم کدہ میں تو ٹک آ کے دل لگا بھی ہے

☆☆☆

خواجہ میر دردؔ علیہ الرحمہ

''زبان گفتگویش گرہ کشائے زلف مشام مدعا، مصرع نوشتہ بر صفحہ کاغذ از کاکل صبح خوش نما، طبع سخن پرداز او سرو مائل چمنستاں انداز است گاہے درکوچۂ باغ تلاش بہ طریق گلگشت قدم رنجہ می فرماید، در چمن شعرش لفظ رنگیں، چمن چمن گل چیں خیال او راگل معنی دامن دامن، شاعر زور آور، ریختہ در کمال علاقگی وارستہ، خلیق متواضع آشنائے درشت اشعر فارسی ہم می گوید، اما بیشتر رباعی گرمی بازار وسعت مشرب اوست۔

(اھ، نکات الشعرا)

اکثر از دست عسرت پریشان شدہ، بہ طرفے افتند لیکن آں ثابت قدم تکیہ بر توکل نمودہ قدم از جا بر نداشت، تا حال در شاہجہاں آباد مقیم است، دیوانش اگر چہ مختصر لیکن مثل کلام حافظ سراپا انتخاب۔''

(اھ، تذکرۂ میر حسن)

''خواجہ میر دردؔ کی غزل سات شعر نو شعر کی ہوتی ہے مگر انتخاب ہوتی ہے، خصوصاً چھوٹی چھوٹی بحروں میں جو اکثر غزلیں کہتے تھے گویا تلواروں کی آبداری نشتر میں بھر دیتے ہیں، خیالات ان کے متین تھے، کسی کی ہجو میں زبان آلودہ نہیں ہوئی، تصوف جیسا انہوں نے کہا، اردو میں آج تک کسی سے نہیں ہوا۔''

(اھ، آب حیات)

سید خواجہ میر نام، درد تخلص تھا، خواجہ محمد ناصر عندلیب کے خلف الرشید تھے، گیارہ واسطوں سے ان کا نسب خواجہ بہاء الدین نقشبندی اور پچیس واسطوں سے امام حسن عسکری علیہ السلام تک پہنچتا ہے، دلی میں پیدا ہوئے اور والد کے آغوش تربیت میں پرورش پائی اور بائیس برس کے سن میں دنیا سے منہ موڑ کر والد کے سجادہ پر بیٹھ گئے، سلطنت کی تباہی، آئے دن کے قتل و غارت کے سبب سے اکثر امرا و شرفا کے گھرانے گھر اور شہر چھوڑ کر نکل گئے مگر ان کے پائے استقلال کو جنبش نہ ہوئی، اللہ پر توکل رکھا اور جو سجادہ بزرگوں نے بچھایا تھا اس پر بیٹھے رہے۔

علوم و فنون میں طاق تھے، تصوف اور موسیقی میں اچھی مہارت تھی، دلی کے بڑے بڑے باکمال گویے اپنی اپنی چیزیں بہ نظر اصلاح لا کر سنایا کرتے تھے۔

ہر مہینہ کی دوسری اور چوبیسویں تاریخ کو ان کے ہاں محفلِ سماع منعقد ہوتی تھی، اس میں علما و مشائخ اور اکثر امرا شرکت کرنا فخر سمجھتے تھے، شاہ عالم بادشاہ بھی کئی بار اس میں شریک ہوئے ہیں، ایک بار بغیر اطلاع کے چلے آئے، چوں کہ پاؤں میں درد تھا، ضبط نہ کر سکے، ذرا پاؤں پھیلا دیا، خواجہ صاحب اس بے ادبی کے متحمل نہ ہو سکے، فرمایا یہ امر فقیر کی آدابِ محفل کے خلاف ہے، بادشاہ نے عذر کیا اور معافی چاہی، خواجہ صاحب نے فرمایا کہ اگر طبیعت ناساز تھی تو تکلیف کرنے کی کیا ضرورت تھی، اس سے خواجہ صاحب کے استغنا کا اندازہ کرو، حقیقت یہ ہے کہ وہ اپنے فضل و کمال کے ساتھ قدیم متانت اور تہذیب کی ایک مجسم تصویر تھے، ضبط نفس، استقلال اور قناعت ان کی مشیخت کا طرۂ افتخار تھا۔

اسرار الصلوٰۃ ایک رسالہ ہے جو پندرہ برس کے سن میں لکھا ہے، وارداتِ درد نام ایک دوسری کتاب ہے جس میں ایک سو گیارہ رسالے ہیں، نالۂ درد، آہ سرد، درد دل، سوز دل، شمع محفل وغیرہ، اس کی شرح میں علم الکتاب جیسی کتاب تصنیف کی، اگر ان کے فضل و کمال کا صحیح اندازہ کرنا چاہو تو علم الکتاب کا مطالعہ کرو، ایک رسالہ مبحث غنا میں لکھا ہے، ایک

دیوان فارسی میں ہے، ایک ریختہ میں، میرے عزیز دوست نواب نور الحسن (۱) خاں مرحوم نے اپنی حسن عقیدت سے یہ سب کتابیں چھپوادی ہیں۔

---

(۱) یادش بخیر نواب نور الحسن خاں مرحوم امیر الملک والا جاہ نواب سید صدیق حسن خاں بہادر کے بڑے بیٹے جمال الدین خاں بہادر مدار المہام بھوپال کے نواسے نانا کی طرح عالی حوصلہ، فیاض، سیر چشم اور اپنے والد کے مانند ذہین، ذکی، قوی الحفظ اور سریع الادراک تھے، ۲۱؍ رجب ۱۲۷۸ھ کو بھوپال میں پیدا ہوئے، اپنے والد ماجد و دیگر علما و محدثین سے علوم آلیہ و عالیہ کی تحصیل کی اور افتخار الشعرا حافظ خان محمد خان شہیر سے مشق سخن کی۔

ایک مدت تک اپنے والد اور نواب شاہجہاں بیگم والیہ بھوپال کے سایۂ عاطفت میں نہایت عیش و آرام سے زندگی بسر کی، بچپن سے مزاج میں بے تعلقی اور وارستگی تھی، جمال الدین خاں بہادر کے بعد نواب شاہجہاں بیگم مرحومہ نے چاہا کہ ان کو مدار المہام مقرر کریں مگر اس کو منظور نہیں کیا، حقائق و معارف کے دلدادہ تھے، مطالعہ یا مذاکرہ میں صرف اوقات کرنے کو پسند کرتے تھے۔

نواب شاہجہاں بیگم کے انتقال کے بعد لکھنؤ میں آکر بود و باش اختیار کی اور اسی بے تعلقی اور وارستگی میں زندگی بسر کردی، اخیر زمانہ میں گوناگوں امراض میں مبتلا ہوجانے خصوصاً اختلاج قلب اور خفقان کی وجہ سے کاوشِ فکر کی عادت جاتی رہی تھی مگر اس پر بھی تھوڑے تامل کے بعد نہایت آبدار شعر کہہ لیتے، زود نویس ایسے تھے کہ جب بیٹھ جاتے تو جزو دو جزا ایک جلسہ میں لکھ کر اٹھتے، زود نویسی کے ساتھ شیریں قلم بھی تھے اور ان دونوں باتوں میں اپنے والد نامدار کی یادگار تھے، ذہن نہایت سلیم تھا، حافظہ کی یہ کیفیت تھی کہ تیس پینتیس برس پہلے حدیث شریف کی کتابیں پڑھی تھیں مگر موقع آجاتا تو متن اور اسناد کے ساتھ روایت پیش کردیتے۔

فیاضی اور سیر چشمی میں اپنے نانا کی نظیر تھے، امیر، فقیر، بچہ، بوڑھا جو آتا اس کو کچھ دیے بغیر نہ رہتے اور دینا بھی وہی جو اس کے مناسب حال ہو اور دیتے بھی اسی طرح سے کہ ایک ہاتھ سے دیں دوسرے کو خبر نہ ہو، ان کے بچوں کو معلوم نہ تھا کہ بیوی کو کیا دیا اور بیوی کو معلوم نہ تھا کہ بیٹی کو کیا دے آئے (باقی اگلے صفحہ پر)

آزاد کہتے ہیں کہ میر صاحب نے ان کو آدھا شاعر مانا ہے، میرے نزدیک میر صاحب پر یہ نرا بہتان ہے جس کو آب حیات میں آزاد نے چمکا کر دس پانچ جگہ بیان کیا ہے، میر صاحب کی جو رائے خواجہ صاحب کے باب میں ہے اس کو پڑھ چکے، نکات الشعرا چھپ گیا ہے،

سابقہ حاشیہ: اسی پر باہر والوں کا قیاس کرو۔

بڑی خصوصیت ان کے دینے کی یہ تھی کہ دیتے اس طرح سے تھے کہ لینے والے کو شرمندگی ہوتی اور اس کو بغیر لیے بن نہ پڑتا، دینے کی اور کوئی تدبیر بن نہ پڑتی تو جس کسی کو کچھ دینا ہوتا اس کی کسی شکستہ اور بوسیدہ چیز کی تعریف کرتے اور کہتے کہ یہ مجھے بہت پسند ہے، میری فلاں چیز سے بدل لیجیے، وہ کہتا کہ بدلنے کی کیا ضرورت ہے، آپ اس کو یونہی قبول فرمایئے تو اس کو نہ مانتے اور بدل کر چھوڑتے اور اس کو دوسرے وقت کسی اور حاجت مند کو دے دیتے۔

دستر خوان وسیع تھا اور مزیدار کھانوں کو تیار کرانے کا شوق تھا، اپنے باورچی خانہ میں ہر روز طرح طرح کے کھانے پکائے جانے کا حکم دیتے، علاوہ اس کے شہر میں جہاں کہیں کوئی ہوشیار رکابدار آجاتا، بلا کر اس سے پکواتے، یا عرب و عجم سے کوئی سیاح آجاتا اس سے ترکیبیں پوچھتے اور پکانے کی فرمائش کرتے اور بے تکلف دوستوں کو مدعو کر کے خود بہت کم کھاتے مگر دوسروں کو اصرار کر کے کھلاتے۔

مرنے سے تقریباً پندرہ سال پہلے مجھ سے شناسائی ہوئی اور وہ یوماً فیوماً اتنی بڑھی کہ ان کو بغیر مجھ سے ملے چین نہ آتا تھا، ہر روز ایک دو بار خود تشریف لاتے اور گھڑیوں بیٹھتے اور اس فکر میں رہتے کہ مجھ کو اپنے ساتھ لے جائیں۔

گھر میں اگر کبھی کسی کو چھینک آگئی اور ان کو معلوم ہو گیا تو فوراً تشریف لاتے اور کہتے کہ چلیے فلاں مریض کو دکھانا ہے، وہاں پہنچتا تو اکثر ایسا ہوتا کہ علمی اذکار یا کھانے پینے کے شغل میں سارا وقت کٹ جاتا اور کسی مریض کے دیکھنے کی نوبت نہ آتی اور کچھ بہانہ نہ ملتا تو حسب معمول صبح سے آکر مطب میں بیٹھ جاتے، جس وقت بھیڑ چھٹ جاتی کہتے کہ میں نے فلاں کتاب نئی منگوائی ہے چل کر دیکھو، یا میں نے تمہارے لیے خاص کر فلاں فلاں کھانے پکوائے ہیں، غرض کہ ہر روز کوئی نہ کوئی بہانہ (باقی اگلے صفحہ پر)

اس کو دیکھ لو۔

خواجہ صاحب کی زبان اور طرز ادا وہی ہے جو میرؔ کی ہے، قصیدہ کی طرف مائل نہیں ہوئے، اس واسطے کہ جس مرتبہ کے وہ آدمی تھے اس کو بھٹئی سے کیا نسبت، غزلوں کا دیوان بقول میر حسن کے مثل دیوانِ حافظ کے سراپا انتخاب ہے، تصوف اور اخلاق کی چاشنی کے اعتبار سے ان کا کلام میرؔ و مرزاؔ کے کلام سے زیادہ دلآویز ہے۔

خواجہ صاحب نے ۲۴ صفر ۱۱۹۹ھ روز جمعہ اڑسٹھ برس کی عمر میں رحلت فرمائی، دلی میں ان کا مرقد منور ترکمان دروازے سے باہر زیارت گاہِ خاص و عام ہے۔

سابقہ حاشیہ: لے جانے کا تلاش کر لیتے مگر باوجود اس کے کہ ہر وقت یکجائی رہتی، دور باش اور ادب کا رکھ رکھاؤ اخیر وقت تک اتنا قائم رکھا جس سے زیادہ تصور میں نہیں آسکتا، میں ان سے عمر میں چھوٹا اور فضیلت علمی میں کم پایہ تھا مگر محبت کا قانون سب سے نرالا قانون ہے، خدا جانے کیوں وہ میرا ادب کرتے تھے، گاڑی میں کبھی میرے پاس نہیں بیٹھتے، مکان میں تکیہ سے لگ کر نہیں بیٹھے، میرے سامنے کبھی ننگے سر نہیں بیٹھے، کبھی لیٹے نہیں، کبھی بغیر سہارے بیٹھے بیٹھے تھک جاتے تو دوسرے کمرے میں چلے جاتے، وہاں تھوڑا سا آرام کر کے پھر آ کر بیٹھ جاتے، مرض الموت میں بھی باوجود شدت تنفس کے جس وقت میں جاتا گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کرتے اور خود نہ اٹھ سکتے تو آدمیوں کو حکم دیتے کہ وہ اٹھا کر بٹھادیں، میں نے ہر چند کوشش کی کہ اس وضعداری کو اب ترک کر دیں مگر نہیں مانا، صرف اس وقت لیٹے جب سکرات کی حالت میں اٹھ نہ سکتے تھے اور حیف صد ہزار حیف کہ یہ گنج خوبی ۸ محرم ۱۳۳۶ھ کو پیوند زمین ہوگیا۔

مرحوم کو خواجہ میر دردؔ سے بہت عقیدت تھی، ان کی تصنیفات جہاں تک مل سکیں، نالۂ درد، آہ سرد، سوز دل، شمع محفل ایک مجموعہ میں، علم الکتاب جو مجلد ضخیم ہے، دیوان فارسی اور مجموعہ رباعیات فارسی اپنے صرف سے، ان کے والد کی کتاب نالۂ عندلیب دو جلدوں میں سرکار عالیہ بھوپال سے کہہ کر چھپوائیں، ان کے علاوہ دیگر مصنفین کی بہت سی کتابیں چھپوائیں، خود بھی صاحب تصنیف تھے، اردو فارسی کلام کا مجموعہ، طرز عشق اردو شعرائے کلام کا بہترین مجموعہ اور مجموعۂ رسائل تصوف بار بار چھپوا کر تقسیم کیے تھے۔

ہوگیا مہماں سرائے کثرتِ موہوم آہ — وہ دل خالی کہ تیرا خاص خلوت خانہ تھا
وائے نادانی کہ بعد از مرگ یہ ثابت ہوا — خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا

قتلِ عاشق کسی معشوق سے کچھ دور نہ تھا — پر ترے عہد سے آگے تو یہ دستور نہ تھا
ذکر میرا تو وہ کرتا تھا صریحاً لیکن — میں نے پوچھا تو کہا خیر یہ مذکور نہ تھا

سینۂ و دل حسرتوں سے چھا گیا — بس ہجومِ یاس جی گھبرا گیا
میں نے تو ظاہر نہ کی تھی دل کی بات — پر مری نظروں کے ڈھب سے پا گیا

ان بتوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا

دردؔ ہم کو یہ رات دن تیرا — نالۂ زار خوش نہیں آتا

تو اپنے دل سے غیر کی الفت نہ کھو سکا — میں چاہوں اور کو تو یہ مجھ سے نہ ہو سکا

گو نالہ نارسا ہو نہ ہو آہ میں اثر — میں نے تو درگزر نہ کی جو مجھ سے ہو سکا

ہے کوتہی اجل کی طرف سے وگرنہ میں — اک عمر سے اسیر ہوں زلفِ دراز کا

سو بھی نہ تو کوئی دم دیکھ سکا اے فلک — اور تو یاں کچھ نہ تھا ایک مگر دیکھنا

نالۂ دل کا اثر دیکھ لیا دردؔ بس — جی میں نہ رہ جائے یہ آہ بھی کر دیکھنا

کی تو تھی تاثیر آہِ آتشیں نے اس کو بھی — جب تلک پہنچے ہی پہنچے راکھ کا یاں ڈھیر تھا

پھرتی ہے میری خاک صبا در بدر لیے — اے چشمِ اشک بار یہ کیا تجکو ہو گیا

مثلِ نگیں جو ہم سے ہوا کام رہ گیا — ہم روسیاہ جاتے رہے نام رہ گیا

یارب یہ دل ہے یا کوئی مہماں سرائے ہے　　غم رہ گیا کبھو، کبھو آرام رہ گیا
سو بار سوزِ عشق نے دی آگ پر ہنوز　　دل وہ کباب ہے کہ جگر خام رہ گیا

دل بھی اے دردؔ قطرۂ خوں تھا　　آنسوؤں میں کہیں گرا ہوگا

وہ دن کدھر گئے کہ ہمیں بھی فراغ تھا　　یعنی کبھو تو اپنے بھی دل تھا دماغ تھا

جایئے کس واسطے اے دردؔ میخانہ کے بیچ　　اور ہی مستی ہے اپنے دل کے پیمانے کے بیچ

صیاد اب رہائی سے کیا مجھ اسیر کو　　ہے کس کو زندگی کی توقع بہار تک

ہمارے پاس ہے کیا جو فدا کریں تجھ پر　　مگر یہ زندگیِ مستعار رکھتے ہیں

مدت تلک جہاں میں ہنستے پھرا کیے　　جی میں ہے خوب روئیے اب بیٹھ کر کہیں

جو اہل دید ہیں انہیں گلشن میں جا نہیں　　نرگس کی گو کہ آنکھیں ہیں پر سوجھتا نہیں

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں　　دل ہی نہیں رہا ہے کہ کچھ آرزو کریں

نزع میں تو ہوں ولے تیرا گلہ کرتا نہیں　　دل میں ہے وہ ہی وفا پر جی وفا کرتا نہیں

نہیں شکوہ مجھے کچھ بے وفائی کا تری ہرگز　　گلہ تب ہو اگر تو نے کسی سے بھی نباہی ہے

کیا فرق داغ و گل میں اگر گل میں بو نہ ہو　　کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو

اپنے بندہ پہ جو کچھ چاہو سو بیداد کرو　　پر نہ آجائے کہیں جی میں کہ آزاد کرو
نہ کہیں عیش تمہارا بھی منغص ہو جائے　　دوستو دردؔ کو محفل میں نہ تم یاد کرو

اہل فنا کو نام سے ہستی کے ننگ ہے　　لوحِ مزار بھی، مری چھاتی کا سنگ ہے

خدا جانے کیا ہوگا انجام اس کا　　میں بے صبر اتنا ہوں وہ تند خو ہے

کس لیے آئے تھے اور کیا کر چلے　　تہمتِ چند اپنے ذمہ دھر چلے
زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے　　ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں　　چشم تر آئے تھے دامن تر چلے
ساقیا اب لگ رہا ہے چل چلاؤ　　جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

اگلے معانقے کو اگر کیجیے معاف　　لگ جایئے گلے سے مکافات کے لیے

اس طرح سے یک لخت جو آنسو نہیں تھمتے　　معلوم ہوا دردؔ کہیں آنکھ لڑی ہے

تیری گلی میں، میں نہ چلوں اور صبا چلے　　یوں ہی خدا جو چاہے تو بندہ کی کیا چلے

روندے ہے مثل نقش قدم خلق یاں مجھے　　اے عمرِ رفتہ چھوڑ گئی تو کہاں مجھے

دل بھلا ایسے کو اے دردؔ نہ دیجیے کیوں کر　　ایک تو یار ہے اور تس پہ طرحدار بھی ہے

سلطنت پر نہیں ہے کچھ موقوف　　جس کے ہاتھ آئے جام سو جم ہے

رباعی

اے دردؔ یہ درد جی کا کھونا معلوم　　جوں لالہ جگر سے داغ دھونا معلوم
گلزار جہاں ہزار پھولے لیکن　　میرے دل کا شگفتہ ہونا معلوم

☆☆☆

سید محمد میر سوزؔ

میر تخلص، جوانے است، بسیار اہل خوش طبع، ہر چند طرز علاحدہ دارد
لیکن از خوش کردن تخلص من نصف دلم از و خوش است۔ (اھ، نکات الشعرا)
بسیار نازک طبع، زود رنج، نکتہ سنج، مردے عجیب ہست و شخصے
غریب، موجد طرز علاحدہ، شعر را بادائے نادر کہ دست و چشم بلکہ تمام اعضا
در حرکت می آیند می خواند و مردمانِ نافہم را متوجہ جانب خود می گرداند۔
(اھ، طبقات الشعرا)
در عہد خود از جملہ ادا بندان ممتاز طرز ادا اور املک اوست و خواندنِ
اشعارش از زبان او نیکو از خواندنش چناں خوب می نماید کہ در گفتن نمی آید۔"
(اھ، تذکرۂ میر حسنؔ)

سید محمد میر نام، سوزؔ تخلص، میر ضیاء الدین کے بیٹے اور قطب عالم گجراتی کی اولاد میں تھے، دہلی میں پیدا ہوئے وہیں نشو و نما پائی، تعجب ہے کہ گلشن بیخار میں ان کو لکھنوی لکھا ہے، ایک طرح سے یہ بھی سچ ہے کہ یہ لکھنؤ میں آ کر پیوند خاک ہوئے ہیں۔

خط شفیعہ اور نستعلیق خوب لکھتے تھے، شہسواری اور تیر اندازی میں خوب ماہر تھے، ورزش کرتے تھے اور طاقت خداداد ایسی تھی کہ ہر ایک ان کی کمان کو چڑھا نہ سکتا تھا، شعر و سخن کا شوق بچپنے سے تھا، پہلے میر تخلص کرتے تھے، جب میر تقی میرؔ کی شہرت نے میر کو اپنے لیے

مخصوص کرلیا تو انہوں نے سوز اختیار کیا۔

آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے ان کو پاؤ شاعر مانا ہے، ایک خود، ایک مرزا رفیع سودا، آدھے خواجہ میر درد، پاؤ میر سوز، یہ آزاد کی صرف بذلہ سنجی ہے، خواجہ میر درد کے حال میں اس کو میں لکھ چکا ہوں۔

ہاں اس میں شبہہ نہیں کہ میر سوز کی شاعری کو اس زمانہ کے شعرا خاطر میں نہ لاتے تھے، میر صاحب کا قول دیکھو "ہر چند طرز علاحدہ دارد"، میر حسن کی بھی سنو، وہ کیا کہتے ہیں "از خویش چناں خوب می نماید کہ در گفتن نمی آید" شیفتہ نے کھل کر کہہ دیا ہے "کلامش از جادۂ مستقیمہ شعرا، برکراں" مگر انصاف یہ ہے کہ آزاد کی رائے اس میں بے لاگ ہے، وہ کہتے ہیں کہ میر سوز کی زبان عجب میٹھی زبان ہے اور حقیقت میں غزل کی جان ہے، ان کی انشا پردازی کا حسن تکلف اور صنائع مصنوعی سے بالکل پاک ہے، البتہ غزل میں دو تین شعر کے بعد ایک آدھ پرانا لفظ ضرور کھٹک جاتا ہے۔

شاہ عالم کے زمانہ میں جب دلی پر تباہی آئی تو میر سوز بھی گھبرا گئے، سیدھے فرخ آباد گئے اور نواب مہربان خاں رند کی سرکار میں کچھ دنوں زندگی بسر کی، اس کے بعد لکھنؤ آئے مگر رنگ نہیں جما، مرشد آباد گئے، وہاں بھی قسمت نے یاوری نہ کی پھر لکھنؤ واپس آئے، اب کی تقدیر چمکی، نواب آصف الدولہ ان کے شاگرد ہو گئے، چند روز آرام سے نہ گزری تھی کہ ۱۲۱۳ھ میں ستر برس جی کر دنیا سے گزر گئے۔

آہ یارب رازِ دل ان پر بھی ظاہر ہو گیا　　اہل ایماں سوز کو کہتے ہیں کافر ہو گیا

کہ تیرا اشک جس جا گر پڑے گلزار ہو پیدا　　تڑپتی کیوں ہے اے بلبل کمال اتنا تو پیدا کر

ہاتھ میں اک روز تو دامانِ قاتل ہوئے گا　　قتل سے یہ بے گنہ راضی ہے اپنے اس لیے

جو تم سے بتاں ہوگا سو اللہ کرے گا　　کعبہ ہی کا اب قصد یہ گمراہ کرے گا

سوؔز کیوں آیا عدم کو چھوڑ کر دنیا میں تو وہاں تجھے کیا تھی کمی، یہاں تجکو کیا درکار تھا

یہ سب باتیں ہیں قاصد یار میرے گھر نہیں آتا
نہ دیکھوں جب تلک آنکھوں سے کچھ باور نہیں آتا

کہتا نہ تھا میں اے دل اس کام سے تو باز آ دیکھا مزا نہ تو نے نادان عاشقی کا

بغیر از عاشقی کچھ کام مجھ سے ہو نہیں سکتا تڑپنے کے سوا آرام مجھ سے ہو نہیں سکتا

اور تو بس نہیں چلتا ہے رقیبوں کا مگر سوؔز کے نام کو لکھ لکھ کے جلا دیتے ہیں

لوگ کہتے ہیں مجھے یہ شخص ہے عاشق کہیں عاشقی معلوم لیکن دل تو بے آرام ہے

سر زانو پہ ہو اس کے اور جان نکل جائے مرنا تو مسلم ہے ارمان نکل جائے

منھ دیکھو آئینہ کا تری تاب لا سکے خورشید پہلے آنکھ تو تجھ سے ملا سکے

اشک خوں آنکھوں میں آکر جم گئے دور کے بھی دیکھنے سے ہم گئے

ایک آفت سے تو مر مر کے ہوا تھا جینا پڑ گئی اور یہ کیسی مرے اللہ نئی

جوں خضر ہوس عمرِ ابد کی نہیں مجکو اس دم کی تمنا ہے جو تجھ پاس گزر جائے

پرکار کی روش پھر سے ہم جتنے چل سکے اس گردشِ فلک سے نہ باہر نکل سکے

☆☆☆

شیخ قیام الدین قائم

''بسیار آدم با مزہ واہل درد، متواضع، خلیق، مہذب صورت، پاکیزہ سیرت، خوش مقال ودر سخن باکمال، از خوش خیالانِ زماں وبلند فطرتانِ جہاں فکر رسا دارد ودر نازک خیالی ومعنی یابی دادِ سخنوری می دہد۔ (اھ، طبقات الشعرا)

در پختگی کلام وچستی مصراع غزل وروبہ قصیدہ ومثنوی وغیرہ موافق رواج زمانہ دوش بہ دوش استاد راہ می رفت بلکہ دربعضے مقام رجحان می جست۔''

(اھ، تذکرۂ مصحفی)

قیام الدین علی نام تھا، قائم تخلص، چاند پورا ضلع بجنور کے رہنے والے تھے مگر ملازمت کے تعلق سے زندگی کا بیشتر حصہ دلی میں بسر ہوا، توپ خانہ میں اسامی تھی، تحصیل علم کا حال معلوم نہیں، مگر اس قدر استعداد ضرور تھی کہ اپنی انشا پردازی میں خلل نہیں آنے دیتے اور یہ جوہر اس زمانہ کے شریف خاندانیوں کے لیے عام تھا۔

دلی اس زمانہ میں آج کی سی دلی نہ تھی، خواجہ میر درد، مرزا رفیع سودا، میر محمد تقی میر، سید محمد میر اثر، حکیم ہدایت اللہ وغیرہ جیسے ارباب کمال کا جمگھٹا تھا اور شاعری کا ہنگامہ گرم تھا، ان کو بھی شعر وسخن کا شوق پیدا ہوا، خواجہ میر درد کی خدمت میں آنے جانے لگے، چند روز ان سے فیضیاب ہو کر مرزا رفیع سودا کے شاگرد ہوئے اور ایسی مشق بہم پہنچائی کہ ان کے طرز ادا کو دیکھ کر سودا کے کلام کا دھوکا ہوتا ہے۔

دلی کی تباہی کے بعد وطن واپس آئے اور کچھ دنوں نواب محمد یار خاں (۱) کے

ساتھ ٹانڈہ میں زندگی بسر کی، جب ان کا بھی کام بگڑا تو رامپور چلے گئے اور احمد یار خاں پسر نواب فیض اللہ خاں نے ان کی تنخواہ مقرر کردی، کچھ دنوں اسی پر قناعت کی، جب تنگ حالی سے زیادہ پریشاں ہوئے تو لکھنؤ آئے اور مہاراجہ ٹکیت رائے کا شقہ اپنے وطن کے عامل کے نام لے گئے، یومیۓ اور ملکیتیں جو ضبط ہو چکی تھیں ان کو پھر بحال کرایا۔

اس کے بعد پھر رامپور چلے گئے اور وہیں ۱۲۱۰ھ میں انتقال کر گئے۔

قسمت کو دیکھیے کہ کہاں ٹوٹی جا کمند　　دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا

غیر سے ملنا تمہارا سن کے گو ہم چپ رہے　　پر سنا ہوگا کہ تم کو ایک جہاں نے کیا کیا

---

(۱) نواب محمد یار خاں امیر تخلص، نواب علی محمد خاں مورث نوابانِ رامپور کے چوتھے بیٹے اور نواب فیض اللہ خاں رئیس رامپور کے بھائی تھے، انولہ کے قریب ٹانڈہ ایک بستی ہے، وہاں بود و باش تھی، شعر و سخن اور سیر و شکار کا شوق تھا، میر سوزؔ اور مرزا محمد رفیع سوداؔ کو فرخ آباد بلایا تھا، وہ نہیں آئے تو شیخ قیام الدین کو بلا کر سو روپیہ ماہوار ان کے کر دیے اور ان سے مشق سخن کی، شیخ غلام ہمدانی مصحفیؔ، فدوی لاہوری، میر محمد نعیم پروانہؔ علی شاہ، میاں عشرت، حکیم اکبر علی سنبھلی وغیرہ شعرا بھی ملازم تھے اور رات دن شعر و سخن کا چرچا رہتا تھا، ان کے حکم سے عاقل خاں مصور نے ایک مرقع تیار کیا تھا جس میں نواب اور ان کے حاشیہ نشیں شاعروں کی تصویریں بنائی تھیں۔

مرہٹہ گردی میں یہ تمام لوگ بنات النعش کی طرح منتشر ہو گئے اور نواب کو فیض اللہ خاں آ کر رامپور لے گئے اور پچاس ہزار سالانہ ان کی جیب خاص کے لیے مقرر کر دیا، ۱۱۸۸ھ میں وفات پائی۔

بیٹھے بٹھائے کوچۂ قاتل میں لے گیا　　یارب برا ہو اس دل خانہ خراب کا

ساقی گزک کی کچھ نہیں حاجت شراب دے　　ہم دل جلوں میں آپ مزا ہے کباب کا

گر وقتِ ذبح نالہ کیا میں نے کیا ہوا　　پیارے کسی کا ہاتھ، کسی کی زباں چلے

معاملہ ہے یہ دل کا اسے کہے گا کون　　پیامبر کے ہمیں ساتھ آپ جانا تھا

لے گیا خاک میں ہمراہ دل اپنے قائم شاید اس جنس کا یاں کوئی خریدار نہ تھا

ظالم تو مری سادہ دلی پر تو رحم کر روٹھا تھا آپ ہی تجھ سے اور آپ ہی من گیا

قائم ضرور کیا ہے اب اس جنگجو سے صلح مدت ہوئی کہ جان سے میں ہاتھ دھو چکا

طوفان گریہ کی ہے مرے حد عمر نوح دریا نہیں کہ آج چڑھا کل اتر گیا

درد دل کچھ کہا نہیں جاتا آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا

ہردم آنے سے میں بھی ہوں نادم کیا کروں پر رہا نہیں جاتا

جلوہ ہر رنگ میں ہے اس بت ہرجائی کا یہ پریشاں نظری جرم ہے بینائی کا

قائم آتا ہے مجھے رحم جوانی پہ تری مر چکے ہیں اسی آزار میں بیمار بہت

کچھ طرفہ مرض ہے زندگی بھی اس سے جو کوئی جیا تو مر کر

تم کو کیا قدر ہے اے دیدہ مرے رونے کی ایک بوند آتی ہے سو خونِ جگر سے باہر

جو سوزِ عشق کا چرچا وہاں نہیں قائم تو کیا میں جاؤں گا دینے بہشت میں آتش

مے کی توبہ کو تو مدت ہوئی قائم لیکن بے طلب اب بھی جو مل جائے تو انکار نہیں

مجھ سا جہاں میں کوئی بھی آشفتہ سر نہیں ہے یوں تو زلف یار بھی پر اس قدر نہیں

آگے مرے نہ غیر سے گو تم نے بات کی سرکار کی تو نظروں کو پہچانتا ہوں میں

تنگ تو ہم کو تو اے حبیب کرے ہے لیکن
اٹھ گیا ہاتھ گر اپنا تو پھر اک تار نہیں

جورِ سپہر، دوریِ یاران دردے غیر
جو کچھ نہ دیکھنا تھا سو اب دیکھتا ہوں میں

ایک مدت سے یہاں وہ تو موا پھرتا تھا
آج تم مرنے کا عاشق کے عجب کرتے ہو

تھا بد و نیک جہاں سے میں عدم میں آزاد
آہ کس خواب سے ہستی نے جگایا مجکو

اس حسن نیم رنگ کے صدقے کہ جس کے بیچ
ہلکی سی ایک شوخی کی نہ ہو حیا کے ساتھ

دامانِ گل تئیں ہے کہاں دسترس مجھے
تکلیف سیر باغ نہ کرائے ہوس مجھے

بعد خط آنے کے تھا اس سے وفا کا احتمال
لیک واں تک عمر نے اپنے وفاداری نہ کی

دنیا میں ہم رہے تو کئی دن پہ اس طرح
دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہماں رہے

خدا نہ کردہ اسے غیر سے نہیں سروکار
تھی ایک بات ہمارے ہی یہ جلانے کی

کسی بلا میں پھنسے قید ہوئے جان سے جائے
پر آدمی کو خدا تجھ پہ مبتلا نہ کرے

بتوں کی دید کو جاتا ہوں دیر میں قائم
مجھے کچھ اور ارادہ نہیں خدا نہ کرے

شیخ جی آیا نہ مسجد میں وہ کافر ورنہ ہم
پوچھتے تم سے کہ اب وہ پارسائی کیا ہوئی

دل ڈھونڈتا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے
اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

گو ہم (۱) سے تم ملے نہ تو کچھ ہم نہ مر گئے
کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

کسی کے پھرنے نہ پھرنے سے کیا خدا نہ پھرے　　پھرے زمانہ جہاں تک ہے ہم سے یا نہ پھرے

جی دیجیے تو دیجیے پر دل نہ کیجیے　　مرجائیے کسی سے پر الفت نہ کیجیے

وہ دن گئے کہ ارادہ تھا بادشاہی کا　　فلک جو دے تو خدا بھی اب نہ لے قائم

میں ہی کچھ اللہ کا ڈر کر گیا　　تا بفلک نالہ تو پہنچا تھا رات

☆☆☆

(۱) حسرت کے مطبوعہ دیوانِ قائم میں یہ شعر اس طرح ہے:

کہنے کو رہ گیا یہ سخن دن گزر گئے　　ہم سے ملے نہ آپ تو ہم بھی نہ مر گئے

انعام اللہ خاں یقینؔ

”جوانے بود، خوش رو، خوش گو، خوش خلق و قابل منظور نظر و تربیت کردہ مرزا مظہر موصوف، در عین عنفوان جوانی پدر نسبت تقصیرے کہ از یقین بہ وقوع آمدہ باشد گشت و یقین است کہ مغفرتش شدہ باشد۔ (اھ، طبقات الشعرا)

بے اغراق ریختہ گوئی بر طاق بلند گذاشتہ و تخم معنی در زمین سخن کاشتہ و انچہ از طبعش سرزدہ از فرط شیوع و حسن قبول در تمام ہندوستان بر افواہ دانسہ جاری است۔ (اھ تذکرۂ فتح علی شاہ)

در دورۂ ایہام گویان اول کسے کہ ریختہ راشستہ و رفتہ ایں جوان بود، بعد ازاں تتبعش بہ دیگراں رسیدہ، چنانچہ خودمی گوید:

حق کو یقین یارو برباد مت دو آخر ۔۔۔ طرز سخن کے اس کے تم نے اڑائیاں ہیں“

(تذکرۂ مصحفی)

انعام اللہ خاں نام تھا، یقین تخلص، نواب اظہر الدین خاں کے بیٹے، حضرت شیخ عبدالاحد سرہندی کے پرپوتے اور جناب مرزا مظہرؒ کے شاگرد رشید تھے، معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کلام کے زور میں وہ دوسروں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، میر صاحب ان سے بہت خفا ہیں، نکات الشعرا میں لکھتے ہیں:

”القصہ پردبوچ چندے کہ بافتہ است کہ ما و شما نیز توانیم بافت،

ایں قدر برخود چیدہ است کہ رعونت فرعون پیش او پشت برزمین می گزارد،
بعد از ملاقات ایں قدر معلوم شد کہ ذائقہ سخن فہمی مطلق نہ دارد۔"

میر صاحب کی زبردستی دیکھو، یقینؔ کا دیوان ان کی سخن گوئی کی زندہ شہادت ہے، ایسے سخن گو کی سخن فہمی کا انکار کرنا میر صاحب کی زبان سے اچھا نہیں لگتا، اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ ان کے معاصرین میں سے کچھ لوگ سرے سے یقینؔ کے کلام کو مرزا صاحب کی طرف منسوب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یقین کو شعر کہنا ہی نہیں آتا تھا، محمد حسین کلیمؔ نے اس شعر میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے:

یقیںؔ کے شعروں پر ہیں بدگماں بعضے کہ اس کے نہیں
غلط ہے ہم نے بوجھا ہے گا مرزا جانجاناں کو

مگر میر صاحب نے باوجود ناراضی کے اس سے انکار کیا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"مردمان می گفتند کہ مرزا مظہر اورا شعر گفتہ می دہد و وارث شعر ہائے
ریختہ خود گردانیدہ از قبول کردن ایں معنش بندہ را خندہ می آید کہ ہمہ چیز
بہ وارث می رسد الا شعر، مثلاً کسے کہ بر شعر پدر خود یا بر مضمون او متصرف شود،
ہمہ کس او را وزد خواہند گفت تا بہ شعر استاد چہ رسد۔"

مصحفیؔ کے تذکرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ۲۵ برس کے سن میں یقینؔ کا کلام تمام ہوگیا، اگر جیتے رہتے تو میر ہوں یا مرزا ہوں کسی کا چراغ ان کے سامنے نہیں جل سکتا تھا۔

کلام ملاحظہ ہو:

ہر گھڑی صحرا نشینی پر نہ کر جرأت یقیںؔ — آ گئی تھی راس مجنوں کو بیاباں کی ہوا

اتنا کوئی جہاں میں کبھی بے وفا نہ ہو — ملتے ہی تیرے مجھ سے یہ دل آشنا نہ تھا

جو کچھ کہیں یہ تجھ کو یقیںؔ ہے سزا تری — بندہ جو تو بتوں کا ہوا کیا خدا نہ تھا

تری الفت سے مرنا خوش نہیں آتا مجھے ورنہ — یہ ایسا کار آساں اس قدر دشوار کیوں ہوتا

خفیت مجھ سے الجھ کر عبث ہوا واعظ — کہ میں تو مست تھا اس کو بھی کیا شعور نہ تھا

فصل گل بھی آن پہنچی دیکھیے کیا ہو یقیںؔ — اب کی چلتا ہے جنوں پر جی ہمارا بے طرح

بہار آخر ہوئی ہے اب تو سینے دے گریباں کو — یقیںؔ کرتا ہے کوئی اس قدر دیوانہ پن بس کر

ناصح سے مجکو غم نے کیا شرمسار حیف — سو بار پھٹ چکا یہ گریباں ہزار حیف

کعبہ سے ہم گئے نہ گیا پر بتوں کا عشق — اس درد کی خدا کے بھی گھر میں دوا نہیں

یہ سینہ عشق سے محرومِ درد و داغ نہیں — ہزار شکر کہ یہ ملک بے چراغ نہیں

یقیںؔ مارا گیا جرم محبت پر زہے طالع — شہادت اس کو کہتے ہیں سعادت اس کو کہتے ہیں

فکر مرہم کی مرے واسطے مت کر ناصح — خوب ہوتا نہیں اس عشق کا ناسور کبھو

روداد محبت کی، مت پوچھ یقیںؔ مجھ سے — کچھ خوب نہیں سننا افسوں ہے یہ افسانہ

اگرچہ عشق میں آفت ہے اور بلا بھی ہے — نرا برا نہیں یہ شغل کچھ بھلا بھی ہے

جور و جفا میں یار بہت ہو گیا دلیر — کرنے کو کی، پہ راس نہ آئی وفا مجھے

عشق میں ملتی نہیں راحت مگر جوں کوہ کن — جانِ شیریں دیجیے تب خوابِ شیریں کیجیے

اگر زنجیر میرے پیر میں ڈالی تو کیا ہوگا — بہار آنے دو میرا ہاتھ ہے اور یہ گریباں ہے

یقیںؔ کے واقعے کی سن خبر وہ بدگماں بولا — یہ دیوانہ تو ایسا تو نہ تھا بیمار کیا کہیے

نظر آتا نہیں ثابت گریباں ایک غنچے کا — چمن پر یہ کیا ستم کرتا ہے اے بادِ صبا کوئی

شب ہجراں کی وحشت کو تو اے بیدار کیا جانے
جون دن پڑتے ہیں راتوں کو مجھے تیری بلا جانے

گریباں چاک کرنے سے کسی کے کیا تجھے ناصح
ہمارے ہاتھ جانیں اور ہمارا پیرہن جانے

خطا ہے مفت مر کر یار کیوں دیجیے رقیبوں کو
ہماری ہم سے پوچھو، کوہ کن کی کوہ کن جانے

مفت کب آزاد کرتی ہے گرفتاری مجھے — جی ہی لے کر چھوڑے گی آخر یہ بیماری مجھے

یقیںؔ جاتا رہا گر بلبلوں کے ساتھ جانے دو — کوئی اس بے مروت دل کو اپنے پاس کیا رکھے

پڑیں پتھر الٰہی اس محبت پر کہ ہو بے کس — مرے فرہاد اور پرویز شیریں کو اٹھا لائے

یقیںؔ ہوا مجھے قطرہ سے اشک کے معلوم — نہ اٹھ سکے کوئی جو آنکھ سے گرا ہووے

حق مجھے باطل آشنا نہ کرے — میں بتوں سے پھروں خدا نہ کرے

☆☆☆

خواجہ احسن اللہ بیاںؔ

''شاعر عذب البیان از خوش گویانِ زمان خواجہ احسن اللہ المتخلص بہ بیاں، از تلامذۂ مرزا مظہر جانجاناں، مولدش شاہجہان آباد الحال معلوم نیست کہ کجا است زیچ نامہ از و مشہور ہست، بسیار خوب گفتہ رباعیات دلپذیر دارد۔'' (اھ، تذکرۂ میر حسن)

خواجہ احسن اللہ نام، بیان تخلص، اصلی وطن اکبر آباد تھا، دلی میں پیدا ہوئے اور مرزا مظہر جانجاناں علیہ الرحمہ کے آغوشِ تربیت میں ان کی شاعری نے ترقی کی، مولانا فخر الدین دہلوی کے مرید تھے، آخر عمر میں حیدر آباد گئے اور نواب آصف جاہ ثانی کی سرکار میں عزت سے زندگی بسر کی۔

خوش خلق، پاکیزہ سیرت، ظریف الطبع اور لطیف مزاج تھے، دوستوں سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے اور جو ایک بار ان سے ملتا وہ ہمیشہ ان سے ملنے کا متمنی رہتا۔

۱۲۱۳ھ میں وفات پائی اور حیدر آباد میں مدفون ہوئے، ان کے شاگرد رائے گلاب چند ہمدم نے تاریخ کہی ''استاد از جہاں رفت۔''

ان کے دیوان کا ایک قلمی نسخہ انڈیا آفس کے کتب خانہ میں موجود ہے اور ہندوستان میں بھی کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔

ان کے کلام کے دیکھنے سے پرانے تذکرہ نویسوں کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ صاحب اصول شاعری سے باخبر، خوش گو، تیز طبع اور مشاق سخنور تھے، ان کے کلام میں نمکینی اور رنگینی ایسے غضب کی ہے کہ شعر کو پڑھ کر دل تڑپ جاتا ہے، دور از قیاس استعاروں

اور پیچیدہ بندشوں سے کلام پاک وصاف ہے اور سادگی میں بھی اس کا انداز ایسا ہے جس پر ہزاروں بناوٹیں قربان کردی جائیں۔

کب تلک اس کی شکایت نہ ہو لب سے آشنا
ایک بیگانہ ہے مجھ سے اور سب سے آشنا

کوئی کسی کا بیان آشنا نہیں دیکھا
سوائے اس کے ان آنکھوں نے کیا نہیں دیکھا

کیوں آج سماتا نہیں سینہ میں خوشی سے
پہنچا ہے مگر دل! تجھے پیغام کسی کا

خانماں کچھ ہم بھی رکھتے تھے کبھو لیکن بیاںؔ
اب یہی در ہے، یہی گھر خانۂ الفت خراب

تو بزم سے اٹھا تو ہوئی تلخ مے کشی
میں سچ کہوں شراب کو سمجھا حرام آج

کہتا نہیں میں عرش پر اے نالہ جا پہنچ
کانوں تلک تو اس کے تو اے نارسا پہنچ

ہمارا ضعف بصارت ہے مانعِ دیدار
وگرنہ سامنے آنکھوں کے یار ہے موجود

عرش تک جاتی تھی اب لب تک بھی آسکتی نہیں
رحم آتا ہے بیاںؔ اب مجھ کو اپنی آہ پر

ہم سرگزشت کیا کہیں اپنی کہ مثلِ خار
پامال ہو گئے ترے دامن سے چھوٹ کر

صاف منہ پر میں نہیں کہتا کہ ہوگا اس کے پاس
ورنہ کیا واقف نہیں میں دل ہے میرا جس کے پاس

جانے دے مجھ کو اے ہوسِ سیرِ گلستاں
اب اس چمن سے اپنے غم آباد کی طرف

ہووے گا ذوق حسرتِ دیدار میں خلل
شیریں! اگزر نہ کیجیو فرہاد کی طرف

ہوئی آہ اب اس قدر نارسا
کہ سینے سے آتی نہیں لب تلک

تمنا بادشاہی کی کسی سفلہ کو ہووے گی
مرے دل میں خدائی کا بھی خطرہ ہوتو کافر ہوں

کافر ہو جس کے دل میں کچھ اور آرزو ہو
اک مختصر سی جا ہو میں ہوں بس اور تو ہو

قمارِ عشق کی بازی بھی کچھ دنیا سے باہر ہے
اسے کہتے ہیں جیتا جو کوئی یاں نقدِ جاں ہارے

رسوا ابھی سے کرتی ہے اے چشم تر مجھے
آتا ہے اس کی بزم میں بار دگر مجھے
آیا ہوں اس گلی سے ابھی دم نہیں لیا
پھر لے چلا ہے یہ دلِ وحشی ادھر مجھے

مت آئیو اے وعدہ فراموش تو اب بھی
جس طرح کٹا روز گزر جائے گی شب بھی
اب ہجر میں کہتا ہے کہ تھا وصل میں آرام
نالاں ہی بیاں میں نے تو دیکھا تجھے جب بھی

ہزاروں قصرِ جنت کے برابر میں سمجھتا ہوں
اگر گردوں دوں آسودہ زیر خاک رہنے دے
فرشتوں کی عبادت کا مصلّی ہے مرا دامن
اگر آلودگی دنیا کی اس کو پاک رہنے دے

شب فراق کی دہشت سے جان جاتی ہے
یہی ہے صبح سے دھڑکا کہ رات آتی ہے

جاتا ہے یار کچھ تو بیاں منہ سے بول دے
اے بے نصیب مانعِ گفتار کون ہے

خدا تجھے مرے آغوش سے جدا نہ کرے
یہ بات کہتے ہی دھڑکے ہے دل خدا نہ کرے

کیجیے عرض حال گو کچھ ہو
نہیں رہتی زبان پر آئی

کیا ہوا عرش پر گیا نالہ
دل میں اس شوخ کے تو راہ نہ کی

☆☆☆

میر محمد باقر حزیںؔ

''میر محمد باقر حزیں تخلص، شاعر ریختہ ست صاحب دیوان از نصیریان
مرزا جانجاناں مظہر شنیدہ می شود کہ بنگالہ رفت۔'' (اھ، نکات الشعرا)
''طبع رسا و فکرے والا داشت و در ملک سخنوری علم شاہی می افراشت
غنچۂ استعدادش از نسیم انفاس مرزا مظہر شگفتہ۔'' (تذکرۂ فتح علی شاہ)

میر محمد باقر نام تھا، حزیں تخلص، دہلی کے رہنے والے اور جناب مرزا مظہر علیہ الرحمہ کے شاگردوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے، مرزا صاحب کو بھی ان سے بے حد لطف تھا، دیوان میں جہاں کہیں استاد کا ذکر کرتے ہیں اس سے ان کے اخلاص و عقیدت اور مرزا صاحب کے لطف و کرم کا پتہ چلتا ہے، چنانچہ ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

جس طرح جی چاہتا ہے ہو نہیں سکتی حزیںؔ ‏ ‏ ‏ حضرتِ استاد یعنی شاہ مظہر کی ثنا

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں:

اے حزیںؔ شکر کہ ہے مصحف ارباب جنوں ‏ ‏ ‏ فیض سے حضرت استاد کے دیوان میرا

افسوس ہے کہ مصائب روزگار سے تنگ آ کر انہیں آخر کار دلی چھوڑنا پڑا۔

عظیم آباد پہنچے، وہاں نواب صولت جنگ نے ان کی قدردانی کی اور انہی کی سرکار میں فراغت کے ساتھ زندگی بسر کی، اب تک کسی تذکرے میں ان کا سنہ وفات میری نظر سے نہیں گزرا، دیوان ان کا کہیں کہیں پایا جاتا ہے جس میں قصائد اور غزلیں ردیف وار موجود ہیں۔

غزلوں کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ طبیعت معنی یاب وفکر رنگین رکھتے تھے اور سوز وگداز کی چاشنی اس میں کسی سے کم نہیں۔

خوب سوجھا ہے مزا عشق میں رسوائی کا معتقد دل سے ہوں اس دل کی میں دانائی کا

یہ کہہ کر باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ یا قسمت
لکھا تھا یوں کہ فصل گل میں چھوڑیں آشیاں اپنا

گوارا ہو گیا دل پر ہمارے جور یار آخر ہمیں رنج والم سے ہو گئی صحبت برار آخر

نہ ہوا اے باغباں بلبل کو مانع گل کے ملنے سے
نہیں رہنے کی گلشن میں بہار آخر سدا ہر گز

آتی ہے نو بہار دھڑکتا ہے دل کہ ہائے پھر شور و شر کرے گا یہ خانہ خراب دل

فصل گل آخر ہوئی کیا دیکھ ہوں گے شاد ہم کچھ کرا اے صیاد اب ہوں گے نہیں آزاد ہم

بیوفائی دیکھ کر ان خوش نگاہوں کی حزیںؔ اب کسی سے اس طرح ملنے کو میرا دل نہیں

آرزوئیں عشق کی ہوتی نہ دیکھیں سر براہ کوہ کن بھی سر پٹک کر مر رہا آخر وہیں

جس دن سے میں سنا ہے کہ آخر ہوئی بہار اس دن سے چھوٹنے کی مجھے کچھ ہوس نہیں
ویراں ہوا خزاں سے چمن یاں تلک کہ اب چاہیں کہ جل مریں تو کہیں خار و خس نہیں

نہ وصل میں اسے راحت نہ ہجر میں آرام کسی طرح سے حزیںؔ دل کے تئیں قرار نہیں

کچھ کہا شاید اس نے قاصد سے دل پہ میرے وہ اضطراب نہیں

حال اے قاصد مرا جو کچھ کہ تو جاتا ہے دیکھ
اس طرح سے اس سے مت کہیو کہ وہ محجوب ہو

کچھ کٹے ہجر میں کچھ وصل میں گریاں گزرے کیا مری عمر کے اوقات پریشاں گزرے

ہر نصیحت میں تری مانوں گا اے ناصح پر ایک دلبروں کے دیکھنے میں دل مرا ناچار ہے

میں چاہتا ہوں عشق چھپاؤں پہ کیا کروں رسوا کرے ہے خلق میں یہ چشمِ تر مجھے

راحت میں دل کے ہاتھ نہ پاؤں گا ایک دم
جب تک کہ میرے ساتھ یہ خانہ خراب ہے

حزیںؔ میں دردِ دل کا کس طرح ظاہر کروں اس سے
مجھے کہتا ہے تیری بات مجکو خوش نہیں آتی

وفا میری اگر جور و جفا تجکو نہ سکھلاتی تو کیا آرام سے یہ زندگانی ہائے کٹ جاتی

☆☆☆

حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایت

’’ہدایت تخلص از دہلی است، ریختہ را بہ طرزی گوید، از یاران خواجہ میر است، اگر چہ در ظاہر بہ عجز و انکسار پیش می آید، اما کمیت خامہ او در عرصۂ میدان سخن بال بستہ راہ می رود۔‘‘ (اھ، نکات الشعرا)

’’مشاق قدیم معاصر و ہم طرح محمد قائم شریک دور میرؔ و مرزاؔ شاگرد بلکہ مرید خواجہ میر دردؔ نور اللہ مرقدہٗ، شخصے است بسیار حلیم و سلیم، شعر را بسیار بہ فصاحت می گوید، عمرش از شصت متجاوز خواہد بود، صاحب دیوان است۔‘‘

(اھ، تذکرۂ مصحفی)

ہدایت اللہ نام، ہدایت تخلص تھا، خواجہ میر دردؔ کے فیضانِ صحبت سے دل کو روشن کیا اور شعر و سخن کی مشق بھی انہی سے کی، طبابت میں نام بر آوردہ تھے، میر قدرت اللہ خاں قاسمؔ ان کے شاگرد رشید تھے، ۱۲۱۵ھ میں واصل بحق ہوئے، علاوہ دیوان ریختہ کے بقول مرزا لطف ایک مثنوی بنارس کی تعریف میں بہت خوب لکھی ہے:

نہ رحم اس کے ہے جی میں نہ دل میں اپنے صبر
ہماری گزرے گی کیوں کر الٰہی کیا ہوگا

دیکھ اس کی چشم مست کو دل تو بہک گیا　　بس میری جان دو ہی پیالوں میں چھک گیا
دیکھا نہیں ہے ہم نے ہدایت کو ان دنوں　　شاید کسی جگہ پہ دل اس کا اٹک گیا

ہے آدمی کو بھی قید حیات اک زنداں کسی نے خوب کہا ہے موا سو چھوٹ گیا

آیا ہوں تنگ کشمکش دام زلف میں یارو میں کس بلا میں گرفتار ہوگیا
بوسہ طلب کیا تھا فقط اور کچھ نہیں میں اتنی بات کہہ کے گنہگار ہوگیا

اک دن بھی مہرباں نہ وہ بے وفا ہوا اے آہ و نالۂ سحری تم کو کیا ہوا

کوئی پھرا نہ ملک عدم سے تو اب تلک پایا جہاں کسو نے کچھ آرام رہ گیا

رہا مرتے مرتے مجھے غم اسی کا نہیں میرے بعد میرے کوئی بے کسی کا
کیا تیغ قاتل نے جب کام اپنا میں منہ دیکھتا رہ گیا بے بسی کا

کس دل جلے کی خاک سے گزری چمن میں آج
دیکھا عرق فشاں میں نسیم بہار کو

تجھ بن تو چاہتا نہیں جی سیر باغ کو لگتی ہے ٹھیس نکہت گل سے دماغ کو

تم نہ فریاد کسی کی، نہ فغاں سنتے ہو اپنے مطلب ہی کی سنتے ہو جہاں سنتے ہو

کرتا نہیں ہے جانے کو دل کوئے یار سے گو اس میں جی رہے نہ رہے ہم تو یاں رہے

کیا کہوں میں کہ ترے ہجر میں کیونکر گزری وہی جانے ہے مری جان کہ جس پر گزری

دن جو گزرا تو مجھے روز قیامت سے دراز رات گزری تو شب ہجر سے بدتر گزری

☆☆☆

میر محمد بیدآر

''قریب چہاردہ سال شدہ باشد کہ فقیر اورا در لباس درویشی در شاہجہان آباد دیدہ بود، طبع دردمند داشت، باریک و منحنی، بہ زیور حلم وحیا آراستہ، معلوم نیست کہ الحال کجا است۔'' (اھ، تذکرۂ میر حسن)

میر محمد علی نام، بیدار تخلص مگر شہرت میر محمد ہی کے نام سے ہوئی، دلی وطن تھا، وہیں نشو و نما بھی ہوا، مرتضیٰ قلی بیگ فراقؔ سے فارسی اور حضرت خواجہ میر دردؔ سے اردو میں مشق سخن کی پھر مولانا فخر الدین دہلوی کے فیضان صحبت سے بہرہ ور ہوئے اور طریقۂ چشتیہ کے اذکار واشغال کی ورزش کرنے کے بعد خرقۂ خلافت پہنا، جب تک دلی میں رہے عرب سرا میں قیام تھا، ہر روز اپنے پیرو مرشد کی خدمت میں آتے جاتے تھے، آخر عمر میں دلی سے آگرہ چلے گئے اور وہیں کٹرہ دندان فیل میں سکونت اختیار کر لی، دو دیوان یادگار چھوڑ کر ۱۲۰۹ھ/۱۷۹۴ء میں وفات پائی اور آگرہ میں مدفون ہوئے، میرؔ و مرزاؔ کے ہم عصر تھے جب انہوں نے رعایت لفظی کے ناپسندیدہ رنگ کو ترک کیا تو بیدآر نے بھی اس میں کوشش کی اور صفائی کے ساتھ تصوف کا رنگ بہ قدر مناسب شامل کر کے اپنے طرز کلام کو علاحدہ کر لیا، ان کے اشعار دلآویزی کے باعث اب تک لوگوں کی زبانوں پر چڑھے ہوئے ہیں ع

قبول خاطر و لطف سخن خدا داد است

واہ وا اے دلبر کج فہم یوں ہی چاہیے　　ہم سے ہونا آشنا، غیروں سے ہونا آشنا

تیرے رخسار و قد و چشم کے ہیں عاشق زار گل جدا، سرو جدا، نرگسِ بیمار جدا

کس کس کا دل نہ شاد کیا تو نے اے فلک اک میں ہی غمزدہ ہوں کہ ناشاد رہ گیا
بیدآر راہ عشق کسی سے نہ طے ہوئی صحرا میں قیس کوہ میں فرہاد رہ گیا

کروں ہوں شاد دل اپنا ترے تصور سے اگر یہ شغل نہ ہوتا تو کیا کیا ہوتا

اے شانہ کھولیو گرہِ زلف دیکھ کر دل سیکڑوں ہیں اس میں گرفتار دیکھنا

چھوڑ کر کوئے بتاں جاتا ہے تو کعبے کو جلد پھریو تجھے بیدآر خدا کو سونپا

ہم خاک بھی ہوگئے پر اب تک دل سے نہ ترے غبار نکلا

ہم پہ سو ظلم و ستم کیجئے گا ایک ملنے کو نہ کم کیجیے گا

دامن کو ترے نہ پہنچے اب تک ہرچند غبار ہوگئے ہم

نے پر پرواز ہے بیدآر، نے فصل بہار کس توقع پر قفس سے ہوویں اب آزاد ہم

یہ بھی کوئی وضع ہے آنے کی جو آتے ہو تم ایک دم آئے نہیں گزرا کہ پھر جاتے ہو تم

صورت اس کی سماگئی دل میں آہ کیا آن بھاگئی دل میں

ہم تری خاطرِ نازک سے حذر کرتے ہیں ورنہ یہ نالے تو پتھر میں اثر کرتے ہیں

شکوۂ کم نگہی آنکھوں سے اس کی نہ کرو گفتگو خوب نہیں مردمِ بیمار کے ساتھ

اب تک مرے احوال سے واں بے خبری ہے اے نالۂ جاں سوز یہ کیا بے اثری ہے

کس باغ سے آتی ہے بتا مجکو کہ یہ آج کچھ اور ہی بو تجھ میں نسیم سحری ہے

ربط جو چاہیے بیدآر سو اس سے معلوم مگر اتنا کہ ملاقات چلی جاتی ہے

مردمِ چشم سے پوچھا اے مہہِ تاباں تجھ بن کون سی شب نہیں گزری مجھے روتے روتے

کس کے آگے میں کروں چاک گریباں کہہ تو
جو ترے ہاتھ سے ناصح مرا داماں چھوٹے

جام و مینا و مے و مطرب و ساقی ہمراہ اس سرانجام سے بیدآر کہاں جاتا ہے

بیدآر کیوں کر آتش دل اشک سے بجھے ظاہر کی آگ ہووے تو پانی بجھا سکے

نے میکدہ سے کام نہ مطلب حرم سے تھا محوِ خیالِ یار رہے ہم جہاں رہے

☆☆☆

میر قدرت اللہ قدرتؔ

''مردے ست از متوسلان میر شمس الدین فقیر درویش وضع، خلیق طبع،
رتبہ قدرش رفیع وشیوۂ معانیش بدیع، سمند طبعش در میدان فارسی و ہندی
چالاک و چست وتصویر بے نظیر، معانیش دراستخواں بندی الفاظ درست،
بندہ وے را یک بار در مشاعرۂ لکھنؤ دیدہ ام۔'' (اھ تذکرۂ میر حسن)

میر قدرت اللہ نام، قدرتؔ تخلص، میر شمس الدین فقیر کے عزیز قریب اور شاگرد رشید تھے، دلی وطن تھا، اس کی تباہی کے بعد چندے ادھر ادھر پھرے، آخر کار مرشد آباد میں سکونت اختیار کرلی، وہاں کے امرا و شرفا نے اعزاز و اکرام سے ان کا خیر مقدم کیا اور بہت فارغ البالی سے زندگی بسر کی۔

میر تقی میرؔ شاید ان سے ناخوش ہیں، فرماتے ہیں: ''او عاجز سخن است لیکن برائے خاطر میر عارف کہ از یاران درست فقیر است نوشتہ شد'' اس کے بعد ایک شعر ان کا نکات الشعرا میں درج کیا ہے، ممکن ہے کہ قدرت کا بہترین کلام میر صاحب تک نہ پہنچا ہو، یا ان کی کسی بات پر چڑھ گئے ہوں اور ان کو یاران بزم میں شریک کرنا پسند نہ کرتے ہوں، قدرت کے قادر الکلام ہونے میں کچھ شک نہیں، ایسے شخص کو عاجز سخن کہنا میر صاحب کی زبردستی ہے، قدرتؔ نے غالباً ۱۲۵۰ھ میں وفات پائی اور مرشد آباد میں مدفون ہوئے۔

کچھ دیر ہوئی اشک نہیں آنکھوں سے گرتے — شاید تہ مژگاں کوئی لخت جگر آیا

جب مسیحا دشمن جاں ہو تو کب ہو زندگی	کون رہ بتلا سکے جب خضر بہکانے لگا

مجکو غفلت نے خبر ایامِ فرصت کی نہ دی	آہ جب جاتے رہے دن تب میں پچھتانے لگا

اوپر سے زخم گرچہ ہرے ہو چلے ولے	ناسور تھا جگر میں سو ناسور رہ گیا

یہ دلِ شوریدہ جب سے ساتھ ہے زیرِ زمیں	شورِ محشر ہی رہا قدرتؔ کی مشتِ خاک پر

شائستۂ دنیا نہ سزاوار ہوں دیں کا	اے وائے میں قدرتؔ نہ ادھر ہوں نہ ادھر ہوں

زخم پر زخم لگے تب ہو تسلی دل کی	حوصلے پر مرے ایک زخم کچھ افزود نہیں

تو بھی کم ابر بہاری سے نہیں اے چشمِ تر	کر دے اب رشکِ چمن خون جگر سے آستیں

تو کیا سامان پوچھے ہے کہ تجھ بن کیونکہ گزرے ہے	یہ سر ہے اور زانو آستیں اور چشم پر خوں ہے

حسرتؔ اے صبحِ چمن ہم سے چمن چھوٹے ہے	مژدہ اے شامِ غریبی کہ وطن چھوٹے ہے

سینہ اس کا ہے دل اس کا ہے جگر اس کا ہے	تیرِ بیداد جدھر رخ کرے گھر اس کا ہے

قطعہ

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے	کیا ہی ملک و روم و کیا ہی سرزمین طوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشا میں تجھے	چل دکھاؤں تو کہ قیدِ آز کا محبوس ہے
لے گئی یکبارگی گورِ غریباں کی طرف	جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے	یہ سکندر ہے، یہ دارا ہے، یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ و تمکنت دنیا سے آج	کچھ بھی ان کے ہاتھ غیر از حسرت و افسوس ہے
کل تو قدرتؔ پائے خم رکھتے تھے تسبیح ریا	آج رہن جام مے پھر خرقۂ سالوس ہے

میر ضیاء الدین ضیاؔ

''ضیا تخلص، متوطن دہلی، جوانے است مہذب مودب متواضع بافقیر ربطے بسیار دارد۔'' (اہ نکات الشعرا)

''شعر پرورش بر جگر عاشقان نشتر زارے است و برائے سوختگان عشق شرارے اکثر غزل در زمین سنگلاخ گفتن و الفاظ نامعقول را مقبول ساختن کار اوست۔'' (اہ تذکرۂ میر حسن)

ضیاء الدین نام تھا، ضیا تخلص، دلی کے رہنے والے اور مرزا رفیع سوؔدا کے ہم عصر تھے مگر معلوم نہیں مشق کس سے کی ہے۔

دلی کی تباہی کے بعد یہ فیض آباد چلے آئے تھے، کچھ دنوں وہاں رہے اور کچھ دنوں لکھنؤ میں، اس کے بعد عظیم آباد پٹنہ میں جا کر بیٹھ رہے، گوشۂ عزلت کے دلدادہ تھے، آشنا پرست، دردمند، رنج و راحت میں ہمیشہ خوش رہتے، اصنافِ سخن میں سے غزل کو پسند کیا تھا، قصیدہ اور مثنوی کی طرف طبیعت نہیں مائل ہوئی، سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنے کا شوق تھا جس میں شعر کا سرسبز کرنا ہر کسی کا کام نہیں۔

عظیم آباد میں راجہ شتاب رائے کا بیٹا ان کی ضروریاتِ زندگی کا متکفل رہا، وہ ان سے مشق سخن بھی کرتا تھا، سنہ وفات کا پتہ نہیں چلا۔

کل کی رسوائی تجھے کیا کم نہ تھی اے ننگ خلق اس کے کوچہ میں ضیاؔ تو آج پھر جانے لگا

برس اے ابر جتنا چاہے تو اب تیری باری ہے　　کبھی دل تھا تو میں بھی رو رو اک دریا بہتا تھا

روویں ہم برہموں کو کیا اپنے دنوں کے پھیر ہیں　　شمع محفل تھے جو کل سوراکھ کے اب ڈھیر ہیں

رسوائیوں کی اپنی مجھے کچھ ہوس نہیں　　ناصح پہ کیا کروں کہ مرا دل پہ بس نہیں

آہستہ پاؤں رکھیواے بوئے گل زمیں پر　　سوتے ہیں اس زمیں میں نازک دماغ کتنے

کسی دشمن کی بھی یارب نہ گزرے شب جدائی کی
کہ جیسے اس سے میرے وصل کا یہ دن گزرتا ہے

رازِ دل ہیں پوچھتے اور بولنے دیتے نہیں　　بات منھ پر آرہی ہے اور لب ہلانا منع ہے

اے آہ بچ کر نہ کہیں دل تھلک پڑے　　یہ جام بھر رہا ہے مبادا چھلک پڑے

کون سے زخم کا کھلا ٹانکا　　آج پھر دل میں درد ہوتا ہے

رباعی

کیا عیش و نشاط و شادمانی کرتے　　کیا ناز و نیاز جاودانی کرتے
گر یار کہے میں اپنے ہوتا تو ہم　　کیا خوب طرح سے زندگانی کرتے

☆☆☆

دوسرا دور

متوسطین شعرائے اردو کا

سید محمد میر اثر

"درویشے است موقر، صاحب سخنے است مؤثر، عالم و فاضل، رتبہ قدرش بہ غایت بلند و گوہر صدرش نہایت ارجمند، در خدمت برادر بزرگوار خود گوشہ نشینی اختیار کردہ و قدم بر جادۂ بزرگاں خود نہادہ بسر می برد۔"

(اھ، تذکرۂ میر حسن)

"دیوان قلیل الحجم دارد ملاحظہ شد بعض خیالات ایشاں بہ قصوی غایت دردمندانہ و دلپذیر و مطبوع واقع شدہ، مثنوی ایشاں شہرت تمام دارد کہ بنائے آں بر محاورۂ ہست۔" (اھ، گلشن بیخار)

سید محمد میر نام تھا، اثر تخلص، خواجہ محمد ناصر عندلیب کے بیٹے تھے اور خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی، بڑے بھائی کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی اور انہی کے نقش قدم پر چلتے تھے، علوم و فنون اساتذۂ دہلی سے حاصل کیے تھے، تصوف، موسیقی، حساب اور دیگر فنونِ ریاضیہ میں ان کا جواب نہ تھا۔

فنون ریاضیہ کی تعلیم خواجہ احمد دہلوی سے پائی تھی جو مرزا خیر اللہ مہندس کے شاگرد تھے، یہ وہی مرزا خیر اللہ ہیں جن کے اہتمام سے دلی میں محمد شاہی رصد قائم ہوئی تھی اور زیچ محمد شاہی کے مصنف ہونے کی حیثیت سے وہ دنیا میں کافی شہرت رکھتے ہیں۔

میر اثر نے اپنے بڑے بھائی خواجہ میر درد کے بعد آبائی سجادہ کو زینت بخشی اور مدت دراز تک اپنے ظاہری وباطنی کمالوں سے لوگوں کو فیضیاب کرتے رہے، تقویٰ، توکل، زہد وقناعت میں یہ کسی طرح اپنے باپ اور بھائی سے پیچھے نہیں رہے، تصوف وشاعری میں جو رنگ بڑے بھائی کا ہے وہی ان کا بھی ہے۔

تصنیفات میں ایک دیوان غزلوں کا ہے، ایک مثنوی جو اپنے رنگ کی اردو میں پہلی مثنوی ہے اس کا نام خواب وخیال رکھا ہے، کہا جاتا ہے کہ نواب مرزا شوق نے زہر عشق، بہار عشق وغیرہ مثنویوں میں اسی مثنوی کا تتبع کیا ہے، افسوس ہے کہ یہ مثنوی میری نظر سے نہیں گزری، مرزا لطف نے کچھ اشعار اس کے اپنے تذکرے میں نقل کیے ہیں مگر صحیح اندازہ کسی مثنوی کے حسن وقبح کا اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی ایک پوری داستان پیش نظر نہ ہو، خواجہ محمد میر کی تاریخ وفات مجھے نہیں ملی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲۵۰ھ سے پہلے انہوں نے رحلت کی ہے۔

منتخب اشعار

میرے تئیں تو کام نہ تھا کچھ بتوں سے آہ　　پر دل کے ساتھ مفت میں بدنام ہوگیا
دیکھیں گے اس کی سنگ دلی کو ہم اے اثر　　گر کوئی نالہ ہم سے سر انجام ہوگیا

اس سنگ دل کے دل میں تو نالے نے جا نہ کی
کیا فائدہ جو اور کے جی میں اثر کیا

بے وفا تیری کچھ نہیں تقصیر　　مجکو میری وفا ہی راس نہیں
تو ہی بہتر ہے ہم سے آئینہ　　ہم تو اتنے بھی روشناس نہیں

یوں خدا کی خدائی برحق ہے　　پر اثر کی تو ہم کو آس نہیں

عاشقی اور عشق کی باتیں سب جہاں سے اثر کے ساتھ گئیں

مر تو چلے کہاں تلک اب در گزر کریں یا ہم نہیں اس آہ میں یا آسماں نہیں

جی میں ہے از سرنو جور ترے یاد کریں تو سنے یا نہ سنے نالہ و فریاد کریں
ہم اسیروں کی اسے چاہیے خاطر داری اور الٹے نہ کہ ہم خاطر صیاد کریں

یاں تغافل میں اپنا کام ہوا تیرے نزدیک یہ جفا ہی نہیں

کردیا کچھ سے کچھ ترے غم نے اب جو دیکھا تو وہ اثر ہی نہیں

وہی میں ہوں وہی اثر دل ہے اب خدا جانے کیا ہوا مجکو

ہر دم فزوں ہیں کجرویاں روزگار کی کچھ سیکھتا چلا ہے روش میرے یار کی

غرض آئینہ داریٔ دل سے تیرا جلوہ تجھے دکھانا ہے

اور تو کوئی نہیں دام و قفس دامنگیر تنگ آیا ہوں بہت دل کی گرفتاری سے

دوست ہوتا جو وہ کیا ہوتا دشمنی پر تو پیار آتا ہے

آپ ہی نہ جل بجھے نہ کچھ اس دل میں راہ کی اس پر کہیں گے آہ کہ ہم نے بھی آہ کی

چھپ چھپ کے دیکھنے کے مزے سب یہ اے اثر
معلوم ہوں گے جو کبھی اس نے نگاہ کی

کبھی دوستی ہے کبھی دشمنی تری کون سی بات پر جایئے

ہمیں حیرت ہے آپ ہی تجھ کو دیویں کیا جواب اس کا
کہ تجھ بن اب تلک کس طرح ہم نے زندگانی کی

آپ میں کہنے لگوں سو ہے کہاں میری مجال پوچھے تو احوال میرا، ایسی تجکو کیا پڑی

کب کب گلی میں تیرے ہم بے قرار آئے سو بار جی نے چاہا تب ایک بار آئے
ہر چند جی پہ ٹھہری پھر ہم ادھر نہ آئیں آخر نہ رہ سکے ہم بے اختیار آئے

تیرے کوچے میں دوبارہ خوب ہم ہو کر چلے ڈھونڈنے کو دل کے آئے جان بھی کھو کر چلے

کلیجہ پک گیا میں کیا کہوں اس دل کے ہاتھوں سے
ہمیشہ کچھ نہ کچھ اس میں خیال خام آتا ہے

☆☆☆

شیخ بقاء اللہ بقا

''جوان سراپا خلق وظریف مزاج وقانع دیدنش طبع شوخش بہ طرف
ہجو بسیار مائل افتادہ در شاہجہان آباد با میر دور لکھنؤ با مرزا رفیع معرکہ گیری
ہا کردہ، وقت طبع خود را اظاہر نمود۔'' (اھ تذکرۂ مصحفی)

''در مراتب نظم طبعے شگفتہ و رنگیں وطرزے بامزہ وشیریں داشتہ کمتر ک
بہ قند فارسی ہم کام وزبان را حلاوت آگیں نمودہ بہ پارسی شاگرد مرزا فاخر مکین و
در ریختہ از تلامذۂ شاہ حاتم وخواجہ میر درد نوشتہ اند۔'' (اھ، گلشن بیخار)

بقاء اللہ نام، بقا تخلص، حافظ لطف اللہ خوش نویس کے بیٹے اور اکبر آباد کے رہنے والے تھے، دلی میں پیدا ہوئے اور لکھنؤ میں جا بسے، اسی وجہ سے ان کا وطن بعضوں نے لکھنؤ کو قرار دیا ہے۔

طبیعت فن شعر کے لیے بہت مناسب تھی، فارسی میں مرزا فاخر مکین کے شاگرد تھے اور غمگین تخلص کرتے تھے، جب ریختہ کی طرف طبیعت مائل ہوئی تو شاہ حاتم کی خدمت میں پہنچے اور شاہ صاحب کے ارشاد سے بقا تخلص اختیار کیا، شاہ حاتم نے ان کو اپنے شاگردوں میں شمار کیا ہے اور فتح علی شاہ چشتی نے اپنے تذکرہ میں خود انہی کی زبانی نقل کیا ہے کہ وہ خواجہ میر درد علیہ الرحمہ کے شاگرد تھے، ممکن ہے کہ دونوں سے مشق سخن کی ہو، میر و سودا دونوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے، دلی میں میر صاحب سے الجھے اور لکھنؤ میں سودا سے۔

بقاؔ کا شعر ہے:

سیلاب سے آنکھوں کے رہتے ہیں خرابے میں
ٹکڑے جو مرے دل کے بستے ہیں دوآبے میں

میر صاحبؔ نے خدا جانے سن کر کہا یا توارد ہوا ہے ؎

وے دن گئے کہ آنکھیں دریا سی بہتیاں تھیں
سوکھا ہی پڑا ہے اب تو مدت سے یہ دوآبہ

اس پر بگڑ کر بقاؔ نے یہ قطعہ کہا ؎

میرؔ نے گر ترا مضمون دوآبہ کا لیا — اے بقاؔ تو بھی دعا دے جو دعا دینی ہو
یا خدا میرؔ کی آنکھوں کو دوآبہ کر دے — اور بینی کا یہ عالم ہو کہ تربینی ہو

ایک اور موقع پر کہا ہے:

پگڑی اپنی سنبھالیے گا میرؔ — اور بستی نہیں یہ دلی ہے

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں ؎

میرؔ و مرزاؔ کی شعر خوانی نے — بسکہ عالم میں دھوم ڈالی تھی
کھول دیوان دونوں صاحب کے — اے بقاؔ ہم نے جب زیارت کی
کچھ نہ پایا سوائے اس کے سخن — ایک تو تو کہے ہے اک ہے ہے

بقاؔ نے زندگی بہت بے مزہ گزاری، افلاس سے تنگ آ کر کسی کی رہنمائی سے "تسخیر کواکب" کے اعمال شروع کیے تھے اس نے سودائی بنا دیا، جب ہر طرف سے مایوس ہوئے تو ۱۲۰۶ھ میں عجباتِ عالیات کی زیارت کو چلے، راستہ میں موت نے اس ارمان کو بھی نکلنے نہ دیا۔

ہم نفس کوئی نہ دیکھا بے کسی میں اے بقاؔ — آشنا صورت مگر معنی میں وہ بیگانہ تھا

یار کو پہنچی خبر نالۂ تنہائی کی — مدعی کون کھڑا تھا پسِ دیوار لگا

ساقی کو دو نوید، بہار آئی باغ میں سودے نے پھر خلل سا کیا ہے دماغ میں

اے عشق تو ہر چند مرا دشمن جاں ہو مرنے کو نہیں نام کا اپنے میں بقا ہوں

دیکھیے منصب مجنوں پہ یہ لیلیٰ صفتاں خاک میں ہم کو ملا کس کو سرافراز کریں

تو نے اس طرح سے اے چرخ گرایا ہم کو کہ موے پر بھی کسی نے نہ اٹھایا ہم کو

پنہاں ہی بھلا ہے خونِ عاشق جانے دو اب اس پہ خاک ڈالو

تیرے بیمار کو کیا ہووے شفا جس کے طبیب نہ تو کچھ درد کو پہنچے نہ دوا ہی جانے

ناتواں ہم ہوئے اتنے کہ تری محفل تک ڈر سے آتے ہوئے سو بار چلے بیٹھ گئے

رہرواں کہتے ہیں جس کو جرسِ محمل ہے محنت راہ سے نالاں وہ ہمارا دل ہے
موج سے بیش نہیں ہستی وہمی کی نمود صفحۂ دہر پہ گویا یہ خطِ باطل ہے
کچھ تعلق نہیں اس راہ میں جو ریگ رواں جس جگہ بیٹھ گئے اپنی وہی منزل ہے
آستیں حشر کے دن خون سے تر ہو جس کی یہ یقیں جانیو اس کو کہ مرا قاتل ہے

یہ رخ یار نہیں زلف پریشاں کے تلے ہے نہاں صبح وطن شام غریباں کے تلے
کیا کروں سینہ جو ناصح سے چھپائے نہ پھروں داغ سے داغ ہیں کچھ میرے گریباں کے تلے
نہیں ملنے کی بقا ہم کو بجز کنج مزار جاے آسودگی اس گنبد گرداں کے تلے

تہی کف آئے تھے ہم عدم سے، چلے یہاں سے تو دست خالی
نہ توشہ داں سے یہاں تھا آیا نہ ساتھ یاں سے درم اٹھائے
بقا جو راہی ہوئے عدم کے تو وقفہ ہرگز کرو نہ دم کا
یہ راہ ہستی کی پر خطر ہے چلو یہاں سے قدم ہٹائے

مرزا جعفر علی حسرت

''جوان خوش خلق و حلیم و سلیم واقع شدہ از مدت مدید مشق سخن می کند، شاگرداں بسیار بہم رسانیدہ، فقیر اورا در مشاعرۂ لکھنؤ دیدہ در قصیدہ و غزل ید طولیٰ دارد۔'' (از تذکرۂ مصحفی)

جعفر علی نام حسرت تخلص، ابوالخیر عطار کے بیٹے جن کی عطاری کی دوکان لکھنؤ میں اکبری دروازے کے پاس تھی۔

تحصیل علمی کا حال معلوم نہیں، غالباً رواج زمانہ کے موافق فارسی کی درسی کتابیں سب پڑھی ہوں گی، شعر وسخن سے خداداد مناسبت تھی، رائے سرب سنگھ دیوانہ سے مشق سخن کی مگر اخیر میں ان سے منحرف ہو گئے تھے۔

جب تلک والد زندہ رہے شاعری کی بدولت امرا و شاہزادوں کی مصاحبت میں مزے سے زندگی بسر کی، پہلے مرزا احسن علی خاں بہادر کی سرکار سے تعلق رہا، اس کے بعد صاحب عالم مرزا جہاندار شاہ کی مصاحبت میں رہے، جب والد کا انتقال ہوا تو ترک ملازمت کر کے ان کی دوکان پر بیٹھ گئے مگر عطاری کرتے ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا کہ کسی درویش کی صحبت میں ترک لباس کر کے گوشہ نشین ہو گئے۔

تصنیفات میں ایک کلیات ہے جس میں ساقی نامہ، مثنوی، واسوخت، ترجیع بند، ترکیب بند، مسدس، مخمس، قصیدے، رباعیاں اور دو دیوان غزلوں کے ہیں، غرض کہ اصناف سخن

میں سے ہر قسم کے نمونے اس میں پائے جاتے ہیں۔

حسرتؔ کے کلام میں ترکیبوں کی موزونیت، الفاظ کی برجستگی اور خیالات کی سادگی ان کے پیشرو شعرا کی طرح بہت نمایاں ہے، یہ صحیح ہے کہ سارا کلام ان کا ایک طرح کا نہیں ہے، تاہم آزاد کی اس رائے سے مجھے اتفاق نہیں کہ ان کے دیوان میں پھیکے شربت کا مزہ آتا ہے۔

حسرتؔ کا خاص انداز یہ بھی ہے کہ وہ اکثر غزل کو قطعہ پر ختم کرتے ہیں اور کبھی پوری غزل ایک ہی مضمون پر لکھتے ہیں۔

ان کو جس قدر شاگرد نصیب ہوئے بہت کم شاعروں کو ملے ہوں گے، میر حسنؔ اپنے تذکرہ میں فرماتے ہیں کہ ''کثرت شاگردانش چنان است کہ در صورت شناسی خودہم حیران است'' ان سب شاگردوں میں شیخ قلندر بخش جرأت، نواب محبت خاں، خواجہ حسن بہت نامور شاعر ہوئے ہیں، حسرتؔ نے ۱۲۱۷ھ میں وفات پائی اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔

دل میں سو بات تھی پر اس نے جو پوچھا احوال — مجھ سے کچھ دردِ دل اظہار ہوا کچھ نہ ہوا
ساری ہستی کے بکھیڑے ہیں وگرنہ دم مرگ — کچھ سر انجام بھی درکار ہوا کچھ نہ ہوا
کاش کہ عشق جتاتا میں نہ اس کو حسرتؔ — میری صورت سے وہ بیزار ہوا کچھ نہ ہوا

خدا حافظ ہے کیوں محفل میں اس کا نام آیا تھا — تڑپنے سے ابھی دل کو مرے آرام آیا تھا
بہاریں ہم کو بھولیں یاد ہے اتنا کہ گلشن میں — گریباں چاک کرنے کا بھی اک ہنگام آیا تھا

روتے ہی اس کو گزرے ہے ہجر میں تیرے رات دن
حال میں کیا بیاں کروں حسرتؔ بے قرار کا

ایک سے ایک اس زمانے میں ہے اس سے خوب تر
کوئی خوش آتا نہیں میری نظر کو کیا ہوا

آشیاں چھوڑ چلے اے چمن آرا ہم تو　　تو ہی لے جائیو سر پر یہ گلستاں اٹھا

کیا مجال اس کی کہاں تو اور کہاں میرا غبار　　لگ چلا دامن سے تیرے مہربانی کے سبب

مانند گل کروں میں گریباں کو چاک چاک　　آتا ہے میرے دل میں یہی بار بار جوش

کل کب تھے ہم سے خوش کہ نہیں ہو تم آج خوش
ہم نے تو ایک دن بھی نہ پایا مزاج خوش

سخت بے دردی ہے بے دردوں سے کہنا دردِ دل
منت مرہم نہ لیجیے کھینچیے ایذاے داغ

کسے منظور تھا یوں تلخ کیجیے زندگانی کو　　ولے کیا کیجیے حسرت بلائے ناگہانی کو
بصد خونِ جگر یک قطرہ مژگاں تک پہنچتا ہے　　نہ دے بربادیوں اے چشم اشک ارغوانی کو

تصور نے ترے ظالم یہاں تک تفرقہ ڈالا　　کہ ملنا ہو گیا دشوار اب مژگاں سے مژگاں کا

ہوئے ہیں اس قدر آفت زدے ہم تو کہ اب ہم میں
نہ کیفیت ہے سننے کی، نہ کچھ لذت ہے رونے کی

کس کا ہے جگر جس پہ یہ بیداد کرو گے　　لو ہم تمہیں دل دیتے ہیں کیا یاد کرو گے

مثال نقش قدم یاں سے اٹھ نہیں سکتے　　تری گلی میں نہ جانا بھلا تھا جانے سے

تمہیں غیروں سے کب فرصت ہم اپنے غم سے کب خالی
چلو بس ہو چکا ملنا نہ تم خالی نہ ہم خالی

گر کہے تو رات تو دن کو کہوں میں رات ہے
کفر کچھ اس میں نہیں یہ دل ملے کی بات ہے

یہ بھی اک ستم تھا کہ خواب میں مجھے اپنی شکل دکھا گئے
کبھی نیند برسوں میں آئی تھی سو اسی طرح سے جگا گئے

اب تو یہ دل اک بتِ ناآشنا کے ہاتھ ہے
اس کے ہاتھوں چھوٹنا اس کا خدا کے ہاتھ ہے

☆☆☆

شیخ غلام ہمدانی مصحفی

''از آغاز شباب بہ مقتضائے موزونی طبع مصروف تحصیل علم بود، چنانچہ بہ فیض صحبت بزرگاں اول تکمیل نظم ونثر فارسی و تحقیق محاورہ واصطلاحات آں فراغت حاصل کردہ بمقتضائے رواج زمانہ خود را مصروف ریختہ گوئی داشتہ، برائے آنکہ رواج فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است و ریختہ فی زماننا بہ پایہ اعلائے فارسی رسیدہ بلکہ از وسیر آمدہ چنداں مصروف فارسی نماندہ است۔'' (اھ تذکرۂ مصحفی)

غلام ہمدانی نام، مصحفی تخلص، شیخ ولی محمد کے بیٹے اور امروہہ کے رہنے والے تھے، عنفوان شباب میں دلی آئے اور مولوی مستقیم گوپاموی سے عربی صرف ونحو کی کتابیں پڑھیں، طبیعت میں موزونیت خداداد تھی، شعر وسخن کی طرف مائل ہوئے اور بزرگانِ دلی کی صحبتوں میں شریک ہونے لگے، چندروز میں مشق بڑھ گئی تو اپنے مکان پر مشاعرہ قائم کیا اور جب تک دلی میں رہے ان کے گھر مشاعرے برابر ہوتے رہے۔

مزاج میں غربت، مسکینی اور ادب کی پابندی تھی، اسی وجہ سے دلی کے سب شاعر اور معزز اشخاص ان کے ساتھ لطف ومروت سے پیش آتے، یہ بھی دلی کو اپنا وطن سمجھتے تھے اور شاید اس زمانے میں فارغ البال بھی تھے، نواب نجف خاں کا زمانہ تھا، یہ کبھی ان کے سلام کو نہیں گئے اور نہ نوکری کی جستجو کی، جب تک دلی میں رہے اسی شاعری کی دھن میں

لگے رہے مگر ایک سا زمانہ ہمیشہ نہیں رہتا، دلی تباہ ہوئی، اہل کمال کا وہ مجمع منتشر ہوا، یہ بھی ناچار دلی سے نکلے مگر مرتے مرتے دلی کی یاد دل سے نہیں نکالی، ایک موقع پر کہتے ہیں:

دلی کہیں ہیں جس کو زمانہ میں مصحفیؔ　　میں رہنے والا ہوں اسی اجڑے دیار کا

دلی سے نکل کر یہ پہلے کٹیہر آئے، شیخ قیام الدین قائمؔ، نواب محمد یار خاں کی سرکار میں ملازم تھے، انہوں نے ان کا قصیدہ پیش کر کے تنخواہ مقرر کرادی، چند روز یہ ٹانڈہ میں نہایت خوشی اور فارغ البالی کے ساتھ رہے، تذکرۂ شعرا میں وہاں رہنے کا حال کئی جگہ بیان کیا ہے اور لکھا ہے کہ جس خوشی سے چند روز وہاں بسر ہوئے ہیں اب تک اس کی یاد تازہ ہے۔

نواب محمد یار خاں کا جب کھیل بگڑا تو لکھنؤ چلے آئے، یہاں تھوڑے دنوں رہ کر پھر دلی چلے گئے اور چاہا کہ پاؤں توڑ کر بیٹھ رہیں مگر کچھ دنوں کے بعد آب ودانہ کی کشش پھر ان کو لکھنؤ کھینچ لائی، اس مرتبہ مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار میں ملازم ہو گئے، محنت و کاوش کے ساتھ مشق سخن جاری رہی، چند روز میں ان کی استادی کو خاص وعام نے تسلیم کرلیا۔

ان کی ہمہ گیر طبیعت نے کسی خاص رنگ پر قناعت نہیں کی، ان کے کلام میں کہیں میرؔ کا درد ہے، کہیں سوداؔ کا انداز، کہیں سوزؔ کی سادگی اور جہاں کہیں ان کی کہنہ مشقی اور استادی اپنے پیشرو اساتذہ کی خوبیوں کو یکجا کر دیتی ہے تو وہ اردو شاعری کے بہترین نمونے قرار دیے جاسکتے ہیں، اس مجموعی حیثیت سے بقول حسرت موہانی میرؔ ومرزا کے بعد کوئی استاد ان کے مقابلہ میں نہیں جچتا اور یہ اپنے ہم عصروں میں سب سے برتر اور سب سے فائق نظر آتے ہیں، آزاد نے بھی آب حیات میں اس کو تسلیم کیا ہے کہ "یہ اصول فن سے بال برابر بھی سرکتے نہ تھے، کلام پر قدرت کامل پائی تھی، الفاظ کو پس وپیش اور مضمون کو کم وبیش کر کے اس دروبست سے شعر میں کھپاتے تھے کہ جو حق استادی کا ہے ادا ہو جاتا تھا، ساتھ اس کے اصل محاورہ کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے، ایسے موقع پر کچھ سوداؔ کا سایہ پڑتا ہے، جہاں سادگی ہے وہاں معلوم ہوتا ہے کہ میر سوزؔ کے انداز پر چلتے ہیں۔"

مگر باوجود اس کے افسوس ہے کہ آزاد نے انشا کو جا بجا مصحفی پر ترجیح دینے کی کوشش کی ہے، انشا کی ذہانت اور طباعی میں کچھ شک نہیں مگر سخن سنجی اور مشاقی کے لحاظ سے انشا کو مصحفی کے مقابلہ میں لانا ہی مصحفی کی سخت توہین کرنا ہے۔

بذلہ سنجی اور ظرافت کے زور سے شاہ وزیر کے دربار میں رسوخ حاصل کر لینا یا زبان آوری اور طباعی کی مدد سے مجلسوں کو گرما دینا اور چیز ہے اور اصول فن کو لیے ہوئے اصناف سخن میں سے ہر صنف پر قدرت کامل رکھنا اور سخن سنجی کا حق پورا پورا ادا کرنا اور بات ہے، یہی وجہ ہے کہ انشا کی گرم بازاری انہی کے ساتھ ختم ہو گئی اور مصحفی کے کمال کا سکہ اب تک رائج ہے۔

اس سے بڑھ کر ثبوت مصحفی کے کمال فن کا کیا ہو سکتا ہے کہ جتنے استادان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں میں سے نکلے اتنے آج تک کسی شاعر کو نصیب نہیں ہوئے اور سچ پوچھو تو شعرائے لکھنؤ کے جتنے بھی سلسلے ہیں وہ سب حضرت مصحفی کے منت پذیر ہیں، شیخ امام بخش ناسخ کو گو انکار ہو مگر اس میں کچھ شک نہیں کہ وہ بھی بواسطہ یا بلا واسطہ انہی کے مائدۂ سخن کے ریزہ چیں تھے، خواجہ حیدر علی آتش، میر مستحسن خلیق، میر مظفر حسین ضمیر، میر مظفر علی اسیر وغیرہ اس پائے کے لوگ ہیں جن کے دامن تربیت میں پرورش پا کر سیکڑوں استاد بن گئے، سب کو جانے دو میر خلیق کے فرزند میر ببر علی انیس اور میر ضمیر کے شاگرد مرزا سلامت علی دبیر کو لو جنہوں نے ہندوستان میں سخنوری کے ڈنکے بجائے ہیں اور اردو شاعری کو معراج کمال تک پہنچا دیا ہے۔

دوسرا ثبوت ان کی مشاقی اور استادی کا خود ان کا کلام ہے جو آٹھ دیوانوں میں مشکل سے سما سکا ہے، اگر یہ سچ ہے کہ مصحفی اپنی غزلیں بیچا کرتے تھے تو جتنا موجود ہے اس کا سوایا اور رہا ہوگا، پھر اگر ان کے سارے دیوانوں میں سے صرف وہی اشعار چھانٹے جائیں جو ہر طرح سے بلند رتبہ ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ انشا کے مجموعہ ہزل و غزل کے برابر ایک

مجموعہ ان کے منتخب اشعار کا تیار ہو سکتا ہے۔

اس بات کا سخت افسوس ہے کہ مصحفی جیسے باکمال شاعر کی جتنی قدر ہونی چاہیے تھی لکھنؤ میں نہیں ہوئی، مرزا سلیمان شکوہ کی سرکار سے ان کو صرف پچیس روپیہ ماہوار ملتے تھے جب میر انشاء اللہ خاں کو باریابی ہوئی اور وہ شاہزادہ کی غزلیں بنانے لگے تو اس پچیس روپیہ میں بھی تخفیف ہوگئی جیسا کہ خود مصحفی نے بھی اس کی شکایت کی ہے:

اے وائے کہ پچیس سے اب پانچ ہیں اپنے ہم بھی تھے کبھی روزوں میں پچیس کے لائق
استاد کا کرتے ہیں امیر اب کے مقرر ہوتا ہے جو درماہہ کہ سائیس کے لائق

اب تم غور کر سکتے ہو کہ اس حالت میں اس غریب پر کیا گزرتی ہوگی، وہ اگر غزلیں بیچ بیچ کر پیٹ نہ پالتے تو اور کیا کرتے، سوا شاعری کے ان کے پاس دھرا کیا تھا جس کو ذریعہ معاش قرار دیتے۔

اسی مرد معمر کا دل گردہ تھا کہ وہ اس تنگ حالی اور دل شکستگی کی حالت میں بھی وقتاً فوقتاً درباروں میں جاتے اور مشاعروں میں غزلیں پڑھتے اور حریف کی نوک جھونک برداشت کرتے تھے۔

انشا میں خدا بخشے یہ بری عادت تھی کہ وہ اپنی گرمی بازار کے لیے ایک نہ ایک ہنگامہ برپا کرتے رہتے تھے، دلی میں اپنی ذکاوت اور طباعی کے زور پر مرزا عظیم بیگ کی مٹی خراب کی مگر وہ دلی تھی، کتنی ہی مٹ گئی ہو پھر بھی ایسے لوگ وہاں موجود تھے جنہوں نے اس کو رفع دفع کر دیا۔

یہاں آ کر انہوں نے مصحفی کو آگے دھر لیا، پہلے تو اس غریب کے پچیس سے پانچ رہ گئے، پھر روز کی چھیڑ چھاڑ، ایک دن مشاعرہ میں مصحفی نے حسب معمول غزل پڑھی اور چلے آئے، اس غزل کا مقطع تھا۔

تھا مصحفی بہ مائل گریہ کہ پس از مرگ تھی اس کی دھری چشم پہ تابوت میں انگلی

ان کے چلے آنے پر یاروں نے ان کی لے دے شروع کی اور غزل الٹ کر بڈھے بیچارے کے کلام کو خوب خراب کیا جس کا مقطع یہ ہے:

تھا مصحفی کانا جو چھپانے کو پس از مرگ رکھے ہوئے تھا آنکھ پہ تابوت میں انگلی

اس غزل کی خبر مصحفی کو پہنچی، وہ پرانے مشاق لکھنؤ بھر کے استاد کوئی معمولی آدمی نہ تھے، بگڑ گئے اور یہ غزل لکھی جس میں متانت کی پابندی کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا مگر افسوس ہے کہ آزاد اس کو بڑھاپے کی سستی یا طبیعت کے امروہے پن سے تعبیر کرتے ہیں۔

مدت سے ہوں میں سرخوش صہبائے شاعری نادان ہے جس کو مجھ سے ہے دعوائے شاعری
میں لکھنؤ میں زمزمہ سنجانِ شعر کو برسوں دکھا چکا ہوں تماشائے شاعری
بھپتا نہیں ہے بزم امیران دہر میں شاعر کو میرے سامنے غوغائے شاعری
اک طرفہ خر سے کام پڑا ہے مجھے کہ ہائے سمجھے ہے آپ کو وہ مسیحائے شاعری
ہے شاعروں کی اب کے زمانے کی یہ معاش پھرتے ہیں بیچتے ہوئے کالائے شاعری
لیتا نہیں جو مول کوئی مفت بھی اسے خفت اٹھا کے آتے ہیں گھر، وائے شاعری
اے مصحفی زگوشۂ خلوت بروں خرام خالی است از برائے تو خود جائے شاعری
ہر سفلہ را زبان و بیان تو کے رسد آری توی فغانی و بابائے شاعری
مجنوں منم چرا دگرے رنج می برد در حصۂ من آمدہ لیلائے شاعری

پھر کیا تھا، سید انشا آئیں تو جائیں کہاں، وہ خاکہ اڑا کہ بقول آزاد شائستگی نے کبھی آنکھیں بند کر لیں اور کبھی کانوں میں انگلیاں دے لیں، جب نوبت حد سے گزر گئی تو مصحفی کے شاگروں میں منتظر اور گرم اٹھ کھڑے ہوئے، ایک دن شہدوں کا سوانگ بھر کر ہجو کے اشعار پڑھتے ہوئے انشاء اللہ خاں کی طرف چلے، ان کو بھی خبر ہوگئی، یہ اپنے یاران صحبت کو ہمراہ لے کر استقبال کو نکلے اور اپنے مکان پر لائے، سب کو بٹھایا اور وہ اشعار دوبارہ پڑھوا کر سنے پھر خاطر تواضع کر کے سب کو رخصت کیا۔

لیکن اس کا جواب سید انشا نے جو دیا وہ قیامت کا تھا، ایک انبوہ کثیر برات کے سامان سے ترتیب دیا اور عجیب و غریب ہجویں تیار کر کے لوگوں کو دیں، کچھ ڈنڈوں پر پڑھتے جاتے تھے، کچھ ہاتھیوں پر بیٹھے تھے، ایک ہاتھ میں گڈا اور ایک میں گڑیا، دونوں کو لڑاتے تھے اور اشعار پڑھتے جاتے تھے جن کا ایک شعر یہ ہے:

سوانگ نیا لایا ہے دیکھنا چرخ کہن　　لڑتے ہوئے آئے ہیں مصحفی و مصحفن

آزاد کہتے ہیں کہ ان معرکوں میں مرزا سلیمان شکوہ نے سید انشا کا ساتھ دیا اور حریف کے سوانگ کو کوتوال سے کہہ کر ایک دفعہ رکوا دیا، اس بات نے مصحفی کو بہت شکستہ خاطر کر دیا چنانچہ اکثر غزلوں میں اس کا رنگ جھلکتا ہے، ان میں سے ایک غزل کا مقطع ہے:

اے مصحفی بے لطف ہے اس شہر میں رہنا　　سچ ہے کہ کچھ انسان کی توقیر نہیں یاں

ان سب پر تازیانہ غضب یہ ہوا کہ سید انشا کے سمجھانے سے یا خود بخود مرزا سلیمان شکوہ کو یہ شبہہ پیدا ہو گیا کہ مصحفی نے اپنی ہجووں میں ہم پر بھی چوٹ کی ہے، اس کے عذر میں مصحفی نے ایک قصیدہ بطور معذرت کے پیش کیا ہے جس سے بہت سے واقعات پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مصحفی بیچارہ کی طرف سے سوانگ نکالنے کی ابتدا نہیں ہوئی ہے، اس قصیدہ کو اس نظر سے نقل کرتا ہوں کہ ناظرین اس بات کا اندازہ کریں کہ مصحفی کو شعر و سخن پر کتنی قدرت حاصل تھی:

قسم بذات خدائے کہ ہے سمیع و بصیر　　کہ مجھ سے حضرتِ شہ میں نہیں ہوئی تقصیر

سوائے اس کے کہ حال اپنا کچھ کیا تھا میں عرض　　سو وہ بطور شکایت تھی اند کے تقریر

گر اس سے خاطر اقدس پہ کچھ ملال آیا　　اور اس گنہ سے ہوا بندہ واجب التعزیر

عوض رپوں کے ملیں مجکو گالیاں لاکھوں　　عوض دوشالہ کے خلعت بہ شکل نقش حصیر

سلف میں تھا کوئی شاعر نواز ایسا کب　　جو ہے تو شاہ سلیماں شکوہ عرش سریر

مزاج میں یہ صفائی کہ کر لیا باور　　کسی کے حق میں کسی نے جو کچھ کہ کی تقریر

مصاحب ایسے کہ گر کچھ کسی سے لغزش ہو
تو اس کے رفع کی ہرگز نہ کر سکیں تدبیر

دگر کریں تو پھر ایسی کہ نار طیش و غضب
مزاج شاہ میں ہو مشتعل بصد تشویر

سو تاب ذرہ کہاں نور آفتاب کہاں
کہاں وہ سطوت شاہی کہاں غرور فقیر

مقابلہ جو برابر کا ہو تو کچھ کہیے
کہاں دبیقی و دیبا کہاں پلاسِ حصیر

میں اک فقیر غریب الوطن مسافر نام
رہے ہے آٹھ پہر جس کو قوت کی تدبیر

مرا دہن ہے کہ مدح حضور اقدس کو
الٹ کے پھیر بحرف ذمیمہ دوں تعبیر

یہ افترا ہے بنایا ہوا سب انشا کا
کہ بزم و رزم میں ہے پائے تخت کا وہ مشیر

مزاج شاہ ہو یوں منحرف تو مجکو بھی
یہ چاہیے کہ کروں شکوہ اس کا پیش وزیر

اگر وزیر بھی بولے نہ کچھ خدا لگتی
تو جاؤں پیش محمدؐ کہ ہے بشیر و نذیر

شفیعؐ روز جزا بادشاہ "او ادنیٰ"
نہ کر وہ جرم پہ جس نے نہیں لکھی تعزیر

کہوں یہ اس سے کہ اے جرم بخش پر گنہاں
تری غلامی میں آیا ہے داد خواہ فقیر

خطا ہو میری جو پہلے تو کر اسیر مجھے
وگر عدو کی پنہا اس کو طوق اور زنجیر

اگر چہ بازی انشائے بے حمیت کو
رہا خموش سمجھ کر میں بازیِ تقدیر

ولے غضب ہے بڑا یہ کہ اب وہ چاہے ہے
خیال میں بھی نہ کھینچوں میں ہجو کی تصویر

سو میں ملک نہیں ایسا بشر ہوں تا کے وچند
کہے ہے اس کے کروں گا نہ ماجرا تحریر

کیا میں فرض کہ میں آپ اس سے درگزرا
پھرے گا مجھ سے کوئی گرم و منتظر کا ضمیر

اور ان پہ بھی جو کیا میں نے تازیانہ منع
تو ہو سکے ہے کوئی ان کی وضع کی تدبیر

ہزار شہدوں میں بیٹھیں ہزار جا پہ ملیں
پھریں ہمیشہ لیے جمع ساتھ اپنے کثیر

نہ مانیں تیغ سیاست نہ قہر سلطانی
نہ سمجھیں قتل کا وعدہ نہ ضربتِ شمشیر

مزاج ان کا ٹھٹھول اس قدر پڑا ہے کہ وہ
ہنسی سمجھتے ہیں اس بات کو نہ جرم کبیر

پھر اس پہ یہ بھی ہے یعنی کہ اس مقام کے بیچ
جو ہوئے منشی تو کچھ نثر میں کرے تسطیر

فلیف جن کو خدا نے کیا ہو موزوں طبع — اور اپنے فضل سے بخشی ہو شعر میں توقیر
یہ کوئی بات ہے سو سن کے وہ خموش رہیں — ہوا ہے مصلحۂ گو کہ تصفیہ یہ اخیر
مگر یہ بات میں مانی کہ سوانگ کا بانی — اگر میں ہوں تو مجھے دیجیے بدتریں تعزیر
میں آپ فاقہ کش اتنا مجھے کہاں مقدور — کہ فکر اور کروں کچھ بغیر آش شعیر
مرے حواس پریشاں بہ ایں پریشانی — ہو جیسے لشکر بشکستہ کی خراب بہیر
گر اس پہ صلح کی ٹھہری رہے تو صلح سہی — اگر ہو پھیر شرارت بشر ہوں میں بھی شریر
جواب ایک کے یاں دس ہیں اور دس کے سو — نگاہ کرتے تھے اول بہ ایں قلیل و کثیر
حصول یہ ہے کہ جب کوتوال تک قضیہ — گیا ہو از پئے تہدید شاعران شریر
تو کوتوال ہی بس ان سے اب سمجھ لے گا — یہ دم بدم کی شکایت کی ہے عبث تحریر
یہ وہ مثل ہے کہ جس طرح سارے شہر کے بیچ — بلند قامتی اپنے سے متہم ہو بعیر
سو متہم مجھے ناداں نے ہجو شہ سے کیا — قباحت اس کے جو سمجھے تو اس کو دے تعزیر
ولے مزاج مقدس جو لاابالی ہے — نہیں خیال میں آتا خیال حرف حقیر
جو کچھ ہوا سو ہوا مصحفی بس اب چپ رہ — زیادہ کر نہ صداقت کا ماجرا تحریر
خدا پہ چھوڑ دے اس بات کو وہ مالک ہے — کرے جو چاہے جو چاہا کیا بہ حکم قدیر

مصحفی کی تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ آٹھ دیوان انہوں نے ریختہ کے ترتیب دیے، ایک دیوان فارسی میں لکھا، دو تذکرے لکھے، ایک تذکرہ فارسی کے شعرا کا، ایک تذکرہ اردو شعرا کا جو پیش نظر ہے اور اس کا مسودہ ندوۃ العلما کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

دیوانوں میں تمام اصناف سخن ہیں، قصائد، قطعات، غزلیں، تاریخیں، مستزاد، مخمس، رباعیاں وغیرہ سنگلاخ زمینوں میں قصائد اور غزلیں کاوش فکر کا بہترین نمونہ ہیں۔

مگر سب دیوان ان کے ملتے نہیں، کئی دیوان نواب کلب علی خاں مرحوم کے کتب خانہ میں تھے، نواب کے حکم سے اسیرؔ و امیرؔ نے ان کی تصحیح کی اور سب کا خلاصہ کر کے

ایک دیوان تیار کیا جس کو نواب نے چھپوادیا ہے، مصحفی نے ۶۷ برس کی عمر پا کر ۱۲۴۰ھ میں انتقال کیا اور لکھنؤ میں مدفون ہوئے۔

غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں:

کریں گے خواب راحت یا یہی جنجال ہووے گا
خدا جانے کہ بعد از مرگ کیا احوال ہووے گا

یا ہے اب یہ گرم جوشی یا کہ وہ پرہیز تھا ان اداؤں کا کوئی مارا جیے کس طرح ہائے

مرض عشق سے گر اب کی سنبھل جاؤں گا تو میں دو چار برس کے لیے ٹل جاؤں گا

تھا اگر روز قیامت تو بھی ہم شاداں رہے وہ جو اک دن اس کے ملنے کا مقرر ہو گیا

شوخی تو دیکھو تیر کو سینہ سے کھینچ کر کہتا ہے میرے تیر کا پیکان رہ گیا

مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم پر تیرے دل میں بہت کام رفو کا نکلا

مت میرے رنگ زرد کا چرچا کرو کہ یاں رنگ ایک سا ہمیشہ کسی کا نہیں رہا

ترے کوچہ میں اس بہانے مجھے دن کو رات کرنا
کبھی اس سے بات کرنا کبھی اس سے بات کرنا

شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے دل ہے گویا چراغ مفلس کا

تلوار کو کھینچ ہنس پڑے وہ ہے مصحفی کشتہ اس ادا کا

درد و غم کو بھی ہے نصیبہ شرط یہ بھی قسمت سوا نہیں ملتا

افتادگان وادی غربت کی سرگزشت   کرتا ہے خود بیاں لب خاموش نقش پا

گلی کو یار کی سمجھے ہے اپنا وہ کعبہ   یہ مصحفی سے نہ پوچھو کدھر ہے سجدہ درست

اے مصحفی اس کوچہ میں دل بسکہ لگا ہے   جاتے نہیں اور کرتے ہیں ہم عزم سفر روز

چھیڑ مت ہردم نہ آئینہ دکھا   اپنی صورت سے خفا بیٹھے ہیں ہم

آنے دوا سے جس کے لیے چاک کیا ہے   ناصح سے گریباں کو سلانے کے نہیں ہم

ہر دم کو سمجھتے ہیں دم باز پسیں ہم   غافل تو ہوا ہم سے ذرا بھی، تو نہیں ہم

وہی دشت اور وہی گریباں چاک   جب تلک ہاتھ پاؤں چلتے ہیں

ہائے وہ دل کہ جسے میں نے بغل میں پالا   اب اسے یوں ہدف ناوک مژگاں دیکھوں

فلک گر ہنساتا ہے مجھ پر کسی کو   میں ہنس کر فلک کی طرف دیکھتا ہوں

کھانے نہیں دیتے ہیں مجھے خون جگر بھی   نالے تو مرے حلق کے دربان ہوئے ہیں

واں چشم فسوں ساز نے باتوں میں لگایا   دے پیچ ادھر زلف اڑا لے گئی دل کو

وعدۂ قتل سے رکھتا ہوں دل اپنے کو میں شاد   کہ اسی وعدہ پہ اک وعدۂ دیدار بھی ہے

یار کا صبح تک ہے وعدۂ وصل   ایک شب اور بھی جیے ہے بنے

غم کھاتا ہوں جتنا مری نیت نہیں بھرتی   کیا غم ہے مزے کا کہ طبیعت نہیں بھرتی

مصحفی سود نصیحت کا نہیں عاشق کو میں نہ سمجھوں تو بھلا کیا کوئی سمجھائے مجھے

کنج قفس میں ہم تو رہے مصحفی اسیر فصل بہار باغ میں دھومیں مچا گئی

تو آکے بیٹھے دم نزع جس کی بالیں پر وہ مر بھی جائے تو آنکھیں کبھی نہ بند کرے

دل کے دھڑکوں کا یہ عالم ہے کہ بے منت دست پرزے ہو ہو کے گریبان اڑا جاتا ہے

حسرت پہ اس مسافر بے کس کے روئیے جو تھک گیا ہو بیٹھ کے منزل کے سامنے

میں وہ نہیں ہوں کہ اس بت سے دل مرا پھر جائے
پھروں جو اس سے تو مجھ سے مرا خدا پھر جائے

راہ میں کشتے پڑے ہیں کئی ارمان بھرے نچلے چلیو نہ ترا خون سے دامان بھرے

ہے غریبی میں خبر کس کو وطن والوں کی کیا گرفتار سے پوچھو ہو چمن والوں کی

☆☆☆

شیخ غلام علی راسخ

شیخ غلام علی راسخ عظیم آباد پٹنہ کے رہنے والے ہیں، میر تقی میرؔ سے مشق سخن کی ہے، ان کے حالات پرانے تذکروں میں جو اس وقت پیش نظر ہیں، نہیں ملتے، گلشن بے خار میں کچھ معمولی سا ان کا ذکر ہے اور چند اشعار ان کے درج ہیں باوجودیکہ ان کا کلیات اچھی خاصی ضخامت رکھتا ہے۔

کلیات میں بہت سے قصیدے ہیں، غزلوں کا دیوان اور چھوٹی بڑی چودہ مثنویاں ہیں، زبان بہت پاکیزہ اور طرز بیان نہایت صاف و سادہ ہے، کلام میں رطب و یابس نہ ہونے کے برابر ہے، تصوف کا مذاق بہت ابھرا ہوا نظر آتا ہے جس کو بہت سادہ طریقہ سے ادا کرتے ہیں، تشبیہ اور استعاروں کی چاشنی کم ہے جس سے کسی قدر پھیکا پن ظاہر ہوتا ہے تاہم رنگین شعروں کی کمی بھی نہیں ہے، سینکڑوں شعر ایسے انتخاب کیے جا سکتے ہیں جو دلنشیں ہونے کے قابل ہیں۔

کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ میں ان کا قیام زیادہ رہا ہے، چند قصیدے نواب آصف الدولہ اور غازی الدین حیدر کی تعریف میں بھی ہیں مگر غازی الدین حیدر کی تعریف کا قصیدہ اس زمانہ کا ہے جب وہ نواب وزیر تھے، بعض غزلیں ناسخؔ و آتش کی طرح زمین میں ہیں مگر وہ بھی اپنے رنگ کی ہیں۔

مقطعوں میں میرؔ کی شاگردی کا اکثر ذکر کرتے ہیں اور کہیں کہیں شفائیؔ اور نظیریؔ کی ہمسری کا بھی دعوا ہے، میرے نزدیک ان کے معاصرین میں سے کسی کا بھی کلام زبان

کی پاکیزگی اور بیان کی خوش ادائی میں ان کا جیسا صاف اور ستھرا نہیں ہے، یہ معلوم ہوتا ہے کہ دو چار دیوانوں سے چھانٹ کر یہ دیوان تیار کیا گیا ہے اور بڑی بڑی غزلوں میں سے دس دس پانچ پانچ شعر انتخاب کر کے جمع کر دیے ہیں مگر اس کو کیا کہیے جو زبان غزلوں کی ہے وہی قصیدوں اور مثنویوں کی بھی ہے۔

اس قدر لکھ لینے کے بعد خمخانۂ جاوید نظر سے گزرا، اس میں نوائے وطن سے ان کا کسی قدر تفصیلی حال نقل کیا ہے، لکھا ہے کہ راسخ ۱۱۶۲ھ میں پیدا ہوئے، کوئی کہتا ہے کہ پٹنہ میں، کسی کا بیان ہے کہ موضع سائیں میں جو پٹنہ سے دس کوس کے فاصلہ پر ایک گاؤں ہے ان کی ولادت ہوئی، ۱۲۲۱ھ تک کلکتہ، غازی پور، لکھنؤ اور دلی کی سیاحت میں مصروف رہے، ۱۲۲۲ھ میں اپنے وطن مالوف کو واپس آئے، اس زمانہ میں پٹنہ مرجع ارباب کمال تھا اور شاعری کا گھر گھر چرچا تھا، ان کی عمر کا بقیہ حصہ یہیں گزرا، مشاعروں میں شریک ہوتے تو دوزانو بیٹھے رہتے اور جب شعرا غزلیں پڑھتے تھے تو یہ آنکھیں بند کیے جھوما کرتے تھے، اپنی غزلیں پڑھتے وقت آنسوؤں کا تار بندھ جاتا تھا۔

چھہتّر برس کی عمر میں ۲۲ جمادی الاخریٰ ۱۲۳۸ھ کو وفات پائی، گلشن بیخار میں ہے کہ ۱۲۴۰ھ میں واصل بحق ہوئے مگر قرینہ یہ ہے کہ خم خانۂ جاوید میں نوائے وطن سے جو سنہ وفات نقل کیا گیا ہے وہی صحیح ہوگا۔

تمہارے آشنا کب خلق سے رکھتے ہیں آمیزش — انہیں تو آپ سے بھی ہم نے بیگانہ سدا پایا
دل بلبل نہ تنہا چاک ہے اس عشق کے ہاتھوں — یہ وہ ہے جس سے گل کے بھی گریباں کو قبا پایا

جب تجھے خود آپ سے بیگانگی ہو جائے گی — آشنا تب تجھ سے وہ دیر آشنا ہو جائے گا

لاگ اس پلک کی اتنی ہی معلوم ہے کہ آہ — کانٹا سا کچھ جگر میں ہے اپنے چبھا ہوا

شہادت گاہ خوں ریز محبت طرفہ جا دیکھی — کہ جو مقتول تھا یاں خنجر قاتل کا ممنوں تھا

جوانی ہنس کے کاٹی اب پلک پر اشک چمکے ہے　　جو رات آخر ہوئی نکلا ستارہ صبح پیری کا

تھا جی میں کہ دشواریِ ہجر اس سے کہیں گے　　پر جب ملے کچھ رنج و محن یاد نہ آیا

کیا بیاں ہو صاحبانِ ظرف کی تاثیرِ قرب　　آب کا قطرہ صدف تک آن کر گوہر ہوا

بے مدعا ہوں یہ بھی ہے اک مدعائے دل　　اس قید مدعا سے نہ کوئی رہا ہوا

انتہائے عاشقی ہے شانِ معشوقی کہ ہم　　صید جس صیاد کے تھے وہ شکار اپنا ہوا

دور میں اس کی مست آنکھوں کے　　محتسب بھی شراب خوار ہوا

بگڑی جب سب سے تب کچھ ان سے　　اسلوب بنا موافقت کا
دل نے کھویا ہمیں کہ تھا آہ　　دیوانہ شریک مشورت کا

صورت ہمارے حال کی بگڑی سی دیکھ کر　　قاصد نے ان کے آنے کی دل سے بنائی بات

اپنا بھی ماجرائے دل اک مرثیہ سا ہے　　بے اختیار روتے ہیں لوگ اس بیان پر

ضبط گریہ تو ہے پر دل پر جو اک چوٹ سی ہے　　قطرے آنسو کے ٹپک پڑتے ہیں دو چار ہنوز
شیخ اس بت شکنی پر نہ ہو اتنا مغرور　　تو نے توڑا نہیں اپنا بت پندار ہنوز

بازار جہاں میں کوئی خواہاں نہیں تیرا　　لے جائیں کہاں اب تجھے اے جنس وفا ہم

گھر سے کھو کر در پہ اپنے بیٹھنے دیتے نہیں　　تم جو کہتے ہو کہ جایاں سے میں اب جاؤں کہاں

معکوس ہے نگیں کی طرح میری سرنوشت　　یاد آنے سے مقید نام و نشاں ہوں میں

اس کا ہر برگ آئینہ روئے چمن آرا کا ہے — دیدنی ہے یہ چمن گر ہم نظر پیدا کریں

غم تمہارے در پئے تخریب چشم و دل ہیں آہ — ہے قریب اب اسے دریا اسے صحرا کریں

باوجود دل نظر آؤ نہ تم حیرت ہے یہ — آئینہ پاس اور ہم دیدار کو ترسا کریں

کچھ بھی کیفیت گراں میں ہو تو یہ سب خرقہ پوش — سبحۂ وسجادہ رہن ساغر و صہبا کریں

ہوئے مغلوب شوق کار فرما آخر آخر ہم — ہمیں تھا اختیار آگے پر اب بے اختیاری ہے

اٹھا سکتے نہیں بے طاقتی کا بار بھی اب ہم — ہوئے ناتواں ایسے کہ جینا تک بھی بھاری ہے

اگر باب اجابت تک رسا اپنی دعا ہوتی — تو جی میں تھا کہ خواہان دل بے مدعا ہوتے

☆☆☆

میر غلام حسن حسنؔ

''از اوائل عمرش طبیعتش موزون بود، اکثر خود را مصروف و مشغول
ایں شغل خطیر می داشت، شعر خود را از نظر میر ضیاء الدین ضیا کہ دراں ایام
از مشہوران زمانہ دریں دیار بودی گزرانید، بعد ازانکہ دور دور مرزا رفیع السودا
شد و زبان ریختہ، چنانکہ بود زیادہ دریں دیار رواج یافت بہ حکم قوت ممیز
قدم بر جادہ مستقیم اساتذہ مسلم الثبوت یعنی خواجہ میر دردؔ و مرزا رفیع السوداؔ و
میر محمد تقی میرؔ و میاں محمد قائم گذاشتہ، زبان خود بہ مرتبہ پاکیزگی و شستگی رسانیدہ،
دیوان ضخیم و مثنوی ہائے متعددہ در سلک نظم کشیدہ، خصوصاً در مثنوی، اخیر کہ
سحر البیان نام دارد وید بیضا نمودہ۔'' (اھ تذکرہ مصحفی)

میر غلام حسن نام، حسن تخلص، میر غلام حسین ضاحکؔ کے بیٹے تھے، دلی میں پیدا ہوئے، بارہ برس کے سن میں والد کے ساتھ فیض آباد آئے، کچھ مدت وہاں رہ کر لکھنؤ میں آ بسے، شعر و سخن کا ذوق موروثی تھا اور طبیعت اس کے مناسب پائی تھی۔

اودھ میں آ کر میر ضیاء الدین ضیاؔ کے شاگرد ہوئے مگر ان کی روش پر چل نہ سکے، خواجہ میر دردؔ، مرزا رفیع اور میر تقی میر کے کلام کا تتبع کیا، ایک تذکرہ شعرائے ریختہ کا، ایک دیوان اور گیارہ مثنویاں تصنیف کیں جس میں سحر البیان کی سی قبولیت اردو میں کسی مثنوی کو نصیب نہیں ہوئی۔

آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ جب تک دلی میں رہے اپنے والد اور خواجہ میر درد سے اصلاح لیتے رہے، اودھ میں جا کر میر ضیاء الدین ضیا کے شاگرد ہوئے اور مرزا رفیع سودا کو بھی غزل دکھائی، اسی بنا پر آزاد نے ان کو جا بجا خواجہ میر درد اور مرزا رفیع کا شاگرد بیان کیا ہے، مگر خود میر حسن نے تذکرہ میں اپنے آپ کو میر ضیا کا شاگرد لکھا ہے اور یہ صحیح بھی ہے، بارہ برس کے سن میں انہوں نے دلی چھوڑی، خواجہ میر درد مرحوم سے اصلاح لینے کا کون سا موقع تھا، اگر سودا کو غزل دکھائی ہوتی تو وہ اس کا تذکرہ ضرور کرتے، دیکھو تذکرہ:

"اصلاح سخن از میر ضیا سلمہ اللہ گرفتہ ام لیکن طرز اوشاں از من کما حقہ
سرانجام نیافت، بر قدم دیگر بزرگاں مثل خواجہ میر درد و مرزا رفیع سودا و
میر تقی پیروی نمودم۔"

۱۲۰۱ھ میں ان کی وفات ہوئی، مصحفی نے "شاعر شیریں زبان" سے تاریخ وفات نکال کر حق آشنائی ادا کیا ہے، تذکرۂ شعرا اور ان کی دوسری مثنوی گلزار ارم کا قلمی نسخہ نہایت خوش خط ندوۃ العلما کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

گلزار ارم میں لکھنؤ کی ہجو اور فیض آباد کی تعریف جی کھول کر کی ہے، شاید اسی وجہ سے اس مثنوی کو قبولیت حاصل نہیں ہوئی۔

میر حسنؔ قصیدے کے مرد میدان نہیں تھے البتہ غزل میں ان کا درجہ بہت بلند ہے اور مثنوی میں تو یکتائے زمانہ تھے جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہوسکتا، بے نظیر و بدر منیر کے قصہ میں جو سحر بیانی کی ہے اس کا آج تک جواب نہیں ہوسکا۔

اس کی زبان کی صفائی، محاورہ کا لطف، مضمون کی شوخی، طرز ادا کی نزاکت اور سوال و جواب کی نوک جھونک حد توصیف سے باہر ہے، باوجود اس کے کہ سحر البیان کی تصنیف کو ڈیڑھ سو برس ہونے کو آئے ہیں لیکن اس کی زبان قریب قریب وہی ہے جو آج کل بولی جاتی ہے، یہی ایک اس امر کا کافی ثبوت ہے کہ میر حسن کا مذاق سخن کتنا لطیف و پاکیزہ تھا۔

سر دیوے گا جس دن تو حسنؔ تیغ کو اس کے　　اسرار کھلے گا بھی اس سر نہاں کا

وہ دن گئے کہ گلشن تھا بود و باش اپنا　　اب تو قفس میں بھولے نقشہ بھی گلستاں کا

نہ رکتی تھیں آہیں نہ تھمتے تھے آنسو　　حسنؔ تجکو کیا رات غم تھا کسی کا

اس شوخ کے جانے سے عجب حال ہے میرا　　جیسے کوئی بھولا ہوا پھرتا ہے کچھ اپنا

میں حشر کو کیا روؤں کہ اٹھ جانے سے تیرے　　برپا ہوئی اک مجھ پہ قیامت تو یہیں اور

دامن صحرا سے اٹھنے کو حسنؔ کا جی نہیں　　پاؤں دیوانے نے پھیلائے بیاباں دیکھ کر

آرزو دل کی برآئی نہ حسنؔ وصل میں اور　　لذتِ ہجر کو بھی مفت میں کھو بیٹھے ہم

پھر چھیڑا حسنؔ نے اپنا قصہ　　بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

دل کو کھویا ہے کل جہاں جاکر　　جی میں ہے آج جی بھی کھو آؤں

ناز سے عشوہ سے غمزہ سے لگا لیتے ہیں　　وہ جسے چاہتے ہیں اپنا بنا لیتے ہیں

ترے بن باغ میں جس وقت غنچے گل کے کھلتے ہیں
خراشِ ناخن غم سے جگر کے زخم چھلتے ہیں

سماں تھا کل عجب ہونے سے تیری شوخ محفل میں
کہ سو سو آرزوئیں مضطرب پھرتی تھیں ہر دل میں

وہ اور زمانہ تھا کہ خوباں میں تھی الفت　　ایسا نظر آتا نہیں اب ایک بھی دس میں

پہنچے نہ حسن منزل مقصود کو ہم اور آخر ہوئے سب زیست کے ایام سفر میں

مزے نہ دیکھے کبھی ہم نے زندگانی کے یونہی گزر گئے افسوس دن جوانی کے

حسنؔ دیتا ہے تو کیوں جی بتوں پر ملا دیں گے تجھے کیا یہ خدا سے

اس بت کی بندگی سے نہ آزاد ہو حسنؔ یہ بات بھی کہیں نہ خدا کو بری لگے

رہے جس میں خطرہ سدا نیستی کا پس اے زندگی ایسی ہستی سے گزرے

آرزو اور تو کچھ ہم کو نہیں دنیا میں یاں مگر ایک ترے ملنے کا ارمان تو ہے

کیا ہنسے اب کوئی اور کیا روسکے دل ٹھکانے ہو تو سب کچھ ہوسکے

نغمہ عشق سے ہیں سبحہ و زنار ملے ایک آواز پہ دو ساز کے ہیں تار ملے

عیش و وصال وصحبت یاران فراغ دل اس ایک جان کے لیے کیا کیا نہ چاہیے

آغاز محبت میں دیکھا تو یہ کچھ دیکھا کیا جانیے کیا ہوگا انجام مرے دل کا

کیا جانے اس کے جی پر کیا کچھ خیال گزرا کچھ آپ ہی آپ اپنے جی پر ملال گزرا

جس عالم ہستی کو سمجھتے تھے بہار آہ آخر کو جو دیکھا تو وہ موسم ہے خزاں کا

نو گرفتاری کے باعث مضطرب صیاد ہوں لگتے لگتے جی قفس میں بھی مرا لگ جائے گا

اظہار خموشی میں ہے سو طرح کی فریاد ظاہر کا یہ پردہ ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

سحر البیان کا نمونہ

بے نظیر فلک سیر گھوڑے پر سوار ہو کر بدر منیر کے باغ میں پہنچتا ہے اور ایک دوسرے کو دیکھ کر فریفتہ ہوتے ہیں۔

ہوا ناگہاں اس کا اک جا گزر — سہانا سا اک باغ آیا نظر
سفید ایک دیکھی عمارت بلند — کہ تھی نور میں چاندنی سے دوچند
وہ چھٹکی ہوئی چاندنی جابجا — وہ جاڑے کی آمد وہ ٹھنڈی ہوا

یہ عالم جو بھایا تو کوٹھے پہ آ — اتر اپنے گھوڑے سے اور سر جھکا
لگا جھانکنے اس مکاں کے تئیں — کہ دیکھوں یہاں کوئی ہے یا نہیں
جو دیکھا تو ایسا کچھ آیا نظر — کہ سب کچھ گیا اس کے جی سے گزر

تھے اک طرف گنجان باہم درخت — کہ لپٹے ہوں جس طرح مشتاق سخت
لگاواں سے چھپ چھپ کے کرنے نظر — درختوں سے جوں ماہ ہو جلوہ گر
جو دیکھی تو صحبت عجب ہے وہاں — عجب چاندنی ہے عجب ہے سماں
عجب صورتیں اور طرفہ محل — چلا دیکھتے ہی دل اس کا نکل

لب نہر پر صاف جو غور کی — تو پڑی تھی وہ ایک بلور کی
پڑے اس میں فوارے چھٹتے ہوئے — ہوا بیچ موتی سے لٹتے ہوئے

کھڑا ایک نمگیرۂ زرنگار — کہ تھے جس کی جھالر پہ موتی نثار
مغرق بچھی مسند اک جگمگی — کہ تھی چاندنی جس کے قدموں لگی
نہ پھولے سماتے تھے تکیے دھرے — کہ تھے وہ فقط حسن ہی سے بھرے

وہ مسند جو تھی موج دریائے حسن | وہاں دیکھی اک مسند آرائے حسن
برس پندرہ ایک کا سن و سال | نہایت حسیں اور صاحب جمال
دیے کہنی تکیے پہ اک ناز سے | سر نہر بیٹھی تھی انداز سے
خواصیں کھڑی ایدھر اودھر تمام | ستاروں کا جوں ماہ پر اژدہام
وہ بیٹھی تھی سج دھج بنائے ہوئے | دل اس چاندنی پر لگائے ہوئے
ادھر آسماں پر وہ رخشندہ مہ | ادھر یہ زمیں پر مہ چار دہ
پڑا عکس دونوں کا جو نہر میں | لگے لوٹنے چاند ہر لہر میں
نظر آئے اتنے جو اک بار چاند | زمانے کے منھ کو لگے چار چاند

وہ مکھڑا جسے دیکھ مہ داغ کھائے | وہ نقشہ کہ تصویر کو حیرت آئے
جو کچھ چاہیے ٹھیک نکسک سے رنگ | نزاکت بھرا سیوتی کا سا رنگ
کچھ اک تمکنت اور کچھ اک بانکپن | غرض ہر طرح میں انوکھی پھبن
وہ ابرو کہ محرابِ ایوانِ حسن | جھکی شاخ نخل گلستان حسن
نگہ آفت و چشم عین بلا | مژہ دیں صفوں کو الٹ برملا

وہ بینی کہ جس کی نہیں کچھ نظیر | ہے انگشت قدرت کی سیدھی لکیر
وہ رخسار نازک کہ ہوجائے لال | اگر اس پہ بوسے کا گزرے خیال

وہ ساقیں بلوریں وہ انداز پا | پھرے ہر سحر چشم دل میں سدا
قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام | قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

یہ قدرت کا دیکھا جو اس نے خیال | کہا شاہزادے نے یا ذوالجلال
درختوں سے وہ دیکھتا تھا نہاں | کسی کی نظر جا پڑی ناگہاں

جو دیکھیں تو ہے اک جوان حسین — درختوں کی ہے اوٹ ماہِ مبین

کسی نے کہا کچھ نہ کچھ ہے بلا — کسی نے کہا چاند ہے یاں چھپا
کسی نے کہا ہے پری یا کہ جن — کسی نے کہا ہے قیامت کا دن
کسی نے کہا دیکھیو اے بوا — کھڑا ہے کوئی صاف یہ مردوا
یہ آپس میں باتیں جو ہونے لگیں — اشاروں سے گھاتیں جو ہونے لگیں
گئی بات یہ شاہزادی کے گوش — یہ سنتے ہی جاتا رہا اس کا ہوش
کہا میں تو دیکھوں یہ کہہ کر اٹھی — گیا سنسنا جی تو رہ کر اٹھی
خواصوں کے کاندھے پہ دھرا اپنا ہاتھ — عجب اک ادا سے چلی ساتھ ساتھ
کئی ہمدمیں تھیں جو کچھ کچھ پڑھیں — دعائیں وہ پڑھ پڑھ کے آگے بڑھیں
جو دیکھیں تو ہے اک جوان حسیں — کھڑا ہے وہ آئینہ ساں مہ جبیں
برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن — مرادوں کی راتیں جوانی کے دن
نئی پشت لب سے مسی کی نمود — جسے دیکھ نیلا ہو چرخ کبود

عیاں چستی و چابکی گات سے — نمود جوانی ہر اک بات سے
بدن آئینہ سا دمکتا ہوا — گل باغ خوبی لہکتا ہوا
اکڑ زلف کی اور کاکل کا بل — جوانی کی شب کا سماں برمحل
قیافے سے ظاہر سراپا شعور — جبین پر برستا شجاعت کا نور

گئی اس جگہ جب یہ بدر منیر — اور اس نے جو دیکھا شہ بے نظیر
گئے دیکھتے ہی سب آپس میں مل — نظر سے نظر جی سے جی دل سے دل
غرض بے نظیر اور بدر منیر — گرے دونوں آپس میں ہو کر اسیر

رہی کچھ نہ تن من کی سدھ بدھ اسے ۔۔۔ نہ کچھ اپنے تن کی رہی سدھ اسے
تھی ہمراہ اک اس کے دخت وزیر ۔۔۔ نہایت حسیں اور قیامت شریر
زبس تھی ستارہ سی وہ دلربا ۔۔۔ اسے لوگ کہتے تھے نجم النسا
شتابی سے اس نے چھڑکا گلاب ۔۔۔ تب آئی تنوں میں ذرا ان کے تاب
وہ شہزادۂ دل شدہ تو ٹھٹھک ۔۔۔ وہ رہ گیا نقش پا سا بھچک
کہ وہ نازنیں کچھ جھجھک منہ چھپا ۔۔۔ کمر اور چوٹی کا عالم دکھا
چلی اس کے آگے سے منہ موڑ کر ۔۔۔ وہیں نیم بسمل اسے چھوڑ کر

ادائیں سب اپنی دکھاتی چلی ۔۔۔ چھپا منہ کو اور مسکراتی چلی
غضب منہ پر ظاہر وہ لے دل میں چاہ ۔۔۔ نہاں آہ آہ اور عیاں واہ واہ
یہ ہے کون کمبخت آیا یہاں ۔۔۔ میں اب چھوڑ کر گھر اپنا جاؤں کہاں
یہ کہتی ہوئی آن کی آن میں ۔۔۔ چھپی جا کے وہ اپنے دالان میں

کہ اتنے میں آئی وہ دخت وزیر ۔۔۔ لگی ہنس کے کہنے کہ بدر منیر
مجھے چوچلے تو خوش آتے نہیں ۔۔۔ ترے ناز بیجا یہ بھاتے نہیں
کیا ہے اگر تو نے گھائل اسے ۔۔۔ تو مت چھوڑ اب نیم بسمل اسے
ٹک اک حظ اٹھا زندگانی کا تو ۔۔۔ مزہ دیکھ اپنی جوانی کا تو
یہ حسن و جوانی یہ جوش و خروش ۔۔۔ غفور است ایزد تو ساغر بنوش
سدا عیش دوراں دکھاتا نہیں ۔۔۔ گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

یہ سن سن کے وہ نازنیں مسکرا ۔۔۔ لگی کہنے اچھا بھلا ری بھلا
میں سمجھی ترا دل گیا ہے ادھر ۔۔۔ بہانے تو کرتی ہے کیوں مجھ پہ دھر

لگی کہنے ہنس ہنس کے وہ ماہ وش ہوئی تھی اسے دیکھ میں ہی تو غش
تمہیں نے تو چھڑ کا تھا مجھ پر گلاب بھلا میری خاطر بلا لو شتاب
یہ آپس میں رمزوں کی باتیں ہوئیں اشاروں کی باہم جو گھاتیں ہوئیں
بلا لائی جا اس جواں کے تئیں کیا میزباں میہماں کے تئیں

بزور اس کو لاکر بٹھایا جو واں نہ پوچھ اس گھڑی کی ادا کا بیاں
وہ بیٹھی عجب اک انداز سے بدن کو چرائے ہوئے ناز سے
منہ آنچل سے اپنا چھپائے ہوئے لجائے ہوئے شرم کھائے ہوئے
پسینے پسینے ہوا سب بدن کہ جوں شبنم آلودہ ہو یاسمن
گھڑی دو تلک وہ مہ و آفتاب رہے شرم سے پائے بندِ حجاب

جب آپس میں چلنے لگے جام مل مندے غنچہ ساں دل کھلے مثل گل
کھلا بند جس دم در گفتگو جواں نے حقیقت کہی مو بہ مو
پری کا بھی احوال ظاہر کیا چھپے راز سے اس کو ماہر کیا
کہا اک پہر کی ہے رخصت مجھے زیادہ نہیں اس سے فرصت مجھے
یہ سن دل ہی دل پیچ کھا پیچ و تاب دیا شاہزادی نے اس کو جواب
مرد تم پری پر وہ تم پر مرے بس اب تم ذرا مجھ سے بیٹھو پرے
میں اس طرح کا دل لگاتی نہیں یہ شرکت تو بندی کو بھاتی نہیں
عبث تم سے کیوں دل لگائے کوئی بھلے چنگے دل کو جلائے کوئی
یہ سن پاؤں پر گر پڑا بے نظیر کہا کیا کروں آہ بدر منیر
کوئی لاکھ جی سے ہو مجھ پر فدا میں تجھ پر فدا ہوں مجھے اس سے کیا
کہا چل سر اپنا قدم پر نہ دھر کسی کے مجھے دل سے ہے کیا خبر

یہ رمز و کنایے جو ہونے لگے — تو آپس میں ہنس ہنس کے رونے لگے
رہی دل ہی دل میں غرض دل کی بات — پہر بھر گئی اتنے عرصہ میں رات
خبر رات کی سن اٹھا بے نظیر — کہا اب میں جاتا ہوں بدر منیر
اگر قید سے چھوٹنے پاؤں گا — تو پھر آج کے وقت کل آؤں گا

جس پری نے بے نظیر کو اڑایا تھا اور صرف سیر کرنے کو فلک سیر گھوڑا دیا تھا، اس کو خبر ہوگئی کہ یہ کسی اور پر دیوانہ ہو گئے ہیں، اس نے چاہ زنداں میں قید کر دیا، ان کے نہ آنے سے بدر منیر کی بے قراری ملاحظہ ہو:

پھنسا اس طرح سے جو وہ بے نظیر — پڑی بے قراری میں بدر منیر
بہم دو دلوں میں جو ہوتی ہے چاہ — تو ہوتی ہے دل کے تئیں دل سے راہ
قلق واں جو گزرا تو یاں غم ہوا — رکا جی وہاں یاں خفا دم ہوا
کئی دن جو آیا نہ وہ رشک ماہ — نظر میں ہوا اس کے عالم سیاہ

گئے اس پہ جب دن کئی اور بھی — بگڑنے لگے پھر تو کچھ طور بھی
دوانی سی ہر طرف پھرنے لگی — درختوں میں جا جا کے گرنے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب — لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
تپ ہجر گھر دل میں کرنے لگی — در اشک سے چشم بھرنے لگی
خفا زندگانی سے ہونے لگی — بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تپ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ — اکیلی لگی رونے منھ ڈھانپ ڈھانپ
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا — نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے — محبت میں دن رات گھٹنا اسے
کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو — تو اٹھنا اسے کہہ کے ہاں جی چلو

کسی نے جو کچھ بات کی بات کی | یہ دن کی جو پوچھو کہی رات کی
کہا گر کسی نے کہ کچھ کھایئے | کہا خیر بہتر ہے منگوایئے
جو پانی پلایا تو پینا اسے | غرض غیر کے ہاتھ جینا اسے
نہ کھانے کی سدھ اور نہ پینے کا ہوش | بھرا دل میں اس کے محبت کا جوش
چمن پر نہ مائل نہ گل پر نظر | وہی سامنے صورت آٹھوں پہر
غزل یا رباعی ویا کوئی فرد | اسی ڈھب کی پڑھنا کہ ہو جس میں درد
سو یہ بھی جو مذکور نکلے کہیں | نہیں کچھ تو اس کی بھی خواہش نہیں
گیا ہو جب اپنا ہی جیوڑا نکل | کہاں کی رباعی کہاں کی غزل

زباں پر تو باتیں مگر دل اداس | پراگندہ حیرت سے ہوش و حواس
نہ منہ کی خبر اور نہ تن کی خبر | نہ تن کی خبر نے بدن کی خبر
جو مستی ہے دو دن کی تو ہے وہی | جو کنگھی نہیں ہے تو یوں ہی سہی
نہ منظور سرمہ نہ کاجل سے کام | نظر میں وہی تیرہ بختی کی شام
ولیکن یہ خوباں کا دیکھا سو بھاؤ | کہ بگڑے سے دونا ہوا ان کا بناؤ
نہیں حسن کی اس طرح بھی کمی | جو بیٹھی ہے بگڑی تو گویا بنی
غرض بے ادائی ہے یاں کی ادا | بھلوں کو سبھی کچھ لگے ہے بھلا

☆☆☆

شیخ قلندر بخش جرأت

"اگر چہ پارۂ در علم موسیقی و دستار نوازی نیز دستے بہم رسیدہ لیکن انچہ گوئید دیوانہ فن شعر است کہ گاہے بے فکر نمی ماند، بسیار دردمند و گداز است۔" (اھ تذکرۂ میر حسن)

"از اصول و قوانین ایں فن بہرہ نداشتہ نغمہائے خارج از آہنگ می سرود، معہذا البعض آبیاتش بہ غایت خوش و دلربا آمدہ۔" (اھ گلشن بیخار)

قلندر بخش جرأت اصل میں دہلی کے رہنے والے تھے، باپ کا نام حافظ امان تھا، ان کے بزرگ دربار شاہی میں دربانی کی خدمت رکھتے تھے اور لوگوں کی طرح ان کا کنبہ بھی فیض آباد آبسا تھا، چنانچہ جرأت کا نشو نما فیض آباد میں ہوا، ابھی جوان بھی نہ ہونے پائے تھے کہ آنکھوں سے معذور ہو گئے۔

طبیعت چلبلی تھی، موسیقی اور ستار نوازی کی طرف مائل ہوئی اور شعر و سخن کا چسکا پڑا، جعفر علی حسرتؔ سے مشق سخن کی، شعر و سخن کے ساتھ بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی میں بھی نام پیدا کیا، اول اول نواب محبت خاں کی سرکار (۱) میں نوکر ہوئے، اس کے بعد مرزا سلیمان شکوہ کے

(۱) نواب محبت خاں حافظ رحمت خاں کے بیٹے تھے، حافظ رحمت خاں کی شہادت کے بعد چند روز شجاع الدولہ نے ان کے سب بیٹوں کو الٰہ آباد میں نظر بند کر رکھا، آصف الدولہ کے وقت میں رہائی ہوئی اور انہوں نے لکھنؤ میں بود و باش اختیار کی، نواب نے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا، خوش رو و خوش خو جوان تھے، میر حسنؔ و مصحفیؔ وغیرہ ان کی مروت، اہلیت اور خوش اخلاقی کے مداح و ثنا خواں ہیں، ان کو شعر و سخن سے بے حد (باقی اگلے صفحہ پر)

دربار تک رسائی ہوگئی، میر انشاء اللہ خاں کی اوران کی صحبتیں خوب گرم رہتی تھیں۔

دیوان ان کا چھپ گیا ہے، اس میں ہر طرح کی غزلیں، رباعیاں، مخمس، مستزاد، واسوخت، ہجویں اور تاریخیں ہیں، دیوان میں رطب ویابس بہت نہیں ہے۔

آزاد نے ٹھیک لکھا ہے کہ جو استادوں کے طریقے پائے ہیں انہیں سلیقے سے کام میں لائے ہیں، اس پر کثرت مشق نے صفائی کا رنگ دیا ہے کہ سب کوتاہیوں کا پردہ ہوگیا اور ان کو خود صاحب طرز مشہور کر دیا۔

آخر عمر تک لکھنؤ میں رہے اور وہیں ۱۲۲۵ھ میں فوت ہوئے، ناسخ نے تاریخ کہی ع

ہائے ہندوستان کا شاعر موا

یاد آتا ہے تو کیا پھرتا ہوں گھبرایا ہوا چمپئی رنگ اس کا اور جوبن وہ گدرایا ہوا

بات ہی اول تو وہ کرتا نہیں مجھ سے کبھی اور جو بولے بھی ہے کچھ منہ سے تو شرمایا ہوا

سابقہ حاشیہ: ذوق تھا، فارسی اور اردو میں فکر کرتے تھے اور جعفر علی حسرت سے مشق سخن کی تھی، مسٹر جانسین کی فرمائش سے سی پنو کا قصہ نظم کر کے اس کا نام اسرار محبت رکھا تھا، دیوان ان کا تمام اصناف سخن پر مشتمل ہے۔

دیر سے مجکو نہ کچھ کام نہ کعبہ سے غرض کیوں گلہ کرتے ہو اے گبرو مسلماں میرا

جس کو تری آنکھوں سے سروکار رہے گا بالفرض جیا بھی تو وہ بیمار رہے گا

بیکسوں کی خاک پر جوشش سے آتا ہے جو ابر اے فلک آنے دے وہ بھی آن کر رہ جائے گا

درد کس کا مرے پہلو میں خلش کرتا ہے یاالٰہی مجھے کیوں رات دن آرام نہیں

عاشقی کا تو تری نام ہر اک لیتا ہے پر محبت سا کوئی عشق میں بدنام نہیں

الفت میں جس کو اشک بہانے کی خو نہ ہو اس کو خدا کرے کہ کہیں آبرو نہ ہو

جو چاہے ہوش تو بیہوش ہو جام محبت سے یہ بیہوشی ہے ایسی جس سے ہشیاری نہیں جاتی

میرے اور اس کے جو پوچھو ربط کیا کیا کچھ نہ تھا
پر دل اس کا پھر گیا ایسا کہ گویا کچھ نہ تھا

آئے جو مرے پاس تو منھ پھیر کے بیٹھے یہ آج نیا آپ نے دستور نکالا

تجکو ہم اس لیے کہتے تھے کوئی دم مت جا چل بسے ہم نہ ترے چلتے ہی چلتے دیکھا
اس کا بیمار نہ نکلا کبھی گھر سے جرأت گھر سے تابوت ہی آخر کو نکلتے دیکھا

جستجو میں دل کے بہلانے کے جی کھونا پڑا جو ہنسی کی بات تھی اس کا ہمیں رونا پڑا

تشبیہ کس مزے سے میں لذت کو اس کی دوں کچھ دل ہی جانتا ہے مزا دل کی چاہ کا

فصل گل گرچہ ہزار آئی پر اپنا جرأت دل پژمردہ نہ جوں غنچۂ تصویر کھلا

اور تو کیا مشغلے ہیں ہجر میں تیرے مگر دل کی بیتابی سے سو سو بار اٹھنا بیٹھنا

ہم اسیرانِ قفس کیا کہیں خاموش ہیں کیوں راہ لگ اپنی چل اے باد صبا تجکو کیا

نزع میں بھی تری صورت کو نہ دیکھا افسوس مرتے مرتے بھی نہ ارمان نظر کا نکلا

خدا جانے کرے گا چاک کس کس کے گریباں کو
ادا سے ان کا چلنے میں اٹھا لینا یہ داماں کا

چین کیا ہو خانۂ ہستی میں خاک جو یہاں آیا مکدر ہی گیا

سر دیجیے راہِ عشق میں پر منھ نہ موڑیے پتھر کی سی لکیر ہے یہ کوہ کن کی بات

گیا وہ دل ہی پہلو سے کہ جس کو کبھی روتے تھے چھاتی سے لگا کر

دل ہی اس کافر کا پتھر ہو تو کوئی کیا کرے ورنہ ایسی آہ سوزاں بے اثر میری نہیں

قیس و فرہاد کی تھی ایک ہی منزل لیکن وہ بیاباں کی گیا راہ وہ کہسار کی راہ

تو نے اس باغ میں دم بھرنے کی مہلت پائی اے صبا ہم نے تو اتنی بھی نہ مہلت پائی

وصل کے دن بھی میں کانپ اٹھتا ہوں بیٹھے بیٹھے
یاد آتے ہیں وہ صدمے جو شب ہجراں کے

نہ ساماں ان کے رہنے کا نہ کچھ امید طالع سے
دل بیتاب سے کس منہ سے کہیے تک تحمل کر

دور سے کل ہم نے اس کے آستاں کو دیکھ کر رو دیا کن حسرتوں سے آسماں کو دیکھ کر

ہم اسیروں کو ملا ہے تنگ یاں ایسا قفس زیر گردوں تک زمیں پر تلملا سکتے نہیں

جو دیکھا مضطرب مجکو تو محفل میں کسی سے وہ یہ کہتا تھا کہ ہے لطف محبت رازداروں میں

اے ستم ایجاد کب تک یہ ستم دیکھا کریں تو کرے غیروں سے باتیں اور ہم دیکھا کریں

دل وحشی کو خواہش ہے تمہارے در پہ آنے کی دیوانہ ہے ولیکن بات کہتا ہے ٹھکانے کی

ناصح میں اور ہم میں ہیں طرفہ صحبتیں ہم کچھ نہیں سمجھتے وہ سمجھائے جائے ہے

پوچھا یہاں تلک کہ ہوا تنگ نامہ بر لذت ملی جو یار کے دشنام سے مجھے

کیا کہوں جرأت میں اس صیاد قاتل کا گلہ دام سے چھوڑا تو چھوڑا توڑ کر بازو مجھے

جوش گل چاکِ قفس سے دم بہ دم دیکھا کیے　　سب نے لوٹی ہیں بہاریں اور ہم دیکھا کیے

مستزاد کا رنگ ملاحظہ ہو:

جادو ہے نگہ چھب ہے غضب قہر ہے مکھڑا، اور قد ہے قیامت
غارت گر دیں وہ بت کافر ہے سراپا۔ اللہ کی قدرت
اٹکھیلی ہے رفتار میں گفتار کی کیا بات۔ ہر بات جگت ہے
اور رنگ رخ یار ہے گویا کہ بھبھوکا۔ پھر تس پہ ملاحت
ہیں بال یہ بکھرے ہوئے مکھڑے پہ دھواں دھار۔ جوں دود بہ شعلہ
حسنِ بتِ کافر ہے خدائی کا جھگڑا۔ ٹک دیکھیو صورت
ابرو فن خونریزی میں اس کے ہیں غضب طاق۔ شمشیر برہنہ
آنکھوں کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں سے نہ دیکھا۔ افسوں ہے اشارت
کان ایسے کہ کانوں سے سنے ویسے نہ اب تک۔ نے آنکھوں سے دیکھے
بالے کے تصور میں مجھے گھیرے ہے گویا۔ اک حلقۂ حیرت
بینی یہ خوش اسلوب کہ نتھنوں کی پھڑک دیکھ۔ تڑپے ہے دو عالم
ہے اس کو لب یار کے بوسہ کی تمنا۔ ارمان ہے حسرت
دانتوں کی صفا کیا کہوں موتی کی لڑی ہے۔ لب لعل کے ٹکڑے
مستی ہے بلاتس پہ رکھے پان کا بیڑا۔ سو شوخی کی رنگت
دل خون کرے وہ دست حنا بستہ پھر اس میں۔ سمرن کی پھبن ہائے
ہے وضع تو سادی سی پہ کیا کیا نہیں پیدا۔ شوخی و شرارت
اس ابھرے ہوئے گات کی کیا بات جسے دیکھ۔ سب ہاتھ ملیں ہیں
اور ہائے ری ہر بات میں گردن کا وہ ڈورا۔ ہے دام محبت
ہے عشوۂ و انداز و ادا ناز و کرشمہ۔ اور گرمی و شوخی
ہر عضو پہ آنکھ اٹکے وہ کافر ہے سراپا۔ اک موہنی مورت

میر انشاء اللہ خاں انشاؔ

"میر انشاء اللہ خاں خلف میر ماشاء اللہ خاں نجفی الاصل مرشد آبادی المولد لکھنوی المدفن دیوانے دارد مشتمل بر اصناف سخن و ہیچ صنف را بطریقہ راسخہ شعرانہ گفتہ امادر شوخی طبع و جودت ذہن او سخنی نیست۔ (اھ گلشن بیخار)

"غزلوں کا دیوان عجیب طلسمات کا عالم ہے، زبان پر قدرت کامل، بیان کا لطف، محاورہ کی نمکینی، ترکیبوں کی خوشنما تراشیں دیکھنے کے قابل ہیں مگر یہ عالم ہے کہ ابھی کچھ ہیں، ابھی کچھ ہیں جو غزلیں یا غزلوں کے اشعار با اصول ہو گئے، وہ ایسے ہیں کہ جواب نہیں اور جہاں طبیعت اور طرف جا پڑی وہاں ٹھکانا نہیں۔" (اھ آب حیات)

نواب مصطفیٰ خاں مرحوم کا بھی یہی مطلب ہے کہ جو آزاد نے سمجھا ہے، پھر معلوم نہیں کہ ایک دوسری جگہ یہ کیا لکھ دیا ہے کہ "نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کا گلشن بیخار جب دیکھتا ہوں تو خار نہیں کٹار کا زخم دل پر لگتا ہے"، سید موصوف کے حال میں "ہیچ صنف را بہ طریقہ راسخہ شعرا نگفتہ۔"

میر انشاء اللہ خاں کی ولادت مرشد آباد میں ہوئی، ان کے والد میر ماشاء اللہ خاں فضیلت علمی کے ساتھ شاعر بھی تھے، انہوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم میں اپنی طرف سے کوتاہی نہیں کی، یہ بھی بلا کے ذہین و ذکی تھے، تھوڑے دنوں میں فارسی، اس کے بعد عربی میں خاصی استعداد پیدا کرلی، طبابت کی طرف متوجہ ہوئے تو وہ ان کی خاندانی چیز تھی، شاعری کی

طرف آئے تو آندھی کی طرح آئے، عربی، فارسی اور ریختہ تینوں زبانوں میں طبع آزمائی کی، بہاء الدین آملی کی نان وحلوا کے جواب میں شیر و برنج تیار کی جو حقیقت میں بہت مزیدار ہے، نواب سعادت علی خاں کے شکار کا حال ایک مثنوی میں لکھا ہے، وہ بھی اچھی ہے۔

مگر زیادہ توجہ ریختہ کی طرف رہی اور اخیر اخیر میں اسی کو اپنے فضل وکمال کا جولان گاہ قرار دیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں تباہی کا سیلاب ہر طرف سے آیا ہوا تھا، یہ مرشد آباد سے دلی آئے، بقول آزاد اس وقت دلی کا دربار ایک ٹوٹی پھوٹی درگاہ اور سجادہ نشین اس کے شاہ عالم بادشاہ تھے (۱) شاہ عالم نے شفقت کا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا، یہ دربار میں داخل ہوئے اور چند روز دلی میں ہنسی خوشی رہے۔

---

(۱) شاہ عالم کا نام عالی گوہر تھا، والد عزیز الدین عالمگیر ثانی عماد الملک وزیر کے ہاتھوں شاہ شطرنج بنے ہوئے بے بسی کی زندگی بسر کر رہے تھے، عالی گوہر سے باپ کی مجبوری اور اپنی تباہی دیکھی نہ گئی، کسی بہانے سے نکل کھڑے ہوئے، کچھ دنوں نواب نجیب الدولہ سے ساز باز کرنے میں لگے رہے، اس کے بعد نواب شجاع الدولہ کے مشورہ سے نواب محمد قلی خاں صوبے دار الہ آباد نے ان کو بلا لیا اور ان کے جھنڈے تلے فوجیں فراہم کر کے عظیم آباد پر چڑھائی کر دی، وہاں راجہ رام نرائن ناظم بنگالہ کی حیثیت سے صوبہ بہار کا حاکم تھا، اس نے قلعہ میں محصور ہو کر یہ مشہور کیا کہ نواب جعفر علی خاں کرنل کلف کو لیے ہوئے مدد کو آرہے ہیں، محمد قلی خاں عظیم آباد تک پہنچ چکے تھے اور مورچے قائم کر لیے تھے مگر اس خبر سے ان کی ہمت جاتی رہی، عالی گوہر کا دائرۂ دولت کرم ناسہ ندی کو عبور کر کے صوبہ بہار میں داخل ہوا ہی تھا کہ باپ کے قتل کیے جانے کی خبر آئی، وہیں کے وہیں ۱۱۷۳ھ میں شاہ عالم کا لقب اختیار کر کے بادشاہ ہو گئے۔

نواب شجاع الدولہ کو قلم دان وزارت، نواب نجیب الدولہ کو امیر الامرائی کا خلعت روانہ کیا، نواب منیر الدولہ کو سفارت کے عہدہ پر نامزد کر کے احمد شاہ درانی کے دربار میں بھیجا اور خود بدولت ایک مدت تک صوبہ بہار کے لیے ہاتھ پاؤں مارتے رہے، کبھی فتح اور کبھی شکست ہوتی رہی اور نواب شجاع الدولہ دور سے بیٹھے بیٹھے گھاتیں بتاتے رہے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

نوجوانی میں جو امنگیں انسان کو ہوا کرتی ہیں وہ ان کو بھی تھیں مگر اس وقت دلی میں کیا دھرا تھا، جی اچاٹ ہوا تو لکھنؤ پہنچے اور مرزا سلیمان شکوہ کے دربار میں رسائی پیدا کی، وہ شاہ عالم بادشاہ کے بیٹے تھے، انہوں نے کچھ تو باپ کا نمک خوار سمجھ کر اور کچھ ان کی بذلہ سنجی

سابقہ حاشیہ: جب نواب قاسم علی خاں عالیجاہ کی انگریزوں سے بگڑ گئی اور وہ شکست کھا کر شجاع الدولہ کے پاس چلے آئے تو شجاع الدولہ نے ان کے زرو جواہر پر قبضہ کیا، اس کے بعد شاہ عالم کو آگے رکھ کر انگریزوں سے لڑنے کو نکلے، جس کا انجام یہ ہوا کہ بکسر کے مقام پر ان کو شکست ہوئی، شجاع الدولہ بھاگ کر روہیل کھنڈ آئے اور انگریزوں نے شاہ عالم سے دیوانی ہرسہ صوبہ بنگال کی سند حاصل کر کے چھبیس لاکھ روپیہ نقد اور صوبہ الٰہ آباد و چکلہ کوڑا پر بادشاہ سے فیصلہ کر لیا۔

شاہ عالم وہاں سے الٰہ آباد آئے اور سات برس یہاں رہے، اس کے بعد نواب منیر الدولہ کو یہاں کا انتظام سپرد کر کے ۱۱۸۵ھ میں دلی تشریف لے گئے، وہاں پہنچ کر مرہٹوں کی مدد سے نواب ضابطہ خاں خلف نواب نجیب الدولہ پر فوج کشی کردی اور مرہٹوں نے اس کا سارا ملک دبا لیا، ضابطہ خاں نے بھاگ کر شجاع الدولہ کے پاس پناہ لی اور چند دنوں کے بعد تکوجی راؤ ہولکر کی سفارش سے دربار شاہی میں باریابی حاصل کی۔

صوبہ الٰہ آباد کا یہ انجام ہوا کہ نواب منیر الدولہ کے مرنے کے بعد شجاع الدولہ نے اس پر قبضہ کر لیا اور چند سال تک وہاں کی آمدنی بادشاہ کو بھیجتے رہے، اس کے بعد یہ بھی بند کر دی۔

ضابطہ خاں کا بیٹا غلام قادر بادشاہ سے دلی عناد رکھتا تھا، اس نے ۱۲۰۲ھ میں ایک دن موقع پا کر بادشاہ کو تخت سے کھینچ کر پچھاڑ دیا اور پیش قبض سے ان کی دونوں آنکھیں نکال لیں اور بیدار بخت پسر احمد شاہ کو تخت پر بٹھا دیا، شاہ عالم سلطنت کے ساتھ نور بصارت سے بھی محروم ہو گئے، مہاراجہ سندھیا کو خبر ہوئی تو انہوں نے فوج بھیجی جس نے قلعہ پر قبضہ کر کے شاہ عالم کو دوبارہ تخت پر بٹھایا اور غلام قادر کو بھاگتے ہوئے پکڑ کر ہاتھ پاؤں کاٹ کاٹ کر بڑے عذاب سے مارا مگر اس سے کیا ہوتا، جو ہونا تھا ہو چکا، شاہ عالم نے خود اس واقعہ کو ایک قطعہ میں نظم کیا ہے جو نہایت درد انگیز ہے، چند اشعار اس کے (باقی اگلے صفحہ پر)

اور لطیفہ گوئی کی وجہ سے ان کی سرپرستی کی اور اپنی غزلیں اصلاح کے لیے ان کو دینے لگے، یہ دوسری فکر میں بھی لگے رہے، آخرکار تفضل حسین خاں علامہ کی سفارش سے نواب سعادت علی خاں کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور ان کا ستارۂ اقبال چمکا، پھر تو ایسے شیر وشکر ہوئے کہ نواب کو ان کے سوا کسی کی بات میں مزا ہی نہ آتا تھا۔

مگر نواب کا مزاج قدرتی طور پر متین اور سنجیدہ واقع ہوا تھا، پھر امور ملکی و مالی کا سرانجام وہ اپنے ہاتھوں سے کرنا چاہتے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ جو حصہ ملک

سابقہ حاشیہ: ملاحظہ ہوں:

صرصر حادثہ برخاست پے خواری ما　　داد برباد سرو برگ جہاں داری ما

آفتابِ فلک رفعت شاہی بودیم　　برو در شام زوال آہ سیہ کاری ما

چشم ما کندہ شد از دست فلک تیرہ شد　　تا نہ بینم کہ کند غیر جہانداری ما

داد افغاں بچہ شوکت شاہی برباد　　کیست جز ذات مبرا کہ کند یاری ما

اس واقعہ کے بعد بڑی بے لطفی سے شاہ عالم نے زندگی بسر کی، برائے نام وہ تخت پر تھے اور حقیقت میں مرہٹوں کا راج تھا، چاروں طرف لوٹ مار جاری تھی، کوئی متنفس ایک گھڑی بھی چین سے سانس لینے کی قدرت نہیں رکھتا تھا، بادشاہ شعر وسخن سے اپنا دل بہلایا کرتے رہتے تھے یہاں تک کہ ۱۲۲۱ھ میں اس مخمصہ سے ان کو نجات ملی، اردو کا کلام ان کا ملاحظہ ہو ؎

کیجیے ہمدم بھلا کیوں کر نہ شکوہ یار کا　　ہم تو بندے اس کے ہوں وہ یار ہوا اغیار کا

خانۂ دل کو جلایا اک نگہ سے اس نے آہ　　ہو جیو یارب برا اس چشم آتش بار کا

دیکھ کر کل نبض مری یوں لگا کہنے طبیب　　کوئی بھی جانبر ہوا بیمار اس آزار کا

صبح اٹھ جام سے گزرتی ہے　　شب دل آرام سے گزرتی ہے

عاقبت کی خبر خدا جانے　　اب تو آرام سے گزرتی ہے

انہوں نے شوق حکمرانی کی گھبراہٹ میں اپنے ہاتھ سے کھودیا تھا اس کا کانٹا ہر وقت ان کے دل میں چبھتا رہتا تھا، میر انشاء اعتدال سے بڑھ کر منسوڑ تھے اور ضرورت سے زیادہ ان میں تمسخر تھا، اس وجہ سے نواب کے ساتھ زیادہ دنوں تک نبھ نہ سکی، ۱۲۲۵ھ میں اقبال نے منھ موڑا، یہ دربار سے نکالے گئے۔

آزاد کہتے ہیں کہ ایک دن نواب سعادت علی خاں نے انہیں بلا بھیجا، گھر پر نہیں ملے، خفا ہو کر حکم دیا کہ ہمارے سوا کسی کے ہاں نہ جایا کرو، اس قید بے زنجیر نے انہیں بہت دق کیا، تازہ مصیبت یہ ہوئی کہ تعالی اللہ خاں جوان بیٹا مر گیا، اس صدمہ سے حواس میں فرق آ گیا یہاں تک کہ ایک دن سعادت علی خاں ان کے مکان کی طرف سے نکلے، کچھ غم وغصہ کچھ دل کے بے قابو ہو جانے سے سر راہ کھڑے ہو کر سخت سست کہا، نواب نے جا کر تنخواہ بند کر دی۔

اس کے بعد مرزا سعادت یار خاں رنگین سے نقل کیا ہے کہ لکھنؤ میں انشا کے وہ وہ رنگ دیکھے جن کا خیال کر کے دنیا سے جی بیزار ہوتا ہے، ایک تو وہ اوج کا زمانہ تھا کہ نواب کی ناک کے بال تھے اور دروازے پر گھوڑے، ہاتھی، پالکی، نالکی کے ہجوم سے راستہ نہ ملتا تھا، دوسری وہ حالت کہ ظاہر درست تھا مگر درخت اقبال کی جڑ کو دیمک لگ گئی تھی، نواب کا حکم تھا کہ سوا دربار کے گھر سے نہ نکلیں، تیسری بار گیا تو ان کو ایک مشاعرہ میں اس طرح دیکھا کہ "ایک شخص میلی کچیلی روئی دار مرزئی پہنے، سر پر ایک میلا سا پھینٹا، گھٹنا پاؤں میں، گلے میں سکوں کا توبڑا ڈالے ایک ککر کا حقہ ہاتھ میں لیے آیا، توبڑے میں سے ایک کاغذ نکالا، غزل پڑھی اور کاغذ پھینک کر چل دیے (۱) چوتھی بار جو گیا تو پوچھتا ہوا گھر پہنچا، ڈیوڑھی پر

---

(۱) آزاد نے انشا کی وہ مشہور غزل اس جگہ نقل کی ہے جو اس موقع کے لیے نہایت موزوں ہے اور اس کا ایک شعر یہ ہے ۔

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی　　تجھے انکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

مگر واضح رہے کہ یہ غزل انشا کی اس زمانے کی تصنیف نہیں ہے جو ان کے جنون اور (باقی اگلے صفحہ پر)

چوتھی بار گیا تو پوچھتا ہوا گھر پہنچا، ڈیوڑھی پر دستک دی، اندر سے کسی بڑھیا نے پوچھا کون ہے، میں نے نام بتایا، وہ ہٹ گئی، میں اندر گیا دیکھا کہ ایک کونے میں بیٹھے ہیں، تن برہنہ ہے، دونوں زانوں پر سر دھرا ہے، آگے راکھ کے ڈھیر ہیں، ایک ٹوٹا سا حقہ پاس رکھا ہے، یہ دیکھ کر بے اختیار دل بھر آیا، میں بھی وہیں زمین پر بیٹھ گیا اور دیر تک رویا، جب جی ہلکا ہوا تو میں نے پکارا، سید انشا! سید انشا! سر اٹھا کر اس نظر حسرت سے دیکھا جو کہتی تھی کہ کیا کروں آنکھ میں آنسو نہیں، میں نے کہا کیا حال ہے، ایک ٹھنڈی سانس بھر کر کہا شکر ہے، پھر اسی طرح سر گھٹنوں پر رکھ لیا کہ نہ اٹھایا۔

آزاد نے انشا کے مجنوں ہو جانے اور ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کی ایسی دردانگیز تصویر کھینچی ہے کہ اس کو انہی کے الفاظ میں پڑھو تو دل بے قابو ہو جاتا ہے اور حقیقت میں دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزاد کی نری جادوطرازی ہے، حیات دبیر کے مصنف نے مرزا اوج کی زبانی لکھا ہے جو میر انشاء اللہ خاں کے نواسے تھے کہ سید انشا نہ مجنوں ہوئے نہ ان کی تنخواہ بند ہوئی، صرف اتنا صحیح ہے کہ نواب سعادت علی خاں نے حکم دے دیا تھا کہ وہ سوا دربار کے اور کہیں نہ آئیں جائیں اور دربار میں بھی اس وقت حاضر ہوں جب ان کو بلایا جائے، انشا نے اسی مجلس بیجا کی طرف اس شعر میں اشارہ کیا ہے ۔

بدوں حکم وزیر الممالک اے آقا
چساں کنم حرکت نوکری است یا یاری

تذکرہ خازن الشعرا مصنفہ سید میر نجاں الہ آبادی کے چند اقتباس اردوئے معلیٰ کی

سابقہ حاشیہ: اور بیچارگی کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے، میں نے اس غزل کے چند اشعار تذکرہ مصحفی میں پڑھے ہیں جو اس زمانہ میں لکھا گیا ہے، جس وقت انشا لکھنؤ پہنچے بھی نہ تھے، مصحفی نے تذکرہ میں وہاں تک کا حال لکھا ہے کہ "مرشد آباد سے دلی آچکے ہیں اور مرزا عظیم بیگ وغیرہ شعرائے دلی سے معرکے درپیش تھے۔ (اھ)

تیرہویں جلد میں شائع ہوئے ہیں، ان میں سید انشا کا بھی تذکرہ نظر سے گزرا اور ایک نئی بات معلوم ہوئی کہ جس زمانہ میں انشا اور مصحفی میں جھگڑا ہوا اور ہجو تک نوبت پہنچی تو نواب وزیر نے انشا کو لکھنؤ سے چلے جانے کا حکم دے دیا تھا، وہ حیدر آباد گئے اور اثنائے راہ سے ایک عریضہ شاہ محمد اجمل الٰہ آبادی کی خدمت میں بھیجا، ان کی درخواست پر شاہ صاحب نے اپنے خاندانی اعمال ان کو لکھ بھیجے، چند دنوں کے بعد نواب وزیر نے ان کو پھر لکھنؤ بلوا لیا، یہاں پہنچ کر شاہ صاحب کی خدمت میں انشا نے شکریہ کا خط بھیجا جو سید میر نجاں کو لکھتے وقت دستیاب نہیں ہوا:

"ہنگامے کہ فیما بین میر و میاں مصحفی مناقشہ واقع شد و نوبت ہجو یکدگر کشید وزیر الملک میر را از لکھنؤ رخصت انصراف داد و ایشاں بحیدر آباد رفتند از اثنائے راہ عریضہ بخدمت جد امجد علیہ الرحمہ ارسال نمودند و دراں یک بیت بہم بود ۔

یوں ہی بے شغل ہمارا کوئی دل رہتا ہے ایک قاتل اسے ہر آن میں مل رہتا ہے

حضرت مرحوم بجوابش تحریر فرمودند ۔

خوش باش دلت چرا خراشد

انشاء اللہ خیر باشد و چیزے از ادعیہ و اعمال مجرب بحسب طلب میر نیز ارسال فرمودند، بعد عرصہ قلیلے نواب وزیر میر را بہ لکھنؤ طلب فرمود، میر بہ لکھنؤ رسیدہ خط شکر گزاری بحضرت جد مرحوم نوشت، ہنگام جمع ایں ترجمہ آں خط باوجود تلاش بسیار بدست نیامد۔"

بہر حال اس میں شبہہ نہیں کہ آخر میں نواب وزیر انشا سے ناخوش ہو گئے تھے، تنخواہ جاری رہی مگر آزادی سے محروم ہو کر ۱۲۳۳ھ میں دنیا کے مخمصوں سے نجات پائی۔

کلیات ان کا چھپ گیا ہے، اس میں ایک دیوان فارسی کا ہے، ایک اردو کا، جس

میں قصیدے، غزلیں، قطعے، خطوط، منظوم، رباعیاں، پہیلیاں، چیستانیں، ہجویں اور چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں، فارسی اردو کے سوا ہندوستان کی مختلف زبانوں میں کچھ کچھ کہا ہے، بقول آزاد ابھی پنجاب میں کھڑے ہیں، ابھی پورب میں بیٹھے باتیں کر رہے ہیں، ابھی برج بھاشی ہیں، ابھی مرہٹے، ابھی افغان، ابھی کشمیری، چند ساعت بھی اپنے رفیق تمسخر سے جدا نہیں ہوتے۔

آزاد نے بطور معذرت کے میاں بیتاب کا یہ قول نقل کیا ہے کہ سید انشا کے فضل و کمال کو شاعری نے کھویا اور شاعری کو سعادت علی خاں کی مصاحبت نے ڈبویا، مگر میں اس کو تسلیم نہیں کرتا، وہ یہ کہتے کہ ان کی شاعری کو تمسخر نے ڈبویا تو یہ بات ماننے کے قابل ہوتی۔

میر انشا کو نواب تک رسائی نہیں ہوئی تھی جب بھی تو یہی میر انشا تھے جو مرزا سلیمان شکوہ کے مکان کے پاس لب دریا ایک مہنت دھرم مورت بن کر جا بیٹھے اور خوب زور و شور سے اشلوک پڑھنے اور منتر جپنے شروع کر دیے، جو لوگ اشنان کے لیے آتے وہ الفربہ خواہ مخواہ مرد آدمی دیکھ کر انہی کی طرف جھکتے، تھوڑی دیر میں اناج، آٹا، پیسے کوڑیوں کے ڈھیر لگ گئے وہ بھی اس قدر اور سب سے زیادہ۔ (دیکھو آب حیات، ص ۲۹۲)

اصل بات وہی ہے جس کو آزاد نے کتاب میں نہیں حاشیے میں بیان کیا ہے کہ "ان کے بزرگوں کو سرکار سے شہدوں کو تقسیم وظائف کی خدمت سپرد تھی، ان کے بھائی جب دلی میں آئے تو وہ بھی ایک پارہ کا کنٹھا گلے میں پہنے تھے، چنانچہ میر انشاء اللہ خاں نے آزادوں کے انداز میں مستزاد کہہ کر داد زبان دانی کی دی ہے" سید انشا کی ذکاوت اور جودت ذہن میں کچھ شبہہ نہیں، بچپن میں انسان کی طبیعت اخاذ ہوتی ہے، شہدوں کی باتیں بچپن سے ان کے کانوں میں پڑی ہوں گی، ان کی ہنسانے والی باتوں نے غیر محسوس طریقہ پر ان کی طبیعت پر قابو پالیا اور انہی باتوں کا جلوہ ان کی زندگی کے تمام کارناموں میں نمایاں ہے، نواب سعادت علی خاں جیسے خشک مزاج کو اس میں مطلق دخل نہیں۔

میرا تو یہ خیال ہے کہ سید انشا جیسا ذکی و ذہین آدمی اگر اپنی طبیعت پر قابو رکھتا ہوتا تو سعادت علی خاں کے مزاج میں درخور ہو جانے پر وہ کوئی اور چیز بن جاتا اور اس کا دیوان لطائف وظرائف سے مالا مال ہونے کی جگہ ملک کے سامنے آج ایک نیا نمونہ پیش کرتا۔

وہ قصیدہ دیکھو جو جارج سوم کے جشن تہنیت میں کہا ہے، اس کو نواب سعادت علی خاں کی مصاحبت کا ثمرہ کہو تو بجا ہے، اسی کے ساتھ اس کا بھی افسوس کرنا چاہیے کہ ایسا قادرالکلام اگر اپنی طبیعت پر قابو رکھتا ہوتا تو ملک کے لیے کس قدر مفید ثابت ہوتا۔

بگیاں پھولوں کی تیار کرائے بوئے سمن — کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن

عالم اطفال نباتات پہ ہوگا کچھ اور — گورے کالے بھی بیٹھیں گے نئے کپڑے پہن

کوئی شبنم سے چھڑک بالوں پہ اپنے پوڈر — کرسی ناز پہ جلوہ کے دکھاوے گا پھبن
شاخ نازک سے کوئی ہاتھ میں لے کر اک کیت — ہو الگ سب سے نکالے گا نرالا جوبن

نسترن بھی نئی صورت کا دکھاوے گا رنگ — کوچ پر ناز کے جب پاؤں رکھے گا بن ٹھن
اپنے گیلاس شگوفہ بھی کریں گے حاضر — آ جب غنچۂ گل کھولیں گے بوتل کے دہن
اہل نظارہ کی آنکھوں میں نظر آویں گے — باغ میں نرگس شہلا کے ہوائے چتون

اور ہی جلوے نگاہوں کو لگیں گے دینے — اودی بانات کی کرتی سے شکوہ سوسن

پتے ہل ہل کے بجاویں گے فرنگی طنبور — لالہ لاے گا سلامی کو بنا کر پلٹن
کھینچ کر تار رگ ابر بہاری سے کئی — خود نسیم سحر آوے گی بجاتی ارگن
اپنی سنگینیں چمکتی ہوئی دکھلاویں گے — آ پڑے گی جو کہیں نہر پہ سورج کی کرن

نے نوازی کے لیے کھول کر اپنی منقار — آ کے دکھلاوے گی بلبل بھی جو ہے اس کا فن

اردلی کے جو گرانڈیل ہیں ہوں گے سب جمع آن کر اپنا بگل پھونکے گا جب سکھ درشن
آئے گا نذر کو شیشہ کی گھڑی لے کے حباب یاسمیں پتوں کی پینس میں چلے گی بن ٹھن
نکہت آوے گی نکل کھول کلی کا کمرا ساتھ ہولے گی نزاکت بھی جو اس کی ہے بہن
حوض صندوق فرنگی سے مشابہ ہوں گے اس میں ہوویں گے پریزاد بھی سب عکس فگن

ایک جگہ گھوڑے کی تعریف میں کہتے ہیں:

ہے اس آفت کا سبک سیر کہ راکب اس کا حاضری کھائے جو کلکتہ تو لندن میں پٹن

غزلوں کے منتخب اشعار:

لگا کے برف میں ساقی صراحی مے لا جگر کی آگ بجھے جس سے جلد وہ شے لا

یہ عجب مزا ہے یارو کہ بروز عید قرباں وہی ذبح بھی کرے ہے وہی لے ثواب الٹا

دل لگایا ہے کہیں انشا نے شاید دوستو ان دنوں آتا نظر ہے سخت گھبرایا ہوا

گرچہ مے پینے سے کی توبہ ہے میں نے ساقی
بھول جاتا ہوں ولے تیری مدارات کے وقت

نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری راہ لگ اپنی تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بیزار بیٹھے ہیں

تصور عرش پر ہے اور سر ہے پائے ساقی پر
غرض کچھ اور دھن میں اس گھڑی میخوار بیٹھے ہیں

بسان نقش پائے رہرواں کوئے تمنا میں نہیں اٹھنے کی طاقت کیا کریں لاچار بیٹھے ہیں
بھلا گردش فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا غنیمت ہے کہ ہم صحبت یہاں دو چار بیٹھے ہیں

ہے نہاں لطف و کرم چین جبیں کی تہ میں ہاں چھپی صاف ہے اک ان کی نہیں کی تہ میں

گر یار مے پلائے تو پھر کیوں نہ پیجئے زاہد نہیں میں شیخ نہیں کچھ ولی نہیں

جی میں کیا آ گیا انشا کے یہ بیٹھے بیٹھے کہ پسند اس نے کیا عالم تنہائی کو

چند مدت سے فراق صنم دیر تو ہے چلو پھر کعبہ ہی ہو آئیں ذرا سیر تو ہے

غصے میں ترے ہم نے بڑا لطف اٹھایا اب تو عمداً اور بھی تقصیر کریں گے

رونے سے اپنے دل کی تپش گرد ہوگئی دو چار بوندیوں میں ہوا سرد ہوگئی

عجیب لطف کچھ آپس کی چھیڑ چھاڑ میں ہے کہاں ملاپ میں وہ بات جو بگاڑ میں ہے

ہوئے ہیں خاک سر راہ اس کی ہم انشا بڑا غضب ہے جو یہ بھی فلک نہ دیکھ سکے

☆☆☆

مرزا سعادت یار خاں رنگینؔ

''در نشست الفاظ و چسپیدگی کلمات و درستی عبارت و ایراد و الفاظ مقابلہ و صحت محاورہ چناں بد ہد کہ ہر چہ کملائے ہم عہدش از ایراد بعض الفاظ رکیکہ ہندوی و تنگی نشست آں بعد رفع کلمات ثقیلہ، قدماء جائز پنداشتند و در شعر خود ہا درج کردند آں ہم از اشعار خود بر انداخت۔ (اہ مہر جہانتاب)

سعادت یار خاں نام، رنگین تخلص تھا، ان کے والد مرزا طہماسپ بیگ خاں توران سے آکر چند روز لاہور میں نواب حسین الملک میر منور خاں کی سرکار میں ملازم رہے، اس کے بعد دلی میں نواب ضابطہ خاں اور نواب نجف خاں وغیرہ امرائے دربار کے ساتھ نوبت بہ نوبت آسودگی سے زندگی بسر کی۔

رنگین کی ولادت سرہند میں ہوئی مگر نشو و نما دلی میں پایا، سپاہی کے بیٹے تھے، شہسواری اور تیر اندازی میں خوب کمال پیدا کیا، گھوڑوں کے پہچاننے اور ان کے معالجہ میں اپنے زمانہ میں بے نظیر تھے۔

ان کی عمر کا بیشتر حصہ شاہزادوں کی مصاحبت میں بسر ہوا، کبھی کبھی تجارت کا مشغلہ بھی کر لیتے تھے، اسی تقریب سے لکھنؤ کئی بار آئے اور شاہزادہ مرزا سلیمان شکوہ (۱) کی سرکار میں عزت و احترام سے عرصہ تک رہے، آخر عمر میں تجارت اور ملازمت سے سبکدوش ہو کر دلی میں گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی اور وہیں ۱۲۵۱ھ میں اسی برس کی عمر پا کر وفات پائی۔

---

(۱) مرزا سلیمان شکوہ خلف شاہ عالم بادشاہ دہلی بڑے علم دوست اور ہنر پرور شاہزادے تھے (باقی اگلے صفحہ پر)

شعروسخن کا شوق عنفوان شباب سے تھا، شاہ حاتم سے مشق سخن کی اور چند دنوں کی محنت و جانکاہی میں اپنے بہت سے ہم عصروں سے آگے نکل گئے۔

سابقہ حاشیہ: باپ کے سایۂ عاطفت میں پرورش پائی، جس وقت شاہ عالم سلطنت کے ساتھ غلام قادر کی نمک حرامی سے نور بصارت بھی کھو بیٹھے، اس کے دوسرے دن کسی بہانہ سے قلعۂ معلیٰ سے نہایت بے سروسامانی کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے، رامپور میں نواب فیض اللہ خاں نے اپنی حیثیت کے موافق پیشکش کی نذر گزرانی جس سے کچھ سامان درست کیا اور ۱۲۰۵ھ میں لکھنؤ پہنچ کر تین کوس پر خیمہ کیا، ان سے پہلے مرزا جواں بخت آچکے تھے اور نواب آصف الدولہ نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی تھی مگر صحبت برآر نہ ہونے سے ان کو بنارس جانے کی تکلیف دی گئی، اسی بنا پر اس مرتبہ نواب نے حاضری سے معذرت کی اور نواب گورنر جنرل پر ٹالا، تین مہینے تک مرزا سلیمان شکوہ پانچ ہزار سوار و پیدل و شاگرد پیشہ کی جماعت سے لکھنؤ سے تین کوس پر ڈیرے ڈالے ہوئے پڑے رہے، تین مہینے کے بعد لارڈ کارنوالس کی تحریک سے نواب وزیر استقبال کو نکلے اور شہزادہ کو ہاتھی پر سوار کر کے خود خواصی میں چنور لے کر بیٹھے اور نہایت تجمل کے ساتھ شہر میں اتارا اور چھ ہزار روپیہ ماہوار ان کے جیب خرچ کے لیے مقرر کر دیے، کچھ دنوں شہزادے نے رزیڈنسی کے قریب مرزا خلیل کے بنگلہ میں لب بام قیام کیا، اس کے بعد جنرل مارٹن کی ٹیڑھی کوٹھی خرید کر کے اس میں مستقل سکونت اختیار کی اور عرصہ دراز تک لکھنؤ میں عزت و احترام سے رہے، نواب وزیر عہد بعہد ان سے فدویانہ سلوک کرتے رہتے تھے، خود نواب آصف الدولہ باوجود تنعم و ناز پروری پانچوں ہتھیار لگائے ایک ایک الائچی اور گلوری کی نوازش پر آداب گاہ جا کر بار بار آداب بجالاتے تھے، جب نواب غازی الدین حیدر نے لارڈ ماٹرا کے زمانہ میں گورنمنٹ انگریزی کے اشارے سے خطاب بادشاہی قبول کیا تو ان کو خواہش ہوئی کہ مرزا سلیمان شکوہ مساویانہ حیثیت سے ملاقات کریں، جان مسٹن رزیڈنٹ لکھنؤ نے شاہزادہ سے کہلا بھیجا کہ اب تک نواب وزیر تھے وہ باآداب وزارت حاضر ہو کر نذر دیا کرتے تھے اور خلعت پہنتے تھے، اب بحکم گورنمنٹ انگریزی وہ بادشاہ ہوئے ہیں، لہٰذا ان سے حضور مساویانہ حیثیت سے ملیں، شاہزادے نے کہلا بھیجا کہ بہتر ہے میں ملاقات کروں گا تو اسی طرح سے کروں گا (باقی اگلے صفحہ پر)

شوخی اور بذلہ سنجی کے ساتھ رنگین کی طبیعت ایجاد پسند واقع ہوئی تھی، اسی بنیاد پر ریختہ سے ریختی نکالی جس کو ان کے لنگوٹیے یار میر انشاء اللہ خاں نے چمکایا اور لکھنؤ میں یہ رنگ خوب مقبول ہوا۔

سابقہ حاشیہ: پھر رزیڈنٹ نے کہلا بھیجا کہ کل بادشاہ اور فدوی ملنے کو آئیں گے، ملاقات کے وقت اس کا لحاظ رکھا جائے، شاہزادے کو نا گوار ہوا مگر مجبور، دوسرے روز بادشاہ اور رزیڈنٹ مع امرا و ارکان دولت، شاہزادے کے جلوخانہ میں تشریف لائے، نواب ناظر نے چلمن اٹھائی اور حسب دستور آواز دی، اہل دربار خبر دار ہو جاؤ حضور برآمد ہوتے ہیں، شاہ اودھ نے موافق اپنی عادت کے ذرا خم ہو کر سلام کیا اور ادھر چوبدار نے آواز دی، صاحب عالم و عالم پناہ سلامت شاہزادے نے سلام کا جواب بطریقہ اسلام دیا، فقط یہ کیا کہ داہنے ہاتھ میں شاہ اودھ کا ہاتھ، بائیں میں رزیڈنٹ کا ہاتھ لے کر دیوان خاص میں ایک دنگل پر اپنے پاس شاہ اودھ کو بٹھالیا، رزیڈنٹ سامنے کرسی پر بیٹھے، فرمایا کہ سرکار کمپنی کی خوشی ہوگئی، مختار محل قریب المرگ ہے، میں اس کو سکرات میں چھوڑ آیا ہوں، اس وقت فرصت نہیں ہے، پھر ملاقات ہوگی، یہ کہہ کر اٹھ کھڑے ہوئے، کشتیاں آئیں، شاہ اودھ نے ایک شالی رومال اٹھا کر اپنے کندھے پر ڈال لیا اور اسی طرح مکان خاص تک آ کر رخصت کیا مگر دل میں بہت کبیدہ ہوئے، اس دن سے پھر نصیر الدین حیدر کی شادی تک ملاقات نہیں ہوئی، بادشاہ کو یہ دھن تھی کہ میں بادشاہ ہوا ہوں تو میرے بیٹے کی شادی تیموریہ خاندان میں ہونی چاہیے، جوڑ توڑ لگا کر اور دے دلا کر شاہزادے کے مصاحبوں کو ہموار کر کے نصیر الدین حیدر کی شادی مرزا سلیمان کی بیٹی سے کر لی، چھ ہزار پہلے سے تھے، ایک ہزار روپیہ ماہوار شادی کے وقت اور پانچ ہزار مساویانہ ملاقات کے وقت جملہ بارہ ہزار ماہانہ پیشکش مقرر ہو گیا، جب نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے اور انہوں نے ہاتھ پاؤں نکالے تو ایک لڑکی پر ڈورے ڈالے جس کو شہزادی بیگم نے پرورش کیا تھا اور اس کا نام قمر چہرہ تھا، پہلے تو گفت و شنید رہی، اس کے بعد کٹنی کو بھیج محل سے اڑوالیا، شاہزادہ کو سخت ناگوار ہوا، رزیڈنٹ تک بات پہنچی، اس نے بادشاہ کو سمجھا بجھا کر قمر چہرہ کو واپس کرا دیا مگر شاہزادے ایسے دل برداشتہ ہوئے کہ کرنل کارن رئیس کاس گنج کو بلوا بھیجا، اس کی پوتی شاہزادے کے (باقی اگلے صفحہ پر)

رنگین ہمہ گیر طبیعت رکھتے تھے، ہر رنگ میں انہوں نے اپنے جوہر دکھائے ہیں جو ان کے مجموعہ تصنیفات کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔

رنگین کے مجموعۂ تصانیف کا نام نورتن ہے جس میں چار دیوان اردو کے ہیں، ریختہ، بیختہ، آمیختہ، انگیختہ، ان میں سے تیسرا دیوان ہزلیات کا ہے جس میں ایک قصیدہ شیطان کی مدح میں بھی ہے، چوتھا دیوان ریختی کا ہے۔

علاوہ ازیں ان کی پانچ کتابیں اور بھی ہیں، ایجاد رنگیں، فرس نامہ، رنگین نامہ، مجالس رنگیں، مثنوی دل پذیر جو زبان کی صفائی و پاکیزگی میں سحر البیان کے بعد اس زمانہ کی

سابقہ حاشیہ: بیٹے سے منسوب تھی، اسی کے ساتھ کاس گنج چلے گئے، پانچ ہزار روپیہ جو غازی الدین حیدر نے بوقت ملاقات مساویانہ مقرر کیے تھے، وہ بند ہو کر سات ہزار میں سے ایک ہزار خزانہ شاہی سے اور چھ ہزار بتوسط رزیڈنٹ شاہزادہ کو ملتے رہے، وہاں یہ گل کھلا کہ کرنل صاحب کے بیٹے قمر چہرہ کو لے اڑے اور الور جا کر عیش کرنے لگے، اس سے شاہزادہ وہاں سے بھی دل برداشتہ ہو گئے اور اکبر آباد جا کر بود و باش اختیار کی، آخر کار ذیقعدہ ۱۲۵۳ھ میں مر کر سکندرہ مقبرہ اکبر شاہ تیموری میں مدفون ہوئے، شاہزادہ کو شعر و سخن کا بہت ذوق تھا، جب تک دلی میں رہے شاہ حاتم کو کلام دکھاتے تھے، لکھنؤ میں ولی اللہ محب شاگرد مرزا رفیع سودا پھر شیخ غلام ہمدانی مصحفی، پھر انشاء اللہ خاں کو سرفراز فرمایا۔

رہ گئے ہوش و حواس و خرد و طاقت سب | یوں ترے کوچہ سے میں بے سر و ساماں نکلا
تیرے بیمار کی سنتے ہیں یہ حالت ہے کہ اب | جو گیا اس کی خبر کو سو وہ گریاں نکلا

جان دی راہ محبت میں الٰہی صد شکر | بات جو ہم نے کہی تھی سو نباہی صد شکر

غیر کا نام جو تم پیار سے لیتے ہو تو بس | ایک برچھی ہے کہ پہلو میں چبھو دیتے ہو

جبہہ سائی کا نشاں جائے جبیں سے کیوں کر | کوئی تقدیر کے لکھے کو مٹا سکتے ہیں
تاج و تخت اپنے سلیماں کو یا شاہ نجف | آپ چاہیں تو ابھی پل میں دلا سکتے ہیں

بہترین تصنیفات میں شمار ہونے کے قابل ہے۔

وہ آیا تھا یہاں اے حضرت دل بھول شب کو — جو تم اس وقت پہلو سے نہ چلاتے تو کیا ہوتا
وہاں اپنی ہی اپنی پڑ گئی اے ہمدمو جا کر — کوئی مطلب کی میری بات فرماتے تو کیا ہوتا
نصیحت رات دن ناصح کیا کرتے ہو ناحق تم — اسے بھی ایک دن تم جا کے سمجھاتے تو کیا ہوتا

کھینچ لائی ہے اسے اے کشش دل یہاں تک — بارے صد شکر کہ تجھ کو بھی یہ مقدور ہوا

جو نالہ رات کو لب سے نہ ہٹ گیا ہوتا — تو ساتھ آہ کے سینہ بھی پھٹ گیا ہوتا

آ جو آتا ہے نہیں آتا تو دے مجھ کو جواب — بھیج کر پیغام جھوٹے روز مت حیران کر
دل بغل سے لے گئی رنگیں وہ دزدیدہ نگاہ — ورنہ دل دیتا ہے کون اپنا کسی کو جان کر

دل تھا جو بساط اپنی سو گزران چکے ہیں — جی نذر کریں جی میں یہ اب ٹھان چکے ہیں

نرگس کو وہ چمن میں کیا بھر نگاہ دیکھے — وہ انکھڑیاں نشیلی جس کو خوش آئیاں ہوں

نبھے گی صحبت اس سے کس طرح کچھ کہہ نہیں سکتے
وہ ہرجائی ہے اور بن شغل ہم بھی رہ نہیں سکتے

تجھ سے جس وقت کہ خالی یہ مکاں رہتا ہے — مجکو تنہائی میں پہروں خفقاں رہتا ہے
جو ترے پاس سے آتا ہے میں پوچھوں ہوں یہی — کیوں جی کچھ ذکر ہمارا بھی وہاں رہتا ہے

جو کوچے میں اس نازنیں کے نہ ٹھہرے — تو پھر یہ کہو ہم کہیں کے نہ ٹھہرے

وہ نہ آئے تو تو ہی چل رنگیں — اس میں کیا تیری شان جاتی ہے

دم بدم بس کہ ترا حسن فزوں ہے ظالم — روز جی میں ہے کہ کھنچوایئے تصویر نئی

☆☆☆

حکیم ثناء اللہ خاں فراقؔ

"جوان حلیم وسلیم وخوش فکر وشیریں گفتار، استفادۂ شعر از خواجہ میر دردؔ کرد بلکہ ذات شریفش را ہمیشہ از کاملین قیاس می کرد، آخر چشم فقیر تحصیل علم طب کردہ نام بطبابت بر آورد دیوان ریختہ اش شستہ ورفتہ است، فقیر در شاہجہان آباد بود، رابطہ دوستی او روز بروز ترقی داشت۔" (تذکرہ مصحفی)

ثناء اللہ خاں نام، فراق تخلص، حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایت کے بھتیجے تھے، دہلی میں پیدا ہوئے اور وہیں حضرت خواجہ میر دردؔ اور ان کے شاگردوں اور مریدوں کے دامن تربیت میں پرورش پائی۔

حکیم قدرت اللہ خاں (۱) قاسم (متوفی ۱۲۴۶ھ) سے طب کی درسی کتابیں پڑھ کر

---

(۱) حکیم قدرت اللہ خاں عباسی، قاسم تخلص، دلی کے نامور عالموں اور طبیبوں میں شمار کیے جاتے تھے، مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ سے بیعت تھی، شعر وسخن کا بھی ذوق تھا، شعرائے اردو کا ایک بسیط تذکرہ لکھا ہے جو میری نظر سے نہیں گزرا (۱) دیوان بھی دیکھنے میں نہیں آیا، گلشن بیخار میں جو شعر نواب مصطفیٰ خاں نے نقل کیے ہیں ان میں سے چند یہ ہیں:

ہمیں بھی رخصت سیر چمن ہو ٹک صیاد ۔۔۔ کہ اب کی شور ہے ظالم بہار آنے کا

وہ آئے بغل میں کہیں یا جی ہی نکل جائے ۔۔۔ مٹ جائے کسو طرح تو یارب خلش دل

جان جاوے یار ہے قاسم پہ دیکھیں گے اسے ۔۔۔ ہے ارادہ یہ مصمم دیکھیے کیسی بنے

(۱) اب لاہور میں چھپ گیا ہے۔ (س)

انہی کے مطب میں نسخہ نویسی کی اور اس فن میں ایسی استعداد بہم پہنچائی کہ چند روز کے بعد ان کا شمار دلی کے مشہور اور نامور طبیبوں میں ہونے لگا اور دلی جیسے شہر میں یہ مرجع اور مقصد بن گئے۔

شعر وسخن سے ان کو خداداد مناسبت ہے، حضرت خواجہ میر درد کے فیض صحبت سے اس میں ترقی ہوئی اور چند روز کی مشق میں انہوں نے قدرتِ کاملہ بہم پہنچائی۔

خبر دیتا تھا کس کے وصل سے شوق ہم آغوشی
کہ میرا رات کو کچھ خود بخود بازو پھڑکتا تھا

جوں ریگ رواں خانہ نشیں ہوں میں ازل سے
نہ قصد وطن کا نہ ارادہ ہے سفر کا

دل تھامتا کہ چشم پہ کرتا تری نگاہ   ساغر کو دیکھتا کہ میں شیشہ سنبھالتا

صاف دل کو کیا اور داغ جگر کو دھویا   کام کیا کیا نہ مرے دیدۂ تر سے نکلا

بعد مرنے کے بھی اک گردش رہی ہم کو مدام
مشت خاک اپنی رہی تھی کچھ سو پیمانہ بنا

انگلیاں گھس گئیں ہاں ہاتھوں کو ملتے ملتے   لیکن افسوس نوشتہ نہ مٹا قسمت کا

حسرت ذرا بھی دل کی نہ نکلی ہزار حیف   نکلا ادھر وہ گھر سے اودھر جی نکل گیا

سمجھے تھے دامِ زلف سیہ ہے بلائے جاں   پر کیا کریں کہ لے گئی تقدیر کھینچ کر

خوش آتی ہیں پاؤں کی تری ٹھوکریں ظالم
سر کو کبھو قدموں سے اٹھانے کے نہیں ہم

کس زلف کا شیدا ہے مرا دل نہیں معلوم　　کس چشم کا زخمی ہے یہ بسمل نہیں معلوم
ہر غنچہ میں بو ہے تری ہر گل میں ترا رنگ　　جس پر بھی تری شکل و شمائل نہیں معلوم
سمجھائے کسی کے بھی سمجھتے ہیں دوانے　　کیوں پاؤں میں پڑتی ہیں سلاسل نہیں معلوم
مجنوں کے سوا دیکھیے اب دشت جنوں میں　　ہو کون فراق اپنے مقابل نہیں معلوم

آنا یہ ہچکیوں کا مجھے بے سبب نہیں　　بھولے سے اس نے یاد کیا ہو عجب نہیں

آنکھ اس شوخ ستم گر سے لڑا بیٹھے ہیں　　بس چلے یا نہ چلے جی تو جلا بیٹھے ہیں

تم گالیاں جو دو تو میں چٹکی بھی کیا نہ لوں　　پیارے کسی کا ہاتھ کسی کی زباں چلے

☆☆☆

دور سوم

از طبقۂ متوسطین

شاہ نصیر الدین نصیرؔ

"پیر زادہ میر صدر جہان است، جوان خوش گو، فقیر در ایائے کہ در شاہجہان آباد بود اکثر در مشاعرہ می آمد، در ہمہ عالم تو مشقی در طبعش روانی بود، حالا می گویند کہ قوت شاعری بسیار پیدا کردہ۔" (اھ تذکرۂ مصحفی)

"از مدت شصت سال بر سر عشق ریختہ است باکثر معمورہائے مشہور مثل لکھنؤ و حیدر آباد مکرر رفتہ و بہ شعرائے مشتہر ہر دیار برخوردہ و مطارحہ و مشاعرہ کردہ و بہ استادی نام بر آوردہ۔" (اھ گلشن بیخار)

شاہ نصیر الدین دلی کے رہنے والے تھے، ان کے والد شاہ غریب نے تعلیم و تربیت میں پوری کوشش کی مگر ان کی قسمت میں شاعری کے سوا اور کچھ نہ تھا، طبیعت کا رجحان ادھر پا کر شاہ محمدی مائل (۱) کے شاگرد ہو گئے۔

(۱) شاہ محمدی مائل بھی دلی کے رہنے والے تھے، فقر و تصوف کی طرف مزاج مائل تھا، آزاد کہتے ہیں کہ مشق سخن شیخ قیام الدین قائمؔ سے کی تھی مگر میر حسنؔ فرماتے ہیں کہ شاہ قدرت اللہ کو کلام دکھلاتے ہیں (باقی اگلے صفحہ پر)

چندروز کی مشق میں اچھا کہنے لگے، شاہ عالم کا زمانہ تھا، وہ خود شاعر تھے، اس وجہ سے بآسانی دربار تک رسائی ہوگئی، شعرائے دربار کے ساتھ یہ بھی طبع آزمائی کرتے رہے۔

دربارشاہی سے ان کے بزرگوں کے نام چند گاؤں آل تمغا معاف تھے، خاندانی عظمت کے ساتھ اہل کمال کو عیدوں اور جشنوں میں انعام بھی ملتا رہتا تھا، اس سے گزر ہوتی تھی مگر ان کی بلند پروازی کی آنکھیں لکھنؤ اور حیدرآباد کو ڈھونڈتی تھیں جہاں سونے اور چاندی کی گنگا جمنا بہ رہی تھیں۔

دوبار لکھنؤ آئے، پہلی مرتبہ مصحفی اور انشا کا زمانہ تھا، مشاعروں میں غزلیں پڑھیں اور داد سخن پائی، دوسری بار آئے تو زمانہ پلٹا ہوا پایا، شیخ امام بخش ناسخ نے عہد قدیم کو نسخ کر دیا تھا اور خواجہ حیدر علی آتش کے کمال نے دلوں کو گرما رکھا تھا، اس لیے ان کی جیسی قدر ہونی چاہیے تھی اس مرتبہ نہ ہوئی۔

حیدرآباد میں راجہ چندولال دیوان (۱) تھے جن کی سخاوت کا گھر گھر چرچا تھا، یہ وہاں

سابقہ حاشیہ: گلشن بیخار میں بھی ان کو قدرت کا شاگرد لکھا ہے، یہ دلی کی تباہی کے وقت مرشدآباد چلے گئے تھے اور وہیں سکونت اختیار کرلی تھی، کیا عجب ہے کہ ابتدا میں شیخ قیام الدین قائم سے اصلاح لی ہو اور جب مرشدآباد میں رہنے لگے تو شاہ قدرت اللہ کے شاگرد ہو گئے ہوں، کلام کا نمونہ حسب ذیل ہے ۔

حال کہنے کی نہ دی گریہ نے فرصت رات کو آج پھر کہیو اسے مائل وہ کیا افسانہ تھا

کیا کیا کہوں میں تجھ سے دل زار کی ہوس مشہور ہے جہاں میں بیمار کی ہوس

کہتا نہ تھا کہ باز آ ہردم کی اس ہنسی سے آخر گیا نہ ظالم اک بے گناہ جی سے

(۱) راجہ چندولال کا "راجہ اجایاں و مہاراجہ بہادر خطاب تھا، قوم کا کھتری تھا، اس کا پردادا مولچند نواب آصف جاہ اول کے ساتھ حیدرآباد گیا تھا، آصف جاہ نے اس کو کروڑگیری کے محکمہ کا افسر اعلیٰ مقرر فرمایا، اس کے بعد اس کا بیٹا پچھی رام، پھر اس کا بیٹا نانک رام اسی خدمت پر سرفراز ہوا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

پہنچے تو ان کے جواہرات نے خاطر خواہ قیمت پائی مگر دلی کا چٹخارہ ایسا نہ تھا کہ انسان بھول جائے، اس لیے انعام واکرام سے مالا مال ہو کر واپس آئے اور تین بار پھر گئے۔

سابقہ حاشیہ: نانک رام چندولال کا چچا تھا، اس نے چندولال کو باپ کے مرنے کے بعد پرورش کیا اور عمدہ تعلیم دلائی، جب نانک رام مرا تو اس کا بیٹا لکھپت رائے مقرر رہا، وہ دو ہی برس کے اندر مر گیا، اس کی جگہ چندولال کو ملی، یہ تعلیم یافتہ، فریس وفہیم، نہایت محنتی وجفاکش، سرکاری کام میں چست وچالاک تھا اور ہر ایک کام کو بذات خود انجام دیتا تھا۔

اس نے اپنی ہوشیاری سے دربار آصف جاہی میں رسائی پیدا کی اور ۱۲۱۲ھ میں کنڑپہ وغیرہ ممالک مفتوحہ کا انتظام اور ''خطاب راجہ بہادر'' اس کو عنایت ہوا اور ۱۲۱۹ھ میں پیشکاری کے عہدۂ جلیلہ پر ترقی کی۔

اس زمانہ میں نواب منیر الملک وزیر تھے، ان کی ناقابلیت کی وجہ سے سارا انتظام ملکی ومالی اس کے ہاتھ میں آ گیا، ۱۲۳۵ھ میں ''مہاراجہ بہادر'' کا خطاب، ہفت ہزاری منصب، نوبت، گھڑیال، جواہر گراں بہا اور جاگیر سے سرفرازی پائی، ۱۲۴۵ھ میں راجہ راجایان کا خطاب ملا اور باوجودیکہ عہدہ وہی رہا مگر وزارت اور دیوانی کے اختیارات اس کے قبضہ اقتدار میں آگئے، نواب منیر الملک صرف خطاب و جاگیر کے مالک تھے۔

لکھنؤ میں آغا میر کو جو دسترس واقتدار حاصل تھا وہ اس کو حیدرآباد میں ہوا اور لطف یہ کہ دونوں ہم عصر اور سخاوت وفیاضی میں ایک دوسرے کی نظیر تھے، فرق اتنا تھا کہ آغا میر کی گرم بازاری جوڑ توڑ اور سازش کی بدولت تھی اور یہ اپنی قابلیت کے زور سے کام نکالتا تھا، یہی وجہ ہے کہ آغا میر کا ستارۂ اقبال گیارہ برس چمک کر ماند پڑ گیا اور اس نے پچاس برس تک والا جاہی کی۔

اس سخاوت وفیاضی کے کارنامے اتنے زبان زد ہیں کہ ان کے لکھنے کی حاجت نہیں، ہمارے بچپن تک کوئی حیدرآباد سے آتا تھا تو لوگ کہتے تھے کہ فلاں شخص چندولال کے حیدرآباد سے آیا ہے، اگر جاتا تو کہتے کہ چندولال کے حیدرآباد جاتا ہے، گویا حیدرآباد کی نسبت چندولال کی (باقی اگلے صفحہ پر)

چوتھی بار جانے کو تھے کہ راجہ چندولال نے سات ہزار روپیہ بھیج کر بلا بھیجا، وہاں پہنچے تو پچیس روپیہ یومیہ ان کا مقرر ہو گیا مگر افسوس ہے کہ اس مرتبہ ان کو دلی آنا نصیب نہیں ہوا، وہیں ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی۔

شاہ صاحب نے خود اپنا دیوان مرتب نہیں کیا، ان کے مرنے کے کچھ دنوں بعد میر حسین تسکین کے بیٹے میر عبدالرحمٰن نے بڑی محنت سے ایک مجموعہ ان کے کلام کا جمع کیا، جس کو نواب رامپور نے خرید لیا مگر حیدر آباد میں ان کی غزلوں کا مکمل دیوان ان کے کسی شاگرد کے پاس تھا، وہ چھپ گیا ہے، اس میں صرف غزلیں ہیں، قصائد، قطعات، رباعیاں اور مخمس وغیرہ کچھ بھی نہیں ہیں۔

کلام میں شکوہ الفاظ کے ساتھ نئی نئی تشبیہیں اور استعارے پائے جاتے ہیں، زمینیں بھی نئی نئی نکالی ہیں، جس میں شعر کا سرسبز کرنا ہر کسی کا کام نہیں، زبان سید انشا اور

سابقہ حاشیہ: طرف ہوگئی تھی، اس سے اس کی نیک نامی اور شہرت کا اندازہ کرنا چاہیے۔

اس کا معمول تھا کہ صبح سے بارہ بجے رات تک مہمات سلطنت میں مشغول رہتا تھا، اس کے بعد شعرا و علما حاضر ہوتے، ان سے مشاعرہ و مذاکرہ رہتا، اس میں ڈھائی بج جاتے، اس کے بعد خواب گاہ میں جا کر استراحت کرتا تھا۔

کم و بیش پچاس برس تک پیشکاری کی خدمت انجام دینے کے بعد ۱۲۶۰ھ میں مستعفی ہوا اور ۱۲۶۱ھ میں بیاسی عمر میں جی کر زندگی سے استعفا دے دیا، فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں طبع آزمائی کرتا تھا اور شاداں تخلص تھا۔

نور تھا یا شعلہ تھا یا برق یا خورشید تھا ‌ ‌ ‌ کچھ تو اے موسیٰ کہو کیا تھا وہ جلوہ طور کا

شاداں وہاں بھی کیا ہے حسینوں کی انجمن ‌ ‌ ‌ جاتے ہیں لوگ کیوں عدم آباد کی طرف

خدا نے دی ہے کیا تاثیر وقت صبح صادق کو ‌ ‌ ‌ اثر رکھتی ہے اکثر جو دعائے صبح صادق ہو

جرأت کی ہے، کچھ الفاظ ان کے ہاں متروک ہو گئے ہیں مگر اتنے نہیں ہیں کہ ناسخ و آتش کے ساتھ ان کو جگہ دی جائے۔

افسوس کہ نرگس کی طرح باغ جہاں میں — کچھ ہم نے بجز حسرت دیدار نہ پایا

کمان و تیر نمط مجکو ربط تھا اس سے — جب اس نے آپ کو کھینچا میں گوشہ گیر ہوا

آہ کچھ ہم کو نہ تھی فرصت یک دم کی خبر — اے حباب لب جو تو نے یہ عقدہ کھولا

نصیر اس شوخ کی یہ کج ادائی کوئی جاتی ہے — مثل مشہور ہے رسی جلی لیکن نہ بل نکلا

چشم وہ کیا ہے کہ جس میں ایک آنسو بھی نہیں — آبرو تب ہے صدف کی جب کہ ہو گوہر سمیت

کس کی نگہ نے جلوۂ برق اب دکھا دیا — آنکھیں جو اپنی ہو گئیں بے اختیار بند

خیال زلف بتاں میں نصیر پیٹا کر — گیا ہے سانپ نکل اب لکیر پیٹا کر

جہاں سے گو بت مغرور اٹھ گیا انصاف — خدا کے روبرو ہوگا مرا ترا انصاف

عاشق سوا ہے کس کو ہوائے شکست رنگ — دل کی شکستگی ہے بنائے شکست رنگ

بلبل ہزار حیف نہ ہو ہمکنار گل — اور مفت میں نسیم تو لوٹے بہار گل

برقع کو الٹ منہ سے جو کرتا ہے تو باتیں — اب میں ہمہ تن گوش بنوں یا ہمہ تن چشم

برباد رفتگان محبت کی خاک ہے — اے قیس دشت میں یہ بگولا نہیں اٹھا

حباب دار غنیمت ہے فرصت اک دم کی — ہوا پہ زندگی مستعار رکھتا ہوں

سر مژگاں سے وقت نالہ آنسو کو ترستے ہیں یہ سچ ہے جو گرجتے ہیں وہ بادل کم برستے ہیں

وجہ معلوم تو ہو چیں بہ جبیں ہونے کی سچ کہو جی میں ہے کیا کس سے لڑا چاہتے ہو

واشد نہیں ہے غنچۂ تصویر کی طرح کیا جانے کیا ہوا دل آفت رسیدہ کو

دل یہ کہتا ہے کہ مت یاد بتاں دلواؤ چھیڑنے کا مرے تب آپ مزا دیکھیں گے

دیکھ لیتی جو اٹھا کر ترے کیا ٹوٹتے ہاتھ لیلیٰ اتنا تو نہ تھا پردۂ محمل بھاری

وحشت سے مجھے ہاتھ اٹھانے نہیں دیتے پڑتے ہیں مرے پاؤں سلاسل کئی دن سے

قطعہ

یہ مجنوں ہے نہیں آہوئے لیلیٰ پہن کر پوستیں نکلا ہے گھر سے

جسے تو سینگ سمجھے ہے یہ ہیں خار لگے ہیں پاؤں میں نکلے ہیں سر سے

☆☆☆

میر نظام الدین ممنون

''جوانانِ سعادت مندو ذی شعور ست، در حین حیات پدر بزرگوار
بعد تحصیل کتب فارسی بمقتضائے موزونی طبع خود را معروف گفتن شعر
ہندی و فارسی میداشت تا آنکہ در عرصۂ قلیل قوت شاعری را چنانچہ باید پیدا
کرد، کلام خود را برتبہ کلام پدر رسانیدہ اکثرے از موزونانِ شہر استفادۂ
شعر از وی کنند۔'' (اھ تذکرۂ مصحفی)

''گفتارش خیلے دلچسپ و دلنشین است و ملاحت کلامش نہایت
عذب و شیریں، در بستن مضامین بیگانہ یگانہ است و فکر صحیح مصائب از غلطش
استادانہ قوت نظم اکثر اصناف سخن داد۔'' (اھ گلشن بیخار)

میر نظام الدین نام، ممنون تخلص، میر قمر الدین منت (۱) کے بیٹے تھے، سونی پت

---

(۱) میر قمر الدین منت سونی پت کے رہنے والے امام ناصر الدین مشہدی کی اولاد میں تھے، شاہ عبد العزیز رحمۃ اللہ علیہ سے قرابت قریبہ رکھنے کی وجہ سے دلی میں ان کا نشو و نما ہوا، علوم و فنون کی تمام درسی کتابیں شاہ صاحب موصوف سے پڑھیں اور مدت تک ان کی صحبت میں رہے۔

فارسی زبان کی تحقیق اور مشق سخن میر شمس الدین فقیر سے کی اور اردو کی شیخ قیام الدین قائم سے، دونوں زبانوں میں شعر اچھا کہتے تھے، جب تک دلی میں رہے سنی مذہب کے پابند رہے، طریقہ چشتیہ میں مولانا فخر الدین علیہ الرحمہ سے بیعت تھی، لکھنؤ تشریف لائے تو مذہب شیعہ اختیار کیا، مدت تک لکھنؤ میں رہے اور نواب وزیر سے قصائد کے صلے خاطر خواہ حاصل کیے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

وطن تھا مگر مولانا شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ سے قرابت قریبہ رکھنے کی وجہ سے ان کے والد دلی آرہے تھے، وہیں ممنون پیدا ہوئے اور نشو و نما پائی۔

درسی کتابیں والد ہی سے پڑھیں اور مشق سخن بھی انہی سے کی، چند روز کی فکر و کاوش میں دلی جیسے شہر میں ان کی شاعری کا سکہ رائج ہوگیا، اکبر بادشاہ نے فخر الشعرا کا خطاب عنایت کیا اور کثرت سے لوگ ان کے سلسلۂ تلمذ میں داخل ہو گئے، لوگ کہتے ہیں کہ مفتی صدرالدین خاں

سابقہ حاشیہ: لکھنؤ سے کلکتہ تشریف لے گئے، عمادالدولہ لارڈ ہیسٹنگز کی تعریف میں قصیدے لکھ کر پیش کیے اور ملک الشعرا کا خطاب پایا، ۱۲۰۰ھ میں گورنر جنرل نے آصف جاہ ثانی کی خدمت میں ایک خاص سفارت پر ان کو حیدرآباد روانہ کیا، وہاں پہنچ کر نواب مذکور کی مدح میں قصیدہ پیش کیا جس کے صلہ میں دس ہزار روپیہ نقد اور دو سو روپیہ ماہوار کا منصب پایا۔

حیدرآباد سے فائز المراد ہونے کے بعد پھر لکھنؤ تشریف لائے اور مہاراجہ ٹکیت رائے کی مصاحبت میں چند دنوں رہ کر کلکتہ تشریف لے گئے، وہاں پہنچے ہی تھے کہ ۱۲۰۸ھ میں سفر آخرت اختیار کیا، ضخیم دیوان اور متعدد مثنویاں یادگار چھوڑیں، نثر میں بھی ایک کتاب گلستان سعدی شیرازی علیہ الرحمہ کے جواب میں لکھی ہے، اس کا نام شکرستان ہے، ان کا شمار پرگو شاعروں میں تھا، چنانچہ خود فرماتے ہیں:

دریں عمر دہ مثنوی گفتہ ام　　بآئین طرز نوی گفتہ ام

چو اشعار من در عدو می رسد　　شمار قصائد بصد می رسد

بود شعر من در غزل سی ہزار　　زپانصد رباعی گرفتم شمار

اردو اشعار کا نمونہ۔

علاج دل کو آئے تھے مسیحا سخت دعوے سے　　یہاں کیا ہوگیا وہ معجزہ حضرت سلامت کا

اس آنے کا کچھ ہے لطف پیارے　　ہر دم جو کہو کہ جائیں گے ہم

قدم رکھ گیا کون سینے پہ اپنے　　گل داغ میں آج مہندی کی بو ہے

آرزو نے بھی ان سے اصلاح لی ہے۔

بہر حال ان کی شاعری نے ترقی کی، اسی زمانہ میں لکھنؤ تشریف لائے تھے اور سرکار اودھ کی طرف سے خاطر خواہ قدردانی ہوئی، مگر بڑی قدردانی گورنمنٹ انگریزی نے کی جوان کو اجمیر میں صدر الصدور کردیا۔

ایک مدت تک اس جلیل القدر عہدے کے فرائض انجام دیتے رہے، جب کبرسنی نے مجبور کیا تو دلی جاکر خانہ نشین ہوگئے اور ۱۲۶۰ھ میں ایک ضخیم دیوان یادگار چھوڑ کر دنیا سے چل بسے۔

زبان ان کی صاف اور شیریں ہے، اس میں جابجا محاوروں کی چاشنی دیتے ہیں تو کلام اور بھی مزیدار ہوجاتا ہے، پھر ترکیب و بندش کی چستی سے پامال و فرسودہ مضامین بھی اس انداز سے ادا کرتے ہیں کہ اس میں ایک قسم کی لطافت و نزاکت پیدا ہوجاتی ہے۔

الٰہی وہ جو وعدے ہیں وفا کس طرح ہوویں گے
نہ واں خو یاد آنے کی نہ یاں شیوہ تقاضا کا

اے آہ بے ادب نہ اسے بھونکیو کہ ہے دل جلوہ گاہ پردہ نشینانِ راز کا

دعا میں زیرِ لب آہستہ آہستہ اسے دوں ہوں
جو یاد آتا ہے لب تک آکے رک جانا وہ گالی کا

ممنون قضا نے ہم کو دیا کیا بغیر دل سو وہ بھی نذر کاہش و تشویش ہوگیا

کل ترے بیمار نے غش سے ذرا کھولی تھی آنکھ
تو نہ تھا سو دیکھ بالیں کو وہ بیدل رہ گیا

اے باد آہ جنبش اتنی بھی تھی نہ لازم اک ایک پارۂ دل آخر اڑا کے چھوڑا

دل میں کیا کیا ہوسِ عرضِ تمنا تھی ولے　　تیری چتون کا وہ ڈھب مانع تقریر رہا

اس کی آنکھوں سے ستاروں کی نمک ریزی پوچھ　　صبح تک جس کا کھلا دیدۂ بے خواب رہا

کس بے ادب کو عرض ہوس ہر نگہ میں تھی　　آنکھ اس نے بزم میں نہ اٹھائی تمام شب

آمد سے تیری ہم پہ جو ہونی تھی سو ہوئی　　اب دغدغۂ حشر نہ پروائے قیامت

کشتیِ طاقت شکستہ اور بحر غم کا جوش　　مژدہ نومیدی نہیں اب اپنی ساحل تک پہنچ

یہ نہ جانا تھا کہ اس محفل میں دل رہ جائے گا　　ہم یہ سمجھے تھے چلے آئیں گے دم بھر دیکھ کر

مدت سے آب ہو کے بہا چشم تر کی راہ　　ممنون کیا بیاں کروں میں ماجرائے دل

تپش دل نے نہ چھوڑا کہ کبھی ہم اک بار　　لائیں تسکیں کے لیے لب پہ ترا نام تمام

اس ذوق سے کہتے ہیں حدیث لب شیریں　　گویا ترے ہونٹوں ہی سے لیتے ہیں مزا ہم

شب وعدہ چشم ہے راہ پر جو ذرا بھی کھٹکے کسی کا در
تو صدائے پا تری جان کر کہوں اب تلک تھے کہاں کدھر

ممنون مبادا آئے کوئی ہجر ناگہاں　　ناکامیوں سے وصل ہی میں آؤ خو کریں

اس مرگ پہ سو جان مری صدقے کہ دم نزع　　گھبرا کے کہے تو کہ بس اب دیکھیے کیا ہو

کون آئے ہے کہ سینہ میں بیدار ہو گئیں　　صد آرزوئے خفتہ صدائے قدم کے ساتھ

دل گرمیاں وہ ہم سے کہاں اب کہ آج کل　　ہنگامۂ محبت اغیار گرم ہے

رات تھوڑی حسرتیں دل میں بہت   صلح کیجیے بس لڑائی ہو چکی

تفاوت قامت یار و قیامت میں ہے کیا ممنوں
وہی فتنہ ہے لیکن یاں ذرا سانچے میں ڈھلتا ہے

نگاہ ناز و نیاز التماس راز میں تھی   وہاں سے عذر ستم یہاں سے سو گلے نکلے

بھری آتی ہے چھاتی یاد میں یارانِ رفتہ کے
یہ دل اور اس قدر صدمے بھلا کس کس کا غم کیجیے

☆☆☆

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

''از مدت سی سال بمشق سخن می پرداز دو در سرکار مرشد زادہ آفاق مرزا ولی عہد بہادر علم امتیاز می افرازد، قوت مشقی کہ اوراست دیگرے را دیدہ نشد والہٰذا رطب و یابس کہ شیوۂ بسیار گویان است در کلامش کمتر و بر جمیع اصناف سخن قدرت تمام دارد۔'' (اھ گلشن بیخار)

''صاحب فکر خداداد دست بر جمیع اصناف سخن قدرتی کہ اوراست در ریختہ سرایان نتواں یافت، گفتارش در پاکی زبان و بلندی معانی وشوخی اشارت وکرسی نشینی ترکیب وبست قافیہ ونشست ردیف طراز یکتائی دارد۔'' (اھ طور کلیم)

محمد ابراہیم، ذوق تخلص، دلی کے رہنے والے اور شیخ محمد رمضان ایک غریب سپاہی کے بیٹے تھے، ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے، حافظ غلام رسول کے مکتب میں ابتدائی تعلیم پائی، وہ شاعر بھی تھے، شوق تخلص تھا، انہی کی صحبت میں ان کو بھی شعر وسخن کا ذوق پیدا ہوا، کچھ کچھ کہنے لگے، جب سن تمیز کو پہنچے تو شاہ نصیر سے اصلاح لینے لگے اور بحکم ضرورت فارسی اور عربی کی کچھ درسی کتابیں بھی موقع پا کر کسی سے پڑھ لیں۔

طبیعت مناسب تھی، چند روز میں مشق سخن بڑھ گئی، مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے، رفتہ رفتہ مرزا ابوظفر کے دربار میں رسائی ہوگئی جو اس زمانہ میں ولی عہد تھے، چند دنوں سے وہ اپنا کلام اصلاح کے لیے ان کو دینے لگے۔

اسی زمانہ میں انہوں نے اکبر شاہ ثانی کی مدح میں ایک پرزور قصیدہ لکھا جس کے صلہ میں ان کو ''خاقانی ہند'' کا خطاب عنایت ہوا، ان کا سن اس وقت انیس سال کا تھا، جب مرزا ابوظفر بادشاہ ہوئے تو سو روپیہ ماہوار ان کی تنخواہ کر دی اور اخیر میں ایک گاؤں بھی جاگیر میں دیا مگر اس سے زیادہ متمتع نہیں ہو سکے، ۲۴؍ صفر ۱۲۷۱ھ میں غدر سے دو برس پہلے وفات پائی۔

غدر میں ان کا سارا کلام تلف ہو گیا، حافظ غلام رسول ویرانؔ نے جو ان کے شاگرد رشید تھے کچھ اپنی یاد سے اور کچھ احباب کی مدد سے ایک مختصر دیوان مرتب کر کے شائع کیا، جس میں اکثر غزلیں تمام، اکثر ناتمام، بہت سے متفرق اشعار اور چند قصیدے ہیں۔

بہت دنوں کے بعد مولوی محمد حسین آزاد نے کوشش کی اور ایک دوسرا مجموعہ مرتب کیا جس سے کچھ ناتمام غزلیں پوری ہو گئیں، کچھ قصیدوں اور غزلوں کا اضافہ ہو گیا مگر حقیقت یہ ہے کہ ایسے فنافی الشعر آدمی کی یہ ساری کمائی نہیں ہو سکتی، اگر کلام ضائع نہ جاتا تو تین چار ضخیم جلدیں بھی اس کی متحمل نہ ہو سکتیں، کلام کے باب میں جو رائے آزاد نے دی ہے، اس پر کچھ اضافہ نہیں ہو سکتا، انہوں نے ٹھیک کہا ہے کہ عام جوہر ان کے کلام کا تازگی مضمون، صفائی کلام، چستی ترکیب، خوبی محاورہ اور عام فہمی ہے مگر رنگ مختلف وقتوں میں مختلف رہا، ابتدا میں مرزا رفیع سودا کا انداز تھا، جب نواب الٰہی بخش خاں (۱) معروف کی صحبت میں پہنچے

---

(۱) نواب الٰہی بخش خاں، معروف تخلص، نواب فخر الدولہ احمد بخش خاں رئیس لوہارو کے چھوٹے بھائی مرزا نوشہ اسد اللہ خاں غالب کے سسر نے نہایت بامذاق، زندہ دل اور درویش مزاج امیر تھے، بزرگان دین کی صحبت میں ترک و تجرید کے ساتھ گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی مگر شعر و سخن کا شوق عنفوان شباب سے مرتے دم تک قائم رہا، مشق سخن شاہ نصیر سے کی تھی، آزاد نے آب حیات میں جس طرح سے ظفر مرحوم کی کاوش فکر پر پانی پھیرا ہے، ان کے بھی نتائج فکر کو اپنے استاد ذوقؔ کے دامن کمال سے وابستہ کر دیا ہے، باوجودیکہ اس کہنہ مشق شاعر کی عمر اس وقت چھیاسٹھ برس کی تھی اور ذوقؔ بمشکل اٹھارہ برس کے رہے ہوں گے مگر جوش عقیدت میں اس کا خیال نہیں رہا۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

جو خواجہ میر درد کے انداز کو پسند کرتے تھے، ان کی غزلیں خواجہ صاحب کے انداز میں بنانے لگے، مرزا ابوظفر نوجوان تھے، وہ جرأت کے انداز کو پسند کرتے تھے، ان کی غزلیں جرأت کے انداز میں بناتے تھے، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ خود ان کی غزل اخیر کو ایک گلدستہ گلہائے رنگا رنگ کا ہوتی تھیں، دو تین شعر بلند خیالی کے، ایک دو تصوف کے، دو تین معاملے کے۔ (دیکھو آب حیات)

سابقہ حاشیہ: مصحفی نے تذکرۂ شعرا ۱۲۰۵ھ میں تالیف کیا ہے، اس میں ذوق کا ذکر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے کیوں کہ ذوق کی عمر اس وقت زیادہ سے زیادہ سال بھر کی رہی ہوگی مگر نواب الٰہی بخش خاں معروف کا تذکرہ ہے، لکھتے ہیں کہ "بہ شاگردی میاں نصیر نازش دارد، وفکر شعر نیز بر دیدا ایشاں کہ تلاش است می کند در یک دو مشاعرہ، صاحب عالم شریک غزل طرحی نیز بود، بعد دو ماہ بشہر عود کرد" یہ اس زمانہ کا قصہ ہے کہ نواب الٰہی بخش خاں معروف سیر و تفریح کے لیے لکھنؤ آئے اور دو مہینہ رہ کر دلی واپس گئے ہیں، اب اس کے بعد آزاد کے ان فقروں کو پڑھو "جو دیوان معروف اب رائج ہے وہ تمام و کمال انہی کا (یعنی ذوق کا) اصلاح کیا ہوا ہے، نواب مرحوم اگرچہ ضعف پیری کے سبب سے خود کاوش کر کے مضمون کو لفظوں میں نہیں بٹھا سکتے تھے مگر اس کے حقائق و دقائق کو ایسا پہنچے تھے کہ جو حق ہے" نواب کے اشعار کا ایک سلسلہ ہے جس میں ردیف وار ۱۰۱ مطلع ہے اور کوئی شعر سبزی کے مضمون سے خالی نہیں، اس کا نام تسبیح زمرد ہے، آزاد کہتے ہیں کہ یہ تسبیح بھی استاد مرحوم نے پروئی تھی، نواب نے ۱۲۴۲ھ میں وفات پائی، اشعار ملاحظہ ہو ۔

معروف اب تو دیکھتے ہو تم ہمیں غریب تک منہ لگائے یار تو پھر ہم کو دیکھیے

روٹھنے کو تو چلے روٹھ کے ہم واں سے ولے مڑ کے تکتے تھے کہ اب کوئی منا کر لے جائے

کچھ تو سمجھ لیا ہے جو اس کو دیا ہے دل کیوں ناصحا عبث ہمیں سمجھائے جائے ہے

گریۂ و آہ و فغاں سے ایک دم فرصت نہیں ہم سمجھتے تھے محبت کام بیکاروں کا ہے

درد سر میں ہے کسے صندل لگانے کا دماغ اس کا گھسنا اور لگانا درد سر یہ بھی تو ہے

مئے عشرت طلب کرتے تھے ناحق آسماں سے ہم
کہ آخر جب اسے دیکھا فقط خالی سبو نکلا

کہیں تجکو نہ پایا گرچہ ہم نے اک جہاں ڈھونڈا
پھر آخر دل ہی میں دیکھا بغل ہی میں سے تو نکلا

گھسے سب ناخن تدبیر اور ٹوٹے سر سوزن
مگر تھا دل میں جو کانٹا نہ وہ ہرگز کبھو نکلا

سب کو دیکھا اس سے اور اس کو نہ دیکھا جوں نگاہ
وہ رہا آنکھوں میں اور آنکھوں سے پنہاں ہی رہا

مجھ میں اس میں ربط ہے گویا برنگ بوئے گل
وہ رہا آغوش میں لیکن گریزاں ہی رہا

موت اس کو یاد کرتی ہے خدا جانے کہ گور
یوں ترا بیمار غم جو ہچکیاں لینے لگا

عشق نے ڈالی تھی جب قصر محبت کی بنا
لکھ دیا تھا کوہ کن بھی نام اک مزدور کا

ہم ہیں اور سایہ ترے کوچہ کی دیواروں کا
کام جنت میں ہے کیا ہم سے گنہگاروں کا

کہے ہے خنجر قاتل سے یوں گلو میرا
کمی جو مجھ سے کرے تو پیے لہو میرا

جل کے میں خاک ہوا تو بھی رہا دل مضطر
یہ وہ سیماب ہے کشتہ نہ ہوا پر نہ ہوا

ذوق بیمار محبت ہے خدا خیر کرے
کہ یہ آزار ہوا جس کو وہ جانبر نہ ہوا

میں ہجر میں مرنے کے قریں ہو ہی چکا تھا
تم وقت پہ آپہنچے نہیں ہو ہی چکا تھا

اس سے تو اور آج وہ بے درد ہو گیا
اب آہ آتشیں سے بھی دل سرد ہو گیا

سینہ میں بوالہوس کے بھی تھا آبلہ مگر
نشتر کا نام سنتے ہی منہ زرد ہو گیا

لگائی زلف کو شانہ نے جب انگلی پکارا دل
یہ گستاخی بھلا رہ تو سہی اے بے ادب آیا

ترے ڈر سے نہ آیا پاس کوئی نیم جانوں کے
مگر رونا کبھی چوری سے بعد از نیم شب آیا

سن کے مجنوں نے شور جنوں کو یوں کہا　　واقعی مجھ سے بھی یہ شوریدہ سر اچھا ہوا

یوں لائے واں سے ہم دل صد پارہ ڈھونڈ کر　　دیکھا جہاں پڑا کوئی ٹکڑا اٹھا لیا

ریش سفید شیخ میں ہے ظلمت فریب　　اس مکر چاندنی پہ نہ کرنا گمان صبح

ٹھہری ہے اس کے آنے کی یاں کل پہ جا صلاح　　اے جان برلب آمدہ اب تیری کیا صلاح

ساقی لڑائیوں سے تری چاہتا ہے دل　　باہم لڑا کے شیشہ و ساغر کو توڑ دوں

نازک کلامیاں مری توڑیں عدو کا دل　　میں وہ بلا ہوں شیشہ سے پتھر کو توڑ دوں

نہ چھوڑا تار وحشت نے ہماری جیب و داماں میں　　مگر تار نفس سینہ میں سمجھو یا گریباں میں

ہم اپنے جذبۂ دل کے اثر کو دیکھتے ہیں　　وہ دیکھیں بزم میں پہلے کدھر کو دیکھتے ہیں

جو مانگوں موت درد ہجر سے مجکو نہیں زیبا
کہ نام عشق لوں اور اس قدر راحت طلب ہوں میں

سینہ و دل پہ مرے زخم و جگر ہنستے ہیں　　ہنسنے دو چارہ گرو ہنستے ہی گھر بستے ہیں

مر گئے پھر بھی تغافل ہی رہا آنے میں　　بے وفا پوچھے ہے کیا دیر ہے لے جانے میں

خط پڑھ کے اور بھی وہ ہوا پیچ و تاب میں　　کیا جانے لکھ دیا اسے کیا اضطراب میں

بے یار روز عید شب غم سے کم نہیں　　جام شراب دیدۂ پرنم سے کم نہیں
دیتا ہے دور چرخ کسے فرصت نشاط　　ہو جس کے پاس جام وہ اب جم سے کم نہیں

اس پہ مرتے ہیں کہ کیوں غیر کو تو نے مارا ۔۔۔ وہ نصیب اس کو ہوئی تھی جو تمنا ہم کو

ہم تبرک ہیں بس اب کر کے زیارت مجنوں ۔۔۔ سر پہ پھرتا ہے لیے آبلۂ پا ہم کو

عبث تم اپنا رکاوٹ سے منھ بناتے ہو ۔۔۔ وہ لب پہ آئی ہنسی دیکھو مسکراتے ہو

دیکھا دم نزع دل آرام کو ۔۔۔ عید ہوئی ذوق ولے شام کو

نکالوں کس طرح سینہ سے اپنے تیر جاناں کو
نہ پیکاں دل کو چھوڑے ہے، نہ دل چھوڑے ہے پیکاں کو

لبیک واذاں، ناقوس و جرس یا خندۂ قلقل نالہ نے
دل کھینچنے میں ہاں کوئی ہو، پر اک نوائے دلکش ہو

تو جان ہے ہماری اور جان ہے تو سب کچھ ۔۔۔ ایمان کی کہیں گے ایمان ہے تو سب کچھ

رخصت اے زنداں، جنوں، زنجیر در کھڑکائے ہے ۔۔۔ مژدہ خار دشت پھر تلوا مرا کھجلائے ہے
سر بوقت ذبح اپنا اس کے زیر پائے ہے ۔۔۔ یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
بل بے استغنا کہ وہ یاں آتے آتے رہ گئے ۔۔۔ اف ری بیتابی کہ یاں تو دم ہی نکلا جائے ہے

ترے کوچہ کو وہ بیمار غم دار الشفا سمجھے ۔۔۔ اجل کو جو طبیب اور مرگ کو اپنی دوا سمجھے
نگہ کیا اور مژہ کیا ہم تو دونوں کو بلا سمجھے ۔۔۔ اسے تیر قضا اوس کو پر تیر قضا سمجھے
ستم کو ہم کرم سمجھے، جفا کو ہم وفا سمجھے ۔۔۔ اور اس پر بھی نہ سمجھے وہ تو اس بت سے خدا سمجھے
ہر اک گردش میں سو انداز ناز فتنہ زا سمجھے ۔۔۔ فلک کو ہم کسی کافر کی چشم سرمہ سا سمجھے
نہ دی رخصت نظر کو میری جانب کیوں تغافل سے ۔۔۔ اسے بھی آپ کیا میرا ہی بخت نارسا سمجھے

حساب اصلا نہ پوچھیے مجھ سے میرے دل کے زخموں کا حساب دوستاں در دل اگر وہ دلربا سمجھے

کیا غرض لاکھ خدائی میں ہوں دولت والے ان کا بندہ ہوں جو بندے ہیں محبت والے
رہے جوں شیشۂ ساغر وہ مکدر دونوں کبھی مل بھی گئے دو دل جو کدورت والے
نہیں جز شمع مجاور مری بالین مزار نہیں جز کثرت پروانہ زیارت والے
کبھی افسوس ہے آتا تو کبھی رونا آتا دل بیمار کے دو ہی ہیں عیادت والے

ہے تیرے کان زلف معنبر لگی ہوئی رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی
بیٹھے بھرے ہوئے ہیں خم مے کی طرح ہم پر کیا کریں کہ مہر ہے منہ پر لگی ہوئی
کرتی ہے زیر برقع فانوس تاک جھانک پروانہ سے ہے شمع مقرر لگی ہوئی
اے ذوق دیکھ دختر رز کو نہ منہ لگا چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

مزے جو موت کے عاشق بیاں کبھو کرتے مسیح و خضر بھی مرنے کی آرزو کرتے
غرض تھی کیا ترے تیروں کو آب پیکاں سے مگر زیارت دل کیوں کر بے وضو کرتے
اگر یہ جانتے چن چن کے ہم کو توڑیں گے تو گل کبھی نہ تمنائے رنگ و بو کرتے
سراغ عمر گزشتہ کا کیجیے گر ذوق تمام عمر گزر جائے جستجو کرتے

جو پاس مہر محبت یہاں کہیں بکتا تو ہم بھی لیتے کسی اپنے مہرباں کے لیے
وبال دوش ہے اس ناتواں کو سر لیکن لگا رکھا ہے ترے خنجر و سناں کے لیے

قسمت برگشتہ دیکھو اک نگہ کی تھی ادھر سو بھی آکر تا سر مژگاں حیا سے پھر گئی

زخمی میں ہوا ہوں تری دزدیدہ نظر سے جانے کا نہیں چور مرے زخم جگر سے

نگہ کا وار تھا دل پر پھڑکنے جان لگی چلی تھی برچھی کسی پہ کسی کے آن لگی

فلک کیا فتنہ سازی میں ہو ہمسر چشم فتاں سے
گرا تھا یہ بھی اشک سرمہ آلود اس کی مژگاں سے

دل صاف ہو تو چاہیے معنی پرست ہو آئینہ خاک صاف ہے صورت پرست ہے

دروازہ میکدہ کا نہ کر بند محتسب ظالم خدا سے ڈر کہ در توبہ باز ہے

ساقیا عید ہے لا ساغر و مینا بھر کے بادہ آشام پیاسے ہیں مہینہ بھر کے

نہیں مژگاں پہ خوں خار غم بھی دلنشیں نکلے
جنوں یہ نیشتر کیسے، کہیں ڈوبے کہیں نکلے

باز آیا دیکھنے سے نہ آتش رخوں کے دل سو بار آبلے اسے آنکھیں دکھا چکے

کوئی کمر کو تری ہو اگر کمر تو کہے کہ آدمی جو کہے بات سوچ کر تو کہے

مری طاعت سے اب تو معصیت بھی عار کرتی ہے مری توبہ پہ توبہ، توبہ استغفار کرتی ہے

اگر اٹھے تو آزردہ جو بیٹھے تو خفا بیٹھے لگایا جی کو اپنے روگ جب سے جی لگا بیٹھے

جو کہو گے تم کہیں گے ہم بھی ہاں یونہی سہی آپ کی گر یوں خوشی ہے مہرباں یونہی سہی

☆☆☆

بہادر شاہ ظفرؔ

''بہ اکثر صفات موصوف وبمحامد مکارم معروف، دراکثر خطوط دستگاہے
شایستہ دارد وبایں فن بسیار مالوف ہست، شیخ ابراہیم ذوق از مائدہ نعمتش
زلہ ربا ووظیفہ خوار است۔'' (اھ گلشن بیخار)

''درخطاطی دست بلند داشت ودرسخن پایہ ارجمند، گفتارش اگرچہ
سادہ پرکار ہست، اما ہماء اش خاطر شکار ہست، محاورہ گوئی ازان اوست و
معاملہ نویسی زیر فرمان او۔'' (اھ بزم سخن)

ابوظفر سراج الدین بہادر شاہ اکبر ثانی کے بیٹے تھے اور شاہ عالم بادشاہ کے پوتے تھے، ہندوستان کی سلطنت دادا کے وقت میں جا چکی تھی، ایک وظیفہ خوار کی حیثیت سے برائے نام بادشاہ رہ گئے تھے اور ان کی حکومت دہلی میں قلعہ معلیٰ کی چار دیواری کے اندر سمٹ کر رہ گئی تھی۔

لیکن اقلیم سخن کی فرماں روائی دادا سے ترکہ میں ملی تھی اور اردوئے معلیٰ ان کے زیر نگیں تھا، افسوس ہے کہ اس کو بھی مولوی محمد حسین آزاد نے ظفر سے چھین کر استاد ذوقؔ کو بخش دیا۔

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا　　بخال ہندوش بخشم سمر قند و بخارا را

آب حیات میں استاد ذوقؔ کے حالات پڑھو، ظفرؔ کے ہاتھ کیا رہتا ہے، کوئی شعر پورا کوئی ڈیڑھ مصرع، کوئی ایک، کوئی آدھا مصرع، فقط بحر اور ردیف وقافیہ باقی بخیر، استاد ذوق ان ہڈیوں پر گوشت و پوست چڑھا کر حسن و عشق کی پتلیاں بنا دیتے تھے، پہلا

دیوان نصف سے زیادہ، باقی تین دیوان سرتاپا حضرت مرحوم (استاد ذوق) کے ہیں۔

لطف یہ ہے کہ چاروں دیوان اس بدنصیب بادشاہ کے چھپ چکے ہیں اور حضرت ذوق کا بھی تھوڑا بہت جو کچھ کلام مل سکا ہے وہ ایک دیوان کی شکل میں شائع ہو چکا ہے، ان دونوں کو پڑھو اور ہر ایک کے انداز سخن پر غور کرو، پھر اپنی فطرت سلیم سے فتویٰ لو، دونوں کی حیثیتیں جداگانہ نظر آئیں گی، ذوقؔ پھر بھی ذوقؔ ہیں، ظفرؔ کے استاد، ان کے کلام کی رنگینی، ترکیب کی چستی، مضمون کی بندش، جوش وخروش، ان کی باتیں ان کے ساتھ ہیں، ظفرؔ کے ہاں جو سامان نظر آئے گا وہ اس سے ملتا جلتا ہوگا اور ہونا بھی چاہیے، کیوں کہ استاد کا رنگ شاگرد میں آنا ضرور ہے، مگر پھر بھی وہ دوسری طرح کا ہوگا، محاوروں کی فراوانی یہاں زیادہ ملے گی مگر جوش وخروش کی جگہ دل وجگر کے ٹکڑے حروف والفاظ بن کر آنسوؤں کی سیاہی اور آہ جگر دوز کے قلم سے لکھے ہوئے تم کو ملیں گے، اب انہیں ظفر کا سمجھو یا ذوق کا۔

۱۲۷۱ھ میں جب شیخ ابراہیم ذوق کا انتقال ہو گیا تو مرزا نوشہ غالبؔ کے متعلق خدمت ہو گئی تھی، مولانا حالیؔ نے یادگار غالب میں جہاں اس کا ذکر کیا ہے، وہاں انہوں نے بھی بجائے ذوق کے غالب کے متعلق ناظر حسین مرزا کی زبانی آزاد کے اسی مضمون کو دہرایا ہے مگر مقدمۂ دیوان حالی میں ایک موقع پر ذوق وظفر کے کلام میں قریب قریب اسی طرح کا فرق بیان کیا ہے جو میں نے لکھا ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''ذوقؔ کی غزلوں میں عموماً زبان کا چٹخارہ اپنے معاصرین کے کلام سے زیادہ ہے، مگر وہ جہاں مضمون آفرینی کرتے ہیں صفائی سے بہت دور جا پڑتے ہیں، ظفر کا تمام دیوان زبان کی صفائی اور روزمرہ کی خوبی میں اول سے آخر تک یکساں ہے لیکن اس میں تازگی خیالات بہت کم پائی جاتی ہے۔''

اس بحث کے بعد میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ ظفر کی کمزوری صحیح اور ان کے اساتذہ کی کاوش فکر مسلم مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی ساری عمر کی محنت پر پانی پھیر کر استاد ذوق کو ان کے دیوانوں کا مالک بنا دیا جائے۔

اس بدنصیب بادشاہ کی ساری زندگی روتی جھیکتی گزری، دلوں کے ارمان دل ہی میں رہے، سلطنت کا خواب جو دیکھا تھا اس کی تعبیر یوں ظاہر ہوئی کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد قلعہ معلیٰ سے بھی نکال کر رنگون پھینک دیے گئے۔

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن　　بہت بے آبرو ہوکر ترے کوچہ سے ہم نکلے

جوان جوان بیٹے اور پوتے ان کی آنکھوں کے سامنے کھڑے کر کر کے گولی مار دیے گئے، طوق وسلاسل اور خدا جانے کیا کیا جو کچھ بھی اس منحوس شاعری کی بدولت ان کو ہوس ہوتی ہوگی وہ سب نکل گئی اور جتنے دنوں کی زندگی تھی رنگون کے بلاخانہ میں بے کسی و بے بسی کے ساتھ پوری کر کے ۱۲۷۹ھ میں پیوند خاک ہوگئے، اب کوئی یہ بھی نہیں جانتا کہ ان کو گور و کفن ملا بھی یا نہیں۔ (تسلیم)

نہ شامیانہ، نہ شمع تربت، نہ موج سبزہ، نہ چادر گل
بلا نصیبوں میں پھنس کے کیا کیا خراب مٹی ہے بیکسی کی

ظفر مرحوم کا کلام ملاحظہ ہو:

ہم اپنے کنج غم میں نالہ و فریاد کرتے ہیں　　ہمیں کیا گر چمن میں چہچہا ہے عندلیبوں کا

سر تلک دست ستم جوں ہی ترا قاتل بڑھا　　خون جسم ناتواں تل تل گھٹا تل تل بڑھا

تم لاکھ کرو حضرت دل نالہ و فریاد　　چاہو کہ ہو کچھ اس کو اثر ہو نہیں سکتا

کیا کان بھر دیے ہیں خدا جانے غیر نے　　غصہ میں جو پھرے ہے وہ کافر پھرا پھرا

ظالم ترے چپ رہنے کا عقدہ نہیں کھلتا　　کیا جانے کہ ہے دل میں ترے کیا نہیں کھلتا

دنیا میں بلا سے اگر آرام نہ پایا　　ہم نے یہی پایا کہ برا نام نہ پایا

ضبط فریاد کروں گریہ کو روکوں لیکن دل بے تاب کو تھاموں یہ نہیں ہوسکتا

وہ کھاگئے سو بار مرے آگے قسم جھوٹ اور پھر ہے یہ دعویٰ کہ نہیں بولتے ہم جھوٹ

ہوں جو ٹیڑھے ترچھے دکھلا ان کو اپنا بانکپن
ہم ہیں سیدھے سادھے ہم سے بات کر سیدھی طرح

صد آرزوئے وصال و حیات نیم نفس نفس شماری و اندوہ بے شمار دریغ

یوں تو مدت سے ہے الطاف وعنایات میں فرق
لیکن ایسا نہ ہو آجائے ملاقات میں فرق

رہا تھا کیا وہ مجھ سے چھین کر لیتے تو کیا لیتے دل و دیں لے چکے تھے اب اگر لیتے تو کیا لیتے

برسوں گزرے کہ ہوئی خاک ہماری برباد اب تو اس کوچے میں اے باد سحر خاک نہیں

دل دے کے ان کو ایسی اذیت ہوئی ہمیں اب دل کبھی نہ دیں گے نصیحت ہوئی ہمیں

ہوگیا اور زیادہ وہ کشیدہ ہم سے دوستو کیا کشش دل کا اثر پوچھتے ہو

نہیں معلوم ظفر اس سے ہوئی کیا باتیں چپکے بیٹھے ہوئے تم آج خفا سے کچھ ہو

خدا کے واسطے زاہد اٹھا پردہ نہ کعبہ کا کہیں ایسا نہ ہو یاں بھی وہی کافر صنم نکلے

اسے کیا کام تھا وہ بے خبر کیوں پوچھتا پھرتا دل گم گشتہ کی اپنے خبر لیتے تو ہم لیتے

خدا بچائے ظفر دوستی سے اس دل کی جو ہو یہ دوست تو حاجت نہیں عدو کی مجھے

نہ پہنچا کوئی اپنے پاس پہنچا جب کہ وقت اپنا
اجل کو آفریں ہے وقت پر پہنچی تو یہ پہنچی

وقت پر جو کام آئے دوست اس کو جانیے
ورنہ رہتا اے ظفریاں کام کس کا بند ہے

جنوں میں کیا مرے پیوند پیرہن میں لگے
کہ ایک تار بھی چھوڑا ہو تو کفن میں لگے

اسی کو دوست سمجھتے ہیں وہ جو کچھ نہ کہے
کرے جوان سے سوال و جواب دشمن ہے

یہ کیا ستم ہے ہم کہیں رو رو کے اپنا حال
منہ اپنا پھیر پھیر کے وہ بے وفا ہنسے

میں جو کہتا ہوں بے وفا ہے رقیب
وہ مجھے کہتے ہیں کہ تو کیا ہے

☆☆☆

حکیم محمد مومن خاں مومنؔ

''بزعم فقیر بقوت شاعری ایشاں کم کسے برخاستہ، در ہر جنس آنچناں مکانتی دانی دارد کہ کسی رادر یک صنف ہم میسر نیامدہ، اگر خطے از فہم خداداد داری، بیاد بدیوانش نظر کن وبتصدیق وتکذیب من زبان انصاف بکشا۔''

(از گلشن بیخار)

محمد مومن خاں نام، مومن تخلص، حکیم غلام نبی خاں کے بیٹے تھے، ۱۲۱۵ھ میں پیدا ہوئے، جب ذرا ہوش سنبھالا تو مولانا شاہ عبدالقادر علیہ الرحمہ سے عربی کی کتابیں پڑھیں، جب استعداد درست ہوگئی تو والد اور چچا حکیم غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انہی کی زیر نگرانی نسخہ نویسی کی۔

اسی زمانہ میں نجوم کا شوق پیدا ہوا، اس کو بھی اہل کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پہنچائی، شعر وسخن سے طبعی مناسبت تھی، عاشق مزاجی نے اسے اور بھی چمکا دیا، ابتدا میں شاہ نصیر کو اپنا کلام دکھایا، پھر ذہن خداداد کے اطمینان پر اصلاح لینی چھوڑ دی اور بطور خود مشق سخن کی۔

رنگین طبع، رنگیں مزاج، خوش وضع، خوش لباس اور عاشق مزاج آدمی تھے، غزل دردناک آواز اور دلپذیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے، بایں ہمہ دینداری کے خیال سے بھی خالی نہ تھے، جوانی میں حضرت سید احمد شہید سعیدؒ کے مرید ہوئے اور آخر عمر تک عقائد میں انہی کے پیرو وتبع رہے، کلیات میں ایک مثنوی جہادیہ ہے جو اس وقت لکھی تھی جب سید صاحب

سکھوں سے جہاد کررہے تھے، علاوہ اس کے دو قطعۂ تاریخ ان کی امامت کے ہیں جن میں سے ایک کے دو چار شعر یہ ہیں:

گلاب ناز سے دھوتا ہوں مغز اندیشہ — کہ فکر مدحت سبط قسیم کوثر ہے
وہ کون امام جہان و جہانیاں احمدؒ — کہ محض مقتدی سنت پیمبر ہے
زمیں کو مہر فلک سے نہ کیوں ہو دعوی نور — کہ اس کا رایت اقبال سایہ گستر ہے
زبسکہ کام نہیں ہے اسے سوائے جہاد — جو کوئی اس سے مقابل ہو سو وہ کافر ہے
وہ بادشاہ ملائک سپاہ کوکب دین — کہ نور شمس و قمر جس کی گرد لشکر ہے
وہ برق خرمن ارباب شرک و اہل ضلال — کہ شعلہ خوشئہ حاصل تو دانہ اخگر ہے
وہ شاہ مملکت ایماں کہ جس کا سال خروج — امام برحق مہدی نشان علی فر ہے
۱۲۴۲ھ

تاریخ میں ہمیشہ تعمیہ و تخرجہ معیوب سمجھا جاتا ہے مگر ان کے ذہن وذکاوت طبع کی تعریف نہیں ہوسکتی کہ ان کی طبع رسا نے اس کو محسنات میں داخل کر دیا ہے، مولانا شاہ عبدالعزیزؒ کی وفات کی تاریخ کہتے ہیں:

دست بیداد اجل سے بے سروپا ہوگئے — فقر و دیں فضل و ہنر لطف و کرم علم و عمل
۱۲۳۹ھ

اپنے والد کے تاریخ وفات میں کہتے ہیں:

بمن الہام گشت سال وفات — کہ غلام نبی بحق پیوست
۱۲۴۱ھ

صغیر سن بیٹی کی تاریخ وفات:

خاک بر فرق دولت دنیا — من فشاندم خزانہ بر سر خاک
۱۲۶۳ھ

بیٹی کی تاریخ ولادت:

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے — کہی تاریخ دختر مومن
۱۲۶۳ھ

کلیات میں قصائد بھی ہیں جو اپنے درجہ میں عالی رتبہ رکھتے ہیں لیکن انہوں نے صلہ کی امید پر ارباب دنیا کی مدح میں کبھی قصیدہ نہیں کہا، راجہ اجیت سنگھ رئیس پٹیالہ کی مدح میں جو قصیدہ ہے اس کا ایک خاص سبب ہے، ایک دن راجہ اپنے مصاحبوں کو لیے ہوئے دلی میں سر راہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے، خان صاحب کا ادھر سے گزر ہوا، لوگوں نے کہا مومن خاں شاعر یہی ہیں، راجہ نے آدمی بھیج کر بلوایا، عزت و تعظیم سے بٹھایا اور حکم دیا ہتھنی کس لاؤ، ہتھنی آئی تو خانصاحب کو عنایت کی، یہ قصیدہ اسی کا شکریہ ہے۔

نواب وزیر الدولہ بہادر فرماں روائے ٹونک کی تعریف میں بھی ایک قصیدہ ہے جس کا مطلع ہے:

یاد ایام عشرف فانی نہ وہ ہم ہیں نہ وہ تن آسانی

مگر یہ قصیدہ بھی صلہ کی امید پر نہیں لکھا، بات یہ تھی کہ نواب ممدوح کو حضرت سید احمد شہیدؒ قدس سرہٗ سے بیعت تھی، بیعت ہی نہیں تھی عشق تھا، اس لحاظ سے مومن خاں ان کے روحانی بھائی تھے، وہ چاہتے تھے کہ مومن ٹونک آئیں اور نواب کے ساتھ رہیں مگر خانصاحب سے دلی کی گلیاں کب چھٹ سکتی تھیں، علاوہ اس کے ایسے رنگین مزاج کا نواب جیسے مقدس اور متشرع کے ساتھ گزر کیسے ہو سکتا تھا ؏

میں ہوں ہنسوڑا تو ہے مقطع میرا تیرا میل نہیں

کچھ سمجھ بوجھ کر معذرت کا قصیدہ لکھ کر بھیج دیا۔

ان دونوں قصیدوں کے سوا ایک قصیدہ حمد و مناجات میں ہے، ایک نعت میں، ایک ایک خلفائے راشدینؓ اور امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کی منقبت میں۔

کلیات میں آٹھ نو مثنویاں ہیں جن میں سے ایک دو ناتمام ہیں اور ان کا انداز وہی ہے جو غزلوں کا ہے، مگر افسوس ہے کہ اخلاقی حیثیت سے یہ بہت گری ہوئی ہیں۔

دیوان میں مخمس، مسدس، ترجیع بند، مرثیہ وغیرہ سبھی کچھ ہے اور خانصاحب کا انداز

ہر جگہ قائم، اس کلیات کو پہلے ان کے شاگرد رشید نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ نے جمع کیا تھا، پھر میر عبدالرحمٰن خلف میر حسن تسکین (خانصاحب کے فرزند نسبتی) نے از سر نو مرتب کیا جو کئی بار چھپ چکا ہے۔

علاوہ اس کے ان کا دیوان فارسی بھی چھپ گیا ہے، وہ بھی اپنے رنگ میں لاجواب ہے اور جو دل فریبیاں مومن خاں کے اردو کلام کے ساتھ مخصوص ہیں، وہ اس میں بھی بدرجۂ اتم موجود ہیں۔(۱)

آزاد نے آب حیات میں مومن کے کلام کی نسبت جو رائے ظاہر کی ہے اس کو سن لو پھر جو بات رہ جائے گی اس کو میں بیان کروں گا۔

> ''ان کے خیالات نہایت نازک اور مضامین عالی ہیں، استعارہ اور تشبیہ کے زور سے اور بھی اعلیٰ درجہ پر پہنچایا ہے، ان میں معاملات عاشقانہ عجیب مزے سے ادا کیے ہیں، اسی واسطے جو شعر صاف ہوتا ہے اس کا انداز جرأت سے ملتا ہے، وہ اکثر اشعار میں ایک شے کو کسی صفت خاص کے لحاظ سے ذات شے کی طرف نسبت کرتے ہیں اور اس ہیر پھیر سے شعر میں عجیب لطف ولطیف بلکہ معانی پنہاں پیدا کرتے ہیں، اکثر عمدہ ترکیبیں اور نادر تراشیدہ فارسی کی اور استعارے واضافتیں اردو میں استعمال کر کے کلام کو نمکین کرتے ہیں۔''

بات یہ ہے کہ جو جذبات وخیالات غزل میں بیان کیے جاسکتے ہیں، وہ سب قدما کے حصے میں آگئے اور جتنے لطیف اور پاکیزہ اسلوب بیان کے ہوسکتے ہیں وہ سب ختم ہو گئے ممکن تھا کہ متاخرین اس دائرہ سے نکل کر ہر قسم کے خیالات پر اپنی شاعری کی بنیاد قائم

---

(۱) ایک انشائے فارسی ہے، دیوان فارسی اور انشا حکیم احسن اللہ مرحوم نے مرتب کی اور مطبع سلطانی میں ۱۸۵۷ء سے قبل چھپی۔

کر دیتے تو ان کو زیادہ وسیع اور فراخ میدان مل جاتا، مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا، اسی محدود دائرے میں اپنے اپنے مبلغ فکر کے موافق لطافتیں اور نزاکتیں پیدا کیں۔

مومن خاں کے ہم عصروں میں مرزا غالب نے اس میں نمایاں حصہ لیا ہے، مگر جیسا کہ خود مولانا حالی نے یادگار غالب میں ایک موقع پر تسلیم کیا ہے کہ مومن خاں مرحوم اس خصوصیت میں مرزا سے بھی سبقت لے گئے، حقیقت یہ ہے کہ مومن خاں نے جس قدر اسالیب بیان میں نزاکت و لطافت پیدا کردی ہے وہ ان کی ذہانت اور جولانی طبیعت کا تماشا گاہ ہے، قصیدوں میں، غزلوں میں، مثنویوں میں، ہر جگہ ان کا انداز بیان کیفیت سے خالی نہیں مگر افسوس ہے کہ ان کو مولانا حالی جیسا نقاد نہیں ملا جو ان کی کاوش فکر کے نتائج کو ملک میں نمایاں کرتا۔

ان کے طرز ادا میں ایک بات اور بھی ہے جس کو مولانا شبلی نے شعر العجم میں خصوصیات غالب میں بیان کیا ہے، کچھ شک نہیں کہ مرزا غالب بھی ان کے ساتھ شریک ہیں مگر مومن کے یہاں یہ بات بہت نمایاں ہے کہ اکثر موقعوں کے بعض اجزا چھوڑ جاتے ہیں جس سے ایک خاص لطف پیدا ہو جاتا ہے، یہ وہ موقعے ہوتے ہیں جہاں سننے والے کا ذہن خود بخود اس جزو کی طرف منتقل ہو سکتا ہے، یہ شاعری کا ایک نازک پہلو ہے جس میں کبھی بے اعتدالی بھی پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے شعر سخت پیچیدہ ہو جاتا ہے اور اس کے سمجھنے میں کاوش فکر کی ضرورت پڑتی ہے۔

افسوس ہے کہ اس جامع کمالات ہستی نے بہار زندگی کے صرف باون سال مزے لے کر ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی اور میدچورہ میں دلی دروازہ کے باہر حضرت شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ کے مقبرہ کے پاس سپرد خاک کیے گئے۔

غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں:

غضب سے تیرے ڈرتا ہوں، رضا کی تیرے خواہش ہے
نہ میں بیزار دوزخ سے نہ میں مشاق جنت کا

نہ جاؤں گا کبھی جنت میں نہ جاؤں گا　　اگر نہ ہوئے گا نقشا تمہارے گھر کا سا

کچھ سن کے جو میں چپ ہوں تو تم کہتے ہو بولو
سمجھو تو یہ تھوڑا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

اللہ ری ناتوان جب شدت قلق میں　　بالیں سے سر اٹھایا دیوار تک نہ پہنچا

اس نقش پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل　　میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

کیا سناتے ہو کہ ہے ہجر میں جینا مشکل　　تم سے بے رحم پر مرنے سے تو آساں ہوگا

درد ہے جاں کے عوض ہر رگ و پے میں ساری
چارہ گر ہم نہیں ہونے کے جو درماں ہوگا

دل لگانے کے تو اٹھائے مزے　　جی بلا سے رہا رہا نہ رہا

نہ مانوں گو نصیحت پر نہ سنتا میں تو کیا کرتا　　کہ ہر ہر بات پر ناصح تمہارا نام لیتا تھا

کیا تم نے قتل جہاں اک نظر میں　　کسی نے نہ دیکھا تماشا کسی کا

وہ کرتے ہیں بیباک عاشق کشی یوں　　نہیں کوئی دنیا میں گویا کسی کا

یہ عذر امتحان جذب دل کیسا نکل آیا　　میں الزام اس کو دیتا تھا قصور اپنا نکل آیا

وقت وداع بے سبب آزردہ کیوں ہوئے　　یوں بھی تو ہجر میں مجھے رنج و عذاب تھا

بیخود تھے، غش تھے، محو تھے، دنیا کا غم نہ تھا　　جینا وصال میں بھی تو مرنے سے کم نہ تھا

دشنام یار طبع حزیں پر گراں نہیں ‏ اے ہم نفس نزاکت آواز دیکھنا
بدکام کا مآل برا ہے جزا کے دن ‏ حال سپہر تفرقہ انداز دیکھنا

دھودیا اشک ندامت نے گناہوں کو مرے ‏ تر ہوا دامن تو بارے پاک دامن ہو گیا

ہجر بتاں میں تجکو ہے مومن تلاش زہر ‏ غم پر حرام خور تو کل نہ ہو سکا

مٹی نہ دی مزار تلک آکے اس پہ بھی ‏ کہتے ہیں لوگ خاک میں اس نے ملادیا

چشم غضب سے مشورۂ قتل کھل گیا ‏ جو بات دل میں تھی سو نظر سے عیاں ہے اب

اس ضعف میں تو آتا ہے سینہ سے لب تلک ‏ کہتے ہیں اپنے نالہ کو ہم نارسا عبث

مرچک کہیں کہ تو غم ہجراں سے چھوٹ جائے ‏ کہتے تو ہیں بھلے کی وہ لیکن بری طرح

ٹھانی تھی دل میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم ‏ پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم
اس کوچہ میں جامریں گے مدد اے ہجوم شوق ‏ آج اور زور کرتے ہیں ناطاقتی سے ہم

خنجر کو نہ توڑ سخت جانی ‏ پھر کس کو گلے لگائیں گے ہم

گر ہے دل غیر نقش تحریر ‏ تو تیرے لیے جلائیں گے ہم

اے تپ ہجر دیکھ مومن ہیں ‏ ہے حرام آگ کا عذاب ہمیں

نہ میں اپنا، نہ دل اپنا، نہ تم میرے، نہ جاں میری
اثر کس کس کو ہو، ہووے بھی گر فریاد بیکس میں

ذرا سمجھو تو جان من وصال غیر پر ہردم
مری جاں کون ہے یہ کس کی جھوٹی کھاتے ہو قسمیں

یار تھے یا دشمن جاں تھے الٰہی چارہ گر — لے چلے مرتے ہی زنداں سے سوئے صحرا ہمیں

شیریں پہ طعن تلخی فرہاد کس لیے — مجکو بھی کچھ مزا نہ ملا تیری چاہ میں
ہے دوستی تو جانب دشمن نہ دیکھنا — جادو بھرا ہوا ہے تمہاری نگاہ میں

بے التفاتیاں جو عدو سے سنی نہ تھیں — ہم جانتے تھے وصل میں رنج والم نہیں
ناصح کہاں تلک تری باتیں اٹھا سکوں — سچ ہے کہ مجھ میں طاقت جور و ستم نہیں

میں گلہ کرتا ہوں اپنا تو نہ سن غیروں کی بات — ہیں یہی کہنے کو وہ بھی اور کیا کہنے کو ہیں
غیر سے سرگوشیاں کر لیجیے پھر ہم بھی کچھ — آرزوہائے دل درد آشنا کہنے کو ہیں

نہ چاہوں روز جزا داد یہ ستم دیکھو — کب آزماتے ہیں جب وقت امتحاں نہیں

ہیں غیر مرے نکلنے سے خوش — گویا کہ میں ان کا مدعا ہوں

کیا کیجیے کہ طاقت نظارہ ہی نہیں — جتنے وہ بے حجاب ہیں ہم شرمسار ہیں
جز نہ سپہر ہیں مرے دشمن تو اور بھی — لیکن بڑے ستم یہی دو تین چار ہیں
کیسے گلے رقیب کے کیا طعن اقربا — اپنا ہی دل نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

گو آپ نے جواب برا ہی دیا ولے — مجھ سے بیاں نہ کیجیے عدو کے پیام کو

کچھ شور محبت کی تو لذت ہی نہ پوچھو — ہے آپ کے بھی حسن سے کتنا نمکیں یہ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجر یار کی — آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

توبہ گنہ عشق سے فرمائے ہے واعظ — یہ بھی کہیں دل دے کے گنہگار ہوا ہے

تاب نظارہ نہیں آئینہ کیا دیکھنے دوں — اور بن جائیں گے تصویر جو حیراں ہوں گے
ایک ہم ہیں کہ ہوئے ایسے پشیمان کہ بس — ایک وہ ہیں کہ جنہیں چاہ کے ارماں ہوں گے
عمر ساری تو کٹی عشق بتاں میں مومنؔ — آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

پامال اک نظر میں قرار و ثبات ہے — اس کا نہ دیکھنا نگہ التفات ہے
چھٹ کر کہاں اسیر محبت کی زندگی — ناصح یہ بند غم نہیں قید حیات ہے

عیش میں بھی تو نہ جاگے کبھی تم کیا جانو — کہ شب غم کوئی کس طور بسر کرتا ہے
بخت بد نے یہ ڈرایا ہے کہ کانپ اٹھتا ہوں — تو کبھی لطف کی باتیں بھی اگر کرتا ہے

عذاب ایزدی جانکاہ ہے مانا بس اب مومن — خدا کے واسطے ذکر ستم ہائے بتاں کیجیے

اجل سے خوش ہوں کسی طرح ہو وصال تو ہے — نہ آئے نعش پہ وہ پر یہ احتمال تو ہے
جفائے یار پہ سونپا معاملہ دل کا — اب آگے ہو نہ ہو، امید انفصال تو ہے

کیوں کر یہ کہیں منت اعدا نہ کریں گے — کیا کیا نہ کیا عشق میں کیا کیا نہ کریں گے

تسلی دم واپسیں ہو چکی — ہمیں ہو چکے جب نہیں ہو چکی

رشک دشمن بہانہ تھا سچ ہے — میں نے ہی تم سے بے وفائی کی

شب ہجر میں کیا ہجوم بلا ہے — زباں تھک گئی مرحبا کہتے کہتے

اگر غفلت سے باز آیا جفا کی — تلافی کی بھی ظالم نے تو کیا کی
کسی نے گر کہا مرتا ہے مومنؔ — کہا میں کیا کروں مرضی خدا کی

☆☆☆

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ

''دراوائل حال بتقاضائے طبع دشوار پسند بطرز مرزا عبدالقادر بیدل سخن می گفت و وقت آفرینیہا می کرد، آخرالامر ازاں طریقہ اندازے مطبوع ابداع نمودہ بعد ترتیب و تکمیل دیگر نگریست فراواں ابیات ازاں حذف و ساقط کردہ قدر قلیلے انتخاب زدہ۔'' (از گلشن بیخار)

اسد اللہ خاں نام، مرزا نوشہ لقب، ''نجم الدولہ دبیر الملک نظام جنگ'' خطاب تھا، پہلے اسد تخلص کرتے تھے، پھر بمناسبت اسد اللہ غالب کے غالبؔ اختیار کیا، والد کا نام عبداللہ بیگ تھا، جب پانچ برس کی عمر ہوئی، اس وقت باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، مرزا نصر اللہ بیگ حقیقی چچا لارڈ لیک کے لشکر میں چار سو سواروں کے رسالدار تھے، ان کی ذات اور رسالے کی تنخواہ میں دو پرگنے نواح آگرہ میں سرکار سے مقرر تھے، انہوں نے بھتیجے کی پرورش کی۔

چچا کے مرنے کے بعد ان کے وارثوں کی پنشنیں سرکار نے فیروز پور جھرکہ کی ریاست میں مقرر کرا دیں جس میں سے سات سو روپیہ سالانہ مرزا کو بھی غدر تک ملتا رہا، پچاس روپیہ ماہوار خلعت و خطاب کے ساتھ تاریخ خاندان تیموریہ کے لکھنے کے معاوضہ میں ابوظفر بہادر شاہ نے مقرر کر دیے تھے۔

غدر کے بعد یہ تنخواہ بند ہوگئی اور بہادر شاہ سے تعلقات رکھنے کی پاداش میں پنشن بھی جاتی رہی، دو برس انہوں نے جس مصیبت سے کاٹے وہ انہی کا کام تھا، اس کے بعد یہ

رامپور چلے گئے اور نواب یوسف علی خان (۱) ناظم رامپور نے ایک سو روپیہ ماہوار تنخواہ مقرر کردی اور اگر رامپور میں رہیں تو سو روپیہ مہینہ دعوت کا، مگر دلی چھوڑ کر رامپور کیوں کر رہ سکتے، واپس آئے اور تین سال کی جدوجہد میں پنشن بھی جاری ہوگئی، علاوہ اس کے قصیدوں کے صلے فتوح غیبی کے طور پر کبھی کبھی مل جاتے تھے، اس میں جس طرح سے بن پڑا زندگی بسر کردی،

(۱) نواب یوسف علی خان خلف نواب محمد سعید خان والی رامپور علم دوست اور ہنر پرور رئیس تھے، مولانا فضل حق خیرآبادی، مرزا نوشہ غالب، میر حسین تسکین، مظفر علی خان اسیر، منشی امیر احمد اور بہت سے علما و شعرا ان کے دامن دولت سے وابستہ تھے، ابتدا میں حکیم محمد مومن خاں مرحوم سے مشق سخن کی، ان کے بعد مرزا نوشہ غالب کے شاگرد ہوئے، پھر منشی مظفر علی اسیر کو کلام دکھانے لگے۔

غدر ۱۸۵۷ھ میں گورنمنٹ انگریزی کی مدد دینے کے صلہ میں کچھ علاقہ بھی ان کو ملا اور علاوہ دیگر خطابات کے فرزند دلپذیر دولت انگلشیہ کا خطاب عنایت ہوا، ۱۲۸۱ھ میں وفات پائی، صاحب دیوان ہیں، صرف ایک غزل ان کی یہاں نقل کرتا ہوں:

میں نے کہا دعوی الفت مگر غلط	کہنے لگا کہ ہاں غلط اور کس قدر غلط
تاثیر آہ و زاری شبہائے تار جھوٹ	آوازۂ قبول دعائے سحر غلط
سوز جگر سے ہونٹ پہ بتخالہ افترا	شور فغاں سے جنبش دیوار و در غلط
ہاں سینہ سے نمائش داغ درون دروغ	ہاں آنکھ سے تراوش خون جگر غلط
آجائے کوئی دم میں تو کیا کچھ نہ کیجیے	عشق مجاز چشم حقیقت مگر غلط
بوس و کنار کے لیے یہ سب فریب ہیں	اظہار پاکبازی و ذوق نظر غلط
لو صاحب آفتاب کہاں اور ہم کہاں	احمق بنیں ہم اس کو نہ سمجھیں اگر غلط
مٹھی میں کیا دھری تھی کہ چپکے سے سونپ دی	جان عزیز پیشکش نامہ بر غلط
وہ پوچھتے پھریں کہ جنازہ کدھر گیا	مرنے کی اپنی روز اڑائی خبر غلط
یہ کچھ سنا جواب میں ناظم ستم کیا	کیوں یہ کہا کہ دعوی الفت مگر غلط

نواب الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی سے تیرہ برس کے سن میں شادی ہوگئی تھی، اس تقریب سے دلی آرہے تھے، مگر زندگی بھر گھر نہیں بنایا، دوستوں کے گھر میں مستعار رہے یا کرایہ کے مکان میں عمر کاٹ دی، بیٹے بیٹیاں بہت سی ہوئیں مگر چھٹپنے میں مر مر گئیں، اخیر میں بیوی کے بھانجے نواب زین العابدین خان عارف کے دو یتیم بچوں کو لے کر پرورش کیا اور ان ہی کو بیٹا بیٹی سمجھتے رہے۔

مرزا شگفتہ مزاج تھے، ذہن وذکاوت کے ساتھ قوت حافظہ بھی لاجواب رکھتے تھے، شوخی اور ظرافت ان کے دم قدم کے ساتھ تھی، تحریر ہو یا تقریر کوئی بات ان کی لطافت وظرافت سے خالی نہ ہوتی تھی، میرزایانہ تمکنت مزاج کے ساتھ مروت و دوستی کا نباہ اور وضع داری کا پاس ولحاظ حد سے زیادہ تھا۔

شعر وسخن سے ازلی مناسبت تھی، حسن اتفاق سے ہرمزد نام ایک پارسی نے جو ژند و پاژند کا عالم تھا اسلام قبول کیا اور اس کا اسلامی نام ملا عبد الصمد رکھا گیا، وہ ایام سیاحت میں ہندوستان آنکلا، اس وقت مرزا کی عمر چودہ برس کی تھی مگر وہی مناسبت ازلی طبیعت میں تھی، اس کو دو برس تک گھر میں مہمان رکھ کر اکتساب کمال کیا اور فارسی میں روانی طبیعت کے وہ جوہر دکھائے کہ باید وشاید۔

عربی میں صرف ونحو کے سوا استاد سے اور کچھ نہیں پڑھا تھا مگر چونکہ علم سے فطری مناسبت تھی، ان کی اردو فارسی کی نظم ونثر دیکھ کر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ شخص عربیت سے ناواقف ہے، عربی الفاظ کو ہر جگہ اسی سلیقہ سے استعمال کیا ہے جس طرح ایک اچھے فاضل سے اس کی توقع ہوسکتی ہے۔

ملا عبد الصمد کی صحبت میں فارسیت کا رنگ ان کی قوت متخیلہ پر خوب چڑھ گیا تھا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں مرزا عبد القادر بیدل کا کلام زیادہ دیکھا تھا، اسی وجہ سے جو روش مرزا بیدل نے فارسی زبان میں اختراع کی تھی، مرزا نے اردو میں اسی پر چلنا شروع کردیا۔

مولانا حالی نے یادگار غالب میں کچھ اشعار اس زمانہ کے نقل کیے ہیں (۱) مگر اب بھی ان کے دیوان میں ایک ثلث کے قریب ایسے اشعار موجود ہیں جن پر اردو زبان کا اطلاق بہ مشکل ہو سکتا ہے، مثلاً

شمار سبحہ مرغوب بت مشکل پسند آیا   تماشائے بیک کف بردن صد دل پسند آیا
ہوائے سیر گل آئینہ بے مہری قاتل   کہ انداز بخون غلطیدن بسمل پسند آیا

شب خمار چشم ساقی رستخیز اندازہ تھا   تا محیط بادہ صورت خانۂ خمیازہ تھا
یک قدم وحشت سے درس دفتر امکاں کھلا   جادہ اجزائے دو عالم دشت کا شیرازہ تھا

قمری کف خاکستر و بلبل قفس رنگ   اے نالہ نشانِ جگر سوختہ کیا ہے

سنا گیا ہے کہ مرزا کے اس ناپسندیدہ انداز سے مفتی صدر الدین خان بہت آزردہ رہتے اور ہر موقع پر ان کی اس بے راہ روی کی مذمت فرماتے تھے، دلی کے بعض ظرفا مشاعروں میں غزلیں لکھ کر لے جاتے جو الفاظ اور ترکیبوں کے لحاظ سے تو بہت پر شوکت و

---

(۱) جو اشعار مرزا نے دیوان سے نکال ڈالے ہیں ان میں سے سات شعر مولانا حالی نے یادگار غالب میں نقل کیے ہیں بطور نمونہ کے دو چار شعر نقل کرتا ہوں ۔

بحسرت گاہ ناز کشتۂ جاں بخشی خوباں   خضر کو چشمۂ آب بقا سے ترجبیں پایا
پریشانی سے مغز سر ہوا ہے پنبہ بالش   خیال شوخی خوباں کو راحت آفریں پایا

رکھا غفلت نے دور افتادہ ذوق فنا ورنہ   اشارت فہم کو ہر ناخن بریدہ ابرو تھا

ساتھ جنبش کے بیک برخاستن طے ہو گیا   گویا صحرا غبار دامن دیوانہ تھا

کرے گر فکر تعمیر خرابہائے دل گردوں   نہ نکلے خشت مثل استخواں بیروں زقالبہا

شاندار معلوم ہوتی تھیں مگر معنی ندارد، گویا مرزا پر یہ ظاہر کرتے تھے کہ آپ کا کلام ایسا ہوتا ہے۔(۱)

حسن اتفاق دیکھو کہ مولانا فضل حق خیر آبادی دلی میں سر رشتہ دار کمشنری تھے، بزرگوں کے وطن کے لحاظ سے ان کو خیر آبادی کہہ لو مگر حقیقت میں ان کا بچپن، جوانی اور بڑھاپا

(۱) آزاد نے آب حیات میں حکیم آغا خان عیش اور ہدہد الشعرا کے تذکرہ کے ضمن میں بیان کیا ہے کہ حکیم صاحب کے اشارہ پر ہدہد بلبلان سخن کو ٹھونگیں بھی مارتا تھا چنانچہ بعض غزلیں سر مشاعرہ پڑھتا تھا جس کے الفاظ نہایت شستہ اور رنگین لیکن شعر بالکل بے معنی اور کہہ دیتا تھا کہ یہ غالب کے انداز میں غزل لکھی ہے، ایک مطلع یاد ہے۔

مرکز محور گردون بہ لب آب نہیں ناخن قوس قزح شبہۂ مضراب نہیں

ایک مرتبہ مشاعرہ میں مرزا بھی تھے اور حکیم آغا خان عیش بھی، انہوں نے طرحی غزل میں یہ قطعہ پڑھا۔

گر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے

کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ایک دفعہ مولوی عبد القادر رامپوری نے جو نہایت ظریف اور خوش مذاق فاضل تھے مرزا سے کہا کہ آپ کا ایک دو شعر سمجھ میں نہیں آتا اور اسی وقت دو مصرعے موزوں کر کے مرزا کے سامنے پڑھے۔

پہلے تو روغن گل بھینس کے انڈے سے نکال پھر دوا جتنی ہے کل بھینس کے انڈے میں ڈال

مرزا سن کر حیران ہوئے کہا کہ یہ میرا شعر نہیں ہے، انہوں نے اصرار کیا، آخر کو مرزا سمجھ گئے کہ مجھ پر اس پیرائے میں اعتراض کرتے ہیں اور جتاتے ہیں کہ تمہارے اسی قسم کے اشعار ہوتے ہیں۔

مرزا نے اس قسم کی نکتہ چینیوں پر اردو اور فارسی میں جا بجا اشارہ کیا ہے، ایک جگہ کہتے ہیں۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پروا گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ایک اور اردو غزل کا مطلع ہے۔

گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

سب دلی میں گزارا تھا، یہ اور مفتی صدر الدین خاں ہم سن و ہم سبق اور دوستی کے لحاظ سے یک جان اور دو قالب تھے، مرزا نوشہ دلی میں رہے تو ان سے بھی رسم پیدا ہوئی اور رفتہ رفتہ بڑھ گئی، یہاں تک کہ مرزا ان کو اپنا مخلص بے ریا سمجھنے لگے، مفتی صاحب کی طعن و تعریض کو تو شاید کسی اور بات پر بھی محمول کرتے ہوں مگر جب مولانا فضل حق نے روک ٹوک شروع کی تو ان کے کان کھڑے ہوئے، مولانا حالی لکھتے ہیں کہ مولانا کی تحریک سے مرزا نے اپنے کلام سے دو ثلث سے قریب اشعار نکال ڈالے اور اس کے بعد اس روش پر چلنا چھوڑ دیا۔

مرزا کی خصوصیات شاعری پر حالی نے بہت استیعاب کے ساتھ بحث کی ہے، یہ موقع اس کی تفصیل کا نہیں ہے تاہم جہاں تک ممکن ہے اختصار کے ساتھ کچھ کچھ بیان کروں گا۔

حالی کی رائے ہے کہ میر و مرزا سے لے کر ذوق تک جتنے شعرا گزرے ہیں، ان کا ایک محدود دائرہ ہے جس سے وہ کم نکلتے ہیں، ان کی بڑی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جو مضمون پہلے کسی طور پر بندھ چکا ہے وہی مضمون ایسے بلیغ اسلوب سے بیان کیا جائے کہ اگلی بندشوں سے بڑھ جائے، برخلاف ان کے مرزا نے اپنی غزل کی بنیاد ایسے اچھوتے مضامین پر رکھی ہے جن کو اور شعرا کی فکر نے مس نہیں کیا تھا اور معمولی مضمون ایسے طریقے سے ادا کیے ہیں جو سب سے نرالا ہے۔

میری رائے ناقص میں یہ عقیدہ اس حد تک صحیح اور قابل تسلیم ہے کہ مرزا نے اپنے تغزل کی بنیاد ایسے اچھوتے اسالیب پر رکھی ہے جن کو اور شعرا کی فکر نے مس تک نہیں کیا وہ معمولی سے معمولی مضمون کو ایسے نرالے انداز سے ادا کرتے ہیں جو بالکل نیا معلوم ہوتا ہے، یہ ضرور نہیں ہے کہ ہر ایک مضمون ان کا نیا ہی ہو۔

ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں ان سے جہاں تک ہوسکتا ہے بچتے ہیں اور نئی نئی تشبیہیں پیدا کرتے ہیں، مثلاً سانس کو موج سے، بیخودی کو دریا سے، گرداب کو شعلۂ جوالہ سے، مغز سر کو پنبۂ بالش سے،

دانۂ انگور کو عقدِ وصال سے، استخواں کو خشت سے، بدن کو قالب خشت سے اور اسی قسم کی بہت سی تشبیہیں ان کے ابتدائی ریختہ میں موجود ہیں۔

ان میں ایک خصوصیت یہ ہے کہ متانت اور سنجیدگی کو شوخی اور ظرافت سے ایسا پیوست کرتے ہیں کہ دونوں مل کر شعر میں تڑپ پیدا کر دیتے ہیں، سودا اور انشا شوخی اور ظرافت میں غالب سے بڑھ کر ہیں مگر جب وہ شوخی پر آتے ہیں تو متانت ان کے ہاں سے رخصت ہو جاتی ہے۔

ایک خصوصیت مرزا کی یہ ہے کہ ان کے طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو (مومن کے سوا) اوروں کے ہاں بہت کم دیکھی جاتی ہے، ان کا کلام ایسا پہلو دار ہوتا ہے کہ بادی النظر میں ان سے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد دوسرے معنی نہایت لطیف پیدا ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کا شعر ہمیشہ ایک نیا لطف دیتا ہے۔

مرزا کا معمول تھا کہ وہ نظم ہو یا نثر، نہایت کاوش سے لکھا کرتے تھے مگر باوجود اس عادت کے اپنی ذکاوت اور جولانی طبع سے بدیہہ گوئی کی بھی مشق پیدا کر لی تھی۔

لطیفہ: کلکتہ میں مولوی کرم حسین مرزا کے ایک دوست نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے ریشہ اپنے کف دست پر رکھ کر مرزا سے کہا کہ اس کی کچھ تشبیہات نظم کیجیے، مرزا نے وہیں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا قطعہ لکھ کر ان کو دیا اور ان کے صلہ میں وہ ڈلی ان سے لی، چھ سات شعر اس کے ملاحظہ ہوں ۔

ہے جو صاحب کے کف دست پہ یہ چکنی ڈلی	زیب دیتا ہے اسے جس قدر اچھا کہیے
خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھیے	ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیے
اختر سوختہ قیس سے نسبت دیجیے	خال مشکین رخ دلکش لیلا کہیے
حجر الاسود دیوار حرم کیجیے فرض	نافہ آہوئے بیابان ختن کا کہیے
صومعہ میں اسے ٹھہرائیے گر مہر نماز	میکدہ میں اسے خشت خم صہبا کہیے
مسی آلودہ سر انگشت حسیناں لکھیے	سرِ پستان پریزاد سے مانا کہیے

اپنے حضرت کے کف دست کو دل کیجیے فرض — اور اس چکنی سپاری کو سویدا کہیے

اردو میں اٹھارہ سو شعر کا ایک انتخابی دیوان چھپ گیا ہے، اس میں اکثر تمام کچھ ناتمام غزلیں ہیں، کچھ متفرق اشعار، دو قصیدے، کچھ رباعیاں اور قطعے۔

عود ہندی ایک مجموعہ ہے جس میں اردو کی کچھ تقریظیں، کچھ خطوط ہیں، اردوئے معلیٰ ایک دوسرا مجموعہ ہے جس میں شاگردوں نے جس قدر اردو کے خطوط ان کے ہاتھ آئے جمع کر دیے ہیں، ان خطوط کی عبارت ایسی ہے گویا وہ آپ کے سامنے بیٹھے گل افشانی کر رہے ہیں، بقول آزاد ان کے خطوط کی طرز عبارت ایک خاص قسم کی ہے، کچھ ظرافت، کچھ چٹکلے اور لطافت کی شوخیاں اس میں خوب ادا ہو سکتی ہیں، یہ انہی کا ایجاد تھا کہ آپ مزا لیا، اوروں کو لطف دے گئے۔

علاوہ ان تصنیفات کے لطائف غیبی، تیغ تیز، ساطع برہان وغیرہ اردو میں دوسروں کے نام سے ہیں، فارسی میں کلیات ہے جو در حقیقت ان کی جولانی طبیعت کا تماشا گاہ ہے، ایک کتاب پنج آہنگ ہے، فارسی انشا پردازوں کے واسطے لکھی ہے جو ان کے انداز پر لکھنا چاہے، قاطع برہان یا درفش کاویانی ایک رسالہ ہے جس میں برہان قاطع کی غلطیاں نکالی ہیں، نامۂ غالب اس کا جواب الجواب ہے، مہر نیم روز تاریخ کی کتاب ہے، دری زبان میں امیر تیمور سے ہمایوں بادشاہ تک کا حال ابوظفر بہادر شاہ کے حکم سے لکھا تھا، اسی سلسلہ میں دربار شاہی سے خطاب عنایت ہوا تھا، اس کا دوسرا حصہ ماہ نیم ماہ کے نام سے لکھنا چاہتے تھے جس میں اکبر شاہ سے لے کر بہادر شاہ تک کا حال لکھنا مقصود تھا مگر غدر ہو جانے سے یہ حسرت دل کی دل ہی میں رہی، دستنبو بھی تاریخی کتاب ہے، دری زبان میں غدر کی قیامت خیز تباہی کا حال لکھا ہے، غدر کی تاریخ بھی مرزا نے رستخیز بیجا سے نکالی ہے اور کتنا لطیف تخرجہ ہے۔

سبد چین ایک مختصر مجموعہ ہے جس میں چند قصائد، چند قطعے، چند خطوط فارسی میں جو کلیات کی ترتیب اشاعت کے بعد لکھی تھی۔

مرزا کو آخر عمر میں بڑھاپے نے بہت عاجز کر دیا تھا، کانوں سے سنائی نہ دیتا تھا نقش تصویر کی طرح لیٹے رہتے تھے، انجام کار تہتر برس کا سن پا کر ۱۲۸۵ھ میں زندگی کے دن پورے کیے، ''آہ غالب بمرد'' تاریخ وفات ہے۔

سر گشتۂ خمار رسوم و قیود تھا | تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہ کن اسد

دل بھی اگر گیا تو وہی دل کا درد تھا | جاتی ہے کشمکش کوئی اندوہ و درد کی

وہ ستم گر مرے مرنے پہ بھی راضی نہ ہوا | میں نے چاہا تھا کہ اندوہِ وفا سے چھوٹوں

زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا | دوست غم خواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا

ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا | کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ

صاحب کو دل نہ دینے پہ کتنا غرور تھا | آئینہ دیکھ اپنا سا منہ لے کے رہ گئے

شایانِ دست و بازوے قاتل نہیں رہا | مرنے کی اے دل اور ہی تدبیر کر کہ میں

مجھے دماغ کہاں خندہ ہائے بیجا کا | غم فراق میں تکلیف سیر گل مت دو

غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا | اعتبار عشق کی خانہ خرابی دیکھنا

کہ اگر تنگ نہ ہوتا تو پریشاں ہوتا | تنگی دل کا گلہ کیا یہ وہ کافر دل ہے

دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا | کوئی ویرانی سی ویرانی ہے

عقل کہتی ہے کہ وہ بے مہر کس کا آشنا | رشک کہتا ہے کہ اس کا غیر سے اخلاص حیف

تو مشق ناز کر خونِ دو عالم میری گردن پر | اسد بسمل ہے کس انداز پر قاتل سے کہتا ہے

گرنی تھی ہم پہ برق تجلی نہ طور پر — دیتے ہیں بادہ، ظرف قدح خوار دیکھ کر
واحسرتا کہ یار نے کھینچا ستم سے ہاتھ — ہم کو حریص لذت آزار دیکھ کر

ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں — ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور
یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات — دے اور دل ان کو جو نہ دے مجکو زباں اور

مژدہ اے ذوق اسیری کہ نظر آتا ہے — دام خالی قفس مرغ گرفتار کے پاس

ہم نے مانا کہ تغافل نہ کرو گے لیکن — خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

وہ حلقہ ہائے زلف کمیں میں ہیں اے خدا — رکھ لیجو میرے دعوی وارستگی کی شرم

زہر ملتا ہی نہیں مجکو ستم گر ورنہ — کیا قسم ہے ترے ملنے کی کہ کھا بھی نہ سکوں

لوں دام بخت خفتہ سے اک خواب خوش ولے — غالب یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں

زخم سلوانے سے میرے چارہ جوئی کا ہے طعن — غیر سمجھا ہے کہ لذت زخم سوزن میں نہیں

کہتے ہو کیا لکھا ہے تری سرنوشت میں — گویا جبیں پہ سجدۂ بت کا نشاں نہیں

ترے سرو قامت سے اک قد آدم — قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

کہتے ہیں جیتے ہیں امید پہ لوگ — ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

دل کو نیاز حسرت دیدار کر چکے — دیکھا تو ہم میں طاقت دیدار بھی نہیں
شوریدگی کے حال سے سر ہے وبال دوش — صحرا میں اے خدا کوئی دیوار بھی نہیں

میں نے کہا کہ بزم ناز چاہیے غیر سے تہی — سن کے ستم ظریف نے مجکو اٹھا دیا کہ یوں

نالہ جز حسن طلب اے ستم ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوۂ بیداد نہیں
عشق و مزدوری عشرت کدۂ خسرو کیا خوب ہم کو تسلیم نکونامی فرہاد نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

نظر لگے نہ کہیں ان کے دست و بازو کو یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ہمیں کیا کام دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

یارب زمانہ مجکو مٹاتا ہے کس لیے لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہوگئیں

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے ہم کو

عاشق ہوئے ہیں آپ بھی اک اور شخص پر آخر ستم کی کچھ تو مکافات چاہیے
مے سے غرض نشاط ہے کس روسیاہ کو اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے
تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی
مرے دل میں ہے غالب شوق وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے جو اس سے میں یہ بھی کہوں وہ بھی

غم دنیا سے گر پائی بھی فرصت سر اٹھانے کی فلک کا دیکھنا تقریب تیرے یاد آنے کی

قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی
ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ غالب ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

بس ہجوم نا امیدی خاک میں مل جائے گی یہ جو اک لذت ہماری سعی بے حاصل میں ہے
گرچہ ہے کس کس برائی سے ولے باایں ہمہ ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اس محفل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اس نے کہا میں نے یہ سمجھا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال مدت ہوئی کہ آشتی چشم و گوش ہے

دے مجکو شکایت کی اجازت کہ ستمگر کچھ تجکو مزا بھی مرے آزار میں آئے

نہ ہوئی گر مرے مرنے سے تسلی نہ سہی امتحاں اور بھی باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی
ایک ہنگامہ پہ موقوف ہے گھر کی رونق نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی ہی سہی

اچھا ہے سر انگشت حنائی کا تصور دل میں نظر آتی تو ہے اک بوند لہو کی

منحصر مرنے پہ ہو جس کی امید نا امیدی اس کی دیکھا چاہیے

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل جو آنکھوں ہی سے نہ ٹپکے تو وہ لہو کیا ہے

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق سامان صد ہزار نمکداں کیے ہوئے

غالب اس تلخ نوائی میں مجھے رکھیو معاف آج پھر درد مرے دل میں سوا ہوتا ہے

☆☆☆

میر حسین تسکین

"صاحب فکر بلند و اسلوب گفتارش دل پسند، از حضرت مومن خاں
بدرستی اشعار پرداختہ از احباب راقم است۔" (اھ گلشن بیخار)

میر حسین تسکین دلی کے رہنے والے، میر حیدر کی اولاد میں تھے جنہوں نے حسین علی خاں کو اثنائے سفر میں محمد شاہ بادشاہ کی رضا جوئی کے خیال سے قتل کر دیا تھا، والد کا نام میر حسن تھا مگر میرن صاحب کے لقب سے مشہور تھے۔

دلی میں پیدا ہوئے اور مولوی امام بخش صہبائی سے درسی کتابیں پڑھیں، شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی، کچھ دنوں شاہ نصیر سے مشق سخن کی، اس کے بعد حکیم مومن خاں کے شاگرد ہو گئے۔

کلام کا رنگ گواہی دیتا ہے کہ خاں صاحب کے شاگردوں میں یہ خاص مرتبہ رکھتے تھے، استاد کی طرز ادا، معاملہ نگاری اور شوخی کو روزمرہ کی صفائی اور سادگی کے ساتھ اس طرح سے ملا جلا دیا ہے کہ ان کے کلام میں دلآویزی کی شان بڑھ گئی ہے اور مومن خاں کے ساتھ اس قدر ہم رنگی پیدا ہو گئی ہے کہ اگر ان دونوں کے کلام کو مخلوط کر دیا جائے تو ایک کے کلام کو دوسرے کے کلام سے تمیز کرنا دشوار ہو جائے گا۔

جب دلی میں گزر اوقات کا کوئی ذریعہ نہ رہا تو رامپور چلے آئے، نواب یوسف علی خاں ناظم تخلص نے قدردانی فرمائی، چند روز رامپور میں آرام سے بسر کر کے پچاس برس کے سن میں ۱۷ر شوال ۱۲۶۸ھ میں وفات پائی۔

میر عبدالرحمٰن آسی ان کے سعادت مند بیٹے تھے جنھوں نے شاہ نصیر کا دیوان مرتب کیا تھا، وہ نواب کلب علی خاں کے زمانے تک رامپور میں رہے، حکیم مومن خاں مرحوم کے یہ بھی شاگرد تھے اور ان کے دیوان کی تکمیل انہی کے ہاتھوں سے ہوئی ہے۔

کچھ نمک کچھ مشک کچھ الماس ہوائے چارہ گر　　پھر خدا چاہے بھرے دو دن میں منہ ناسور کا

جس وقت نظر پڑتی ہے اس شوخ پہ تسکین　　کیا کہیے کہ جی میں مرے کیا کیا نہیں آتا

تسکیں کروں کیا دل مضطر کا علاج اب　　کمبخت کو مر کر بھی تو آرام نہ آیا

ہر روز وہ ڈھونڈے ہے کوئی تازہ خریدار　　صورت مری ہر روز بدل جائے تو اچھا

کوچۂ یار میں میں نے تسکیںؔ　　پاؤں رکھا تھا کہ سر یاد آیا

غیروں کو اشارہ ہے مرے قتل پہ ناحق　　یہ جنبش ابرو ہے تو سر کاہے کو ہوگا

زندگی ہووے گی کس طرح سے یارب اپنی　　دم میں سو بار اگر یوں وہ خفا ہووے گا

خوبصورت نہ کوئی ہو تو نہ ہو بدنامی　　سچ تو یہ ہے کہ برا ہوتا ہے اچھا ہونا

اس گلی میں اژدحام اغیار کا یاد آ گیا　　دل میں جوش حسرت و یاس و تمنا دیکھ کر
دیکھنا شوخی یہ کہتے ہیں مرے دشمن سے وہ　　کیا ہنسی آئی مجھے تسکیں کو روتا دیکھ کر

گر مر کے چھٹے دل کی تپش سے تو عزیزو　　تا حشر نہ نکلیں گے کبھی گور سے باہر

اے چشم سرگیں تری گردش نے کیا کیا　　راحت پذیر تھے ستم آسماں سے ہم

یاں انتظار ہی میں کٹی میری ساری رات　　واں وعدہ کیا کیا تھا انہیں یاد ہی نہیں

چھیڑوں ہزار طرح سے تم کو خفا کروں　　قابو میں میرے دل ہو تو کیا جانے کیا کروں

تسکیں نے لے کر نام ترا وقت مرگ آہ　　کیا جانے کیا کہا تھا کسی نے سنا نہیں

باتوں ہی کے مشفق ہیں مرے حضرت ناصح　　دو دن تو رہیں پاس مرے رنج و محن میں

یہ تو سچ ہے کہ جو تم چاہو گے کر گزرو گے　　پر یہ ممکن نہیں ہم پر کبھی بیداد نہ ہو

آتے ہی ان کے جان گئی واہ رے نصیب　　نکلی جو آرزو تو دم واپسیں کے ساتھ

قاصد آیا ہے وہاں سے تو ذرا تھم تو سہی　　بات تو کرنے دے اس سے اے دل بیتاب مجھے

یہ کہہ کے شب ہجر میں کرتا ہوں تسلی　　جو رنج و مصیبت ہے سو انساں کے لیے ہے

تیغ نگاہ یار اچٹنے لگی تھی پر　　برسوں گزر گئے مجھے آزار کھینچتے

اے دل یہ تیرا خاک میں ملنا ہے بے اثر　　وہ کر جو اس کے طبع مکدر میں گھر کرے

نہ اٹھا گیا دل کے ہاتھوں سے تسکیں　　کہا اس نے جو سب سنا بیٹھے بیٹھے

فتنۂ محشر کا تھا سب کو گماں　　تجکو پہچانا تری رفتار سے

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے　　کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی

☆☆☆

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ

''نواب مصطفیٰ خاں فرزند عظیم الدولہ سرفراز الملک نواب مرتضیٰ خاں
بہادر از اوان صہبا بہ مشق سخن مصروف بود و عمرے دریں شغل بسر بردہ در مراتب
نظم و نثر ادائے خاص دارد و بہر دو زبان ریختہ و پارسی سحرے می طراز د۔''

(اہ طور کلیم)

نواب مصطفیٰ خاں کے دادا ولی داد خاں کو ہاٹ سے دلی آئے، نواب مرتضیٰ خاں نے لارڈ لیک کے ساتھ رہ کر بڑے بڑے کام کیے، اس کے صلہ میں ہوڈل پلول کا علاقہ جاگیر میں ملا، جہانگیر آباد کا علاقہ انہوں نے خود خرید کیا تھا جو اب تک ان کی اولاد کے قبضہ میں ہے۔

نواب مصطفیٰ خاں کی ولادت ۱۲۳۱ھ/۱۸۰۶ء کو دلی میں ہوئی، تعلیم و تربیت کے جو بہترین سامان ہوسکتے ہیں وہ ان کو میسر ہوئے، مولوی محمد نور، مولانا کرم اللہ محدث اور دوسرے نامور علما سے تعلیم پائی اور سفر حج میں شیخ محمد عابد سندی مشہور محدث سے سند حاصل کی۔

شعر و سخن سے ازلی مناسبت تھی، حکیم مومن خاں سے مشق سخن کی، دلی اس وقت آج کی ایسی دلی نہ تھی، بڑے بڑے کہنہ مشق شاعر مولوی امام بخش صہبائی، علامہ عبداللہ خاں علوی، مفتی صدرالدین خاں آزردہ، مرزا اسداللہ خاں غالب، نواب ضیاء الدین خاں نیر، شاہ نصیرالدین نصیر، شیخ محمد ابراہیم ذوق، حکیم آغا جان عیش، حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان، میر حسین تسکین اور خدا جانے کتنے سخنوران باکمال کا جمگھٹا تھا، جب یہ لوگ جمع ہوتے ہوں گے تو آسمان کو بھی زمین پر رشک آتا ہوگا۔

مفتی صدرالدین خاں (۱) اور خود نواب کے ہاں ہر ہفتہ باری باری سے مشاعرہ ہوتا تھا، اہل کمال اس میں جمع ہو کر لطف سخن اٹھاتے تھے۔

---

(۱) مفتی صدرالدین خاں بہادر عالی خاندان، والا دودمان، سرمایۂ نازش ہندوستان، فضل وکمال اور فنون ادبیہ کی بے نظیر قابلیت میں اپنا آپ جواب تھے، سرزمین ہند میں جامعیت کے دو ہی چار شخص ہوئے ہوں گے، اس کے ساتھ مزاج دیکھو تو خلق مجسم اور لطف مصور۔

علم وکمال میں بقول شیفتہ، درفنون ادبیہ ثانی اعشیٰ وجریر است و در مراتب حکمیہ ثالث باقر و نصیر، عقل صواب اندیش میں جنرل اکڑلونی کے نفس ناطقہ جس آسانی سے راجپوتانہ کی پیچیدگیوں کو حل کر کے سرکار انگریزی سے معاہدے کرائے ہیں، وہ انہی کا کام تھا۔

علما کی مجلس ہو تو اس میں صدر نشین، مشاعرہ ہو تو اس میں میر مجلس، حکام کے جلسوں میں مؤقر و ممتاز، بے کسوں اور محتاجوں کے ملجاو ماویٰ، سر سید آثار الصنادید میں جہاں کہیں ان کا تذکرہ کرتے ہیں پورے ایک صفحہ میں ان کے القاب وآداب لکھتے ہیں اور پھر کہتے ہیں۔

هزار بار به شویم دہن بمشک و گلاب		ہنوز نام تو گفتن کمال بے ادبی است

نواب مصطفیٰ خاں گلشن بیخار میں فرماتے ہیں "باعتقاد من روزیکہ بے شرف مجالست ایشاں بپایاں آید داخل ایام عمر نیست" خدا جانے ان کے وقت میں کتنی برکت تھی، صدر الصدوری کے فرائض کے ساتھ حکام ورؤسائے شہر سے میل جول، مشاعروں کی شرکت، سب سے بالاتر درس وتدریس کا مشغلہ تھا، شاہجہاں بادشاہ کا مدرسہ دار البقا سلطنت کی تباہی کے ساتھ برباد ہو چکا تھا، اس کو اپنے روپے سے زندہ کیا، عمارت درست کی، طلبہ کے وظائف اور ان کے پڑھانے کو اساتذہ مقرر کیے اور بطور مدرس اعلیٰ منتہی طلبہ کے اسباق اپنے ذمہ رکھے، ہفتہ میں ایک بار تعطیل کے دن سب کو لے کر باغ جاتے، طرح طرح کے میوے اور لذیذ کھانے ان کو کھلاتے اور خوش ہوتے۔

شاگردوں میں نواب سید صدیق حسن خاں بہادر، مولوی سمیع اللہ خاں، سی ایم جی، مفتی سعد اللہ، مولوی ذوالفقار علی، مولوی فیض الحسن اور ان جیسے خدا جانے کتنے علما ان کے دامن تربیت (باقی اگلے صفحہ پر)

اس زمانہ میں نواب کی سخن گوئی سے زیادہ ان کی سخن فہمی کی دھوم تھی، مرزا نوشہ تک ان کی سخن فہمی کے معترف و مداح تھے، مرزا کے نزدیک نواب کی پسند، شعر کے حسن و قبح کا معیار تھی، فرماتے ہیں ؎

غالب بہ فن گفتگو نازد بایں زورش کہ او
ننوشت در دیوان غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

نواب نے سفر حج کے بعد اس شغل بے حاصل کو بہت کم کر دیا تھا، کبھی کبھی احباب کے اصرار سے کچھ کہہ لیتے تو کہہ لیتے، تصنیفات میں ایک فارسی دیوان ہے، ایک ریختہ کا دیوان، ایک مجموعہ ہے جس میں فارسی انشا پردازی کا اعلیٰ نمونہ ظاہر ہوتا ہے، ایک سفر نامہ ہے، ترغیب السالک الی احسن المسالک، فارسی نام اس کارہ آورد ہے۔

علاوہ ان کتابوں کے ایک مبسوط تالیف گلشن بیخار ہے، جس میں ریختہ گو شعرا کے

سابقہ حاشیہ: میں پرورش پا کر نکلے جن سے ایک عالم فیض یاب ہوا، ۱۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور اکیاسی برس کی عمر پا کر ۱۲۸۵ھ میں وفات پائی، مولانا فضل امام خیر آبادی سے فنون حکمیہ اور شاہ عبدالعزیز علیہ الرحمہ اور ان کے بھائیوں سے علوم دینیہ اور معارف ادبیہ کی تعلیم پائی تھی، عربی اور فارسی کلام کے لکھنے کا یہ موقع نہیں، اردو کے دو چار شعر نقل کرتا ہوں ؎

میں اور ذوق بادہ کشی لے گئیں مجھے ۔۔۔ یہ کم نگاہیاں تری بزم شباب میں

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں ۔۔۔ اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
اچھا ہوا نکل گئی آہ حزیں کے ساتھ ۔۔۔ اک قہر تھی بلا تھی قیامت تھی جاں نہیں

کامل اس فرقۂ زہاد میں اٹھا نہ کوئی ۔۔۔ کچھ ہوئے تو یہی رندان قدح خوار ہوئے

مکھڑا وہ غضب زلف سیہ فام یہ کافر ۔۔۔ کیا خاک جیے کوئی شب ایسی سحر ایسی

انتخابی کلام کو فراہم کیا ہے، اس کو دیکھ کر ان کی سخن فہمی کی بیساختہ داد دینی پڑتی ہے۔

نواب دیندار اور مذہبی آدمی تھے، جوانی میں مولانا شاہ اسحاق محدثؒ کے ہاتھ پر بیعت کی تھی، وہ ہندوستان سے ہجرت فرما گئے، صحبت میسر نہیں ہوئی پھر جب خدا کی توفیق نے رہبری کی، حضرت شاہ عبدالغنی محدثؒ سے تجدید بیعت کر کے حلقۂ مشائخ میں داخل ہو گئے، اس لحاظ سے وہ دنیا خورد و عقبیٰ برد کے صحیح مصداق تھے۔

تریسٹھ برس کی عمر پائی اور ۱۲۸۶ھ میں دنیا سے انتقال کیا۔

ہائے اس برق جہاں سوز پہ آنا دل کا ... سمجھے جو گرمی ہنگامہ جلانا دل کا

ایک نالہ میں ستم ہائے فلک سے چھوٹے ... جس کو دشوار سمجھتے تھے وہ آساں نکلا

کب طالع خفتہ نے دیا خواب میں آنے ... وعدہ بھی کیا وہ کہ وفا ہو نہیں سکتا

نہ دیا ہائے مجھے لذت آزار نے چین ... دل ہوا رنج سے خالی بھی تو جی بھر آیا

یاس سے آنکھ بھی جھپکی تو توقع سے کھلی ... صبح تک وعدۂ دیدار نے سونے نہ دیا

کیا جانے گزری غیر پہ کیا اس کی بزم میں ... آئے وہ اس طرح سے مجھے پیار آ گیا

کس لیے لطف کی باتیں ہیں پھر ... کیا کوئی اور ستم یاد آیا

کہتا تھا وقت نزع کے ہر اک سے شیفتہ ... دینا کسی کو دل تو وفادار دیکھ کر

جو بات میکدہ میں ہے اک اک زبان پر ... افسوس مدرسہ میں ہے بالکل نہاں ہنوز

اے تاب برق تھوڑی سی تکلیف اور بھی ... کچھ رہ گئے ہیں خار و خس آشیاں ہنوز

عبث ہے شیفتہ ہر اک سے پوچھتے پھرنا ملے گا بادہ کشوں سے نشان بادہ فروش

کہتے ہیں بے وفا مجھے میں نے جو یہ کہا مرتے رہیں گے تم ہی پہ جیتے ہیں جب تلک
یا عجز بے ریا ہے نہ واں ناز دلفریب شکرِ بجا رہا گلۂ بے سبب تلک

ہیں جاں بلب کسی کی اشارت کی دیر ہے دیکھے ہے اس نگہ کو قضا اور قضا کو ہم

طوفان نوح لانے سے اے چشم فائدہ دو اشک بھی بہت ہیں اگر کچھ اثر کریں

دشمن نواز یارو فلک بوالہوس پرست کس سے جفائے غیر کا یارب گلہ کروں

کچھ اور بے دلی کے سوا آرزو نہیں اے دل یہ یاد رکھیو کہ ہم ہیں تو تو نہیں

آشفتہ خاطری وہ بلا ہے کہ شیفتہ طاعت میں کچھ مزا ہے نہ لذت گناہ میں

آہ و زاری نارسا شوق اسیری بے اثر کون لائے آشیانے تک مرے صیاد کو

ننگ مہمانی دشمن بھی کیا ہم نے قبول شیفتہ لیکن نہ آئے وہ کسی تدبیر سے

ناصح تری زبان ترے بس میں نہ ہو تو پھر انصاف کر کہ دل پہ مرا زور کیا چلے

اے جاں لب پہ آکے ٹھہرنے سے فائدہ رہنا ہوا تو رہ گئے چلنا ہوا چلے

ایسی رغبت سے کرے قتل گماں کا ہے کو تھا شیفتہ اس کو تو لو تم سے محبت نکلی

اے عدو کس لیے نازاں ہے سمجھ تو آخر جس سے ہم خوار ہوئے ہیں یہ وہی عزت ہے

میں کیا کہوں کہ رات مجھے کس کے گھر ملے　　وہ شیفتہ کہ دھوم تھی حضرت کے زہد کی

کم بخت گالیاں بھی نہیں تیرے واسطے　　جس لب کے بوسے غیر لے اس لب کی شیفتہ

قیامت آنے میں شب درمیاں ہے　　سحر ان کو ارادہ ہے سفر کا

☆☆☆

کرامت علی شہیدی

"در عروض دستگاہے معقول دارد و در حساب مکانتے مقبول، در بلاد
پنجاب و گجرات بیشتر بسر بردہ، گاہ گاہ بہ دہلی وارد شدہ، وہنگام در دہلی
باراقم آثم بارہا برخوردہ، مرد بے تکلف و وارستہ مزاج و وسیع المشرب است
آزادانہ می زید۔" (اہ گلشن بیخار)

کرامت علی نام، شہیدی تخلص، عبدالرسول خاں کے بیٹے تھے، بانس بریلی وطن تھا مگر لکھنؤ میں نشو و نما ہوا، مصحفی سے مشق سخن کی، جب ان کا انتقال ہو گیا تو شاہ نصیر کو دکھانے لگے، شعر و سخن میں ایسی قدرت کامل بہم پہنچائی تھی کہ زمین کیسی ہی سنگلاخ ہو، ایک طرح میں چوغزلہ اور پنج غزلہ لکھتے تھے اور کوئی غزل پچیس اور پینتیس شعر سے کم کی نہ ہوتی۔

یار باش، زندہ دل، بذلہ سنج، مرنجاں مرنج اور وارستہ مزاج آدمی تھے، والد مرحوم فرماتے تھے کہ شیخ عابد علی بلندوزی ایک سیر چشم، مہمان نواز آدمی، ضلع فتح پور ہنسوہ کے رہنے والے، اودے پور میں کسی بڑے عہدہ پر مامور تھے، ان کا اور شہیدی کا بہت دنوں تک ساتھ رہا ہے، ابتدائے ملازمت میں وہ اور شہیدی نیمچہ کی چھاؤنی میں سرکار انگریزی کے ملازم ہوئے تھے۔

شہیدی کا تعلق کمسریٹ سے تھا، بہت سارو پیہ یار باشی میں انہوں نے اڑا دیا، جب حساب طلب ہوا تھا، ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، مگر تھے طبیعت دار، جس مکان میں دفتر تھا اسی کے ایک حصے میں رہتے بھی تھے، رات کو اس میں آگ لگا دی، ان کے سامان کے

ساتھ دفتر بھی جل کر خاک سیاہ ہو گیا، یہ کچھ دنوں کے لیے دیوانے بن گئے اور خدا خدا کر کے جان بچی۔

سرکاری ملازمت کے جاتے رہنے پر کوئی تعلق گوارا نہیں کیا، سیر و سیاحت میں زندگی بسر کرتے رہے، بھوپال، دلی، اجمیر، پنجاب اور گجرات میں اکثر دورہ ہوتا رہتا تھا اور ان مقامات میں کثرت سے دوست احباب پیدا کر لیے تھے۔

۱۲۵۵ھ میں حج و زیارت کے ارادہ سے گھر سے نکلے، اسی سال فریضہ حج ادا کر کے مدینہ منورہ جا رہے تھے کہ راستہ میں بیمار پڑے، ۴ صفر ۱۲۵۶ھ کو جس وقت تمام منزلیں طے کرتے ہوئے ایسے مقام پر پہنچے، یہاں سے روضۂ مطہرہ نظر آتا تھا، ایک حسرت ناک نظر اس پر ڈالی اور طائر روح قفس عنصری سے پرواز کر گیا۔

ان کے مشہور قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ طلب ہیں جن میں انہوں نے اسی کی تمنا کی ہے، کیسے خوش نصیب تھے کہ جن کی آرزو ایک حد تک پوری ہو گئی ؎

ہوئی ہے ہمت عالی مری معراج کی طالب — میسر ہو طواف اے کاش مجکو تیری مرقد کا
کبھی نزدیک جا کر آستانہ پر ملوں آنکھیں — کبھی گر دور بیٹھوں میں کروں نظارہ گنبد کا
فراغ دل سے گر واں زندگی کا کوئی دم گزرے — حسد ہو خضرؑ و عیسیٰؑ کو مرے عیش مخلد کا
مدینہ کی زمیں کے گر نہ لائق ہو مرا لاشہ — کسی صحرا میں واں کے طعمہ ہوں میں دام اور دد کا
تمنا ہے درختوں پر ترے روضہ کے جا بیٹھے — قفس جس وقت ٹوٹے طائر روح مقید کا

غزلوں کے انتخابی شعر ملاحظہ ہوں۔

قدر سب چاہنے والوں کی ترے دیکھ چکے — خوار رہتا ہے پرانا تو پشیمان نیا

عام ہیں اس کے تو الطاف شہیدی سب پر — تجھ سے کیا ضد تھی اگر تو کسی قابل ہوتا

وعدۂ شام پہ کی ہم نے عبث جاگ کے صبح — وہ اسی وقت نہ آتے اگر آنا ہوتا

شہیدی حشر کے دن بھی ہمارا ہو چکا اٹھنا   یہی عالم رہا بعد فنا گر ناتوانی کا

فضائے باغ سے ہے گوشہ قفس خوشتر   گر اپنے دل میں نہ ہو دغدغہ رہائی کا

ہو چلا خنجر بیداد کا بسمل ٹھنڈا   لے ہوا اب تو کلیجہ ترا قاتل ٹھنڈا

میں تو سمجھاؤں ہزار اس کو شہیدی لیکن   میرے سمجھانے سے اب یہ دل شیدا سمجھا

اغیار کا منہ تھا مجھے محفل سے اٹھاتے   سچ یہ ہے تری رنجش بیجا نے اٹھایا

بیمار محبت کو اب اللہ شفا دے   سنتے ہیں کہ ہاتھ اس سے مسیحا نے اٹھایا

اندوہ دائمی میں کٹی کس خوشی سے عمر   گر مجکو غم نہ ہو طرب گاہ گاہ کا

کر چکے نیم نگہ پر مرے دل کا سودا   نہ خریدو یہ ابھی اور بھی ارزاں ہوگا

سیکھ لے ہم سے کوئی ضبط جنوں کے انداز   برسوں پابند رہے پر نہ ہلائی زنجیر

بے قراری دل کی میں کیوں کر بتاؤں یار کو   سینہ پر جب ہاتھ رکھتا ہے ٹھہر جاتا ہے دل

ہر وضع کے انساں سے ملاقات ہے ان کو   سب خلق مدارات کے قابل ہے مگر ہم

دوستو گر ہم سے کج خلقی ہو رکھنا تم معاف   فرقت جاناں میں اپنے جی سے ہیں بیزار ہم

رحم آتا ہے مجھے اس نوجوانی پر تری   اے شہیدی رات دن کا رنج و غم اچھا نہیں

اے روز قیامت ادب اس کا ہے تجھے فرض   ہے تجھ سے بڑی میری شب تار کئی دن

ناکامی جاوید کی ہم مانتے منت افسوس شہیدی تری تربت نہیں ملتی

ایام مصیبت کے تو کاٹے نہیں کٹتے دن عیش کے گھڑیوں میں گزر جاتے ہیں کیسے

وہ وقت تو آنے دے بتادیں گے شہیدی بن آئے کسی شخص پہ مر جاتے ہیں کیسے

سب طالب اپنے اپنے ہوں مطلوب سے بہم ہیں نامراد ایک ہمیں تیرے واسطے

ان کے دیوانوں کو بھی کیا ضبط ہے اوقات کا دو پہر ہنستے رہے گر دو پہر رویا کیے
دل کے جانے کا شہیدی واقعہ ایسا نہیں کچھ نہ روئے آہ اگر ہم عمر بھر رویا کیے

☆☆☆

حصہ سوم

طبقہ متاخرین

دوراول

دلی کی تباہی کے بعد ارباب فضل وکمال کا کوئی ملجا و ماویٰ نہیں رہا، کچھ لوگ مرشدآباد وعظیم آباد چلے گئے، کچھ حیدرآباد گئے مگر یہ مقامات دلی سے اتنے دور تھے اور سفر میں اتنی دشواریاں تھیں کہ ہر ایک کو ان مقاموں پر جانے کی ہمت نہیں پڑتی تھی، خصوصا ایسی حالت میں کہ مرہٹوں کی ایک نئی طاقت ہندوستان کی بادشاہت حاصل کرنے کی زورآزمائی کررہی تھی، کبھی بجلی بن کر دکن پر کوندتی، کبھی بنگالہ میں آکر گرجتی تھی، اس زمانہ میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جوراتوں کو میٹھی نیند سوسکتا ہو۔

دلی سے قریب تر فرخ آباد اور فیض آباد دو مقام ایسے تھے جہاں ان بدنصیب اور خانماں آوارہ لوگوں کی تھوڑی بہت قدردانی ہوتی تھی، فرخ آباد کی ریاست تباہ ہوئی اور فیض آباد سے نواب آصف الدولہ نے دارالسلطنت لکھنؤ کو منتقل کیا تو صرف لکھنؤ ان کا ملجا وماویٰ رہ گیا۔

ایک خاص سبب اور بھی فیض آباد پر لکھنؤ کی ترجیح کا یہ پیدا ہوا کہ نواب موتمن الدولہ محمد اسحاق خاں شوستری کی بیٹی امۃ الزہرا بیگم نواب شجاع الدولہ کو بیاہی گئیں، پھر ان کے بیٹے نواب آصف الدولہ کی شادی نواب خانخاناں کی بیٹی سے ہوئی، ان بیگموں کے اعزہ اور متوسلین فیض آباد آ بسے اور چند دنوں کے بعد لکھنؤ میں آکر بودوباش اختیار کی۔

امۃ الزہرا بیگم محمد شاہ بادشاہ دلی کی منہ بولی بیٹی تھیں، نہایت سیر چشم، فیاض اور

مہمان نواز، انہوں نے آدھی دلی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔

اتفاق دیکھو کہ پہلے میرزا جواں بخت شاہ عالم بادشاہ کے ولی عہد لکھنؤ آئے، یہ کچھ دنوں رہ کر بنارس چلے گئے، پھر ان کے بھائی مرزا سلیمان شکوہ آئے اور وہ یہیں رہ پڑے، ان کی وجہ سے بھی کچھ دلی کے بھولے بھٹکے آ کر جمع ہو گئے، شاہزادہ کو بھی اپنے خانہ زادوں پر لطف و کرم تھا، جہاں تک ہو سکتا وہ ان لوگوں کو سمیٹے رہتے تھے۔

علامہ سراج الدین علی خاں آرزو اور میر غلام حسین ضاحک وغیرہ بہت پہلے فیض آباد آ کر بہو بیگم کے لائق بھائی نواب مرزا علی خاں اور نواب سالار جنگ کے سایۂ عاطفت میں زندگی بسر کر رہے تھے، لکھنؤ کے دار السلطنت ہونے پر میر ضاحک کے بیٹے میر حسن اور پوتے میر مستحسن خلیق لکھنؤ آ بسے۔

میر سوز اور مرزا رفیع فرخ آباد میں نواب مہربان خاں رند کی مہربانی سے زندگی بسر کر رہے تھے، جب وہاں کا کھیل بگڑا تو فیض آباد پھر لکھنؤ آ گئے۔

میر محمد تقی میر کی وضع داری نے مدتوں ان کو دلی سے نکلنے نہ دیا، آخر کب تک، وہ بھی گھبرا کر لکھنؤ آ گئے، پھر شیخ غلام ہمدانی مصحفی، میر ولی اللہ محب، میر غلام حسین برشتہ، میر انشاء اللہ خاں اور جرأت بھی آ گئے۔

مرزا قتیل اور قاضی محمد صادق اختر نے بھی لکھنؤ میں مستقل سکونت اختیار کر لی، غرض کہ لکھنؤ میں دلی کی سبھا پوری کی پوری اٹھ کر آ گئی اور گھر گھر شعر و شاعری کا چرچا ہونے لگا۔

یہ وہ زمانہ ہے کہ فرمانروایان اودھ "نواب وزیر" کہلاتے تھے اور دلی کے برائے نام بادشاہ کی طرف سے خطاب اور خلعت وزارت ان کے لیے آیا کرتا تھا، سرکار کمپنی نے ایک خاص اثر کی بنا پر ان کو شہ دی اور نواب غازی الدین حیدر نے تاج شاہی سر پر رکھ کر دلی کی برائے نام وزارت سے سبکدوشی حاصل کی۔

نئے بادشاہ کی نئی نئی امنگیں، دولت کی فراوانی، نواب سعادت علی خاں کا جمع کیا ہوا

سترہ کروڑ روپیہ کا خزانہ، ہر طرف سے عیش و عشرت کی موجیں آنے لگیں اور گھر گھر شادیانے بجنے لگے، بقول شاعر ؎

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو ہر اک گھر خانۂ شادی ہے ہر کوچہ ہے عشرت کا

وضع قطع، لباس، خورد و نوش اور ماند و بود غرض کہ زندگی کے ہر شعبہ میں تراش خراش نے نئے نئے انداز پیدا کر دیے، گنبد نما دستار کی جگہ ہلکی اور نکیلی ٹوپی، جامہ و نیمہ کی جگہ چست شلوکہ اور انگرکھا، شلوار کی جگہ کلی دار غرارہ یا چوڑی دار پائجامہ، سلیم شاہی کی جگہ انی دار کفش یا بے نوک کا لکھنوا جوتا، اسی طرح ہر چیز کو قیاس کرو، ہر چیز نئی، زمین نئی، آسمان نیا ہو گیا۔

کہن سال اور کہنہ مشق شاعر جن کی عمریں دلی کی آب و ہوا میں بسر ہوئی تھیں، ایک ایک کر کے رخصت ہوتے گئے، نوجوانوں نے میدان خالی پایا تو ان کی جوانی کی امنگیں ابھر آئیں، زبان کی تراش خراش کر کے بدمزہ اور ناگوار الفاظ جو ان کے زمانہ میں عموماً مروج تھے، ترک کر دیے، مثلاً: آئے ہے، جائے ہے، کھوئے ہے، ٹک، نت، یا جمع مؤنث کے فعلوں کو الف نون کے ساتھ آئیاں، جائیاں، اسی طرح موصوف جمع ہو اور صفت لفظ ہندی تو موصوف کی مناسبت سے صفت کو جمع بولنا، جیسے بھاریاں، ان سب کو خلاف فصاحت قرار دیا جس کو بالآخر دلی والوں کو بھی ماننا پڑا اور اہل لکھنؤ دلی والوں کی تقلید سے اسی طرح آزاد ہو گئے جیسے نواب وزیر نے دلی کی بادشاہی کے خطاب و خلعت وزارت سے آزادی حاصل کر لی تھی۔

مگر افسوس ہے کہ ان بزرگوں نے زبان کی تراش و خراش پر قناعت نہیں کی، اپنی بلند پروازی کے زور میں قوت تخیل و حسن تعلیل میں اعتدال نہ رکھنے سے ایسے اوج پر پہنچے جہاں آفتاب تارا بن گیا اور دل پر اثر کرنے کی جگہ زبانوں پر صرف واہ واہ رہ گئی۔

چونکہ اسی مضمون کو مقدمہ میں بیان کر چکا ہوں، لہٰذا اس جگہ اس سے زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔

☆☆☆

شیخ امام بخش (۱) ناسخ

''والا مایہ، عالی پایہ، بلند اندیشہ، نازک خیال است و در تلاش مضمون
تازہ و معنی سیراب بے مثل و مثال از اقسام سخنوری، غزل سرائی مائل و غیر از
رباعیات صنفے آخر از و دیدہ نہ شد۔'' (اھ گلشن بیخار)

شیخ امام بخش نام، ناسخ تخلص، شیخ خدا بخش خیمہ دوز کے بیٹے تھے اور بعض اشخاص کہتے ہیں کہ اس نے متبنیٰ کیا تھا، بچپن فیض آباد میں بسر کیا، اس زمانہ کے رواج کے مطابق ورزش پر طبیعت مائل ہوئی، ہزاروں ڈنڈ کرتے اور سیکڑوں ہاتھ جوڑیوں کے ہلاتے، ورزش سے بدن کسرتی اور پھرتیلا ہو گیا تھا۔

نواب محمد تقی فیض آباد کے ایک امیر کو ایسے بانکوں ترچھوں کے رکھنے کا شوق تھا، ان کو نوکر رکھ کر اپنے ساتھ لکھنؤ لائے، سیاہ فام، مضبوط اور گٹھا ہوا بدن، سر منڈا ہوا، داڑھی خشخشی، بانکپن کے ساتھ۔ جاڑوں میں شب کو نواب صاحب کے مکان کے پنبئی پردے اوڑھتے اور دن کو باریک ململ کے کپڑے پہن کر ادھر ادھر اکڑتے پھرتے۔

بڑے بوڑھے کہتے ہیں کہ لکھنؤ میں میر کاظم علی ایک رئیس تھے، انہوں نے ان کو اپنا فرزند بنا لیا تھا، وہ مرے تو اچھی خاصی دولت وصیت نامہ کے رو سے ان کو مل گئی، اب

---

(۱) ناسخ و آتش باعتبار زمانہ کے ذوق و غالب کے معاصر ہیں، اس لیے ان کو طبقہ متوسطین کے دور سوم میں جگہ ملنی چاہیے، مگر مصنف مرحوم نے ان کی شاعری کی عمر اور نشو و نما کے لحاظ سے ان کو متاخرین کے طبقہ اول میں شمار کیا ہے۔ (سید سلیمان ندوی)

آسودہ حال ہو گئے اور ٹکسال میں ایک مکان لے کر بود و باش اختیار کی۔

حسن اتفاق سے مکان کے سامنے گلی بیچ مولوی وارث علی کا کمرہ تھا، وہ گھر بیٹھے طلبہ کو مفت درس دیا کرتے تھے، ان کو بھی شوق ہوا، جو کتاب وہ پڑھاتے اور ان کے مناسب حال ہوتی لے کر بیٹھ جاتے اور روز کے روز سبق یاد کر لیتے، اسی طرح رفتہ رفتہ اچھی خاصی استعداد ہو گئی جو فن شاعری کی ضروریات پورا کرنے کو کافی تھی۔

شاعری میں کسی کے شاگرد نہ تھے مگر ابتدا سے شعر کا عشق تھا جو غالبًا نواب محمد تقی کی ملازمت میں پیدا ہوا ہوگا، جو خود شاعر تھے اور ان کا گھر شاعروں کا ملجا و ماویٰ تھا، پھر لکھنؤ آئے تو یہاں جرأت کی گرم بازاری اور مصحفی وانشا کے ہنگامے آنکھوں سے دیکھے، وہ شوق یہاں آ کر چمک گیا، چپکے چپکے شعر کہتے اور کسی پر ظاہر نہ کرتے تھے، بعضوں کا خیال ہے کہ ابتدا میں مصحفی سے اصلاح بھی لی تھی، کوئی کہتا ہے کہ مصحفی کے شاگردوں میں محمد عیسیٰ تنہا ایک شخص ہیں، ان سے تنہائی میں مشورہ کرتے تھے (۱) جب اطمینان ہوا تو مشاعروں میں غزلیں پڑھنے لگے۔

اس زمانہ میں مرزا حاجی (۲) ایک امیر زادے تھے جو خود بھی ذی استعداد تھے اور ان کی سرکار میں مرزا قتیل، قاضی محمد صادق خاں اختر (۳) اور بہت سے اہل کمال جمع

(۱) حسرت موہانی نے اردوئے معلیٰ میں مصحفی کے دیوان ششم کے دیباچہ سے ایک فقرہ نقل کیا ہے، جس سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے، مصحفی نے لکھا ہے کہ حصہ نعمت الوان ایں خوان بہ شیخ ناسخ کہ یکے از دوستان محمد عیسیٰ تنہا است، بفقیر ہم رسوخی زنتہ دل دارد مقسوم گشت۔ (۲) مرزا حاجی لکھنؤ کے بڑے عالی خاندان امیر زادے تھے، نام فخر الدین احمد تھا، والد کا نام مرزا فخر الدین احمد مگر مرزا جعفر کے نام سے مشہور تھے، نواب حسن رضا خاں ان کے ماموں تھے، مرزا جعفر نے درسی کتابیں ملا مبین فرنگی محلی سے، دینیات مولوی سید دلدار علی مجتہد عصر سے اور فنون ریاضیہ خاں علامہ تفضل حسین خاں سے پڑھی تھیں اور خان علامہ کے عہد نیابت میں بخشی گری کے عہدۂ جلیلہ پر سرفراز ہوئے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

رہتے تھے، شیخ امام بخش ناسخ کو خوش قسمتی سے مرزا کے دربار میں رسائی ہوگئی، ان کی صحبت میں ان کو بھی زبان کی تراش خراش اور تحقیق وتدقیق کا چسکا پڑا اور ان کے دل بڑھانے سے کلام نے روز بروز رنگ پکڑنا شروع کیا، رفتہ رفتہ دل میں امنگ اور طبیعت میں جوش بڑھ گیا۔

سابقہ حاشیہ: مرزا حاجی اسی نامور باپ کے بیٹے اور خاندانی حیثیت سے مرزا زین الدین عالمگیری کی اولاد میں تھے، علوم وفنون میں صاحب استعداد، مذاق سخن سے آشنا اور مسٹر جان بیلی رزیڈنٹ لکھنؤ کے نفس ناطقہ تھے، نواب غازی الدین حیدر کے زمانہ نوابی میں ان کا رسوخ بہت بڑھ گیا تھا، پانچ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ تھی اور نواب وزیر کو بجز اوقات استراحت کے ان کی مفارقت ایک گھڑی کو گوارا نہ تھی، عام دستور کے موافق ان کا گھر اس زمانہ میں قبلۂ حاجات بنا ہوا تھا، مرزا قتیل، قاضی محمد صادق خاں اختر اور دیگر اہل فضل و کمال ان کی مصاحبت میں رہتے تھے، شعر وسخن کا مشغلہ، زبان کی تراش خراش اور تحقیقات علمی کا ہنگامہ گرم رہتا تھا، اسی صحبت میں شیخ امام بخش ناسخ کا نشو ونما ہوا۔

چند روز کے بعد نواب معتمد الدولہ کا زمانہ موافق ہوا، انہوں نے مرزا حاجی کو گھر میں بٹھا دیا، ایک مدت تک نظر بند رہے، ان کے تمام اعزہ جو سلطان پور، رائے بریلی اور سلون کی نظامتوں پر مامور تھے، محاسبہ کے شکنجے میں کسے گئے، مرزا حاجی کا لاکھوں روپیہ برباد ہوا، آخر کار ۱۲۲۸ھ میں جلاوطن کیے گئے اور ان کی املاک نواب نے محسن الدولہ بہادر کو دلا دی تاکہ پھر واپس آئیں تو ان سے نہ لے سکیں، یہ کچھ دنوں کانپور میں رہے، اس کے بعد نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی علی خاں نے فرخ آباد بلا لیا، علاوہ مصارف معمولی کے دو سو روپیہ ماہوار ان کی جیب خرچ کو مقرر کر دیے، جب حکیم مہدی وزیر ہو کر لکھنؤ آئے تو ان کو اپنے ساتھ لائے، املاک پدری تو مل گئی مگر جس قدر املاک نواب محسن الدولہ کے پاس تھی وہ نہ مل سکی۔

حکیم مہدی کی معزولی کے بعد بھی یہ لکھنؤ میں رہے مگر نواب روشن الدولہ کی وزارت میں باوجودیکہ وہ ان کے عزیز تھے مگر کمبوہوں کی سازش سے پھر ان کو لکھنؤ چھوڑنا پڑا، صرف دو ہزار روپیہ سالانہ ان کو دربار شاہی سے ملتا رہا، یہ کانپور میں کسی نہ کسی طرح گزر کرتے رہے، واجد علی شاہ کے زمانہ میں نواب علی نقی خاں کی مہربانی سے جو ان کے رشتہ دار تھے، دوبارہ لکھنؤ دیکھنا نصیب ہوا مگر چند روز (باقی اگلے صفحہ پر)

اس پر خدا ساز بات یہ ہوئی کہ مرزا حاجی کی ہم نشینی نے ان کی شخصیت بڑھادی، اہل فہم اور اہل کمال ان کی طرف کھنچ کھنچ کر آنے اور اپنی مطلب براری کا ذریعہ سمجھنے لگے، غرض کہ مرزا حاجی کی مہربانی سے ان کی شاعری خوب چمکی اور ان کو لکھنؤ میں رشد و فروغ قبل از وقت حاصل ہو گیا۔

سابقہ حاشیہ: کے بعد ۱۲۷۵ھ میں دنیا سے گزر گئے۔ (۳) قاضی محمد صادق خاں ہوگلی کے رہنے والے، مرزا قتیل کے شاگرد اور بڑے بامذاق شاعر تھے، کچھ دنوں غازی الدین حیدر بادشاہ لکھنؤ کے زمانے میں خوش حالی سے زندگی بسر کی اور محامد حیدریہ ایک کتاب غازی الدین حیدر کی تعریف میں لکھی، اخیر زمانہ میں واجد علی شاہ کے یہاں رسائی ہو گئی تھی، اسی سے لکھنؤ کو اپنا وطن بنالیا تھا اور غدر ۵۷ء کے بعد یہیں پیوند خاک ہو رہے، تصنیفات میں "لوامع النور فی وجوہ النشور" انشا پردازی میں، دو دیوان فارسی اور اردو کے ایک تذکرۂ آفتاب عالم تاب بہت ضخیم و جسیم جس میں چار ہزار دو سو چونسٹھ فارسی شعرا کا ذکر کیا ہے، علاوہ ان کے نور الانشا، گنج بے رنج وغیرہ چند کتابیں اور بھی ہیں، اردو کلام کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

کل شیخ بن کے مجتہد عصر ساقیا — دکھلا کے باغ سبز ثواب و عذاب کا
کہنے لگا زراہ تبختر مجھے یہ طنز — معلوم ہوگا حشر میں پینا شراب کا
میں نے کہا کہ میں بھی ہوں یہ خوب جانتا — پر کیا کروں کہ ہے ابھی عالم شباب کا
گستاخی ہو معاف تو اک عرض میں کروں — لیکن نہ کیجیے مجھے مورد عتاب کا
مے ہو اور کنج باغ ہو ساقی ہو ماہ وش — اور کوئی بھی محل نہ ہو باعث حجاب کا
گردن میں ہاتھ ڈال کے وہ شوخ بے حجاب — یہ ریش جس پہ جلوہ ہے رنگ خضاب کا
کھینچ اس کو اور اپنے ملا کر وہ منہ سے منہ — دے ذائقہ زباں کو دہن کے لعاب کا
منت سے یہ کہے کہ ہمارا لہو پیے — گر پی نہ جائے جلد یہ پیالہ شراب کا
اس وقت میں سلام کروں قبلہ آپ کو — گر کچھ بھی خوف کیجیے روز حساب کا
اور امتحاں بغیر تو یہ آپ کا غلام — قائل نہیں ہے قبلہ کسی شیخ و شاب کا

چندروز کے بعد نواب معتمد الدولہ (۱) کا دوبارہ عروج ہوا اور مرزا حاجی نظر بند ہوئے، شیخ صاحب چوں کہ مرزا کے محرم راز اور مقرب خاص تھے، چھپ چھپ کر ان سے ملتے رہے، نواب کو خبر ہوئی تو ان کو بھی گھر میں بٹھا دیا۔

---

(۱) آغا میر کا نام سید محمد خطاب "معتمد الدولہ مختار الملک ضیغم جنگ" تھا، کشمیر کے رہنے والے غازی الدین حیدر کی نواب زادگی میں ان کے معتمد خاص تھے، جب وہ نواب وزیر ہوئے تو یہ نائب وہ بادشاہ ہوئے تو یہ وزیر قرار پائے، غازی الدین حیدر نے قسم کھائی تھی کہ وہ مسکرات کے قریب نہ جائیں گے، چندروز ہوش گوش سے کام کرتے رہے، یہ آغا میر کو کیوں کر گوارا ہوسکتا تھا، انہوں نے عرض کیا کہ پیرومرشد نے حضرت عباسؓ کی قسم کھائی ہے اور غلام بنی فاطمہ ہے، اس کا مظلمہ غلام کے ذمہ ہے ع

تو مشق ناز کر خون دو عالم میری گردن پر

پھر تو وہ ایسے بدمست ہوئے کہ جس بدنصیب کو نواب نے داخل اموات کردیا، اس کو اگر بادشاہ نے کہیں راہ میں دیکھ کر پہچانا اور نواب سے کہا کہ یہ تو جیتا ہے، عرض کرتے اس کو غلام چشم بشری سے نہیں دیکھ سکتا، پیرومرشد کی چشم مبارک البتہ عالم ارواح کو دیکھ سکتی ہے، حاضرین بھی نواب کے خوف سے یہی عرض کرتے، اس طرح رفتہ رفتہ بادشاہ اکثر مصاحبین کے سامنے فرماتے کہ خداوندا میں کسی طرح ظلم کا روادار نہیں، یہ شخص بنی فاطمہ ہے، اگر کوئی بات عدل وانصاف کے خلاف سرزد ہو تو اس کا یہی ذمہ دار ہے، مگر حالت یہ تھی کہ ہر شخص کی عافیت تنگ تھی، جعل وفریب کا بازار گرم تھا، ملازمین ومتوسلین کی تنخواہیں کئی سال کی چڑھی ہوئی، جس طرح سے بن پڑتا وہ لوٹ مار کر کے پیٹ پالتے تھے، سوداگروں سے مال واسباب خرید کیا جاتا تھا اور برسوں قیمت نہیں ملتی تھی، رزیڈنٹ تک کوئی پہنچ گیا تو قیمت ملی ورنہ جان کی بھی خیر نہیں، اپنے لیے محل سرائیں بنوائیں تو سیکڑوں کی خانہ ویرانی ہوگئی اور ایک کرور سے کم عمارتوں پر خرچ نہیں کیا، مگر زندگی بھر اس میں رہنا نصیب نہیں ہوا، چندروز کے بعد نکالے گئے اور ہمارے بچپن میں وہ عالیشان عمارتیں کھد کر اس کی اینٹیں لکھنؤ سے سیتاپور تک ریلوے لائن میں بچھادی گئیں، عالیشان سرائے ان کی تعمیر کردہ رہ گئی تھی، وہ اب جا کر کھدی اور وہاں پارک بن گیا ہے، نواب کی سخاوت و (باقی اگلے صفحہ پر)

ایک دن ان کے بلانے کو چوبدار آیا، سمجھے کہ رنگ بے رنگ ہے، مبادا بے آبروئی ہو، چوبدار سے کہا تم ٹھہرو میں سواری کی فکر کرلوں، اس نے کہا کہ میں کوتوال سے کہہ کر سواری لاتا ہوں، وہ ادھر گیا اور یہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے، جہاں جاتے ہیں نواب کے ڈر سے کوئی

سابقہ حاشیہ: فیاضی کے ایسے ایسے قصے مشہور ہیں کہ آج ان کو مشکل سے لوگ باور کریں گے، ہمارے بچپن تک ایسے صدہا لوگ موجود تھے جنہوں نے ان سے فائدہ اٹھایا ہے اور جو معمولی حیثیت میں لکھنؤ آئے دوسرے دن ان کے دروازے پر ہاتھی جھومنے لگے، خدا جانے کہاں تک سچ ہے، سید محمد میر زائر نے قیصر التواریخ میں لکھا ہے کہ میر بندہ علی ایک عالی خاندان مفلس ہو کر لکھنؤ آئے، مسخرگی پیشہ کی بدولت نواب کے مصاحب ہوگئے، وہ کہتے تھے کہ نواب کے ہاتھوں گیارہ سال میں چودہ لاکھ روپیہ میں نے پایا، محمد خاں ان کا خدمت گار تھا، اس کے پاس چالیس ہزار روپیہ جیب خاص کا تھا، اس نے ایک دن عرض کیا کہ ایک چکلہ دار قید ہے، کہتا ہے کہ قید سے نجات پاؤں تو دس ہزار روپیہ دوں گا، فرمایا جو تمہارے پاس ہے پہلے اسے لے لو پھر اس سے لینا۔

کشمیر سے اس زمانہ میں نادر اور تحفہ مال آیا کرتا تھا، ایک ایک سہ گزہ رومال پانچ پانچ ہزار تک کو نواب نے لے لیا تھا، ایک دن دوشالہ اوڑھے ہوئے اصلاح بنوا رہے تھے، خاص تراش دوشالہ کو دیکھ رہا تھا، پوچھا کیا دیکھتا ہے، عرض کیا غلام کو حضور کی بدولت دوشالے بہت نصیب ہوئے مگر یہ ایسا ہے کہ آدمی اسے دیکھا کرے، اتار کر اسی کو دے دیا۔

ایک مرتبہ سوار ہوئے، گھوڑا تیزی کرنے لگا، دوشالہ سنبھل نہ سکا، چھوٹے خاں چابک سوار کھڑا تھا، اتار کر اس کی طرف پھینکا، اس نے توشہ خانہ میں داخل کر دیا، دوسرے دن وہی دوشالہ سامنے آیا تو فرمایا کہ میں نے اسے دیا تھا یا رکھنے کو کہا تھا۔

نواب سعادت علی خاں نے خون جگر کھا کر سترہ کروڑ روپیہ جمع کیا تھا، اس میں سے ایک کرور روپیہ سرکار انگریزی کو بطور قرض کے دلوا دیا اور اس کے پانچ فیصدی منافع سے صاحبات محل کی تنخواہوں کا وثیقہ کرایا گیا، بیگمات کے سلسلہ میں بیس ہزار ماہوار نواب کے، دو ہزار ان کی بیوی کے، (باقی اگلے صفحہ پر)

پناہ نہیں دیتا، اتفاق سے میر اسد علی خاں مل گئے انہوں نے ان کو اپنے گھر میں پناہ دی، وہ نواب کے رشتہ دار تھے، کہہ سن کر صفائی کرادی۔

نواب مرزا کے استیصال کے درپے تھے، مطلب کا آدمی سمجھ کران پر ڈورے ڈالے، یہ بھی ایسے لطیفۂ غیبی کے منتظر رہتے تھے، دنیا کے شرم ولحاظ سے کھل کر آنا جانا پسند نہیں کیا، نواب سے کہا کہ میں فقیر آدمی ہوں مجھے گھر پر پڑا رہنے دیجیے، انہوں نے بھی کچھ سوچ سمجھ کر سو روپے گھر بیٹھے کر دیے، جب کوئی نیا مضمون پیش آتا ان سے کہلا بھیجتے، یہ اپنی شاعری کے زور سے اس کو موزوں کر دیتے تھے۔

بادشاہ بادۂ غفلت سے سرشار تھے، نواب نے خوب ہاتھ پاؤں نکالے، مرزا کو جلاوطن کیا، بادشاہ بیگم کی جائداد ضبط کرادی، مرزا نصیر الدین حیدر کا دربار بند کیا اور یہ فکر ہوئی کہ محسن الدولہ کو اپنے قابو میں کرلیں۔

نواب محسن الدولہ بادشاہ کے نواسے اور بادشاہ بیگم کے چہیتے تھے، ماں کے مرنے کے بعد بادشاہ بیگم نے پرورش کیا تھا اور ایک دم کو بھی اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھیں، مرزا انور علی شہزادے کے آخوں شیخ صاحب کے دوست تھے، ان کو ہموار کرلیا، اتفاق سے میر فضل علی (جو آگے چل کر اعتماد الدولہ ہوں گے) بادشاہ بیگم کی سرکار میں داروغہ تھے،

سابقہ حاشیہ: دو ہزار بڑے بیٹے کے، ایک ہزار بیٹی کے مقرر ہو گئے اور گورنمنٹ انگریزی اس بات کی کفیل ہوئی کہ ان کی ہمیشہ حمایت کرے گی اور ان کی جائداد ضرورت۔ کے وقت اپنی حفاظت میں لے لے گی، بہر حال بادشاہ مذکور کے عہد دولت میں انہوں نے عیش وعشرت سے بسر کی اور بے دریغ روپیہ صرف کیا۔

بادشاہ کے مرنے پر نصیر الدین حیدر بادشاہ ہوئے، انہوں نے ان کو معزول ونظر بند کیا، چندروز کے بعد بحمایت سرکار انگریزی دو کروڑ روپیہ کا نقد وجنس لے کر کانپور چلے گئے، وہاں کوٹھیاں خرید کر کے ایک نیا شہر آباد کیا، جب تک جیتے رہے پچاس ہزار روپئے ماہوار کا صرف رہا، ان کے مرنے پر اولاد وثیقہ کی بدولت امیرانہ ٹھاٹھ سے زندگی بسر کر رہی ہے۔

ان کی جزرسی اور کفایت شعاری کے نواب محسن الدولہ اکثر شاکی رہا کرتے تھے، آخون صاحب کواس سے بہتر اور کیا موقع مل سکتا تھا، اب جب وہ شکایت کرتے، یہ کہتے کہ نانا جان سے عرض کردو، ادھر معتمد الدولہ بادشاہ بیگم کی بے التفاتی کا ذکر کرتے رہتے تھے مگر بادشاہ کو یقین نہ آتا تھا، جب محسن الدولہ کو سکھا پڑھا کر تیار کرلیا تو ایک دن ان سے کہلایا کہ مجھ کو محل میں تکلیف ہوتی ہے میں حضور کے قدموں تلے رہنا چاہتا ہوں، اب بادشاہ کو یقین آگیا، نواب کو حکم دیا کہ انتظام کرو، یہاں کیا دیر تھی، بیلی گارد کے قریب نیلم والی کوٹھی آراستہ کردی، سواری اور تمام لوازمات امارت خاطر خواہ درست کردیے، آخون صاحب داروغہ مقرر ہوئے، شیخ صاحب کے وہ دوست تھے، پھر کیا پوچھنا، مشہور تو یہ ہے کہ محسن الدولہ کی بدولت وہ ہمیشہ کے لیے فارغ البال ہوگئے اور معتمد الدولہ کے دل میں ان کی گنجائش بڑھ گئی۔

پھر تو ان کی شاعری نے خوب زور پکڑا اور ان کے گھر میں لوگوں کا مجمع بڑھنے لگا، خواہ یہ سمجھو کہ شعر وسخن کے قدردان کھنچ کھنچ کر آنے لگے، یا اسی پردے میں نواب معتمد الدولہ کی نظر عنایت کے خواہش مندوں کا جمگھٹا ہونے لگا، بہر حال پہلے مرزا حاجی پھر نواب معتمد الدولہ کی بدولت ان کی شاعری کا ہنگامہ خوب گرم ہوا اور لکھنؤ میں ان کی استادی کے ڈنکے بجنے لگے۔

مگر افسوس ہے کہ اپنے جوڑ توڑ کی بدولت ان کو چین سے گھر میں رہنا نصیب نہیں ہوا، حکیم مہدی (۱) ایک فرزانہ و مدبر اہل کار اس زمانہ میں تھے، معتمد الدولہ نے ان کو

(۱) حکیم مہدی منتظم الدولہ نواب مہدی علی خاں کشمیر کے رہنے والے بڑے مدبر اور زبردست شخصیت کے آدمی تھے، فضل وکمال کے ساتھ خدا نے عقل دوراندیش ان کو عطا کی تھی، ابوالفضل اور سعد اللہ خاں کی ٹکر کے آدمی تھے، خان علامہ تو نرے ملا تھے، باوجودیکہ خوش قسمتی سے وزارت تک پہنچے مگر کوئی کام بن نہیں پڑا، انہوں نے ایسے ایسے کارنمایاں کیے جن کی یادگار اب تک محو نہیں ہوئی۔

ابتدا میں طبابت کی حیثیت سے نمایاں ہوئے، رفتہ رفتہ نواب سعادت علی خاں کے دربار میں ان کا رسوخ بڑھا اور کارگزاری کے جوہر کھلنے لگے اور اول درجہ کے اہل کار بن کر انہوں نے (باقی اگلے صفحہ پر)

اپنا حریف سمجھ کر نکلوا دیا، شیخ صاحب نے معتمد الدولہ کی رضا جوئی کے لیے غزل لکھی جس کا ایک مصرع ہے ۔

کاشو برائے پختن شلجم گریختہ

---

(۱) بڑے بڑے کام کیے، جب نواب کے بعد غازی الدین حیدر مسند نشین ہوئے اور اپنے معتمد خاص آغا کو میر نائب مقرر کیا، اس نے دیکھا کہ یہ چلتے ہوئے آدمی ہیں، کسی نہ کسی طرح مجھے اکھیڑ پھینکیں گے، یہ سوچ کر ان کو محمدی اور خیر آباد کی نظامت پر بٹھا دیا، مطلب یہ تھا کہ نواب وزیر سے بھی دور رہیں گے اور سرکاری مطالبہ کی علت میں ان کو زیر بھی کیا جاسکے گا۔

انہوں نے علاقہ کا اتنا عمدہ انتظام کیا کہ سرکاری مطالبہ سے بہت زیادہ وصول ہونے لگا اور لطف یہ کہ رعایا بھی سب راضی وخوش، اتفاق سے نواب گورنر جنرل نیپال جاتے ہوئے ادھر سے گزرے، انہوں نے رسد رسانی کا اتنا عمدہ انتظام کیا کہ نواب گورنر جنرل نے ان کی حسن کارگزاری کی نسبت وزیر کے ہاں اپنی خوشنودی لکھ بھیجی، نواب معتمد الدولہ کو اب اور بھی ان کی فکر ہوگئی، وہ ہمہ تن ان کے استیصال کے درپے ہوگئے، یہ بھی بے خبر نہ تھے، قبل اس کے کہ ان کو گرفتار کیا جائے، اپنا مال واسباب شاہجہاں پور بھیج کر خود بھی نکل گئے، چند روز شاہجہاں پور میں رہے، اس کے بعد فرخ آباد چلے گئے اور وہاں کوٹھیاں بنگلے خرید کے عیش وآرام کرنے لگے۔

شاہجہاں پور میں گرہ ندی کا پل، شہر اور قلعہ کے درمیان میں انہی کا بنوایا ہوا ہے، فرخ آباد میں ایک عالیشان کارواں سرا بنوائی اور لکھنؤ سے فرخ آباد تک راستہ میں جہاں جہاں ضرورت تھی سرائیں، مسجدیں اور پل بنوا دیے، جس سے بہت عرصہ تک نیک نامی کے ساتھ لوگ ان کو یاد کرتے رہے۔

نصیر الدین حیدر جب بادشاہ ہوئے تو انہوں نے معتمد الدولہ کو معزول کر کے اعتماد الدولہ کو قلمدان وزارت تفویض کیا، کچھ دنوں کے بعد ان سے بگڑے تو منتظم الدولہ یاد آئے، ان کو بلا کر وزیر مقرر کیا، کم وبیش ڈھائی سال انہوں نے وزارت کی، اس تھوڑے سے زمانہ میں ملکی ومالی انتظام اتنا چست کر دیا کہ جو بدنظمیاں معتمد الدولہ کے زمانہ وزارت میں چلی آرہی تھیں وہ سب دور ہوگئیں۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

محمد خاں قوال نے اس غزل کو نواب کے سامنے گایا تو اس کو ایک ہزار روپیہ انعام ملا، شیخ صاحب کو جو کچھ دیا ہو اس کا حال خدا کو معلوم ہے، اس ایک دینے پر کیا ہے، نواب ان کے شاگرد ہو گئے تھے، عمر بھر سلوک کرتے رہے اور ان کی بدولت انہوں نے امیرانہ زندگی بسر کی۔

سابقہ حاشیہ: گومتی پر لوہے کا پل بنوایا جو اب تک موجود ہے، ایک انگریزی شفاخانہ بنوایا، ایک یونانی دارالشفا تیار کیا، ایک بلغور خانہ جس میں اندھے، لولے، لنگڑے اور محتاج زن و مرد رہا کریں، ان تینوں کے لیے جدا جدا عمارتیں تعمیر کرائیں، بیش قرار تنخواہوں پر ڈاکٹر اور حکیم نوکر رکھے اور رزیڈنٹ لکھنؤ کی وساطت سے ان کے مصارف کے لیے نوٹ خرید لیے، جس کی بدولت یہ تینوں چیزیں لکھنؤ میں اب تک موجود ہیں، یونانی دارالشفا چوک میں، انگریزی شفاخانہ وکٹوریہ گنج میں عام لوگوں کی حاجت روائی کر رہے ہیں۔

ایک مدرسہ سلطانیہ قائم کیا جس میں ہزار ہا لڑکے داخل کیے گئے، ہر بیس لڑکے پر ایک مدرس مقرر ہوا اور طلبہ کے لیے فی کس پانچ روپیہ ماہوار کے حساب سے وظائف جاری ہوئے، یہ مدرسہ نواب سعادت علی خاں کے مقبرے کے چاروں سمت والے ایوانوں میں قائم کیا گیا تھا جس کا اب نشان بھی نہیں ہے۔

ایک مدرسہ اپنے روپے سے خاص کشامرہ کے لیے قائم کیا جس سے منتظم الدولہ کو خاص طور پر دلچسپی تھی، ہر ہفتہ بچوں کا خود امتحان لیتے اور اپنے ہاں مدعو کر کے طرح طرح کے کھانے اور لذیذ میوے کھلاتے تھے۔

ایک چھاپہ خانہ لیتھوگرافی کا قائم کیا، زیر اہتمام مسٹر آرچر کے جن کی تنخواہ پانسو ماہوار تھی، ایک اسکول انگریزی تعلیم کے لیے قائم کیا اور سب سے زیادہ حوصلہ مندی کا کام رسد خانہ سلطانی کا اجرا تھا جو کپتان ہربرٹ کے اہتمام سے قائم کیا گیا اور عالیشان عمارتیں اس کے واسطے تعمیر کرائی گئیں، مولوی اسماعیل شہیدی وغیرہ علما اس میں بطور طالب علم داخل ہوئے۔

افسوس ہے کہ منتظم الدولہ کو کام کرنے کا زیادہ موقع نہیں ملا، بادشاہ عیش پرستی کے ساتھ آتش مزاج بھی تھا، ان میں متانت و سنجیدگی، نواب سعادت علی خاں کی آنکھیں دیکھے ہوئے زیادہ دنوں تک نبھ نہ سکی، ۱۲۴۸ھ میں معزول ہو کر پھر فرخ آباد چلے گئے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

مگر خدا کی قدرت دیکھو نصیر الدین حیدر نے تخت نشین ہوتے ہی معتمد الدولہ کو معزول کر دیا، پہلے میر فضل علی کو اعتماد الدولہ کا خطاب دے کر وزیر بنالیا، جب ان سے کام نہ چلا تو حکیم مہدی بلائے گئے۔

حکیم مہدی کو شیخ صاحب یاد آئے، چوبدار بلانے آیا، انہوں نے اس کو کچھ دے دلا کر راضی کیا کہ ان کو درباری لباس پہننے کی مہلت دے، ادھر یہ پگڑی کے پیچ درست کرنے کے بہانے موقعے ڈھونڈنے لگے، ادھر چوبدار شربت پانی کی فکر میں لگا، شیخ صاحب موقع پا کر نکل کھڑے ہوئے اور فقیر محمد خاں گویا کے ہاں چھپ کر پہنچے، خاں صاحب نے منشی کنج بہاری کے میانے میں پردہ ڈال کر زنانی سواری کی طرح کنول ہاران کو بھیج دیا، وہاں سے کانپور ہوتے ہوئے الٰہ آباد پہنچے اور شاہ ابوالمعالی کے ہاں دائرۂ شاہ اجمل میں مہمان ہوئے، وہاں رہتے رہتے گھبرائے تو کانپور چلے آئے، اسی سلسلہ میں بنارس اور عظیم آباد کی بھی سیر کی۔

جب حکیم مہدی معزول ہو کر فرخ آباد گئے تو خیریت سے گھر آئے مگر پھر تاریخ کہی اور انصاف یہ ہے کہ خوب کہی ۔

افتاد حکیم از وزارت   تاریخ بطرز نو رقم کن
ازجاے حکیم ہشت برگیر   سہ مرتبہ نصف نصف کم کن

چند دنوں کے بعد حکیم مہدی کا ستارۂ اقبال پھر چمکا، محمد علی شاہ نے قلمدان وزارت سپرد کیا، شیخ صاحب پھر بھاگے اور الٰہ آباد پہنچے مگر معلوم ہوتا ہے کہ بار بار الٰہ آباد جانے سے

سابقہ حاشیہ: عرصہ کے بعد محمد علی شاہ کے زمانے میں پھر بلائے گئے، وہ ان کی کارگزاری سے ذاتی واقفیت رکھتے تھے کیوں کہ نواب سعادت علی خاں کے وقت میں دونوں اہل کار تھے، اس زمانہ میں ان کو کام کرنے کا بہترین موقع حاصل تھا مگر افسوس ہے کہ موت نے مہلت نہ دی، نو مہینے کے بعد آخر ماہ رمضان ۱۲۵۳ھ میں وفات پائی۔

امین آباد سے شاہ مینا کو جاتے ہوئے ان کا مقبرہ داہنے ہاتھ کو پڑتا ہے۔

گھبرا گئے تھے، اس گھبراہٹ کو بہت لطیف انداز سے ظاہر کیا ہے۔

آئی کہاں سے گردش پرکار پاؤں میں ہر پھر کے دائرہ ہی میں رکھتا ہوں قدم

مگر تھے خوش قسمت کہ تھوڑے ہی دنوں کے بعد حکیم مہدی کی وفات پر ۱۲۵۳ھ میں ان کی دوادوش کا خاتمہ ہوگیا اور اب کی دفعہ جو آئے تو مر کر بھی گھر سے نہ نکلے۔

محمد علی شاہ نے سو روپے ماہوار گھر پر مقرر کر دیے اور ہر سال قطعہ سال جلوس پر خلعت بھی عنایت ہوتا تھا، امجد علی شاہ مذہبی آدمی تھے، آنہ پائی کا حساب کر کے سال بسال اپنے مال و دولت کی زکوٰۃ نکالتے تھے اور جہاں تک ان سے ہوسکتا، علما و مجتہدین کی خدمت کرتے تھے، شاعروں کو دینا شاید گناہ سمجھتے ہوں، انہوں نے ان کی تنخواہ بند کردی مگر شیخ صاحب ایسے صاحب سلیقہ تھے کہ جس قدر نواب محسن الدولہ کی سرکار سے یا معتمد الدولہ آغا میر کی مہربانی سے کمایا تھا اس کو بیجا صرف نہیں کیا، تمام عمر فراغت سے زندگی بسر کی۔

آزاد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ عیال کا جنجال رکھا ہی نہ تھا، مگر قیصر التواریخ میں سید محمد میر زائر نے لکھا ہے کہ بیٹوں کو اچھی تعلیم دلوائی، حکیم زین العابدین ان کا بیٹا مرزا محمد علی کا شاگرد طبابت کرتا اور خوش چلنی سے زندگی بسر کرتا ہے، بہر حال ناسخ نے ۱۲۵۴ھ میں وفات پائی اور ٹکسال والے مکان میں مدفون ہوئے، میر علی اوسط رشک نے تاریخ کہی،

ولا شعر گوئی اٹھی لکھنؤ سے

دو دیوان ان کے چھپ گئے ہیں، پہلے دیوان میں ان کا خاص انداز نہایت نمایاں ہے، دوسرا دیوان الہ آباد کی کمائی ہے جس میں بے وطنی اور پریشانی کی جھلک ہر جگہ نظر آتی ہے، اسی وجہ سے اس کا نام بھی دفتر پریشان تجویز کیا تھا۔

ان دیوانوں میں غزلوں، رباعیوں، قطعوں اور تاریخ کے سوا اور کسی قسم کی نظم نہیں، طبیعت قصیدوں سے بہت مناسب تھی مگر خدا جانے اس کا شوق کیوں نہیں تھا، شاہانِ اودھ کی تاریخ و تہنیت میں کبھی کچھ کہنے کی ضرورت ہوئی ہے تو غزلوں اور قطعوں میں اس فرض کو

ادا کر دیا ہے۔

ایک مثنوی ''حدیث مفصل'' کے ترجمہ میں ہے اور ایک مولود شریف ہے، یہ دونوں نظمیں ان کے منہ پر نہیں کھلتیں، غزلوں میں بقول آزاد شوکت الفاظ، بلند پروازی اور نازک خیالی بہت ہے اور تاثیر کم، صائب کی تشبیہ و تمثیل کو اپنی صنعت میں ترکیب دے کر ایسی دست کاری اور مینا کاری کی ہے کہ بعض موقع پر بیدل اور ناصر علی کی حد میں جا پڑے ہیں۔

بات یہ ہے کہ ناسخ کی قوت تخیل نہایت زبردست ہے، ایک چیز کو وہ سو سو دفعہ دیکھتے ہیں اور ہر دفعہ کے دیکھنے میں ان کو ایک نیا عالم نظر آتا ہے، پھر وہ کلام کی بنیاد اس پر قائم کر کے تمثیل اور مبالغہ سے اس میں گرمی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں مگر اس قوت کے استعمال کرنے میں اکثر اعتدال سے گزر جاتے ہیں۔

کہیں پر مبالغہ اصلیت اور واقعیت سے اتنا دور جا پڑتا ہے کہ ان کی بلند پروازی کے سامنے آفتاب تارا بن کر رہ جاتا ہے، کہیں پر تمام عمارت کی بنیاد صرف کسی لفظی تناسب یا ایہام پر ہوتی ہے، کہیں فرضی تشبیہوں اور استعاروں پر شعر کی بنیاد قائم کرتے ہیں جو لطیف اور قریب الماخذ نہیں ہوتے، کہیں پر کسی چیز کو کسی چیز سے تشبیہ دے کر اس کے تمام لوازم اور اوصاف اس میں ثابت کرتے ہیں حالانکہ اس سے کسی قسم کی مناسبت نہیں ہوتی۔

یہ ان کا انداز بیان ہے جس کا نام نازک خیالی یا خیال بندی رکھا گیا ہے اور اسی نے متاخرین کی شاعری کو تباہ کر کے چھوڑا، یہ لوگ صرف گل و بلبل سے دیوان تیار کر کے اس کو چمنستان خیال بنا دیتے ہیں اور افسوس ہے کہ یہی ان کی شاعری کا طرۂ افتخار ہے۔

پہلے ناسخ کی ایک پوری غزل میں نقل کرتا ہوں تا کہ ان کا مخصوص انداز اس سے معلوم ہو، اس کے بعد غزلوں کے منتخب اشعار پیش کیے جائیں گے:

روئے جاناں کا تصور میں جو نظارہ ہوا — دل میں تھا جو داغ حسرت عرش کا تارا ہوا

وہ مہ خانہ نشیں گلیوں میں آوارہ ہوا — اے منجم دیکھنا ثابت بھی سیارہ ہوا

کس ادا سے تو نے شانہ اپنے بالوں میں کیا — سر پہ ہر محبوب کے خط مانگ کا آرا ہوا
محفل مے میں جو آیا تو برائے مے کشی — تھا جو شیشہ جوش مے سے ایک فوارہ ہوا
گرم ہے کیا عکس تیرے روئے آتشناک کا — آئینہ کی پشت کا معدوم سب پارا ہوا
رات غائب ہوگئی، حاضر ہوئے آثار صبح — وصل میں خورشید گویا شام کا تارا ہوا
چشم بددور آج کیا آتے نظر ہیں گال صاف — سبزۂ خط کیا غزال چشم کا چارا ہوا
ابر کو نسبت بھلا کیا چشم دریا بار سے — ایک دم روئے کنارہ پر جو ہم دھارا ہوا
شب ہوا سے ہل گئی جو اس کی زلف عنبریں — دم میں موم شمع سارا عنبر سارا ہوا
کس قدر ہے تیز ظالم آتش رنگ حنا — سنگ پا لگتے ہی بس تلووں سے انگارہ ہوا
قد ترا سرو، ہا آنکھیں نرگس، زلف سنبل، رخ ہے گل — کون ہے یکشست گل میں جو چمن آرا ہوا
جوش وحشت تیری آنکھوں پر یہ خوش چشموں کو ہے — مثل آہو دشت میں ہر ایک آوارا ہوا
ہوگئی ہے شمع تیرے سامنے خجلت سے آپ — شمع داں گویا تری محفل میں فوارا ہوا
چین سے سویا نہ دنیا میں کبھی جز خواب مرگ — بعد مرنے کے جنازہ مجکو گہوارا ہوا
زاہد ہم جانتے ہیں عشق بازی ہے گناہ — گھر لٹایا ہے جو وحشت میں وہ کفارا ہوا
ہو رہا ہے بت پرستی کا یہ دنیا میں عذاب — مجکو ہر داغ جنوں دوزخ کا انگارا ہوا
پیٹھ پیچھے میرے بد کہنے سے زاہد یہ ملا — پیٹھ پر بار گنہ کا جمع پشتارا ہوا
دور پھینکا ساقیا لیتے ہی تیرے ہجر میں — ہاتھ میں جام مئے گل رنگ انگارا ہوا
ہجر ساقی میں نہیں اے میکشو آواز رعد — فوج غم میں بہر خونریزی یہ نقارا ہوا
جب نہانے کو ہوا عریاں وہ پتلا نور کا — حوض میں روشن برنگ شمع فوارا ہوا
دوستو جلدی خبر لینا کہیں ناسخ نہ ہو — قتل آج اس کی گلی میں ایک بیچارا ہوا

غزلوں کے منتخب اشعار:

سیکڑوں آہیں کروں پر دخل کا کیا آواز کا — تیر جو آواز دے ہے نقص تیر انداز کا

پاؤں بھی اب اے جنوں کر دیجیے کانٹوں کے نذر
سر تو مدت سے نیاز سنگ طفلاں ہوگیا

محشر میں ہم کو نامۂ اعمال دیکھ کر　　قاصد خیال آئے گا خط کے جواب کا

اے اجل ایک دن آخر تجھے آنا ہے ولے　　آج آتی شب فرقت میں تو احساں ہوتا

مانع صحرا نوردی پاؤں کی ایذا نہیں　　دل دکھا دیتا ہے میرا ٹوٹ جانا خار کا

نہ دہشت محتسب کی ہے، نہ منت مے فروشوں کی
نہاں ہے نشہ آنکھوں میں شراب شیشۂ دل کا

ازل سے عشق کی دولت ہے دیوانوں کی قسمت میں
ملی ہے عقل لیکن بخت ہے برگشتہ عاقل کا

بس میں ہوتا نہ پرائے کے کبھی اے ناسخ　　آہ میرا مرے قابو میں اگر دل ہوتا

خواب میں میں نظر آتا وہ شب ہجر کہیں　　سو مجھے حسرت دیدار نے سونے نہ دیا

عمر بھر وحشت میں گر صحرا نوردی کی تو کیا　　سیر کے قابل جو تھا دل کا بیاباں رہ گیا

رنگ عشرت باغ عالم میں نظر آتا نہیں　　گل کو گل چیں کا خطر بلبل کو غم صیاد کا

تمام عمر یوں ہی ہوگئی بسر اپنی　　شب فراق کٹی، روز انتظار آیا

میکدہ تک محتسب کو میکشو آنے تو دو　　دیکھ کر پیمانہ کو پیماں شکن ہوجائے گا

او محتسب سمجھ کے تو شیشہ کو توڑیو　　دل بھی نہ ٹوٹ جائے کسی بادہ خوار کا

تھی شہادت سے غرض سو اس ادا میں ہوگئی　　گو نہ قاتل سے نزاکت کے سبب خنجر اٹھا

تجھ سے انصاف تو کر چھٹ نہ سکا ایک رقیب　　میں نے کیوں کر تری الفت میں زمانہ چھوڑا

جام مے لبریز ہیں ساقی فقط مطرب نہیں　　گل کھلے ہیں باغ میں خالی ہے جائے عندلیب

ہے یہاں کس کو شب فرقت میں ہوش　　ہو چکی ہوگی ہزاروں بار صبح

کیا روز بد میں ساتھ رہے کوئی ہم نشیں　　پتے بھی بھاگتے ہیں خزاں میں شجر سے دور

اے میکشو نزاکت ساقی کو دیکھنا　　لاتا ہے رکھ کے مثل سبو جام دوش پر

مر گیا کیا ناسخ میکش جو سارے مے فروش　　مسجدوں میں بیٹھے اپنی اپنی دوکان چھوڑ کر

ناز حوروں کے اٹھائیں یہ کہاں اپنا دماغ　　ہو ہمارا در فردوس سے بستر باہر
اے اجل تو نے غضب تفرقہ پردازی کی　　قبر میں تو سر شوریدہ پتھر باہر

کافی ہے سر پہ داغ جنوں دل میں نام یار　　بیزار ہوں فلک ترے تاج و نگیں سے میں

دم اخیر تو کرلوں نظارہ جی بھر کر　　الٰہی خنجر سفاک آبدار نہ ہو

میں خوب سمجھتا ہوں مگر دل سے ہوں ناچار　　اے ناصحو بے فائدہ سمجھاتے ہو مجکو

معشوقوں سے امید وفا رکھتے ہو ناسخ　　نادان کوئی دنیا میں نہیں تم سے زیادہ

ہر کسی کا کام رکھتا ہے ادھورا آسماں　　گر بہم پہنچا سر شوریدہ تو پتھر نہیں

تاب سننے کی نہیں بہر خدا خاموش ہو　　ٹکڑے ہوتے ہیں جگر ناسخ تری فریاد سے

داغ فرقت زیست بھر سوز جہنم بعد مرگ　　ان بتوں کو کس توقع پر خدایا چاہیے

فرقت قبول، رشک کے صدمے نہیں قبول　　کیا آئیں ہم رقیب تری انجمن میں ہے

شوق مے نے کردیا اس درجہ مجکو بدحواس　　محتسب سے راہ پوچھی خانہ خمار کی

سیہ بختی میں کوئی کب کسی کا ساتھ دیتا ہے　　کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا ہوتا ہے انساں سے

کیا برستی ہے بجائے ابر رحمت بے کسی　　ہے یہی تربت مقرر ناسخ مغفور کی

☆☆☆

خواجہ حیدر علی آتش

آتش تخلص، خواجہ حیدر علی نام تھا، آبا و اجداد دلی کے رہنے والے تھے، نواب شجاع الدولہ کے عہد میں ان کے والد خواجہ علی بخش دلی سے فیض آباد آئے اور محلہ مغل پورہ میں سکونت اختیار کی۔

آتش فیض آباد میں پیدا ہوئے، باپ کی طرح گورے چٹے اور خوبصورت تھے، ابھی اچھی طرح جوان نہ ہونے پائے تھے اور تعلیم بھی خوب نہ ہوئی تھی کہ باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، کسی مربی کے موجود نہ ہونے سے فوج کے لڑکوں کی صحبت میں بانکے اور شوریدہ پشت ہو گئے۔

اس زمانہ مین بانکپن اور بہادری کی قدر تھی، نواب محمد تقی (۱) ان کو نوکر رکھ کر اپنے ساتھ لکھنؤ لے آئے، یہاں آکر دیکھا تو ان کو دوسری دنیا نظر آئی، جرأت کی شاعری کا گھر گھر

---

(۱) اسد الدولہ نواب محمد تقی خاں بہادر ترقی تخلص، آغا سید محمد امین نیشاپوری کے خلف الرشید، فیض آباد میں بود و باش تھی اور نواب بہو بیگم کی سرکار سے توسل رکھتے تھے، بڑے وضع دار، علم دوست اور ہنر پرور امیر تھے، لکھنؤ دارالامان ہوا تو لکھنؤ آتے جاتے رہتے تھے، بہو بیگم کے انتقال کے بعد غازی الدین حیدر کے عہد میں مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت اختیار کر لی، میر سوز کے شاگرد تھے اور شعر اچھا کہتے تھے، ان کا خاندان شرافت اور وضع داری میں ہمیشہ نیک نام رہا ہے، لکھنؤ کی زمین بدل گئی، آسمان بدل گیا مگر ان لوگوں کی وضع داری نہیں بدلی، مرزا حیدر اور ان کے دو بیٹے مرزا عالی جاہ اور مرزا والا جاہ اسی خاندان کے چشم و چراغ تھے اور حقیقت یہ ہے کہ فضل و کمال، شرافت و پرہیزگاری میں یہ دونوں بھائی اپنا جواب (باقی اگلے صفحہ پر)

چرچا تھا، انشا اور مصحفی کا اکھاڑا جما ہوا تھا، واہ واہ کے نعرے زمین سے آسمان تک جاتے تھے، ان کو بھی شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا، مصحفی کے شاگرد ہوئے اور چند روز کی محنت میں ایسی مشق بہم پہنچائی کہ یہ خود صاحب طرز ہو گئے۔

استعداد علمی خام تھی مگر رواج زمانہ، بزرگوں کی صحبت اور مصحفی جیسے استاد کی شاگردی نے شاعری کی ضرورتوں سے ان کو اچھی طرح واقف کر دیا تھا، کلام کو مشق کے زور سے قوت دیتے رہے، اصناف سخن میں غزل کے سوا اور کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا، زبان کی تراش خراش، صفائی اور پاکیزگی میں اتنی کوشش کی کہ اپنے زمانہ کے استاد مسلم الثبوت ہو گئے۔

پچاس یا اسی روپیہ مہینہ بادشاہ کے ہاں سے ملتا تھا، شاگردوں یا امیروں میں سے کوئی سلوک کرتا تو اس سے بھی انکار نہیں تھا، باپ دادا سے توکل ترکہ میں پایا تھا اور ہوش سنبھالتے ہی بانکپن اور شورہ پشتی کی تعلیم ملی تھی، یہ دونوں انداز بڑھاپے تک قائم رہے۔

گیروا تہ بند باندھتے تھے، ڈنڈا ہاتھ میں رہتا تھا، سچے کام کا سلیم شاہی جوتا پاؤں میں، ڈنڈے میں ایک چھلہ سونے کا لگا رہتا، دوسرے تیسرے فاقہ کی حالت میں چھلہ رہن رکھ کر فاقہ شکنی کرتے، بھنگ پینے کا چسکا زندگی بھر رہا۔

لکھنؤ میں نوازگنج کے قریب چوپٹیوں سے آگے مادھولال کی چڑھائی مشہور ہے، وہاں سے اتار کو ایک چھوٹا سا باغیچہ اور ایک کچا سا مکان تھا، اس کو آتش نے خرید لیا تھا، اسی میں رہتے تھے، شادی بھی کر لی تھی، ایک بیٹا تھا محمد علی نام، جوش تخلص، بڑھاپے میں وہی عصائے پیری تھا، بیوی کے مرنے کے بعد آنکھوں کی بینائی بھی جاتی رہی تھی۔

سابقہ حاشیہ: نہیں رکھتے تھے، یہ سب شاعر تھے مگر یہاں صرف نواب محمد تقی کے دو شعر نقل کرتا ہوں ۔

ساکنانِ کعبہ نے کی بت پرستی اختیار　　وہ صنم نام خدا کیا ان دنوں جوبن پہ ہے

در و دیوار سے آتا ہے نظر جلوۂ دوست　　آئینہ خانہ مرا گوشۂ تنہائی ہے

اخیر زمانے میں معالی خاں کی سرائے میں اٹھ آئے تھے، داڑھی بھی بڑھالی تھی، اس پر مہندی کا خضاب مگر وضعداری کی دوسری باتوں میں کوئی فرق نہیں آیا، وہی رندانہ مزاج، وہی فقر و فاقہ، ایک ٹوٹے کھٹولے پر بیٹھے رہتے تھے، سامنے بچھ بچا حقہ لگا رہتا، کوئی امیر غریب آتا، اس کے سامنے وہی ٹوٹا ہوا حقہ پیش کیا جاتا۔

۱۲۶۳ھ میں ایک دن بھلے چنگے بیٹھے تھے، یکایک موت کا ایسا جھونکا آیا کہ شعلہ کی طرح بجھ کر رہ گئے، میر ولد حسین فوق نے تاریخ کہی ع

لکھنؤ میں نام آتش کر گئے

تمام عمر کی کمائی ایک دیوان غزلوں کا ہے جو ان کے سامنے رائج ہو گیا تھا، دوسرا تتمہ ہے کہ پیچھے مرتب ہوا، وہ بھی حجم میں خاصہ ہے، شاگردوں میں میر دوست علی خلیل، صاحب مرزا شناور، میر وزیر علی صبا، نواب محمد علی خاں رند، نواب مرزا شوق اور پنڈت دیا شنکر نسیم زیادہ نام برآوردہ ہوئے۔

زبان کی صحت وصفائی میں یہ اپنے حریف ناسخ کے دوش بدوش چلتے ہیں مگر نازک خیالی اور بلند پروازی میں ان کا حریف ان سے بہت زیادہ اونچا جاتا ہے اور سوز و گداز میں یہ ان سے آگے ہیں، مرزا غالب نے اپنے ایک خط میں جو چودھری عبدالغفور کے نام ہے، کسی تقریب سے یہ قطعہ نقل کیا ہے ؎

اگرچہ شاعران نغز گفتار　　زیک جام اندوز بزم سخن مست

ولے با بادۂ بعضے حریفاں　　خمار چشم ساقی نیز پیوست

مشو منکر کہ در اشعار ایں قوم　　ورائے شاعری چیزے دگر ہست

اس کے بعد اس چیزے دیگر کی مثال میں میر تقی میر، مرزا سودا، قائم اور مومن کا ایک ایک شعر پیش کر کے لکھا ہے کہ ناسخ کے ہاں کمتر، آتش کے ہاں بیشتر یہ تیز نشتر ہیں۔

میں ان کی بھی ایک پوری غزل نقل کرتا ہوں، اس کے بعد منتخب اشعار پیش کروں گا۔

فریب حسن سے گبر و مسلماں کا چلن بگڑا
خدا کی یاد بھولا شیخ، بت سے برہمن بگڑا

قبائے گل کو پھاڑا جب مرا گل پیرہن بگڑا
بن آئی کچھ نہ غنچہ سے جو وہ غنچہ دہن بگڑا

نہیں بے وجہ ہنسنا اس قدر زخم شہیداں کا
تری تلوار کا منہ کچھ نہ کچھ اے تیغ زن بگڑا

تکلف کیا جو کھوئے جان شیریں پھوڑ کر سر کو
جو غیرت تھی تو پھر خسرو سے ہوتا کوہ کن بگڑا

کسی چشم سیہ کا جب ہوا ثابت میں دیوانہ
تو مجھ سے مست ہاتھی کی طرح جنگلی ہرن بگڑا

اثر اکسیر کا میں نے قدم سے تیرے پایا ہے
جذامی خاک رہ مل کر بناتے ہیں بدن بگڑا

تری تقلید سے کبک دری نے ٹھوکریں کھائیں
چلا جب جانور انساں کی چال اس کا چلن بگڑا

زوال حسن کھلواتا ہے میوے کی قسم مجھ سے
لگا یا داغ خط نے آن کر سیب ذقن بگڑا

رخ سادہ نہیں اس شوخ کا نقش عداوت ہے
نظر آتے ہی آپس میں ہر اہل انجمن بگڑا

وہ بدخو طفل اشک اے چشم تر ہیں دیکھنا اک دن
گھروندے کی طرح سے گنبد چرخ کہن بگڑا

صف مژگاں کی جنبش کا کیا اقبال نے کشتہ
شہیدوں کے ہوئے سالار ہم جب سے تمن بگڑا

کسی کی جب کوئی تقلید کرتا ہے میں روتا ہوں
ہنسا گل کی طرح غنچہ جہاں اس کا دہن بگڑا

کمال دوستی اندیشۂ دشمن نہیں رکھتا
کسی بھونرے سے کس دن کوئی ماریاسمن بگڑا

رہی نفرت ہمیشہ داغ عریانی کو پھاہے سے
ہوا جب قطع جامہ پر ہمارے پیرہن بگڑا

رگڑوائیں یہ مجھ سے ایڑیاں غربت میں وحشت نے
ہوا مسدود رستہ جادۂ راہ وطن بگڑا

کہا بلبل نے جب توڑا گل سوسن کو گل چیں نے
الٰہی خیر کیجو نیل رخسار چمن بگڑا

ارادہ میرے کھانے کا نہ اے زاغ و زغن کیجو
وہ کشتہ ہوں جسے سونگھے سے کتوں کا بدن بگڑا

امانت کی طرح رکھا زمیں نے روز محشر تک
نہ اک مو کم ہوا اپنا نہ اک تار کفن بگڑا

جہاں خالی نہیں رہتا کبھی ایذا دہندوں سے
ہوا ناسور نو پیدا اگر زخم کہن بگڑا

تونگر تھا بنی تھی جب تلک اس محبوب عالم سے
میں مفلس ہو گیا جس روز سے وہ سیم تن بگڑا

لگے منہ بھی چڑھانے دیتے دیتے گالیاں صاحب
زباں بگڑی تو بگڑی تھی خبر لیجے دہن بگڑا

بناوٹ کیف مے سے کھل گئی اس شوخ کی آتش　　لگا کر منہ سے پیمانے کو وہ پیماں شکن بگڑا

آتش نے مسلسل غزل بھی لکھی ہے، جس میں ایک شعر کا مضمون دوسرے شعر سے الگ نہیں ہے، بلکہ ساری غزل کا مضمون اول سے آخر تک ایک ہے، ایسی غزلوں کے لکھنے میں بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں کسی قدر طولانی مضمون بھی بندھ سکتے ہیں، مثلاً ہر اک موسم کی کیفیت صبح و شام کا سماں، چاندنی رات کا لطف، جنگل یا باغ کی بہار، سفر کی روداد، وطن کی دلبستگی اور اسی قسم کی بہت سی باتیں جو دو ایک شعر میں نہیں سما سکتیں، اس غزل کو بھی نمونہ کے لیے نقل کرتا ہوں۔

غزل مسلسل

شب وصل تھی چاندنی کا سماں تھا　　بغل میں صنم تھا خدا مہرباں تھا
مبارک شب قدر سے بھی وہ شب تھی　　سحر تک مہ و مشتری کا قراں تھا
وہ شب تھی کہ تھی روشنی جس میں دن کی　　زمیں پر سے اک نور تا آسماں تھا
نکالے تھے دو چاند اس نے مقابل　　وہ شب صبح جنت کا جس پر گماں تھا
عروسی کی شب کی حلاوت تھی حاصل　　فرح ناک تھی روح، دل شادماں تھا
حقیقت دکھاتا تھا عشق مجازی　　نہاں جس کو سمجھے ہوئے تھے عیاں تھا
بیاں خواب کی طرح جو کر رہا ہے　　یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جواں تھا

منتخب اشعار

خدا سر دے تو سودا دے تری زلف پریشاں کا
جو آنکھیں ہوں تو نظارہ ہو ایسے سنبلستاں کا

حسن پری اک جلوۂ مستانہ ہے اس کا　　ہشیار وہی ہے کہ جو دیوانہ ہے اس کا

دوستوں سے اس قدر صدمے ہوئے ہیں جان پر　　دل سے دشمن کی عداوت کا گلہ جاتا رہا

آئے بھی لوگ بیٹھے بھی اٹھ کر چلے گئے   میں جا ہی ڈھونڈتا تری محفل میں رہ گیا

اللہ رے شوق اپنی جبیں کو خبر نہیں   اس بت کے آستانہ کا پتھر رگڑ گیا

بڑا شور سنتے تھے پہلو میں دل کا   جو چیرا تو اک قطرۂ خوں نہ نکلا

چال ہے مجھ نیم جاں کی مرغ بسمل کی تڑپ   ہر قدم پر ہے گماں یاں رہ گیا واں رہ گیا
کارواں یاروں کا پہنچا منزل مقصود تک   میں بگولے کی طرح سے خاک اڑا کر رہ گیا

فاتحہ پڑھنے کو آئے قبر آتش پر نہ یار   دو ہی دن میں پاس الفت اس قدر جاتا رہا

صندل کو مول لے کر کس کی بلا رگڑتی   میں درد سر کی خاطر یہ درد سر نہ کرتا

خریدار محبت آئے تھے بازار عالم میں   وہی سودا کیا ہے ہم نے جس میں درد سر دیکھا

قاصدوں کے پاؤں توڑے بدگمانی نے مری
خط دیا لیکن نہ بتلایا نشان کوے دوست
فرش گل بستر تھا اپنا خاک پر سوتے ہیں اب
خشت زیر سر نہیں یا تکیہ تھا زانوے دوست
اس بلائے جان سے آتش دیکھیے کیونکر نبھے
دل سوا شیشے سے نازک دل سے نازک خوے دوست

مشتاق درد عشق جگر بھی ہے دل بھی ہے   کھاؤں کدھر کی چوٹ بچاؤں کدھر کی چوٹ

منہ دیکھتا ہوں یار کا کچھ کہہ نہیں سکتا   آنکھیں تو کھلی ہیں مری لیکن ہے زباں بند

کوچہ سے یار کے نہ صبا دور پھینک اسے　　مدت کے بعد آئی ہے خاک اپنی راہ پر

کون کہتا ہے بسر ہو گئے ایام جنوں　　اک گریباں نظر آتا نہیں بے چاک ہنوز

کوچہ یار میں سایہ کی طرح رہتا ہوں　　در کے نزدیک کبھی ہوں کبھی دیوار کے پاس

جنوں میں بھی ہوئی زائل نہ مجھ سے دانائی　　رہا میں عالم وحشت میں بیشتر خاموش

رخسار زرد پر مرے بہتے ہیں اشک خوں　　یکجا دکھا رہے ہیں خزاں و بہار رنگ

وحشی تھے بوئے گل کی طرح سے جہاں میں ہم
نکلے تو پھر کے آئے نہ اپنے مکاں میں ہم

اسے جان کے برابر مرتے مرتے ہم نے رکھا ہے
ہماری قبر پر رویا کرے گی آرزو برسوں

جام شراب عشق سے دونوں ہیں بے خبر　　بلبل چمن میں مست ہے میں کوئے یار میں

بلند و پست سبک روح کو برابر ہے　　نسیم بے سروپا کا کہاں مقام نہیں

برباد ہو رہے ہو کچھ آتش تمہیں نہیں　　مٹی خراب اپنی بھی ہے اس دیار میں

یہ سعادت لکھی ہے قسمت میں کس کے دیکھیے　　خون گرفتہ ایک میں ہوں اور خنجر سیکڑوں

یہ کیفیت اسے ملتی ہے جو جس کے مقدر میں
مے الفت نہ خم میں ہے، نہ شیشہ میں، نہ ساغر میں

مست شراب عشق کب آتے ہیں ہوش میں — یہ نشہ وہ نہیں ہے کہ جس میں خمار ہو

پر کترنے ہیں مرے صیاد تو کاٹ اس طرح — حسرت پرواز بھی اڑ جائے بال و پر کے ساتھ

باغ میں آئے ہو ساتھ ان کے پھر بھی لو دو گام
کبک و طاؤس کا جھگڑا ہے چکاتے نہ چلو

ہنسنے والا نہیں ہے رونے پر — ہم کو غربت وطن سے بہتر ہے

پیامبر نہ میسر ہوا تو خوب ہوا — زبان غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

سوائے نام کے باقی اثر نشاں سے نہ تھے — زمیں سے دب گئے دبتے جو آسماں سے نہ تھے

افسوس ہے فرہاد کو پہلے ہی نہ سوجھی — سر توڑ کے مرجائے اس کوہکنی سے

خوب روئے حال پر اپنے وطن کا سن کے حال
کوئی غربت میں جو آنکلا ہمارے شہر سے

لگی ہے دیر بہت نامہ بر کے آنے میں — وہ خود ہی آتے ہیں قاصد جواب کے بدلے

نقش پائے رفتگاں سے یہ صدا ہے آرہی — دو قدم میں راہ طے ہے شوق منزل چاہیے

ان سے کہہ دو نہیں آہستہ جو رکھتے دو گام — گر ہی پڑتے ہیں بہت دوڑ کے چلنے والے

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے — ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے
مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے — خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

موت مانگوں تو رہے آرزوئے خواب مجھے ڈوبنے جاؤں تو دریا ملے پایاب مجھے

شگفتہ رہتی ہے خاطر ہمیشہ قناعت بھی بہارِ بے خزاں ہے

زمین چمن گل کھلاتی ہے کیا کیا دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
نہ مڑ کر کے بیدرد قاتل نے دیکھا تڑپتے رہے نیم جاں کیسے کیسے
تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں گل و لالۂ و ارغواں کیسے کیسے
بہار آئی ہے نشہ میں جھومتے ہیں مریدان پیر مغاں کیسے کیسے

☆☆☆

خواجہ محمد وزیر وزیر

محمد وزیر نام، وزیر تخلص، خواجہ محمد فقیر کے بیٹے تھے، لکھنؤ وطن تھا، آبائی سلسلہ حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ سے ملتا ہے اور ننھیالی قرابت مرزاؤں کے ایک نامی گرامی خاندان سے تھی۔

مرزا سیف اللہ بیگ نانا تھے جو نواب امیر الدولہ مرزا حیدر بیگ خاں کے حقیقی بھائی تھے، غرض دادھیال و ننہال دونوں طرف سے عالی خاندان تھے۔

فارسی کی پوری اور عربی کی کچھ کچھ درسی کتابیں علمائے لکھنؤ سے پڑھیں، عروض و قافیہ میں بہت اچھی مہارت تھی، گوشہ نشینی اور توکل باپ دادا سے ترکہ میں ملا تھا، ساری عمر کسی کی نوکری نہیں کی۔

شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا، شیخ امام بخش ناسخ سے مشق سخن کی اور انہی کی زندگی میں استاد مسلم الثبوت ہو گئے، شیخ صاحب کو ان پر فخر تھا اور بجا طور پر فخر تھا، اکثر اپنے شاگردوں کو اصلاح سخن کے لیے ان کے سپرد کر دیتے تھے اور ہر طریقہ سے ان کی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے۔

ان کو آخر میں شعر و سخن سے نفرت سی ہو گئی تھی، فتوح و تسخیر اعمال کا شوق رہ گیا تھا، ہر وقت نقوش بھرا کرتے تھے، سو روپیہ ماہوار سے کم خرچ نہیں تھا مگر آمدنی کہیں سے نہیں تھی، واجد علی شاہ بادشاہ نے دو بار یاد فرمایا، مگر علالت کا عذر کر کے اپنی جگہ سے ہلے نہیں، اسی وجہ سے لوگ ان کی آمدنی کو دست غیب پر محمول کرتے تھے۔

۱۲۷۰ھ میں وفات پائی، مقبول الدولہ مرزا مہدی علی خاں قبول نے تاریخ کہی ع

وزیر بادشہ شاعران نامی بود

منشی اشرف علی شاگرد نسیم دہلوی نے کہا ع

مزہ شعر کا ہائے جاتا رہا

ان کی زندگی میں ابتدائی کلام کا جو مجموعہ مرتب ہوا تھا، وہ تلف ہو گیا، دوبارہ اس کے جمع کرنے کا خیال نہیں کیا، عبدالواحد خاں مالک مطبع مصطفائی کو اس کا خیال پیدا ہوا تو انہوں نے کچھ سادی کتابیں ان کو لا کر دیں اور ان کے دوستوں اور شاگردوں کو متوجہ کیا، اس طریقہ سے پھر دوبارہ ایک دیوان مرتب ہوا جو ان کے مرنے کے بعد ۱۲۷۱ھ میں چھاپا گیا۔

رنگ ان کا وہی ہے جو ان کے استاد کا ہے، مضمون کی بلندی، خیال کی نزاکت، بیان کی متانت اور زبان کی صحت، غرض کہ پختگی کلام کے تمام لوازم اس میں موجود ہیں لیکن غزل کی جان یعنی تاثیر کے نہ ہونے سے ان کے کلام کی حیثیت ایک حسین مگر جسد بے روح سے زیادہ نہیں قرار پا سکتی۔

ان کے تمام دیوان کو اول سے آخر تک پڑھو، اس میں دس شعر بھی ایسے نہ ملیں گے جن سے اہل دل کے قلوب کو سرور اور ارباب نظر کی آنکھوں کو نور حاصل ہو۔

مگر اس میں شک نہیں کہ جو ان کا رنگ ہے اس میں ناسخ و آتش کے بعد ان کے معاصرین میں سے کوئی ان کا مثل نہیں، نمونہ کے لیے ایک غزل نقل کرتا ہوں، اس کے بعد انتخابی اشعار لکھوں گا۔

عوض مطلع کے کھنچوائیں گے نقشہ روئے جاناں کا — بنے تا مطلع خورشید مطلع اپنے دیواں کا

نہیں انبوہ خط میں جلوہ حسن روئے جاناں کا — عیاں ہے تخت یہ پریوں کے جھرمٹ میں سلیماں کا

حنائی ہاتھ کی تاثیر طرفہ رنگ لائی ہے — شجر تیرے نگیں کا بن گیا ہے نخل مرجاں کا

گلے سے حرف باتوں کے نظر آتے ہیں حیرت ہے — عیاں جوہر ہیں رشک آئینہ ہے جسم جاناں کا

کرے گا آتش افروزی چمن سودائے گیسو میں
دھواں بن کر رلائے گا نظارہ سنبلستاں کا

بگڑ کر اس نے چلمن سے جو ہم کو آنکھ دکھلائی
غزال چشم پر دھوکا ہوا شیر نیستاں کا

پری وش پڑھتے ہیں کلمہ مرا ئین ہوں وہ دیوانہ
ہر اک داغ جنوں میں ہے اثر مہر سلیماں کا

ترے ہونٹوں کے آگے رنگ جب اس کا نہیں جمتا
تو کیا کیا جوش کھاتا ہے لہو لعل بدخشاں کا

ہے یہ حسن دو ہفتہ چار دن کی چاندنی ساقی
چھلک جاتا ہے بھرتے ہی پیالہ ماہ تاباں کا

نہیں ہے سرمہ کا دنبالہ اے ترک آنکھ میں تیری
پھریرا سرمئی ہے یہ نشان فوج مژگاں کا

ذقن میں دانۂ خال سیہ دیکھا تو میں سمجھا
لطافت سے عیاں ہے تخم یہ سیب زنخداں کا

جہاں کو قتل کرتے ہیں یہ مہرو جامہ زیبی سے
مگر تیغ ہلالی ہے ہلال ان کے گریباں کا

حلب کی صبح صادق کا گماں ہے اس کے عارض پر
مسی پر لعل لب کے شبہہ ہے شام بدخشاں کا

بہت کچھ کھو کے پائی اس نے راہ خود فراموشی
دل گم گشتہ آپ ہی خضر ہے اپنے بیاباں کا

ہوئے ہیں جمع آنسو کر رہے ہیں شوخیاں کیا کیا
گماں ہے دامن مژگاں پہ بازی گاہ طفلاں کا

فلک پر ہے دماغ اے منعمو! اپنا گدائی میں
بہت ہی بوریا خواہاں نہیں تخت سلیماں کا

نہ پایا بوسۂ لب اس پری سے جب تو یہ سمجھا
نہیں انساں کی قسمت میں چشمہ آب حیواں کا

لب لعلیں پہ اس کے یہ نہیں ہے پان کا لاکھا
نکل آیا ہے کھا کر جوش خوں لعل بدخشاں کا

مسیں بھیگی نہیں ہیں اے وزیر اس آئینہ رو کی
نمایاں پشت لعل لب پہ ہے یہ عکس مژگاں کا

منتخب اشعار

چلا ہے او دل راحت طلب کیا شادماں ہو کر
زمین کوئے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر

اسی خاطر تو قتل عاشقاں سے منع کرتے تھے
اکیلے پھر رہے ہو یوسف بے کارواں ہو کر

کیا قتل اس نے غیروں کو ہوئے ہم رشک کے مارے
اجل بھی دوستو آئی نصیب دشمناں ہو کر

وزیر آغوش یہاں فرقت میں بھی خالی نہیں رہتی
نہیں ہے یار اگر تو درد ہے مدت سے پہلو میں

ترچھی نظروں سے نہ دیکھو عاشق دلگیر کو	کیسے تیر انداز ہو سیدھا تو کرلو تیر کو

ہے چشم نیم باز عجب خواب ناز ہے	فتنہ تو سو رہا ہے در فتنہ باز ہے

ہوئی گر صلح بھی تو بھی رہی جنگ	ملا جب دل تو آنکھ اس سے لڑائی

پڑا ہے تفرقہ بے تابیوں سے	وزیر اب میں کہیں ہوں دل کہیں ہے

قطعہ

نہ کر عوض مرے جرم و گناہ بے حد کا	الٰہی تجکو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں کہیں نہ عدو دیکھ کر مجھے محتاج	یہ ان کے بندے ہیں جن کو کریم کہتے ہیں

☆☆☆

میر وزیر علی صباؔ

''درچستی بندش وصحت وصفائی محاورہ ودقت فکر و بلندی اندیشہ

سرآمد مستعداں بود۔'' (اے مہر جہانتاب)

وزیر علی نام، صباؔ تخلص، میر بندہ علی کے بیٹے تھے، لکھنؤ وطن تھا، یہیں پیدا ہوئے اور یہیں ان کا نشو ونما ہوا، اس زمانے کے شریف زادوں کی طرح فارسی کی اچھی اور عربی کی بقدر ضرورت تعلیم پائی۔

اس زمانہ میں علوم قدیمہ کا زور شور تھا، عربی، صرف ونحو اور منطق کے ساتھ ساتھ فن طب اور علم کلام کے مہمات مسائل کا سمجھ لینا شریف زادوں کے لیے ضروریاتِ زندگی میں داخل تھا، جو لوگ سبقاً سبقاً تحصیل نہ کر سکتے تھے، وہ بھی علما کی صحبت میں اتنی معلومات بہم پہنچا لیتے تھے کہ مجلس گرم کرنے کو وہ کافی سے زیادہ ہوتی تھیں۔(۱)

---

(۱) اس زمانہ میں ایک معمولی سے معمولی آدمی کی زبان پر بھی مصطلحاتِ علمی ایسی بے تکلفی کے ساتھ رواں ہوتے تھے کہ ان کو سن کر کسی طرح یہ باور نہیں آتا تھا کہ اس نے درسی کتابیں نہیں پڑھیں، اب بھی لکھنؤ میں شاہی زمانہ کے جو سن رسیدہ لوگ موجود ہیں ان سے مل کر اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔

میرے بچپنے میں ایک فقیرنی بھیک مانگنے آیا کرتی تھی، پیر فرتوت مگر آواز میں لوچ اور شیرینی، صورت سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ جوانی میں بہت شکیل اور کسی شریف گھرانے کی لڑکی ہوگی۔

میرے ایک دوست نے اس کی بہت تعریف کی اور کہا کہ باتیں کرنا چاہو تو دو چار آنہ کی بالائی منگوا کر اس کے سامنے رکھ دو، میں نے اس کو بلا کر بٹھایا اور بالائی پیش کی تو بے حد (باقی اگلے صفحہ پر)

میر وزیر علی صبا نے اسی زمانے میں تعلیم و تربیت پائی، شعر و سخن سے خدا داد مناسبت تھی، خواجہ حیدر علی آتش کے فیض صحبت سے اور بھی زیادہ مشتاق ہو گئے۔

ان کے دیوان کا نام غنچۂ آرزو ہے جو ایک ضخیم جلد میں شائع ہو گیا ہے، صحت و صفائی محاورہ اور لطف سخن میں ان کا کلام ہم عصروں کی نسبت سے بہت بہتر ہے۔

۱۲۷۱ھ میں گھوڑے سے گر کر جان دی، شاگردوں نے خوب خوب تاریخیں کہیں، کسی نے کہا ع

صبا در گلشن فردوس جا کرد

کسی نے کہا ع

صبا از گلشن دنیا کجا رفت

دل میں اک درد اٹھا آنکھوں میں آنسو بھر آئے بیٹھے بیٹھے ہمیں کیا جانیے کیا یاد آیا

اللہ رے ان کا غصہ اتنا نہیں سمجھتے کیوں کر کوئی جیے گا جب یوں عتاب ہوگا

جائے عبرت ہے جہان بے ثبات دیکھتے ہی دیکھتے کیا ہو گیا

اللہ ہے جو حال پہ بندہ کے ہو کرم پہچانتا ہوں خوب میں سرکار کا مزاج

سابقہ حاشیہ: خوش ہوئی اور باتیں کرنے لگی، معلوم ہوتا تھا کہ منہ سے پھول جھڑتے ہیں، فارسی اور اردو کے اساتذہ کا کلام خصوصاً سعدی شیرازی کے منتخب اشعار اور گلستاں کے برجستہ فقرے اس طرح برمحل پڑھتی اور ترجمہ کرتی تھی کہ اس کی حلاوت آج تک باقی ہے۔

افسوس ہے کہ بچپن کی وجہ سے اس کا خیال نہیں ہوا کہ اس سے عہد قدیم کے حالات پوچھتا، صرف اتنا معلوم ہوا کہ غازی الدین حیدر کے زمانے میں لڑکیوں کا کوئی مدرسہ تھا، اس مدرسہ سے اس کو کچھ تعلق رہا ہے۔

آدم سے باغ خلد چھٹا ہم سے کوئے یار	وہ ابتدائے رنج ہے یہ انتہائے رنج

کہتے ہیں میرے دوست مرا حال دیکھ کر	دشمن کو بھی خدا نہ کرے مبتلائے رنج

نہ کہیے نالہ عاشق میں کچھ نہیں تاثیر	سنی ہے تم نے کسی کی ابھی کہاں فریاد

آفت ہے قید سبحۂ و زنار جان کو	تار حیات میں نہیں یہ گتھیاں پسند

صیاد و باغباں نہ کریں کج ادائیاں	ناز و نیاز بلبل و گل میں ہے چار روز

اس مرقع میں عجب نقشہ ہے دیکھو جس طرف	صورتیں دس بیس ناخوش ہیں جو ہیں دو چار خوش

ہوش میں آ مجھے کیا جان نہیں اپنی عزیز	دوست رکھوں میں تجھے اے دل دشمن کب تک

کہتے تھے دل نہ دیں گے کسی کو تمام عمر	مجبور ہو گئے مگر اک دلستاں سے ہم

ہمیں کو رنج دے کر الٹے شکوے ہم سے کرتے ہو	جواب اپنا نہیں رکھتے ہو تم باتیں بنانے میں

کون سنتا ہے تری جوش جنوں میں ناصح	خضر بھی آئیں تو ہم راہ بتادیں ان کو

کوچۂ عشق کی راہیں کوئی ہم سے پوچھے	خضر کیا جانیں غریب اگلے زمانے والے

☆☆☆

نواب سید محمد خاں رندؔ

"سخنش دردانگیز وکلامش مہر خیز در عین بے تکلفی تکلفے دارد۔" (اہ مہر جہانتاب)

سید محمد خاں رند، نواب غیاث الدین نیشاپوری کے بیٹے تھے جو نواب برہان الملک صوبہ دار اودھ کے حقیقی بھانجے تھے، ۱۴ ربیع الاول ۱۲۱۲ھ کو فیض آباد میں پیدا ہوئے، چوں کہ "نواب وزیر" کے خاندان سے قریبی تعلق تھا، اس واسطے نواب بہو بیگم کے دامن تربیت میں ناز ونعمت سے پرورش پائی، جب تک وہ زندہ رہیں، فیض آباد میں رہے، ان کے مرنے کے بعد ۱۲۴۰ھ میں لکھنؤ چلے آئے اور یہیں سکونت اختیار کرلی۔

شعروسخن سے طبعی مناسبت تھی، جب تک فیض آباد میں رہے، میر مستحسن خلیق سے مشق سخن کرتے رہے، لکھنؤ آکر خواجہ حیدر علی آتش کے شاگرد ہوئے، پہلے وفا تخلص تھا، خواجہ صاحب نے رند بنادیا۔

ایک دیوان فیض آباد میں میر خلیق کے مشورہ سے تیار ہو چکا تھا، لکھنؤ آنے کے بعد اس کو غرق آب کر کے دو دیوان اور مرتب کیے جو گلدستۂ عشق کے نام سے چھپ گئے ہیں مگر ان دیوانوں میں بھی میر خلیق کے فیض صحبت کا رنگ صاف جھلکتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اہل لکھنؤ کی شاعری کا مدار مضمون کی بلندی، خیال کی نزاکت اور زبان کی صحت پر ہوا کرتا ہے، ان کے ہاں تینوں چیزیں کمزور ہیں، بلند پروازی اور خیال آفرینی میں خواجہ وزیر اور زبان کی صحت میں میر صبا کو یہ نہیں پہنچتے مگر ان کے ہاں سادگی اور صفائی اور تاثیر کا ہلکا سا رنگ نظر آتا ہے، جس سے خواجہ وزیر محروم ہیں اور صبا کے ہاں کچھ کچھ

پایا جاتا ہے۔

سنہ وفات ان کا میری نظر سے نہیں گزرا مگر اتنا معلوم ہے کہ آخر عمر میں منہیات سے تائب ہو گئے تھے اور دربار اودھ کی سازشوں سے دل برداشتہ ہو کر غدر سے چند سال پہلے عتبات عالیات کی زیارت کی نیت سے گھر سے نکل کھڑے ہوئے، چوں کہ ان کے مقدر میں یہ بات نہ تھی، بمبئی پہنچ کر سفر آخرت اختیار کیا۔

دید لیلیٰ کے لیے دیدۂ مجنوں ہے ضرور میری آنکھوں سے کوئی دیکھے تماشا تیرا

پھینک دوں دل کو ابھی چیر کے پہلو اپنا تجھ پہ قابو نہیں دل پر تو ہے قابو اپنا

ضعف اسے کہتے ہیں سینہ سے لبوں تک آتے سو جگہ راہ میں نالہ مرا بیٹھا اٹھا

چھوڑا قفس سے تب ہمیں صیاد تو نے آہ جب موسم بہار چمن سے نکل گیا

مژدہ اے گردوں بر آیا تیرے دل کا مدعا شہر سے آباد آتا ہے نظر ویرانہ آج

کھلی ہے کنج قفس میں مری زباں صیاد میں ماجرائے چمن کیا کروں بیاں صیاد
دکھایا کنج قفس مجکو آب و دانے نے وگرنہ دام کہاں میں کہاں کہاں صیاد

آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں تو ہائے گل پکار، میں چلاؤں ہائے دل

پھر وہی کنج قفس اور وہی صیاد کا گھر چار دن اور ہوا باغ کی کھالے بلبل

لطف گلگشت چمن کنج قفس میں بھولے اب تو نقشہ بھی گلستاں کا مجھے یاد نہیں

کبھی خوف خزاں ہے اور کبھی صیاد کا کھٹکا بناؤں کیا سمجھ کر آشیانہ اس گلستاں میں

او دل ہدف تیر نگہ پھر کیا تو نے　　اگلے ہی مرے زخم جگر تھے ابھی آلے

قیدِ ملت میں پھنسے چھوڑ کے رندانہ طریق　　کیسے جھگڑے میں تم اے کافرو دیندار پڑے
کیا بتاؤں میں کسے یاد ہے بحران کا دن　　مدتیں گزریں مسیحا مجھے بیمار پڑے

وعدہ پر تم نہ آئے تو کچھ ہم نہ مر گئے　　کہنے کو بات رہ گئی اور دن گزر گئے

جنوں اگرچہ ہمیں ہر برس ہوا لیکن　　یہ دلولے نہ ہوئے تھے جواب کی سال ہوئے

چار دن کی دوستی کا ہے زمانے میں رواج　　کس توقع پر کسی سے آشنائی کیجیے

اے جان لب پہ آکے ٹھہرنے سے فائدہ　　رہنا ہوا تو رہ گئے چلنا ہوا چلے

ستم کرتا ہے چرخ سفلہ پرور اہل غیرت پر　　جو کانوں سے نہ سنتے تھے وہ آنکھوں سے دکھاتا ہے

کچھ ہنس کے کٹی وصل میں کچھ ہجر میں رو کر　　ہر طرح غرض عمر دو روزہ بسر آئی

پھنسائیں بلبلیں گن گن کے توڑے پھول چن چن کے
چمن میں تم نے او صیاد و گل چیں کچھ بھی چھوڑا ہے

دو چار گام یاں سے ہے دولت سرائے دوست　　ٹوٹیں یہ پاؤں دیکھو تو آکر کہاں تھکے

وقت بد میں کون دیتا ہے کسی کا ساتھ رندؔ　　یار ثابت اک ملی دنیا میں تنہائی مجھے

گزرے جس دم ہم دنیا سے　　ہم نے جانا دنیا گزری
بحر جہاں میں زیست ہماری　　شکل حباب دریا گزری

خوش رہو تم وطن میں اہل وطن ہم ہیں اور سیر دشت غربت ہے

کرے فرقت میں کب تک صبر ایوبؑ یہ عاشق تیرا پیغمبر نہیں ہے

بت کریں آرزو خدائی کی شان ہے تیری کبریائی کی

کئی دن سے ہے گھات میں صیاد عندلیب آج کل ہی پھنستی ہے

قطعہ

بس اب آپ تشریف لے جائیے جو گزرے گی ہم پر گزر جائے گی
طبیعت کو ہوگا قلق چند روز ٹھہرتے ٹھہرتے ٹھہر جائے گی

☆☆☆

مرزا محمد رضا برقؔ

محمد رضا نام، برقؔ تخلص، ''فتح الدولہ بخشی الملک'' خطاب تھا، مرزا کاظم علی خاں کے بیٹے اور واجد علی شاہ بادشاہ (۱) کے مصاحب تھے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے، اس زمانے کے رواج کے موافق تعلیم پا کر شعر وسخن کی طرف توجہ کی، شیخ امام بخش ناسخ کا زمانہ تھا، نواب معتمد الدولہ

(۱) ابوالمنصور ناصر الدین سکندر جاہ سلطان عالم واجد علی شاہ خاتم شاہان اودھ ۱۲۶۳ھ میں اپنے باپ امجد علی شاہ کی جگہ تخت نشین ہوئے، شروع شروع میں کام میں جی لگایا، بانکا ترچھا و رسالے، نادری اور حیدری دو پلٹنیں قائم کیں، خود قواعد لیتے تھے، سواری کا جلوس نکلتا تو آگے آگے ایک صندوق ہوتا تھا جس میں ہر شخص کو عرضیاں ڈالنے کا اختیار تھا، اس کا نام مشغلۂ سلطانی رکھا تھا۔

چند روز کے بعد ان سب باتوں سے جی ہٹ گیا، نواب علی نقی خاں کو وزیر مقرر کیا جو سسرے بھی تھے اور سمدھی بھی، خود اپنے لیے بجائے سلطان عالم کے جان عالم خطاب پسند کیا، وزیر کو حضور عالم بنایا اور ملک و دولت انہیں سپرد کر کے اپنے شاہزادگی کے مشاغل میں مصروف ہو گئے، قیصر باغ بنایا گیا اور اس کو صدہا حسین وجمیل وخوش گلو اور خوش خرام معشوقوں سے آباد کیا گیا، گویوں اور ڈھاڑیوں کو قطب الدولہ اور دیانت الدولہ اور خدا جانے کیا کیا خطاب دے کر انیس ومحرم راز بنایا گیا۔

شعر وسخن وموسیقی میں مہارت پیدا کرنے کے ساتھ طبلہ بجانے اور ناچنے میں وہ کمال پیدا کیا کہ اس فن کے بڑے بڑے ان کے سامنے کان پکڑتے تھے، ہر سال قیصر باغ میں ایک میلہ مقرر کیا جس میں ہر شخص گیروے کپڑے پہن کر شریک ہو سکتا تھا، جان عالم جس دن گم ہوتے اور پریاں جوگنوں کا بھیس بدل کر بین بجاتی ہوئی ان کو ڈھونڈنے نکلتی تھیں تو اچھے اچھے ثقہ اور پرہیزگار لوگوں کے (باقی اگلے صفحہ پر)

کے استاد ہونے کی وجہ سے لکھنؤ میں ان کی شاعری کا سکہ رائج تھا، انہی کے شاگرد ہو گئے اور چند روز کی مشق میں ان کے اکثر شاگردوں سے بہتر کہنے لگے۔

سابقہ حاشیہ: حواس باختہ ہو جاتے تھے پھر جب وہ ملتے تھے اور جشن منایا جاتا تھا تو اس کے شان و شکوہ کا کچھ ٹھکانا نہ تھا۔

قیصر باغ میں ٹیڑھی کوٹھی چند روز ہوئے کھدی ہے، اس میں اندر کا اکھاڑا جمتا تھا، پریاں آسمان سے اترتی تھیں اور ان کا ناچ ہوتا تھا، خود جان عالم راجہ اندر بن کر بیٹھتے تھے، غرض کہ وہ وہ سامان کیے گئے تھے کہ اندر سبھا، سحر البیان کے مصنفین نے عالم خیال میں بھی وہ تماشے نہیں دیکھے تھے۔

جان عالم جب ان مشغلوں میں محو تھے، تو سمجھو کہ سارا لکھنؤ انہی باتوں کا سودائی ہو رہا تھا، ادنی اہلکار سے لے کر وزیر تک سب اسی بادۂ غفلت سے سرشار تھے، مصارف کی زیادتی، چکلہ داروں کی نوچ کھسوٹ اور تعلقہ داروں کی سرکشی سے ملک میں ایک ہنگامہ برپا تھا، رعایا دن دھاڑے لٹ رہی تھی مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی تھی، سلیمن صاحب اس زمانہ میں رزیڈنٹ تھے، وہ نواب علی نقی خاں سے کچھ برہم بھی تھے، موقع پا کر سرکار کمپنی کے اہلکاروں کے خوب کان بھرے اور لارڈ ڈلہوزی گورنر جنرل تھے، پنجاب اور ناگپور کی ریاست کو ضبط کر کے منہ کو خون لگ چکا تھا، بجائے اس کے کہ بادشاہ کو آنکھیں دکھا کر نالائق اہلکاروں کو نکلوا دیتے، یا خود بادشاہ کو معزول کر کے ان کے بھائی بیٹوں میں سے کسی کو بادشاہ کر دیتے، انتزاع سلطنت کا فرمان لکھ کر جنرل اوٹرم کے پاس ۱۲۷۱ھ میں بھیج دیا، انہوں نے آتے ہی دو کرور روپیہ سالانہ آمدنی کا ملک بغیر اس کے کہ بندوق کا ایک فیر بھی ہو، انگریزی گورنمنٹ کے قبضہ میں لے لیا، جناب عالیہ (واجد علی شاہ کی ماں) بہت چیخیں چلائیں کہ واجد علی نالائق ہے تو مصطفیٰ علی ایک بھائی کو یا جنرل سکندر حشمت دوسرے بھائی کو بیٹھا دو مگر کون سنتا ہے، جان عالم کے مشاغل کے لیے پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ کا وظیفہ مقرر ہو گیا۔

۵ رجب ۱۲۷۱ھ کو بادشاہ بہ نفس نفیس اپیل کرنے کو باصد حسرت و یاس لندن روانہ ہوئے، مگر کلکتہ پہنچ کر رائے بدل گئی، جناب عالیہ اپنے فرزند جنرل سکندر حشمت مرزا حامد علی خاں (باقی اگلے صفحہ پر)

برق شاعری کے علاوہ بانکپن میں بھی انگشت نما تھے، بانک بنوٹ اچھی جانتے اور تلوار خوب لگاتے تھے، نواب منتظم الدولہ حکیم مہدی کے زمانہ وزارت میں امرا، وزرا سے

سابقہ حاشیہ: ولی عہد اور مولوی مسیح الدین کا کوروی سفیر شاہی کو لے کر ایک سو دس زن و مرد کے ساتھ لندن روانہ ہوئیں، وہ لندن پہنچی ہی تھیں اور کوئن وکٹوریہ ملکہ معظمہ انگلستان سے صرف ایک ملاقات ہونے پائی تھی کہ ہندوستان میں غدر ہو گیا، جن انگریزوں کو اس خانماں آوارہ قافلہ سے ہمدردی بھی تھی وہ بھی ان کو چشم غضب آلود سے دیکھنے لگے اور انجام یہ ہوا کہ جناب عالیہ اور جنرل سکندر حشمت نے یورپ میں سفر آخرت اختیار کیا، باقی لوگ بادل بریاں و چشم گریاں واپس آئے، ادھر بادشاہ کو انگریزوں نے ایام غدر میں بلحاظ مصلحت ملکی فورٹ ولیم میں نظر بند کر رکھا تھا، چھبیس مہینے کے بعد وہاں سے چھوٹ کر نکلے اور پندرہ لاکھ روپیہ سالانہ وظیفہ قبول کر کے مٹیا برج میں کوٹھیاں اور بنگلے خرید کر کے اپنے عیش و عشرت کا سامان مہیا کر لیا، چند روز میں عالیشان عمارتیں بن کر تیار ہو گئیں اور لکھنؤ کا پرستان اٹھ کر مٹیا برج آ پہنچا، بادشاہ نے دل بہلانے کو زندہ جانوروں کا خصوصاً سانپوں کا ایسا ایک چڑیا خانہ بنایا کہ شاید دنیا میں اس کا کہیں جواب نہ ہوگا۔

اس زمانے میں جس نے مٹیا برج دیکھا ہے وہ جانتا ہے کہ اس مٹی ہوئی حالت میں اسے باغ ارم بنا کر راجہ اندر کا اکھاڑا کر رکھا تھا، اس پر محلات و ایوانہائے دلکشا کی وہی شان، آرائش و آسائش کے سامان کی وہی افراط، زرپاشی اور داد و دہش کی وہی کیفیت، غرض جو کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا وہ کر دکھایا اور اس طرح سے ہنس بول کر زندگی بسر کر دی کہ گویا کوئی مصیبت پڑی ہی نہ تھی۔

لوگ کہتے ہیں ان میں نری برائیاں ہی نہ تھیں، کچھ خوبیاں بھی تھیں، اول یہ کہ باوجود اس عیش و عشرت کے شراب کو کبھی منہ سے نہیں لگایا، دوسرے یہ کہ نامحرم پر کبھی ہاتھ نہیں ڈالا، نہ کسی کی بہو بیٹی زبردستی چھینی، جس پری پیکر پر دل آیا اس سے نکاح یا متعہ کر کے حرام کو حلال کر لیتے تھے، تیسرے تعصب مذہبی دیوانگی کی حد تک نہیں تھا، شیعہ، سنی اور ہندو سب ان کے خوانِ نعمت سے متمتع رہے، بلکہ اکثر اہلکار سنی تھے اور ان کے مذہب سے کبھی تعرض نہیں کیا، چوتھے یہ کہ مذاق اتنا عمدہ تھا کہ جس چیز کا (باقی اگلے صفحہ پر)

روشناس ہو چلے تھے، واجد علی شاہ کے زمانہ میں ترقی کی، ہر وقت مصاحبت میں رہتے اور بادشاہ کے کلام میں اصلاح بھی دیتے تھے۔

اس زمانہ کا رنگ ہی اور تھا، لفظی رعایتیں، ضلع جگت کی حد تک پہنچ گئی تھیں، نئی نئی تشبیہوں اور پیچیدہ پیچیدہ استعاروں کا ہر شخص دلدادہ ہو رہا تھا اور شاعری اپنے بلند مرتبہ سے گر کر انگیا چوٹی میں پھنس گئی تھی، یہ باتیں اس زمانہ میں عیب نہیں رہی تھیں بلکہ طرۂ افتخار سمجھی جاتی تھیں، خود برق کی زبان سے اس کی حقیقت سنو ؎

سابقہ حاشیہ: نام رکھتے یا جس کو خطاب دیتے اس سے ان کی ذہانت نمایاں ہوتی تھی، شاعری کی حیثیت سے دیکھو تو تصنیفات کا اتنا بڑا ذخیرہ چھوڑا ہے کہ کسی بڑے سے بڑے شاعر کو بھی نصیب نہیں، چھ دیوان غزلوں کے، کئی مثنویاں عاشقانہ قصوں کی جن میں اکثر آپ بیتی، ایک کتاب مباحثہ میں النفس والعقل، نصائح اختری، عشق نامہ، رسالہ ایمان، مصائب اہل بیت میں، دفتر پریشان، مقتل معتبر، دستور واجدی، سیاست مدن میں، دلہن موسیقی میں، جوہر عروض، عروض میں اور خدا جانے کتنی تصنیفات ہیں جن کی تعداد چالیس سے کم نہیں۔

کلام کا رنگ وہی ہے جو اس زمانہ میں عام تھا اور جس کی ذمہ داری خود انہی کے مشاغل پر عائد ہوتی ہے، آپ بیتے جو قصے مثنویوں میں لکھے ہیں، ان کو کوئی مہذب آدمی دیکھ نہیں سکتا۔

اے پری زادو! تمہاری آگ نے پھونکا یہ گھر — قاف سے تا قاف شہرہ اور فسانہ ہو گیا

یہی تشویش شب و روز ہے بنگالہ میں — لکھنؤ پھر بھی دکھائے گا مقدر میرا

یوں تو شاہان جہاں پر ہے پڑا وقت مگر — ختم ہے اختر بیکس پہ جفائے غربت

قید ہونے سے کہیں بوئے ریاست جائے گی — لاکھ گردش آسماں کو ہو زمیں ہوتا نہیں

سخاوت کیا کروں گا داغہائے جسم عریاں سے — خزانے میں وہ مہریں جمع ہیں جو بٹ نہیں سکتیں
توقع صبح ہونے کی کسے ہوتی ہے فرقت میں — وہ راہیں ہجر کی ہیں اے خدا جو کٹ نہیں سکتیں

راجہ اندر کا اکھاڑا صحبت اقدس ہے برقؔ　　نام رکھا ہے پرستاں بزم عشرت گاہ کا

ناسخ و آتش کے شاگرد سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے، کوئی کم کوئی زیادہ، اس کی تفصیل دیکھنا ہو تو اس کتاب کا مقدمہ پڑھو۔

برقؔ بہت پر گو شاعر تھے، ایک ضخیم دیوان عمدہ کاغذ پر نہایت خوشخط انہی کی زندگی میں شائع ہو گیا تھا، اس میں غزلیں، مخمس، مسدس، ترجیع بند، رباعیاں، قطعے، سبھی کچھ ہیں۔

ایک شہر آشوب لکھنؤ کی تباہی کا بہت دردانگیز لکھا ہے، معلوم نہیں کہ پہلے دیوان کی اشاعت کے بعد دوسرا دیوان ان کا مرتب ہوا یا نہیں۔

انتزاع سلطنت کے بعد اپنے بادشاہ کے ساتھ یہ بھی کلکتہ چلے گئے تھے اور جب بادشاہ فورٹ ولیم میں نظر بند کیے گئے تو انہوں نے بھی حق رفاقت ادا کیا اور وہیں ۱۸ر صفر ۱۲۷۳ھ کو فرق مبارک پر تصدق ہو گئے اور جو کچھ کہا تھا کر دکھایا۔

برق جو کہتے تھے آخر وہی کر کر اٹھے　　جان دی آپ کے دروازہ پر مر کر اٹھے

منتخب اشعار

اتنا تو جذب عشق نے بارے اثر کیا　　اس کو بھی اب ملال ہے میرے ملال کا

نکلا غبار دل سے صفائی تو ہو گئی　　اچھا ہوا جو خاک میں تم نے ملا دیا

اذاں دی کعبہ میں، ناقوس دیر میں پھونکا　　کہاں کہاں ترا عاشق تجھے پکار آیا

ہر اک نفس عشق میں ہے زندگی خضرؑ　　جینے کے لیے مرتے ہیں بیمار محبت

آتا نہیں قرار دل بے قرار کو　　غم میں پھنسا ہوں دام محبت سے چھوٹ کر

دل مکدر ہو تو سب عیش جہاں مٹی ہے　　تو نہیں پاس تو پھر لطف چمن خاک نہیں

قیس کا نام نہ لو ذکر جنوں جانے دو دیکھ لینا مجھے تم موسم گل آنے دو

ہم تو اپنوں سے بھی بیگانہ ہوئے الفت میں تم جو غیروں سے ملے تم کو نہ غیرت آئی

خدا غریب کی سنتا ہے غیب سے فریاد اثر عجیب دل درد مند رکھتا ہے

شکوہ میں نے جو کیا جائے شکایت یہ نہیں جس سے ہوتی ہے امید اس سے گلہ ہوتا ہے

اٹھا کے آئینہ دکھلا دیا اسے میں نے نہ سوجھی عارض گلگوں کی جب مثال مجھے

☆☆☆

میر علی اوسط رشکؔ

علی اوسط نام، رشکؔ تخلص، میر سلیمان کے بیٹے تھے اور فیض آباد بزرگوں کا وطن تھا، لکھنؤ میں ان کا نشو ونما ہوا، پورا نام ولقب والا جاہ میر علی اوسط رشک ہے۔

والد ان کے علوم وفنون میں کافی مہارت رکھتے تھے، والد سے اور دیگر علما کی فیض صحبت سے استعداد علمی حاصل کر کے شیخ امام بخش ناسخ کے شاگرد ہوئے۔

شاعری میں وہ جوش وخروش نہیں پایا جاتا جو خواجہ وزیر یا ان کے اور خواجہ تاشوں کے حصہ میں آیا تھا مگر زبان کی تصحیح اور لغات کی تحقیق میں یہ ناسخ کے تمام شاگردوں میں ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔

تاریخ گوئی میں بھی ان کو خاص ملکہ تھا، بات بات پر تاریخ کہتے تھے اور مرنے جینے کی تاریخوں کا تو انہوں نے ٹھیکہ لے رکھا تھا، ادھر کسی کا دم نکلا انہوں نے تاریخ نکال لی، کوئی پیدا ہوا، نال کٹنے میں دیر ہو تو ہو مگر تاریخ میں دیر نہیں لگتی تھی۔

سب سے زیادہ جو چیز ان کی زندگی کا نمایاں کارنامہ ہے وہ زبان کی اصلاح ہے، ناسخ تو استاد تھے ہی مگر واضع ان قوانین کے رشک تھے، کچھ الفاظ نمونہ کے طور پر ملاحظہ ہوں، وہاں بروزن جاں، نہو بروزن جہاں ہو، پر، پہ کہ کی جگہ ہونا ضروری ہے، رکھا بالتخفیف کی جگہ رکھا بالتشدید، تلک کی جگہ تک نبھانا، نِبھانا کی جگہ نباہنا، پہنانا، اسباب کی جگہ اس بارہ میں شعلہ وعدہ دریا اور صحرا کا ہم قافیہ نہ ہو، علاوہ ان کے اور بھی قاعدے بنائے ہیں جن کی پابندی ناسخ وآتش نے بھی نہیں کی، مگر انہوں نے وجوباً ان کو اختیار کیا اور مزہ یہ ہے کہ ان کی

شاعری اسی میں چوپٹ ہوگئی۔

معلوم ہوتا ہے کہ وہ شعرا اسی ضرورت سے کہتے تھے کہ جو الفاظ یا جو ترکیبیں بول چال میں لطف دیتی ہیں، ان سے شعر میں بھی کام لیا جائے، مثلاً آپ ہی کی جگہ آپی یا اور ہی کی جگہ اوری یا ایک ہی کی جگہ ایکی، یا ساتھ ہی کی جگہ ساتھی، یا بال بیکنا کی جگہ بال بیکا ہونا، آخر کرنا مار ڈالنے کے معنوں میں، اپنی طرف دیکھو جانے دو کے معنی میں، ادھر کی باتیں ادھر کرنا لگائی بجھائی کے معنوں میں، اتنے لیے کے بجائے صرف اسی کام کے واسطے، جب نہ تب، اکثر وقت بے وقت، جان ہار، جان پر کھیلنے والا، خاطر نشان ہونا، مطمئن ہونا، صاحبی پانا، عروج پانے کے معنوں میں، غرض کہ اس طرح کے سیکڑوں الفاظ اور ترکیبیں جو بول چال میں تھیں مگر شعر و انشا میں ان سے بچاؤ کیا جاتا تھا، انہوں نے ان کو نظم کر کے زبان کو وسعت دے دی اور صرف نظم کرنے ہی پر قناعت نہیں کی، بلکہ ۱۲۵۶ھ میں اردو کا ایک لغت تالیف کر کے ملک پر احسان عظیم کیا جس کا تاریخی نام نفس اللغتہ ہے، اس کا ایک حصہ نشتر کاکوروی نے چھپوا کر دفتر نور اللغات سے شائع کر دیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاعری سے قطع نظر بھی کرو تو ان خدمتوں کے لحاظ سے رشک کو بجا طور پر اس کا فخر حاصل ہے کہ ان کو اساتذۂ شعرا کے دوش بدوش جگہ دی جائے۔

رشک آخر عمر میں کربلائے معلیٰ چلے گئے تھے اور وہیں ۱۲۸۴ھ میں وفات پائی، ان کے تین دیوان ہیں، ان میں سے نظم مبارک اور نظم گرامی دو دیوان ۱۲۵۳ھ اور ۱۲۶۱ھ میں ترتیب دے کر ۱۲۶۳ھ میں خود چھپوائے تھے، تیسرا دیوان ضائع ہوگیا جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ ان دونوں سے اچھا تھا۔

ان دونوں میں چوٹی کے شعر کم ہیں، اصلاح زبان کی دھن میں بلند خیالی اور مضمون آفرینی کی ان کو پروا نہیں تھی، نمونہ ملاحظہ ہو ؎

یار کو ہم سے کچھ لگاؤ نہیں   وہ محبت نہیں وہ چاؤ نہیں

پرزوں میں دستخط کروں کیا حال | ایک دو تین چار تاؤ نہیں
عید بھی وصل سے چلی خالی | کچھ گلے ملنے کا لگاؤ نہیں
گنگ کو بحرِ غم سے کیا نسبت | یہ وہ دریا ہے جس میں ناؤ نہیں
اور کیا ہے ترا لعاب دہن | یہ اگر قند کا چاؤ نہیں
اب کی جاڑے میں اور نالہ و آہ | اس طرح کا کوئی الاؤ نہیں
چاول الماس گوشت لختِ جگر | فرقتِ یار میں پلاؤ نہیں
میرے کھانے سے کیوں فلک ہے کباب | پاؤ روٹی ہے نان پاؤ نہیں
ہجر میں کیوں طرح طرح نہ ہائے | بارِ غم پر مرا دباؤ نہیں
یہ زمینِ غزل وہ ہے اے رشک | جس میں ذرہ کہیں بھراؤ نہیں

یہ بہت بڑی غزل ہے جس کے کچھ اشعار میں نے نقل کیے ہیں، اتفاق سے ایک قافیہ رہ گیا ہے جس کو رشک نے ہاتھ نہیں لگایا، ان کے کسی حریف نے اس کمی کو پورا کر کے خود انہی کی طرف منسوب کر دیا ہے اور نشتر کاکوروی نے نفس اللغۃ کے مقدمہ میں ناظرین کتاب کی اس سے ضیافتِ طبع کر دی ہے، اس کو بھی ملاحظہ فرمایئے ؎

دور سے چھچھڑے دکھاؤ نہیں | رشک بیٹھا ہے بن بلاؤ نہیں

یہ تو ایک دل لگی ہوئی مگر دیکھنا یہ ہے کہ اس زمانے کے اہلِ مذاق ان کے کلام کی نسبت کیا رائے رکھتے تھے، معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان کی صحت و صفائی کے سامنے مضمون کی تازگی اور بلندی کا خیال نہیں رکھتے تھے، مضمون خاک میں مل جائے مگر زبان صحیح اور پاکیزہ ہو، باوجود اس کے ان کے دیوانوں سے ایسے اشعار بھی انتخاب کیے جا سکتے ہیں جن سے ان کی مشاقی اور استعداد کا پتہ چلتا ہے، مثلاً

کہاں یہ لطف چیتے نے کمر پائی اگر پتلی | تمہارے ہونٹ پتلے، انگلیاں پتلی، کمر پتلی
تجھے تشبیہ حیوانوں سے کیوں انسان دیتے ہیں | نہ وحشت چشمِ آہو میں، نہ چیتے کی کمر پتلی

فقط تجھ میں عناصر نے عجب ترکیب پائی ہے　　بدن شفاف، شانے گول، قد موزوں، کمر پتلی

بیشتر حصہ ان کے کلام کا لفظی رعایت اور ضلع جگت کی پیچیدگیوں میں پھنسا ہوا ہے اور کہیں کہیں ایسے مبتذل مضامین باندھے ہیں جو پڑھنے کے قابل نہیں، بدمذاقی کا اس سے زیادہ ثبوت کیا ہو سکتا ہے کہ جستجو اور تلاش سے بھی ایسے اشعار ان کے ہاں نہیں ملتے جن سے دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہو، وہ چار شعر جو ملے ہیں انہی پر قناعت کرتا ہوں۔

اس فہم پر حقیقت صانع کی فکر ہے　　واقف نہیں ہم اپنی حقیقت سے آج تک

ہم آپ میں آئیں گے تو وہ آئیں گے آپی (آپ ہی)　　دل ہی میں سراغ در دلدار ملے گا

محفل میں شمع، چاند فلک پر، چمن میں پھول　　تصویر روئے انور جاناں کہاں نہیں

جو مشکل ہے مرنا تو مرنا کسی پر　　یہ مرنا تو اے رشک مشکل نہیں ہے

☆☆☆

مرزا اصغر علی خاں نسیمؔ

''مولد و منشا اش شاہجہان آباد دہلی است، در آخر عمر لکھنؤ را از قدوم خود رونق بخشیدہ، مدتے بر مسند افادہ نشست و طالبان فن را از پایۂ تعلیم و تلمذ بمرتبہ کمال رسانیدہ۔'' (اھ مہر جہاں تاب)

اصغر علی خاں نام، نسیم تخلص، نواب آقا علی خاں قاچار کے بیٹے تھے، دلی میں پیدا ہوئے اور وہی نشو و نما پایا، حکیم مومن خاں سے مشق سخن کی، زمانہ موافق تھا، اپنے مکان پر مجلس مشاعرہ ترتیب دیتے تھے، اس میں مومن خاں و دیگر مشاہیر دلی شریک ہو کر داد سخن دیتے تھے۔

پہلے اصغر تخلص کرتے تھے بعد میں نسیم اختیار کیا، جب تک دلی میں رہے، بہت فراغت اور خوش حالی سے زندگی بسر کرتے رہے، باپ کے مرنے کے بعد بھائیوں سے نہیں بنی اور کچھ ایسی شکل پیش آئی کہ دلی کو چھوڑنا پڑا، غدر کے کچھ دنوں پہلے لکھنؤ آرہے، واجد علی شاہ کا زمانہ تھا، ان کی تعریف کے قصیدے دیوان میں موجود ہیں مگر یہ معلوم نہیں کہ دربار تک رسائی ہوئی یا نہیں اور ہوئی تو ان سے کیا سلوک ہوا۔

اتنا معلوم ہے کہ نواب سالار جنگ کے خاندان کے بعض امرا ان کے شاگرد ہو گئے تھے اور وہ ان کے ساتھ سلوک کرتے تھے۔

غدر کے بعد منشی نولکشور مالک مطبع نے جن کا چھاپہ خانہ اس وقت تک تمام ہندوستان میں بے نظیر سمجھا جاتا ہے، ان کی طرف قدر دانی کا ہاتھ بڑھایا اور الف لیلہ کو نظم کرنے کی خدمت سپرد کی، ایک جلد اس کی تمام کر پائے تھے کہ خود ان کا قصہ تمام ہو گیا اور

۱۴رمضان ۱۲۸۲ھ کو وفات پائی۔

مزاج میں آزادی اور وارفتگی بے حد تھی، جو کچھ لکھتے تھے اس کی نقل اپنے پاس نہیں رکھتے تھے، مرنے کے بعد ان کے شاگردوں نے بڑی محنت اور کاوش سے ان کا کلام فراہم کر کے دیوان مرتب کیا۔

نسیم نے تمام اصناف سخن میں قدرت کامل پائی تھی، خصوصاً مثنوی میں ان کو ید بیضا حاصل تھا، ان کے کلام میں خیال کی دلفریبی اور بیان کی رنگینی کے ساتھ زبان کی صفائی اور پاکیزگی اس قدر نمایاں اور واضح ہے کہ اس کے ساتھ کسی دوسرے کا کلام لگا نہیں کھاتا۔

میری نظر میں وہ اپنے معاصرین اہل دہلی میں ایک ہی شخص ہیں جس نے اپنی طرز بیان کو محفوظ رکھتے ہوئے اہل لکھنؤ کی متروکات کو قبول کرنے میں پیش قدمی کی اور زبان کا ایسا اعلیٰ نمونہ پیش کیا کہ شعرائے لکھنؤ نے بھی اس کی داد دی اور یہاں رہ کر اپنے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا ایک معقول گروہ پیدا کر لیا۔

الف لیلہ منظوم کے ساقی نامے اگر ایک جگہ جمع کر دیے جائیں تو میرا خیال ہے ظہوری کا ساقی نامہ اس کے سامنے بے حقیقت ہو جائے گا، نمونہ کے طور پر چند اشعار پیش کرتا ہوں، ملاحظہ فرمایئے اور داد دیجیے۔

سنبھل ساقی کہ وقت اب اور آیا — رہوں بے ہوش پھر وہ دور آیا
مزا رکھتا نہیں بے کیف جینا — تمنا ہے کہ برسے ابر مینا
ہر اک قطرہ لہو بن بن کے ٹپکے — مرے دامن سے مے چھن چھن کے ٹپکے
طبیعت صورت مے جوش میں ہے — تمنا عزم نوشا نوش میں ہے
نظر آئے کنار جام گلگوں — لب شاعر سے ٹپکے لطف مضموں
وفور شوق وقف گفتگو ہو — سخن افسانہ ریز آرزو ہو
گلے مل مل کے لفظوں سے معانی — دکھائیں گفتگو کی نوجوانی

طبیعت محو ہو عرض سخن میں　　فسانہ یوں بیاں ہو انجمن میں

غزلوں کے منتخب اشعار ملاحظہ ہوں:

حیا بڑھنے نہیں دیتی ارادہ نوجوانی کا　　اشارہ ہو کے رہ جاتا ہے ہم پر مہربانی کا

گلے میں بخت کے ان کا بھی کچھ قصہ نکل آیا　　ہوئی تھی صلح کس مشکل سے پھر جھگڑا نکل آیا

جب دیکھیے قرار نہیں ایک حال پر　　میرا سا اب تو حال ہوا روزگار کا

کبھی آغوش میں رہتا کبھی رخساروں پر　　کاش اے آفت جاں میں ترا آنسو ہوتا

منہ میرا نہ کھلواؤ کہ ہو جائیں گے لب بند　　دیکھو یہی اچھا ہے کہ میں کچھ نہیں کہتا

افشائے محبت کا جو تھا خوف تو ہر اشک　　آنکھوں میں نہاں تھا کوئی دامن میں چھپا تھا

اب درد جگر ہو کے نکلتا ہے دہن سے　　وہ جوش جو برسوں مرے سینہ میں نہاں تھا

بہت مشکل ہے رہنا پاک دامن لوث دنیا سے
الجھ کر رہ گیا جو وادی پرخار میں آیا

اشک دیدہ ہیں ہمیں کیا خانہ ویرانی کی فکر　　گر پڑے جس جا وہی اپنا وطن ہو جائے گا

کہے دیتی تھیں یہ نیچی نگاہیں　　کہ بالائے زمیں کیا کیا نہ ہوگا

نام میرا سنتے ہی شرما گئے　　تم نے تو خود آپ کو رسوا کیا

آنکھوں میں ہے لحاظ تبسم فزا ہیں لب　　شکر خدا کہ آج تو کچھ راہ پر ہیں آپ

ہاتھ میں خنجر کمر میں ہے تیغ تیز یہ ارادے ایک مشت خاک پر

ہوتی نہیں ہے کم میری ویرانہ دوستی جاتا نہیں ہے سر سے خیال وطن ہنوز

برق نے اک طرز بیتابی مرا سیکھا تو کیا سیکڑوں باتیں ہیں ایسی خاطر ناشاد میں

ہم اسیران قفس کیا جانیں لطف بوستاں مدتوں سے مبتلائے زحمت صیاد ہیں

شوق شراب و خواہش جام و سبو نہیں ہے سب حرام جب سے کہ پہلو میں تو نہیں

میرا ہی دوست خود سبب دشمنی ہوا آئیں خرابیاں دل خانہ خراب سے

☆☆☆

میر مظفر علی خاں اسیرؔ

''شاعرے بلند فکر، عالی پایہ و دبیرے نیکو تحریر، گراں مایہ، صاحب التصانیف و کثیر التلامذہ معاصر فقیر راقم ہست۔'' (از مہر جہانتاب)

مظفر علی اسیر، میر مدد علی کے بیٹے تھے، امیٹھی ضلع لکھنؤ میں پیدا ہوئے، فارسی کی کتابیں اپنے والد سے، عربی صرف و نحو اپنے چچا سید علی اور علمائے فرنگی محل سے پڑھیں اور شیخ غلام ہمدانی مصحفی سے مشق سخن کی، مگر یہ ان کے ایسے زمانہ کے شاگرد ہیں کہ استاد کے رنگ سے ان کو کچھ حصہ نہیں ملا۔

نصیر الدین حیدر شاہ اودھ کے زمانہ میں ملازم ہوئے، آٹھ برس تک ''محکمہ صدر امانت'' میں رہے، امجد علی شاہ کے زمانے میں نواب امین الدولہ کا ستارۂ اقبال چمکا تو ان کی عنایت سے یہ میر منشی ہوگئے، جب زمانے نے ورق الٹا تو امین الدولہ سے دوستی کی پاداش میں چند دنوں اسیر رہے۔

چند دنوں کے بعد پھر تقدیر چمکی، واجد علی شاہ نے قید و بند سے آزاد کر کے تنخواہ مقرر کر دی اور ''تدبیر الدولہ مدبر الملک بہادر جنگ'' کا خطاب عنایت کیا۔

انتزاع سلطنت کے بعد رامپور یاد آیا، جس زمانہ میں نواب محمد سعید خاں لکھنؤ میں رہتے تھے، اپنے صاحبزادوں کی تعلیم ان کے سپرد کر دی تھی، اسی سلسلہ سے رامپور پہنچے اس وقت ان کے شاگرد نواب یوسف علی خاں برسر حکومت تھے، انہوں نے سرپرستی فرمائی اور اپنا کلام ان کو دکھلانے لگے۔

یوسف علی خاں کے مرنے کے بعدان کے لائق جانشین نواب کلب علی خاں مرحوم کی قدر دانی سے تھوڑے دنوں فراغت سے زندگی بسر کر کے ۱۲۹۹ھ میں وفات پائی۔

اسیر بہت پر گو اور کہنہ مشق شاعر تھے اور تمام اصناف سخن پر قدرت رکھتے تھے مگر اپنے ہم عصروں کی طرح لفظی رعایتوں کے اسیر تھے، شاگردوں میں منشی امیر احمد امیر، مولوی الٰہی بخش نازش، منشی احمد علی شوق اور ریاض احمد ریاض ایسے اچھے شاعر ہوئے جو درحقیقت استاد کی ناموری کے زیادہ تر باعث ہوئے، تصنیفات میں ایک دیوان فارسی کا ہے، چھ دیوان اردو کے اور کئی مثنویاں ہیں، ایک کتاب عروض میں زر کامل عیار شرح معیار الاشعار ہے، کئی اور رسالے عروض و قافیہ اور صرف و نحو میں ہیں۔

دشمن سے جہاں میں کوئی غافل نہیں رہتا — دشمن جو سمجھتے ہو تو کیوں مجھ سے ہو غافل

کیا ضعف سے بیمار کو چکر نہیں آتا — آنکھ اس کی پھری مجھ سے یہ باور نہیں آتا

ناز نے غمزہ پہ غمزہ نے ادا پر رکھا — ثابت اپنا نہ ہوا خون کسی پر دم حشر

تقدیر نے میری مجھے رکھا نہ کہیں کا — مسجد سے نکل کر میں رہ بت کدہ بھولا

گل خورشید کبھی زیب گریباں نہ ہوا — نفع پہنچا نہ کسی کو چمن گردوں سے
تجھ سے اتنا بھی تو اے دیدۂ گریاں نہ ہوا — اس کے دامن سے مرے خون کا دھبہ دھوتا

اب عصا بنوایئے نخل تمنا کاٹ کر — ضعف پیری بڑھ گیا زور جوانی گھٹ گیا

حیلہ ہے کہ دیکھی نہیں جاتی تپش دل — اٹھنا انہیں منظور ہے پہلو سے ہمارے

اب یہ عالم ہے کہ جھکنے لگے اغیار سے ہم — یاد ایام کہ رہتے تھے کھنچے یار سے ہم

احباب کی نظر میں سبک ہوں تو ہوں اسیر　　کرتا ہوں شکر، دل پہ کسی کے گراں نہیں

میں اور زیست ہجر میں، قدرت خدا کی ہے　　انساں کے اختیار میں اپنی اجل نہیں

دھوم محشر میں ہوئی جب تری آمرزش کی　　بیکنہ مل گئے چھپ چھپ کے گنہگاروں میں

باقی ابھی ہے ترک تمنا کی آرزو　　کیوں کر کہوں کہ کوئی تمنا نہیں مجھے

وہ نہ آیا تھا اگر موت ہی آتی شب ہجر　　اے فلک کوئی تو امید برآئی ہوتی

خدا جانے یہ کس کی جلوہ گاہ ناز ہے دنیا　　بہت آئے گئے رونق وہی باقی ہے محفل کی

☆☆☆

شیخ امداد علی بحر

امداد علی نام، بحرؔ تخلص، امام بخش کے بیٹے اور اپنے باپ کے ہم نام شیخ امام بخش ناسخؔ کے شاگرد ہوئے، لکھنؤ وطن تھا، گندم گوں، دبلے پتلے، میانہ قد، صحت الفاظ، تحقیق لغت اور فن عروض میں مشہور، رشکؔ کے بعد ناسخؔ کے شاگردوں میں ممتاز درجہ رکھتے تھے۔

چھوٹی شہزادی کی سرکار سے کچھ وظیفہ ملتا تھا، انہی کی ڈیوڑھی پر پھاٹک کی بغل میں ایک کمرہ تھا، وہیں افیون گھلا کرتی تھی اور ایک بوسیدہ چٹائی پر بیٹھے رہتے، لوگ دور دور سے تحقیق الفاظ کو آتے اور اسی بوسیدہ بوریے پر بیٹھنا فخر سمجھتے تھے۔

دن بھر ڈیوڑھی میں بیٹھ کر شام کو گھر آتے، توپ دروازہ میں ایک کچا سا مکان تھا، بیوی تھیں اور آپ تھے، لوگ کہتے ہیں کہ ایک لڑکی اور ایک لڑکا بھی تھا، پینسٹھ برس اسی عسرت اور تنگ حالی میں بسر کیے، نواب کلب علی خاں مرحوم کو خبر ہوئی کہ لکھنؤ میں ایک زبان داں موجود ہے، بلوا بھیجا اور عزت افزائی فرما کر تنخواہ مقرر کردی، عرصہ تک رامپور میں رہے، آخر وقت میں وطن یاد آیا، نواب کے یہاں مشاعرہ تھا، یہ بھی غزل لے کر پہنچے، مقطع میں لکھنؤ کی جدائی کا اظہار دردناک انداز سے کیا تھا، نواب کو رحم آیا، کچھ دے دلا کر رخصت کردیا، یہ پھر اسی مسند جم پر آبیٹھے جس کے بارے میں خود فرماتے ہیں ؎

خدا آباد رکھے لکھنؤ کے خوش مزاجوں کو ہر اک گھر خانہ شادی ہے ہر کوچہ ہے عشرت کا

مزاج کی وارفتگی نے دیوان کی ترتیب کا موقع نہیں دیا، ان کے دوستوں کو جو کچھ غزلیں ہاتھ لگیں، ردیف وار جمع کیں اور جو ردیف خالی تھی اس میں غزلیں لکھوا کر شامل کیں،

یہ دیوان چھپ گیا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اردو کا ایک لغت لکھنا شروع کیا تھا، ان کے مزاج کو دیکھتے ہوئے اس کی کیا توقع ہے کہ اس کو پورا کیا ہو، تخمیناً پچھتر برس کی عمر میں ۱۳۰۰ھ میں وفات پائی۔

نہ تو وہ پھول نہ کلیاں نہ وہ سبزی نہ بہار — رت کے پھرتے ہی چمن زار کا تختہ الٹا

میرا دل کس نے لیا نام بتاؤں کس کا — میں ہوں یا آپ ہیں گھر میں کوئی آیا نہ گیا

کیا کیا نہ مجھ سے سنگ دلی دلبروں نے کی — پتھر پڑیں سمجھ پہ نہ سمجھا کسی طرح

وصل جاناں نہ ہوا وقت وصال آ پہنچا — وائے حسرت کہ رہی دل کی تمنا دل میں

ظالم ہماری آج کی یہ بات یاد رکھ — اتنا بھی دل جلوں کا ستانا بھلا نہیں

مدت سے التفات مرے حال پر نہیں — کچھ تو کجی ہے دل میں کہ سیدھی نظر نہیں

افسوس عمر کٹ گئی رنج و ملال میں — دیکھا نہ خواب میں بھی جو کچھ تھا خیال میں

ہوا بدل گئی پیری میں نوجوانی کی — بہار دیکھ چکے باغ زندگانی کی

آشائش بیجا سے مسرت نہیں ہوتی — سو جائیں اگر پاؤں تو راحت نہیں ہوتی

بسمل ہجر سے پوچھے کوئی مرنے کی خوشی — جان آتی ہے بدن میں کہ قضا آتی ہے

داغ کو کیوں نہ کلیجے سے لگائے رکھوں — مجکو اس پھول سے خوشبوئے وفا آتی ہے

کئی برسات پھر اس سال بھی فریاد و شیون میں — خبر ہم کو نہیں بادل کدھر آئے کدھر برسے

دور دوم

منشی امیر احمد امیر

منشی امیر احمد امیر مولوی کرم احمد مینائی کے بیٹے اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے، نسب کا سلسلہ مخدوم شاہ میناؒ کے خاندان سے ملتا ہے، ۱۶ رشعبان ۱۲۴۴ھ کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے، درسی کتابیں مفتی سعد اللہ مرحوم اور ان کے ہم عصر علما سے پڑھ کر شعر و سخن کا شوق پیدا ہوا، منشی مظفر علی اسیر کے شاگرد ہو گئے اور کچھ دنوں کی محنت و جانکاہی میں ایسی مشق بہم پہنچائی کہ استاد سے بھی آگے بڑھ گئے۔

۱۲۶۹ھ میں خوش قسمتی سے دربار شاہی تک رسائی ہو گئی، ارشاد السلطان وہدایۃ السلطان دو کتابیں لکھ کر پیش کیں اور خلعت فاخرہ سے سرفراز ہوئے۔

غدر کے بعد ۱۲۷۵ھ میں رامپور گئے، نواب یوسف علی خاں نے قدر دانی فرمائی، ۱۲۸۱ھ میں ......نواب کلب علی خاں (۱) مسند نشیں ہوئے اور خوش قسمتی سے امیر کو نواب کی استادی کا شرف حاصل ہوا۔

---

(۱) نواب کلب علی خاں والی رامپور علم دوست، ہنر پرور اور قدر دان رئیس تھے، ۱۲۸۱ھ میں اپنے والد نواب یوسف علی خاں کی جگہ مسند نشین ہوئے اور اپنی دانش مندی سے رامپور جیسی چھوٹی سی ریاست میں ایسے ایسے باکمال لوگوں کو جمع کر لیا جس کی نظیر نہیں۔

علما کے گروہ میں علامہ عبدالحق خیر آبادی، علامہ عبدالعلی مہندس، مولانا ارشاد حسین (باقی اگلے صفحہ پر)

یہ زمانہ منشی امیر احمد کے عروج واقبال کا زمانہ تھا، یہ جوہر قابل اور نواب جیسا قدرشناس جوہری ؏

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

سابقہ حاشیہ: سید حسن شاہ محدث، مفتی سعد اللہ اور ایسے ایسے نامور فاضل جن سے کسب کمال کرنے کو عرب وعجم سے شائقین علوم آیا کرتے تھے، اطبا میں حکیم محمد ابوابراہیم، حکیم علی حسین، حکیم عبدالعلی اور حکیم حسین رضا جو اپنے زمانہ کے چیدہ اور برگزیدہ لوگ تھے، شعرا میں میر مظفر علی اسیر، شیخ امداد علی بحر، میر اسماعیل حسین منیر، آفتاب الدولہ قلق، احمد حسن عروج، مرزا رحیم الدین حیا، منشی امیر احمد امیر، نواب مرزا خان داغ، شیخ امیر اللہ تسلیم، حکیم ضامن علی جلال، جان صاحب ریختی گو، آغا، ہجو اور خدا جانے کتنے شاعر جو اپنے زمانہ میں مشہور و مستند مانے جاتے تھے، یہ سب رامپور کے وظیفہ خوار تھے۔

غدر کے بعد دلی اور لکھنؤ میں جو جس فن کا باکمال تھا، اس کو رامپور کے سوا کہیں ٹھکانا نہ تھا، سرکاری باورچی خانہ میں ایسے ایسے رکابدار جمع کیے تھے جن کا مثل ہندوستان میں نہ تھا، داستان گو ایسے ایسے قابل کہ جس وقت داستان گوئی پر آتے تو بات بات میں انعام وخلعت سے سرفراز ہوتے، چوبدار اور مردہے ایسے ادب وآداب اور سلیقے کے کہ دوسری جگہ کے فہمیدہ اور سنجیدہ لوگ ان کے سامنے بات نہ کرسکتے تھے۔

لطیفہ مولوی بشارت اللہ فرزند مفتی سعد اللہ مرحوم مجھ سے کہتے تھے کہ ایک بار نواب سرشام سوار ہوئے، جامع مسجد کے قریب سواری پہنچتے پہنچتے نماز کا وقت آگیا، ہوادار سے اتر کر مسجد میں نماز پڑھی اور آکر پھر سوار ہوئے، چوبدار نے دیکھا کہ پیشانی پر ایک تنکارہ گیا ہے، جب سوار ہولیے تو اس نے بڑھ کر یہ آیت پڑھی ''وسیماھم فی وجوھھم من اثر السجود'' نواب نے ہنس کر رومال سے پیشانی صاف کرلی، اس سے تم اندازہ کرسکتے ہو کہ نواب نے گردوپیش کیسے لوگوں کو جمع کرلیا تھا۔

مگر یہ بھی سنو کہ اس چھوٹی سی ریاست میں اتنے لوگوں کی گنجائش کیسے نکالی تھی، یہ جتنے لوگ تھے ان کی تنخواہیں بڑی بڑی نہیں تھیں، مولانا ارشاد حسین، مولوی عبدالحق اور منشی امیر احمد کے علاوہ کسی کی تنخواہ سو روپیہ سے زیادہ نہیں تھی، علاوہ اس کے جو جس کام کا اہل تھا، اس سے وہ کام بھی لیا جاتا تھا (باقی اگلے صفحہ پر)

نواب کی زندگی بھر رامپور میں رہے اور مزہ میں رہے، نواب کی قدر دانی، امیر، منیر، داغ، تسلیم، جلال، اوج، عروج اور بحر کی صحبت، شعر و سخن کے چرچے ایسی باتیں تھیں جو

سابقہ حاشیہ: مگر نواب کا رکھ رکھاؤ اس غضب کا تھا کہ جو ایک دفعہ ان کے دربار تک پہنچ گیا، وہ پھر رامپور سے نکلنے کا نام نہ لیتا تھا، بات یہ تھی کہ عید، بقر عید، سال گرہ اور عام طور پر خوشی کے موقعوں پر لوگوں کو خلعت و انعام ملتے تھے اور جن سے زیادہ خصوصیت تھی ان کی خبر گیری خود نواب رکھتے تھے، ان کو معلوم ہوتا کہ مولوی عبدالحق قرضدار ہو گئے ہیں، بلا کر حال پوچھتے اور جتنا قرض ہوتا اس سے کچھ زیادہ ہی عنایت فرماتے، یہ لوگ بھی داد و دہش کے خوگر ہو گئے تھے، بے ضرورت بھی قرضدار بن جاتے تھے۔

حیدرآباد میں نواب مرزا خاں کی دو ہزار روپیہ ماہوار تک تنخواہ ہوئی اور نواب فصیح الملک خطاب پایا مگر رامپور کو مرتے دم تک نہیں بھولے، حکیم عبدالعلی مرحوم میرے استاد تھے، رامپور سے آنے کے بعد واجد علی شاہ نے انہیں یاد فرمایا، ان کے مرتے وقت تک کلکتہ رہے، اس کے بعد بھوپال بلائے گئے نواب شاہجہاں بیگم جیسی فیاض اور سیر چشم فرمانروا کا زمانہ، دونوں جگہ تنخواہ المضاعف، مگر میں نے ان کو دیکھا ہے کہ جس وقت نواب کلب علی خاں کا نام آجاتا آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہو جاتے اور پہروں انہی کا ذکر کرتے۔

نواب کی صحبتوں میں مولانا عبدالحق، مولانا عبدالعلی، مفتی سعد اللہ، منشی امیر احمد اور دیگر علماء و شعرا حاضر رہتے، مناظرہ کا شوق تھا، علما میں کوئی مسئلہ چھیڑ دیتے اور مزے لیتے، شعر و سخن، الفاظ کی تحقیق اور محاوروں کی صفائی و صحت پر شعرا کی گفتگو سنتے اور خود قول فیصل بیان کرتے۔

دینداری کی حیثیت سے دیکھو تو اس میں شان بے مثالی تھی، نماز روزہ کے پابند، ذکر و شغل کے عادی، زکوٰۃ باقاعدہ ادا کرتے، حج کا سفر جس دھوم سے کیا ہے اس کو زمانہ جانتا ہے، دلی سے حضرت شاہ احمد سعیدؒ کو تشریف لانے کی تکلیف دی، وہ خود تشریف نہیں لائے مگر اپنے فرزند ارجمند مظہر شریعت و طریقت حضرت شاہ عبدالرشید علیہ الرحمہ کو بھیج دیا، ان کے حق پرست پر بیعت کی اور ان کی تشریف بری کے بعد مرتے دم تک مولانا ارشاد حسین خلف حضرت ممدوح سے اذکار و اشغال کی ورزش کرتے رہے۔

حکیم عبدالعلی مرحوم فرماتے تھے کہ مرض الموت میں ایک دن مجھ سے فرمایا (باقی اگلے صفحہ پر)

دارالسرور رامپور سے ہٹنے نہیں دیتی تھیں۔

نواب کے انتقال کے بعد زمین پاؤں کے نیچے سے نکل گئی، وہ قدردانی، وہ محبتیں،

سابقہ حاشیہ: کہ تم پر میرے جس قدر حقوق ہیں وہ تم جانتے ہو اور میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ تم کس قدر محبت و محنت سے میرا علاج کر رہے ہو مگر جب وقت آجاتا ہے کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی، اس لیے تم سے صرف ایک کام متعلق کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ جس وقت تم کو یہ معلوم ہو جائے کہ میں اب جانبر نہ ہو سکوں گا مجھے فوراً مطلع کر دو، وہ فرماتے تھے کہ میں اس بات کو سن کر سناٹے میں آگیا اور سوچنے لگا کہ میں اس فرض کو کیوں کر ادا کر سکتا ہوں، نواب مجھ کو فکر مند دیکھ کر سمجھ گئے اور وہ مجھ سے دوبارہ تاکید کی، جب وقت آیا تو میں نے بار بار قصد کیا مگر زبان نہ ہلتی تھی، خدا جانے کیوں کر ان سے کہا یا وہ خود سمجھ گئے، حکم ہوا کہ مولانا ارشاد حسین صاحب کو بلاؤ وہ تشریف لائے تو لوگوں کو باہر جانے کا اشارہ کیا اور ان سے فرمایا کہ وقت آپ کی ہمت اور توجہ کا ہے، یہ کہہ کر دونوں مراقب ہو گئے اور اسی حالت میں روح نے جسد عنصری سے مفارقت کی، سبحان اللہ دنیا خورد عقبیٰ برد کے یہی معنی ہیں، ۱۳۰۰ھ کا یہ واقعہ ہے، چار دیوان ریختہ کے ان سے یادگار ہیں، کلام کا رنگ ملاحظہ ہو:

مرے ہی سامنے اغیار کی ہنس ہنس کے باتیں ہوں ۔۔۔ مجھی سے ہو پھر الٹا شکوہ میری بدگمانی کا

بچا ہوا تھا جو کچھ چال سے ترا فتنہ ۔۔۔ بدل کے رنگ وہی گردش زمانہ ہوا

گالیاں روز تھیں پر ہم نے سنا ہے نواب ۔۔۔ اور کچھ شب کو ہوا آپ کا اعزاز نیا

دیا ہے بوسہ اسے پھر لو تو ہم جانیں ۔۔۔ یہ دل نہیں ہے کہ لے جاؤ مسکرا کر تم

عجب حسرت سے دیکھا ہے سوئے جاناں دم آخر ۔۔۔ رہے گی یاد اس کو بھی نگاہ واپسیں برسوں

کہتی ہے جس کو فتنۂ محشر تمام خلق ۔۔۔ ڈرتا ہوں وہ بھی کوئی تمہاری ادا نہ ہو

ادا سے ناز سے غمزے سے مسکرانے سے ۔۔۔ وہ دل کو لیتے ہیں مل جائے جس بہانے سے

وہ اطمینان وفراغت سب باتیں خواب پریشاں ہوکر آنکھوں سے اوجھل ہوگئیں، چنانچہ فرماتے ہیں:

امیر اب ہم کہاں اور اب کہاں داغ   یہ جلسے ہوچکے خلد آشیاں تک

سب سے پہلے نواب مرزا داغ حیدر آباد کو سدھارے، ایک مدت تک امیدواری کی، جب دربار شاہی تک رسائی ہوگئی تو روز ورود سے اس وقت تک کی تنخواہ مل گئی۔

منشی امیر احمد کو بھی قسمت آزمائی کا شوق ہوا، یہ بھی گئے مگر وہاں کی خاک دامنگیر تھی، چند ہی روز کے بعد ۱۹ر جمادی الاولیٰ ۱۳۱۸ھ کو سفر آخرت گوارا کیا۔

سچ یہ ہے کہ امیر و داغ اس دور آخر میں فلک شاعری کے آفتاب و ماہتاب تھے، ایک مضمون آفرینی کا دلدادہ تھا تو دوسرا بیان کی شوخی اور معاملہ نگاری پر فریفتہ، امیرؔ کے ہاں نازک خیالی کے ساتھ شکوہ الفاظ کی بھی چاشنی ملی ہوئی تھی اور مزہ یہ ہے کہ اس میں دقت پسندی کو وہ جائز نہیں رکھتے تھے۔

اہل سخن کا اتفاق ہے کہ امیر اس فن میں استاد مسلم الثبوت تھے، وہ ایسی طبیعت لے کر آئے تھے جو شعر وانشا کے لیے موزوں تھی، انہوں نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی کی ہے، اس پر کلام کا زور مضمون کی نزاکت سے ہر جگہ دست وگریباں ہے، بندش کی چستی اور ترکیب کی درستگی سے لفظوں کو خوبصورتی سے پہلو بہ پہلو جوڑتے ہیں، خیالات نازک اور مضامین بلند اس طور پر باندھتے ہیں کہ اس باریک نقاشی پر فصاحت آئینہ کا کام دیتی ہے۔

ان میں ایک خصوصیت یہ بھی ہے جو داغؔ میں نہیں ہے کہ جیسے جیسے یہ بوڑھے ہوتے گئے، کلام میں جوانی کی امنگیں بڑھتی گئیں، پہلا دیوان ان کا مراۃ الغیب ہے، بہت ضخیم اس میں سب کچھ ہے، قصائد، دیوان ریختہ جس میں لاجواب غزلیں، رباعیاں، قطعات، تاریخیں، مخمس وغیرہ ہیں۔

دوسرا دیوان صنم خانۂ عشق ہے، جو ضخامت میں مراۃ الغیب سے کم نہیں، صحت زبان، صفائی محاورہ اور پختگی کلام میں اس سے بہتر ہے۔

تیسرا دیوان محامد خاتم النبیین نعت میں ہے جو اس لحاظ سے اچھا ہے کہ نعت کا وہ مذموم طریقہ جس میں شاعرانہ مبالغہ کے ساتھ دیگر انبیائے کرام کے جناب میں گستاخی کا جو پہلو نکلتا ہے، اس کو چھوڑ کر نئی راہ نکالی ہے مگر افسوس ہے کہ باوجود صحت زبان و پختگی کلام کے تاثیر یا سوز و گداز کا کہیں پتہ نہیں، اصل یہ ہے کہ انداز بیان کا جو سانچہ ناسخ و آتش کے زمانے میں تیار ہوا تھا، اس میں ڈھل کر شعر با مزہ ہو ہی نہیں سکتا، اس سانچہ کو توڑ کر دوسرا سانچہ تیار کرلو تو اس کی دوسری بات ہے۔

اردو نثر میں خیابان آفرینش ایک رسالہ جس کی صاف و سادہ عبارت میں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کے مولود مسعود کا ذکر صحت اور صفائی کے ساتھ کیا ہے، یہ رسالہ اس قابل ہے کہ عورتوں اور بچوں کے نصاب درس میں داخل کیا جائے۔

ایک تذکرہ شعرائے رامپور کا انتخاب یادگار کے نام سے بفرمائش نواب کلب علی خاں مرحوم لکھا تھا، اس کی نسبت امیر نے ایک دوست کو خط میں لکھا ہے کہ ''اس میں مجکو حالات تاریخی اور انتخاب اشعار میں ایسی مداخلت ہے جیسی قلم کو دست کاتب میں۔''

ان تصنیفات کے سوا جوہر انتخاب، گوہر انتخاب، مضامین دل آشوب، واسوختوں اور قصیدوں کا مجموعہ، مثنویوں میں نور تجلی، ابر کرم، ایک مسدس نعتیہ جس کا نام ذکر شاہ انبیا ہے، چھپ چکے ہیں۔

سب سے بڑی اور مفید تصنیف امیر مینائی کی امیر اللغات ہے جو افسوس ہے کہ پوری نہ ہوئی، صرف دو جلدیں اس کی الف ممدودہ و الف مقصورہ کی شائع ہوئی ہیں، یہ کتاب پوری ہوگئی ہوتی تو اردو زبان کے سرمایہ میں بیش بہا اضافہ ہو جاتا۔

نمونۂ قصائد

شب دوشینہ جو لی خواب میں میں نے کروٹ　　　آئی اک حور لقا پاس الٹ کر گھونگھٹ

شعلۂ رخسار، جفا کار، قیامت آفت
شوخ عیار، غضب قہر چھلاوا نٹ کھٹ

وہ نگاہیں غضب آلود و مژگاں کی صفتیں
لشکر صبر جنہیں دیکھ کے کھائے گھونگھٹ

پختہ کار اس کو جو دیکھیں طمع خام کریں
ثمر پیش رس حسن میں وہ گدراہٹ

طرفہ چہرہ کی لطافت وہ سنہری رنگت
دست افشار طلا سے بھی سوا نرماہٹ

آپ ہی چھیڑ کرے آپ ہی پھر حد سے بڑھے
تو سن ناز کو پوئی سے وہ پھینکے سرپٹ

مستی حسن سے گردوں پہ کبھی ڈال دے ہاتھ
بے چھوئے گاہ لجالو کی طرح جائے سمٹ

پتلیاں آنکھوں کی در پردہ اشاروں سے کہیں
ناچنے ہی کو جو نکلے تو کہاں کا گھونگھٹ

فتنۂ حشر کو دیکھے تو کہے زلف سے آنکھ
لاجھپٹے میں اسے دیر نہ کر دوڑ جھپٹ

طاق کاکل وہ پھینکتی میں کہ سر کی کوئی چوٹ
روک لے مڑ کے تو جھک کے لگائے پالٹ

دیکھ کر ابرو پیوستہ یہ ہوتا تھا گماں
پہلواں دو ہیں کہ کشتی میں ہوئے ہیں غت پٹ

جلوہ گر مردم چشم وصف مژگاں سے یہ صاف
حور بیٹھی ہے در خلد پہ کھولے ہوئے پٹ

بڑھ کے گلبرگ سے بھی وہ کف رنگیں نازک
غنچے لیں انگلیوں کی کیوں نہ بلائیں چٹ چٹ

سینہ آئینہ شفاف شکم چشمۂ حسن
موج دریائے لطافت شکم صاف کی پٹ

غرض اس شکل کی معشوقہ کیا جس کا بیاں
نظر آئی تو عجب جی کو ہوئی للچاہٹ

شوق دل نے یہ کہا مست ہے یہ سرو کہی
عشق بچے کی طرح جایئے مستی میں لپٹ

ہاتھ دامن پہ پڑا تھا کہ وہ پیچھے سرکی
سر قدم تک بھی نہ پہنچا کہ گئی دور وہ ہٹ

چوٹ سی دل پہ لگی ہاتھ گیا جب خالی
تازیانہ سے نہیں کم وہ پڑی تیغ جو پٹ

ہنس کے ظاہر میں کہا واہ ری ٹھنڈی گرمی
آپ ہی لطف و کرم آپ ہی یہ جھنجھلاہٹ

چپ رہی پہلے کہا تو یہ کہا دیر کے بعد
تھی ملاقات کہاں کی کہ یہ تیزی جھٹ پٹ

ہوش میں آؤ ذرا خیر ہے کیسا ہے مزاج
خفقاں سے تو طبیعت میں نہیں گھبراہٹ

میں وہ ہوں جس کی ہوس میں ہیں ہزاروں نامی
سیکڑوں مر گئے تھی جن کو مرے نام کی رٹ

ذوق وصلت میں ہووے گور کنارے کتنے — شوق دیدار میں کتنوں کی گئی آنکھ الٹ
پاؤں کتنوں کے گھسے مثل سبو سر پھاڑے — بادۂ وصل کی پائی نہ کسی نے تلچھٹ
ناطقہ خانہ دولت ہے مرا نام صفت — میں مکیں ہوں تو مکاں جائے زر و سیم سے پٹ
ملہم غیب نے بھیجا میں آئی ترے پاس — ہو گراں تجھ کو جو آنا ابھی جاؤں میں پلٹ
وصف تو کرتا ہے جس کا میں اس کی ہوں صفت — دیکھ اعضا کو ذرا پردۂ غفلت کو الٹ
روئے انور سے اسی کی مری آنکھوں میں ہے نور — خلق اس کا مرے گیسو میں ہے خوشبو کی لپٹ
صف مژگاں سے عیاں پنجۂ پرزور کی شکل — عزم اس کا مرے شاہین نگہ کی ہے جھپٹ
اس کی جو راستی طبع وہ ہے قد میرا — دامن فیض کا لٹکاؤ مرے زلف کی لٹ
مصحف رخ کو جو دیکھو تو نمایاں وہی شان — کعبۂ دل کو جو دیکھو تو اسی کی چوکھٹ
کون وہ کلب علی خاں بہادر جم جاہ — دیتے ہیں جس کو ملک عالم بالا کی رپٹ

عالم خواب میں پہنچا میں عجب باغ میں کل — شجر طور کو جس باغ کی کہیے کونپل
خواب میں سبزۂ خوابیدہ جو یاں کا دیکھے — خواب ہو طالع خوابیدہ کا خواب مخمل
سامنے اس کے کسی اور چمن کا کیا ذکر — گلشن خلد بھی مجکو نظر آیا جنگل
اک شگوفہ تھا اسی باغ کا باغ عشرت — ایک غنچہ اسی گلزار کا گلزار امل
ساغر عشرت کونین وہیں کے دو پھول — میوۂ مقصد دارین وہیں کے دو پھل
سخت حیراں ہوں کہ دیوار کو دوں کس سے مثال — کہوں آئینہ تو آئینہ میں نہیں اتنا دل
دست مژگاں سے سنبھالے تھیں نگہ کو آنکھیں — پھر بھی دیوار پر جب چڑھتی تھی جاتی تھی پھسل
خط گلزار سے ہو گل پہ یہ مصرع تحریر — نقش ثانی ہے یہ فردوس ہے نقش اول
ہے یہ تاثیر نمو ہاتھ جو مجرم کے کٹیں — صورت دست چنار آئیں نئے سر سے نکل
اور شاخوں کا تو کیا ذکر یہ ہے فیض نمو — نکلے گر پات میں بھی شاخ تو پھوٹے کونپل

ٹکڑے بدلی کے نہ تھے ہندوسن کے لیے　　بھر کے آیا تھا وہاں چھاگلوں میں گنگا جل
نوجوانان چمن دھوپ میں کیا کمھلاتے　　چتر کھولے ہوئے پھرتے تھے ہوا پر بادل
لڑکھڑاتا تھا جو مستی میں کہیں پائے نسیم　　غنچہ کہتا تھا چٹک کر کہ خبردار سنبھل
ہوگیا لوٹ میں سامان یہ آیا جو نظر　　پاؤں کس طرح سنبھلتا کہ گیا دل ہی پھسل
لے اڑی ہوش مری حیرت نظارۂ باغ　　آ گیا غش مجھے بیہوش گرا سر کے بھل
متحیر تھا کہ یارب ہے یہ کیسا گلزار　　غنچہ ہے تنگ دہن کس سے معما ہو یہ حل
گوش گل میں ہے ہوائے طرب انگیز بھری　　کون سنتا ہے جو پوچھوں میں کہ کیا ہے یہ محل
قمریوں کو نہیں کوکو سے مجال گفتار　　بلبلوں کو نہیں نغموں سے کسی شاخ پہ کل
تھا اسی فکر سے دریائے تحیر میں غرق　　کہہ رہا تھا کہ زہے صنعت صناع ازل
ناگہاں طرف چمن میں نظر آیا اک نور　　آنکھ نے دل سے کہا دیکھ کے اس کو کہ سنبھل
طرفۃ العین میں وہ روشنی آ پہنچی قریب　　کھل گیا دیکھتے ہی اس کو مرے دل کا کنول
دیکھتا کیا ہوں کہ ہے بیچ میں اک حور لقا　　کچھ حسیں گرد ہیں آگے ہے فروزاں مشعل
حور وہ حور جسے دیکھے تو فردوس سے حور　　مضطرب نعرہ زناں خاک بسر آئے نکل
فرق سے تابقدم پیکر انداز و ادا　　غمزۂ و ناز سے ڈالے دل عاشق کو مسل
گرمی حسن سے رخسار بھبوکا ایسا　　شمع کی طرح جسے دیکھ کے دل جائے پگھل
چوکڑی آہوئے مشکیں کو ختن میں بھولے　　بال کھولے جو حلب میں وہ دکھائے چھل بل
قطرے کہتے تھے پسینے کے رخ گلگوں پر　　جوش کھا گرمی حسن آئی ہے چہرے پہ ابل
پتلیوں کا جو ان آنکھوں کی تماشا دیکھا　　دل ناداں مرے پہلو میں گیا اور مچل
تیر پر تیر پڑے دل پہ نگاہیں جو لڑیں　　نیم جاں پاؤں پہ اس کے میں گرا سر کے بھل
اور کی عرض کہ اے عشوہ گر جلوہ فروش　　رحم کر رحم بس آگے دل مضطر کو نہ چھل
رخ روشن کی طرح آئینہ تو مجکو کیا　　اپنے گیسو کی طرح کر مرے عقدوں کو بھی حل

کون سا باغ ہے یہ کون ہے تو میں ہوں کہاں
تجھ سے وحشت نہیں یہ اور ہے حیرت کا محل

متبسم ہوا پہلے تو وہ سرمایہ ناز
پھر اک انداز سے بولا یہ دکھا کر کس بل

سر اٹھا پانوں سے یہ بے ادبی خوب نہیں
اچھی صورت پہ گیا دیکھتے ہی خوب پھسل

ہوش میں آ یہ نہیں قسم نباتات سے باغ
ہے سراپا چمن صنعت خلاق ازل

انس کچھ آج نیا تجکو نہیں مجھ سے
کھا چکا چوٹ مرے حسن کی تو روز ازل

نہ پری ہوں میں نہ انساں ہوں نہ غلماں ہوں نہ حور
پر لطافت میں نزاکت میں ہوں ان سے افضل

باغ نقشہ ہے صفات حسنہ کا اس کے
حسن فطرت میں جو یوسف سے کہیں ہے افضل (معاذاللہ)

ہاتھ پھیلائے جو شاخیں زر گل دیتی ہیں
ہے یہ مطلب کہ دہش میں ہے وہ بے مثل و بدل

اشرفی کے جو گلوں کا ہے چمن میں انبار
یہ اشارہ ہے کہ دولت میں ہے وہ ضرب مثل

جوش رحمت کا ہے اس بحر کرم کے شمہ
اس گلستاں میں جو برساتا ہے پانی بادل

دیکھتا ہے جو رواں نہر میں پانی شفاف
چشمہ فیض یہ اس کا نہیں ہے گنگا جل

پوچھتا ہے جو حقیقت کو مری او ناداں
طبع نازک ترے آقا کی ہوں اے عبد اقل

تغزل کا رنگ ملاحظہ ہو

کہاں وہ اہل وطن کی صحبت وطن کو چھوٹے ہوئی ہے مدت
کسی کسی کی ہے یاد دل میں، خیال کچھ ہے کہیں کہیں کا
قریب ہے یارو روز محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیوں کر
جو چپ رہے گی زبان خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

لاکھوں اس لیلیٰ کے دیوانے ہیں ان میں عشق نے
اک مشت استخواں کا نام مجنوں رکھ دیا

وہ آئے سب کو کھینچ کے تلوار سب کو شاد کیا　　امیر آج بہت ہم نے تم کو یاد کیا

مرے ہی سامنے دامن اٹھا کر ناز سے چلنا　　مجھی سے پھر گلہ الٹا مرے چاک گریباں کا
جگر کو دوں کہ دل کو دوں بتا اے ناوک قاتل　　کہ دو پیاسوں میں ہے یہ ایک قطرہ آب پیکاں کا

پہلو میں مرے دل کو نہ اے درد کر تلاش　　مدت ہوئی غریب وطن سے نکل گیا

جب کہا میں نے شب غم کوئی غم خوار نہ تھا　　درد نے اٹھ کے کہا کیا یہ گنہگار نہ تھا

ہر جگہ جوش محبت کا نیا عالم ہوا　　آنکھ میں آنسو، جگر میں داغ، دل میں غم ہوا
روکنا فرقت میں اشکوں کا نہیں اچھا امیر　　چار دن کے ضبط میں دیکھو تو کیا عالم ہوا

مرغان باغ! تم کو مبارک ہو سیر گل　　کانٹا تھا ایک میں سو چمن سے نکل گیا

کلیم شکر کرو حشر تک نہ ہوش آتا　　ہوئی یہ خیر کہ وہ شوخ بے نقاب نہ تھا

صورت تری دکھا کے کہوں گا میں روز حشر　　آنکھوں کا کچھ گناہ نہ دل کا قصور تھا

وہ مزا دیا تڑپ نے کہ یہ آرزو ہے یارب　　مرے دونوں پہلوؤں میں دل بے قرار ہوتا
جو نگاہ کی تھی ظالم تو پھر آنکھ کیوں چرائی　　وہی تیر کیوں نہ مارا جو جگر کے پار ہوتا

دیر کی تحقیر کر اتنی نہ اے شیخ حرم　　آج کعبہ بن گیا کل تک یہی بت خانہ تھا

دیکھ اے درد جدا ہو نہ دل محزوں سے　　اور الجھے گا یہ بیمار جو تنہا ہوگا

خواہش وصل تو کیوں کر کہوں لیکن ناصح　　دیکھ لینے کا تو حضرت کو بھی ارماں ہوگا

آگ جو دل میں لگی تھی وہ بجھائی نہ گئی　　اور کیا تجھ سے پھرا اے دیدۂ گریاں ہوگا

سب کرشمے تھے جوانی کے جوانی کیا گئی　　وہ امنگیں مٹ گئیں وہ ولولہ جاتا رہا
آنے والا جانے والا بے کسی میں کون تھا　　ہاں مگر اک دم غریب آتا رہا جاتا رہا

گل ہوا غنچہ تو آواز یہ اس سے آئی　　جمع پھر دل نہیں ہوتا ہے پریشاں ہوکر

ہمارے سامنے بڑھ بڑھ کے بولتا ہے بہت　　ملے وہ اب کی تو ناصح کو سامنے کر دیں

عمر کو سارا زمانہ گزران کہتا ہے　　دن جدائی کا مگر عمر میں محسوب نہیں

کانٹا ہوا ہوں سوکھ کے لیکن نہال ہوں　　کھٹکوں گا اور اپنے عدو کی نگاہ میں

تو نے تو اے سیاہی شبہائے تارِ ہجر　　دھبہ لگا دیا مرے بخت سیاہ میں

اے برق تو ذرا کبھی تڑپی ٹھہر گئی　　یاں عمر کٹ گئی ہے اسی اضطراب میں

ظاہر میں ہم فریفتہ حسن بتاں کے ہیں　　پھر کیا کہیں نگاہ میں جلوے کہاں کے ہیں
وہ اور وعدہ وصل کا قاصد نہیں نہیں　　سچ سچ بتا یہ لفظ انہیں کے زباں کے ہیں

نہ کرائے یاس یوں برباد میرے خانہ دل کو　　اسی گھر میں جلایا ہے چراغ آرزو برسوں

دنیا ہے طرفہ میکدۂ بے خودی امیرؔ　　سب مست ہیں کسی کو کسی کی خبر نہیں

زاہد امید رحمت حق اور ہجو مے　　پہلے شراب پی کے گنہگار بھی تو ہو

وصال پر ہے جو وصل امتحاں کر دیکھو　　امیر یوں ہی سہی چند روز مر دیکھو

الفت میں برابر ہے وفا ہے کہ جفا ہو　　ہر بات میں لذت ہے اگر دل میں مزا ہو

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ　　سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

غیروں کے حال پر تو بہت لطف ہے تمہیں　　ہم پر بھی لطف حال ہمارا بھی غیر ہے

مسجد میں بلاتا ہے ہمیں زاہد نافہم　　ہوتا کچھ اگر ہوش تو مے خانے نہ جاتے

قدم کو لغزش زبان کو لکنت ہے رعشہ ہاتھوں کو سر میں جنبش
کہاں گئی ہائے نوجوانی ان آفتوں میں مجھے پھنسا کر

لگی دل کی بجھائے بیکسی میں کون ہے ایسا　　مگر اک گریۂ حسرت کہ بیتابانہ آتا ہے

شب وصلت قریب آنے نہ پائے کوئی خلوت میں
ادب ہم سے جدا ٹھہرے حیا تم سے جدا ٹھہرے

ایک قطرہ بھی نہ پینا مگر اے جانِ جہاں　　اسی انداز سے کہہ دے کہ نہیں تھوڑی سی

چھوڑے کہیں نہ گیسوئے پرخم نے اس کے پیچ　　کچھ رہ گئے تو میرے مقدر میں رہ گئے

آنکھ کہتی ہے یہ دل سے کہ کرے گی برباد　　خواہشِ وصل تجھے حسرتِ دیدار مجھے

تھی کھٹک درد کی پہلے سے مرے دل میں مگر　　تم مرے پاس سے اٹھے کہ قیامت آئی

ہیں تغافل میں بھی سرگرم ستم وہ آنکھیں　　آپ تو سوتے ہیں فتنوں کو جگا رکھا ہے

قاصد یہ زباں اس کی، بیاں اس کا نہیں ہے　　دھوکہ ہے تجھے اس نے کہا اور ہی کچھ ہے

آفت تو ہے وہ ناز بھی انداز بھی لیکن مرتا ہوں میں جس پر وہ ادا اور ہی کچھ ہے

نہ گھبرا اے دل وامانده اب منزل قریب آئی
اسی بستی کے آگے اور آباد ایک بستی ہے
نہ شاخ گل ہی اونچی ہے نہ دیوار چمن بلبل
تری ہمت کی کوتاہی تری قسمت کی پستی ہے

قطعہ

محفل برخاست ہے پتنگے رخصت شمعوں سے ہو رہے ہیں
ہے کوچ کا وقت آسماں پر تارے کہیں نام کو رہے ہیں
ان کی بھی نمود ہے کوئی دم وہ بھی نہ رہیں گے جو رہے ہیں
دنیا کا یہ رنگ اور ہم کو کچھ ہوش نہیں ہے سو رہے ہیں

☆☆☆

نواب مرزا خاں داغؔ

''شوخی کہ در کلام اوست بندہ نہ داریم کہ امروز دیگرے را دادہ
باشند دزبانے کہ اورا بخشیدہ اند فی زماننا ہیچ کس را میسر نیست بیش ازیں
ستائش گفتار او چہ تواں گفت خیر الکلام ماقل ودل۔'' (اہ طور کلیم)

نواب مرزا خاں نام، داغ تخلص، نواب شمس الدین خلف نواب احمد بخش خاں دہلی کے بیٹے تھے، ۱۲رذی الحجہ ۱۲۴۶ھ کو دلی میں پیدا ہوئے، چھ سات برس کی عمر میں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا، ماں شاہزادہ فتح الملک عرف مرزا فخرو خلف بہادر شاہ ابوظفر کے گھر بیٹھ گئیں اور ''شوکت محل'' کا خطاب پایا۔

یہ بھی ماں کے ساتھ لال قلعہ پہنچے، وہیں ان کی تعلیم و تربیت ہوئی، قلعہ میں شعرو سخن کا چرچا زوروں پر تھا، بادشاہ اور مرزا فخرو، دونوں شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد تھے، یہ بھی استاد ذوق سے مشق سخن کرنے لگے اور ایک عرصہ تک مشاعروں میں ان کے ساتھ جاتے اور داد سخن لیتے رہے۔

۱۲۷۲ھ میں مرزا فخرو نے وفات پائی، ماں کے ساتھ یہ بھی لال قلعہ سے نکلے، یہ مصیبت کیا کم تھی کہ ۱۲۷۳ھ عالم آشوب ہنگامہ غدر کا برپا ہو گیا، وہ ایک عام مصیبت تھی، ان کو بھی وہی جھیلنا پڑی جو سب جھیل رہے تھے۔

غدر کا ہنگامہ فرو ہونے کے بعد رامپور چلے آئے اور نواب یوسف علی خاں بہادر کی عنایت سے دم لینے کی مہلت ملی، نواب کے بعد ان کے لائق جانشین نواب کلب علی خاں بہادر

کی عنایت نے سرپرستی فرمائی، پھر ان کی زندگی بھر رامپور میں رہے، کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں پیش آئی۔

نواب کلب علی خاں کے انتقال کے بعد حیدرآباد گئے، کئی برس امیدواری میں بسر ہوئی، آخرکار قسمت نے یاوری کی، پہلے ساڑھے چار سو روپیہ ماہوار مقرر ہوئے اور روز ورود سے اس وقت تک کی تنخواہ مل گئی، چند روز کے بعد ایک ہزار روپیہ ماہانہ مقرر ہو گیا، اس دن سے مرتے دم تک اعلیٰ حضرت محبوب علی خاں (۱) آصف جاہ ششم کی مصاحبت میں

(۱) میر محبوب علی خاں فتح جنگ نظام الدولہ نظام الملک مظفر الممالک آصف جاہ ششم نواب افضل الدولہ میر تہنیت علی خاں آصف جاہ پنجم کے بیٹے تھے، ۶ ربیع الثانی ۱۲۸۳ھ میں پیدا ہوئے، ۱۴ ذی قعدہ ۱۲۸۵ھ میں باپ نے سفر آخرت اختیار کیا، دستور کے موافق محل سرا اور شہر کے دروازے بند کر دیے گئے اور آصف جاہ ششم کی حکمرانی کی منادی کی گئی، اس کے بعد مرحوم کی تجہیز و تکفین عمل میں آئی اور فاتحہ سوم کے بعد تخت نشینی کے رسوم ادا کیے گئے۔

نواب شمس الامرا، امیر اکبر بہادر نائب حضور اور نواب مختار الملک سالار جنگ اول مدار المہام قرار پائے، سالار جنگ اول نے جس خوش اسلوبی سے ملک و دولت کا انتظام کیا وہ ہمیشہ تاریخ میں یادگار رہے گا۔

اعلیٰ حضرت میں فرزانگی و دانش مندی کے آثار نمایاں، ذہن و ذکاوت خداداد تھی، مولوی محمد زماں خاں شہید، مولوی مسیح الزماں خاں، مولوی انوار اللہ خاں، مولوی اشرف حسین، مظفر حسین، خوشنویس مرزا نصر اللہ خاں، مسٹر کلارک، سرور جنگ، افسر جنگ اور مٹو خاں، علوم و فنون، شہسواری، نشانہ بازی وغیرہ کی تعلیم پر وقتاً فوقتاً سرفراز ہوئے اور اعلیٰ حضرت نے تھوڑے زمانے میں بہت سی چیزوں میں دستگاہ حاصل کی۔

۱۳۰۰ھ میں سر سالار جنگ اول نے وفات پائی، راجہ نریندر پرشاد ان کی جگہ مدار المہام ہوئے، ۷ ربیع الثانی ۱۳۰۱ھ میں اعلیٰ حضرت نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لی اور لارڈ رپن وایسرائے و گورنر جنرل ہندوستان نے حیدرآباد جا کر گورنمنٹ انگریزی کی طرف سے کمر میں تلوار باندھی، نواب لائق علی خاں سالار جنگ دوم نے مدار المہامی کا جائزہ حاصل کیا اور اسی سال کونسل آف اسٹیٹ قائم ہوئی۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

زندگی بسر کی اور بیش قرار صلوں کے علاوہ ''سپہ سالار، یار وفادار، مقرب السلطان، بلبل ہندوستان، جہاں استاد ناظم یار جنگ، دبیر الدولہ، فصیح الملک'' کا خطاب پایا۔

سابقہ حاشیہ: اعلیٰ حضرت میں بعض صفتیں غیر معمولی تھیں، سب سے مقدم ان کی بے نظیر فیاضی اور سیر چشمی ہے، جس نے برامکہ کی فیاضی اور سخاوت کو افسانہ کر دیا، ہندوستان کا کوئی گوشہ مشکل سے ایسا ملے گا جہاں ان کی داد و دہش کا فیض نہ پہنچا ہو، دور دراز مقامات پر بھی خانقاہیں، مدرسے اور مسجدیں اب تک ان کے احسانات کی منت پذیر ہیں اور خاص کر دکن کے منادر اور دیول بھی آپ کے چشمہ فیض سے سیراب ہیں۔

دلی اور لکھنؤ کی تباہی کے بعد ارباب فضل و کمال کا ملجا و ماویٰ صرف اعلیٰ حضرت کی سرکار تھی، جہاں سے ہر ایک کے فراخور حال تنخواہیں ہوگئی تھیں، مولانا کرامت علی صاحب سیرۃ احمدیہ، مولانا حیدر علی صاحب منتہی الکلام، مولانا عبدالحلیم فرنگی محلی، مولوی محمد حسن نیوتنی، مولوی امین الدین خاں خلف علامہ رشید الدین خاں، مولانا محمد لطف اللہ صاحب، مولوی وحید الزماں خاں، مولوی محمد زماں خاں، مولوی مسیح الزماں خاں، مولوی مہدی علی، مولوی مشتاق حسین، مولوی سید حسین، مولوی سید علی، مولوی نظام الدین حسن، مولوی نذیر احمد، مولوی عزیز مرزا اور خدا جانے کتنے جوہر قابل وہاں جا کر مناصب عالیہ پر فائز ہوئے۔

مولانا عبدالحی لکھنوی، مولانا عبدالحق خیر آبادی، مولانا عبدالحق دہلوی، مولانا عبدالحق کانپوری، مولانا الطاف حسین حالی، مولانا شبلی نعمانی، دو چار ہوں تو کوئی ان کا نام گنا سکتا ہے، سیکڑوں ارباب کمال تھے جن کے دامن فیض سے ایک عالم تربیت پا رہا تھا اور وہ صرف اسی سرکار کی بدولت فارغ البالی سے گھر بیٹھے علمی خدمتیں انجام دے رہے تھے اور سیکڑوں میل سے بیش قرار تنخواہیں ان کو گھر بیٹھے مل رہی تھیں۔

دوسری غیر معمولی صفت ان کی بے خطا نشانہ بازی تھی، شاہزادہ جرمنی اور ولی عہد روس (بعد کو شہنشاہ روس) سے جس وقت نشانہ بازی میں سابقہ ہوا تو وہ ان کی قدر اندازی کو دیکھ کر محو حیرت ہو گئے اور ان کو ماننا پڑا کہ یہ اس فن میں بھی فرد فرید ہیں، اپنی تھوڑی سی زندگی میں ہزار ہا خونخوار شیر شکار کیے اور ایسے صعب و دشوار گزار مقامات میں پہنچے جہاں بڑے بڑے دلیروں کے بھی چھکے چھوٹتے تھے۔

تیسری صفت ان کی جفاکشی اور محنت تھی، باوجود تنعم اور ناز پروری کے جب (باقی اگلے صفحہ پر)

نواب مرزا خاں داغ، حریف، ظریف، خوش طبع، رنگین مزاج، زبان میں فصاحت و سادگی، بیان میں شوخی اور بانکپن، کلام کو دیکھو فصاحت اور محاورے کا دریا بہہ رہا ہے، حسن و

سابقہ حاشیہ: کسی کام کی طرف متوجہ ہوتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ اب اس کے سوا اور کوئی کام پیش نظر نہیں، اہلکار اور مصاحبین تھک کر چور ہو جاتے تھے اور وہ تازہ دم اسی کام میں لگے رہتے، آفتاب کتنے بار طلوع و غروب کرتا مگر وہ اس کام سے ہاتھ نہیں کھینچتے تھے۔

چوتھی صفت رحم دلی اور رعایا پروری تھی، آج رعایا ان کو یاد کرتی ہے اور روتی ہے جس کو ملک بدر بھی کیا تو اس کی زندگی بھر کی آسائش کا انتظام اول کر دیا، فرماتے تھے کہ پیٹھ کی مار دو پیٹ کی مار مت دو۔

پانچویں صفت خاصان حق کی خدمت میں عقیدت و نیازمندی تھی۔

چھٹی صفت سادہ زندگی۔

ساتویں صفت خودداری تھی جس کی وجہ سے باوجود رحم دلی و بے آزاری کے لوگ ہمیشہ خائف رہتے تھے۔

مگر افسوس ہے کہ بایں ہمہ ذہانت وذکاوت بعض خود غرضوں نے ان کو جام و ساغر پر لگا دیا تھا جس کی وجہ سے یہ خداداد قوتیں یہاں تک کہ ان کی صحت جسمانی کمزور ہوتی گئی اور عمر طبعی تک پہنچنے سے پہلے انہوں نے ۴؍ رمضان ۱۳۲۹ھ کو وفات پائی۔

ان کو شعر و سخن کا بھی شوق تھا، اکثر درباروں کی اسپیچیں بھی نظم میں ارشاد فرماتے تھے، جو کلام ان کی طرف منسوب ہے اس میں سے چند شعر ملاحظہ ہوں:

گلزار تھا دل یہ اسے ویرانہ کر دیا اے یاس تو نے داغ تمنا مٹا دیے

مرد جو کہتے ہیں وہ کر کے دکھا دیتے ہیں ایسے لوگوں میں نہیں ہم جو کہیں اور نہ کریں

ہم تم سے وفا کر کے پشیمان بہت ہیں جھگڑے تو ہزاروں ہیں مگر بات ہے اتنی

فضائے باغ کیسی نکہت گلزار کیسی ہے ہوا بھی ہم اسیروں تک نہیں آتی جو یہ پوچھیں

دل فریفتہ سنتا ہے تو بھلا کس کی نہ کر کسی سے محبت یہ ہم نہ کہتے تھے

عشق کے معاملات ہیں اور عاشق و معشوق کے خیالات، گویا اس میں شراب ناب کا سرور پیدا کرتے ہیں جس کو سن کر عوام سر دھنتے ہیں اور خواص مزہ لیتے ہیں۔

حسن اتفاق سے زمانہ بھی ان کو اچھا ملا، شاعری کا آغاز لال قلعہ سے جو اردوئے معلیٰ کا گہوارہ تھا اور اس کے شباب کا زمانہ نواب کلب علی خاں مرحوم جیسے قدردان کے سایۂ عاطفت میں بسر ہوا، گلزار داغ، آفتاب داغ دو دیوان، ایک مثنوی فریاد داغ اسی زمانے کی کمائی ہے، حیدرآباد میں تیسرا دیوان مہتاب داغ تیار ہوا، مگر اس کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک مسافر بڑی بڑی منزلیں طے کر کے تھک کر کسی مقام پر بیٹھ گیا ہے۔

رامپور میں اسیر، امیر، بحر، جلال اور تسلیم کا جمگھٹا تھا، خود نواب سخن گو و سخن سنج، کلام کی نوک پلک کے دیکھنے اور کھرے کھوٹے کو پرکھنے میں مشتاق، اس وقت طبیعت پر غیر معمولی زور ڈالنے کی ضرورت تھی، ذرا چوکے تو ٹکسال کے باہر، حریفوں سے دادِ سخن لینا ہنسی کھیل نہیں تھا۔

برخلاف اس کے حیدرآباد عیش و عشرت کا گہوارہ، کاوش فکر جو شاعری کا جزو اعظم ہے، مفقود، وہاں جا کر طبیعت بجائے محنت کش ہونے کے عشرت پسند ہو گئی، کچھ جوانی کی امنگیں بھی رخصت ہو چکی تھیں، ان سب وجوہ سے کلام پھیکا پڑ گیا اور آخر کار ۹ رذی الحجہ ۱۳۲۲ھ میں زبان تک بند ہو گئی، مرنے کے بعد یادگار داغ اور ضمیمہ یادگار داغ کے نام سے دو مجموعے ان کے کلام کے اور شائع ہو گئے ہیں۔

غزلوں کے منتخب اشعار

ستم و چشم کافر سے تری چلنا اشاروں کا   غضب و دل پکڑ کر بیٹھ جانا بے قراروں کا

خدا جانے ہوئی ہیں دفن کیا کیا حسرتیں اس میں   پھولوں سے مرے سینہ پہ عالم ہے مزاروں کا

ہو کے ظاہر تو کیا عشق نے اک حشر بپا   حسرت اس دل پہ کہ جس دل میں یہ پنہاں ہوگا

عشق کیا شے ہے یہ وہ شے ہے کہ دل میں شوق وصل
خون ہوکر آگیا، غم بن گیا، سم ہوگیا

اک حرف آرزو پہ وہ مجھ سے خفا ہوئے　　اتنی سی بات کہہ کے گنہگار ہو گیا

خدا کریم ہے یوں تو مگر ہے اتنا رشک　　کہ میرے عشق سے پہلے تجھے جمال دیا

لیے تو چلتے ہیں حضرت دل تمہیں بھی اس انجمن میں لیکن
ہمارے پہلو میں بیٹھ کر تم ہمیں سے پہلو تہی نہ کرنا

مری تقدیر کی برگشتگی سب میں بری ٹھہری
حسینوں کے لیے اک حسن ہے برگشتہ مژگاں کا
بہت ہیں آنکھیں فرش راہ چلنا دیکھ کر ظالم
کف نازک میں کانٹا چبھ نہ جائے خار مژگاں کا

ڈوب کر سینہ میں اس رنگ سے پیکاں نکلا　　دل سے بے ساختہ نکلا کہ وہ ارماں نکلا

دل میں لے دے کر رکھا تھا ایک قطرہ خوں کا　　کچھ نیاز غم ہوا، کچھ صرف مژگاں ہوگیا
بوسہ لے کر دل دیا ہے اور پھر نالاں ہیں داغ　　کوئی جانے مفت میں حضرت کا نقصاں ہوگا

وہ مرا چھیڑنا آغاز الفت میں شکایت سے　　وہ رکھ کر ہاتھ کانوں پر ترا کہنا کہ بھر پایا

ترے دست حنائی میں بھی ہے چور　　کسی کو ہاتھ کا سچا نہ پایا

وصل میں ہائے وہ اترا کے مرا بول اٹھنا　　اے فلک دیکھ تو یہ کون مرے گھر آیا

عرض وفا پہ دیکھنا اس کی ادائے دلفریب دل میں کچھ اعتبار سا آنکھ میں کچھ ملال سا

نومید کرم ہو کر ہم مے سے کریں توبہ دوزخ میں پڑے زاہد بے لطف ثواب ایسا

وعدہ پہ مرے ان کے قیامت کی ہے تکرار اور بات ہے اتنی کہ ادھر کل ہے ادھر آج

جھکی ہی جاتی ہے کچھ خود بخود حیا سے وہ آنکھ گری ہی پڑتی ہے بیمار ناتواں کی طرح

اے شیخ جس کو جو نہ ملے گا بڑھے گا شوق جنت کو میں پسند جہنم کو تو پسند

عمر کیوں کر نہ بسر کیجئے غافل ہو کر کہ ملا ہے ہمیں اک قطرۂ مے دل ہو کر

بزم اغیار کا ظاہر ہے اثر آنکھوں پر مہرباں آنکھ کی خفت مرے سر آنکھوں پر

اپنی نظر میں ہیچ ہے سارے جہاں کی سیر دل خوش نہ ہو تو کس کا تماشا کہاں کی سیر

دل میں سما رہی ہیں قیامت کی شوخیاں دو چار دن رہا تھا کسی کی نگاہ میں

مجھ کو تباہ چشم مروت نے کر دیا مل جائے تو چراؤں کسی کی نظر کو میں

کس سے وعدہ ہے جو گھبرائے ہوئے پھرتے ہو یہ وہ گردش ہے کہ میرے بھی مقدر میں نہیں

کبھی فلک کو پڑا دل جلوں سے کام نہیں اگر آگ نہ لگادوں تو داغ نام نہیں

رہرو راہ محبت کا خدا حافظ ہے اس میں دو چار بہت سخت مقام آتے ہیں

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں ادھر جاتا ہے دیکھیں یا ادھر پروانہ آتا ہے

وہی جھگڑا ہے فرقت کا وہی رونا ہے الفت کا تجھے اے داغ کوئی اور بھی افسانہ آتا ہے

یاد سب کچھ ہیں مجھے ہجر کے صدمے ظالم بھول جاتا ہوں مگر دیکھ کے صورت تیری

دل دے تو اس مزاج کا پروردگار دے جو رنج کی گھڑی بھی خوشی سے گزار دے

دنیا میں جانتا ہوں کہ جنت ملی مجھے راحت اگر ذرا سی مصیبت میں مل گئی

ہزار بار جو مانگا کروں تو کیا حاصل دعا وہی ہے جو دل سے کبھی نکلتی ہے

ایک تو حسن بلا اس پہ بناوٹ آفت گھر بگاڑیں گے ہزاروں کے سنورنے والے
خوش نوائی نے رکھا ہم کو اسیر اے صیاد ہم سے اچھے رہے صدقے میں اترنے والے

شرکت غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری غیر کی ہو کے رہے یا شب فرقت میری

نہیں آتا تجھے گر اے تمنا نکلنا سیکھ لے جان حزیں سے

مرگ دشمن کی دعا مانگ کے پچھتاتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو وہ غیر کے ماتم میں رہے

وقت خرام ناز دکھا دو جدا جدا یہ چال حشر کی یہ روش آسماں کی ہے

تیرے جلوہ کا تو کیا کہنا مگر دیکھنے والے کو دیکھا چاہیے

☆☆☆

سید ظہیر الدین ظہیر

ظہیر الدین نام، ظہیر تخلص، سید جلال الدین حیدر کے بیٹے اور دلی کے رہنے والے تھے، ان کے والد ابو ظفر بہادر شاہ بادشاہ کے خوشنویسی میں استاد اور دربار شاہی سے ''اصلاح الدولہ مرصع رقم خاں بہادر'' کے خطاب سے سرفراز تھے۔

بارہ سال کے سن میں فارسی کی درسی کتابیں اور عربی کی مختصرات پڑھنے پائے تھے کہ ''قوربیگی'' کے عہدے پر سرفراز ہو گئے اور پڑھنا چھوٹ گیا، چندروز کے بعد کارگزاری کے صلہ میں ''راقم الدولہ'' کا خطاب پایا، تنخواہ پچاس روپیہ ماہوار تھی، وہی قائم رہی۔

شعروسخن سے خداداد مناسبت تھی، مکتب ہی میں کچھ غوغاں کرنے لگے تھے، اتفاق سے ان کے مکان کے قریب قطب الدین مشیر شاگرد شاہ نصیر نے اپنے مکان پر مشاعرہ قائم کیا تھا، یہ بھی اس میں آنے جانے لگے اور جب زیادہ شوق بڑھا تو شیخ ابراہیم ذوق کے شاگرد ہو گئے، اس وقت ان کا سن چودہ برس کا تھا۔

غدر ۵۷ء میں ناچار دلی سے نکلنا پڑا، جھجھر، سونی پت، اور نجیب آباد ہوتے ہوئے بریلی آئے، یہاں سے لکھنؤ کا قصد تھا کہ معلوم ہوا کہ وہاں انگریزوں کا قبضہ ہو گیا، مجبور ہو کر کچھ دنوں بریلی میں رہ کر رامپور چلے گئے، وہاں چار برس رہے، اس کے بعد دلی آئے اور محکمۂ چنگی میں ملازمت مل گئی۔

چنگی میں زیادہ دنوں نہیں رہے تھے کہ اخبار جلوۂ طور (بلند شہر) کی اڈیٹری مل گئی، یہ اخبار مہاراجہ شیودان سنگھ مہاراجہ کی نظر سے گزرتا تھا، وہ نہایت ہنر پرور رئیس تھے، ان کو

الور بلا بھیجا، چار برس الور میں رہے، علاوہ تنخواہ کے تقریبوں میں قصائد کا صلہ بھی عنایت ہوتا تھا جس سے بہت اچھی طرح ان کی گزراوقات ہوتی جاتی تھی، مگر بدقسمتی سے مہاراجہ کے بعض بدخواہوں نے جھوٹی سچی شکایتیں کر کے مہاراجہ کے اختیارات سلب کرادیے، یہ مجبور ہوکر پھر دلی آئے اور نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی سفارش لے کر جے پور گئے، سفارش کا یہ اثر ہوا کہ محکمہ پولیس میں ان کو جگہ مل گئی۔

کم وبیش انیس برس جے پور میں رہے، مہاراجہ رام سنگھ والی جے پور کے مرنے پر ان کا تعلق ریاست سے منقطع ہوگیا، چند روز پریشانی میں بسر ہوئی تھی کہ نواب احمد علی خاں رونق خلف نواب میر خاں مرحوم نے ان کو ٹونک بلا بھیجا، جب تک رونق زندہ رہے، یہ بہت آرام سے ان کے ساتھ رہے، ان کے مرنے پر نواب ابراہیم علی خاں بہادر فرمانروائے حال نے ان کا وظیفہ مقرر کردیا، اس طریقہ سے پندرہ سولہ برس ٹونک میں رہے۔

آخر عمر میں حیدرآباد جانے کا شوق پیدا ہوا، ٹونک سے رخصت لے کر حیدرآباد چلے گئے اور آٹھ مہینہ تک باریابی کی تمنا میں وہیں پڑے رہے، نتیجہ یہ ہوا کہ ٹونک سے جو کچھ ان کو ملتا تھا وہ بند ہوگیا۔

حیدرآباد میں آٹھ مہینے کے بعد باریابی ہوئی اور ہر تقریب پر قصیدے بھی پیش ہوئے مگر تنخواہ مقرر ہونے کی نوبت نہ آئی تھی کہ موت نے ساری آرزوؤں کا خاتمہ کردیا۔

بیکاری کے زمانہ میں مہاراجہ کشن پرشاد نے ایک سال بعد چالیس روپیہ ماہوار مقرر کردیے تھے، راجہ بھگوان سہائے اور نواب محمد عمر خاں وفا بھی کچھ کچھ خدمت کرتے رہتے تھے۔

تصنیفات کی تفصیل یہ ہے کہ ایک دیوان ان کا جس کا نام گلستان سخن ہے، مطبع مفید عام آگرہ میں چھپ گیا ہے، دیوان دوم وسوم کا حق تصنیف قاضی عبدالکریم مالک مطبع کریمی بمبئی نے خرید لیا ہے، معلوم نہیں چھپایا نہیں، دیوان چہارم جس میں بقول حسرت موہانی تین سو غزلوں کے علاوہ بہت سے قصیدے اور مسدس شامل ہیں، ان کے نواسہ کے پاس ہے۔

کلام کے متعلق حسرت موہانی کی رائے سے مجھے اتفاق ہے، اس میں بجائے ذوق کے مومن خاں کا رنگ زیادہ پایا جاتا ہے، ذوق کے کلام کی ممتاز خصوصیت کلام کی پختگی، محاورہ کی صفائی اور زبان کی درستی کے ساتھ تعقید الفاظ کا عیب بھی ہے جو ظہیر کے یہاں نہیں پایا جاتا۔

مومن خاں کے یہاں شاعری کا مدار خیال کی نزاکت، ترکیب فارسی کی خوبی اور اسلوب بیان کی جدت پر ہے جو ظہیر کی شاعری کا سرمایہ ناز ہے، چنانچہ خود ظہیر نے جا بجا اس کا اعتراف کیا ہے ؎

طرز مومنؔ سے نہ آگاہ تھے جب تک کہ ظہیرؔ — سچ تو یہ ہے کہ کبھی رنگ غزل نے نہ دیا

دوسری جگہ فرماتے ہیں ؎

کیا نباہی طرز مومنؔ اے ظہیرؔ — طاق ہیں لاریب اپنے فن میں ہم

جہاں کہیں نزاکت خیال اور جدت اسلوب کے ساتھ الفاظ کی رنگینی اور ترکیب کی تازگی کی خوبیاں جمع ہو جاتی ہیں تو مرزا نسیم کی طرح دلپذیری کی شان ان کے کلام میں بھی پیدا ہو جاتی ہے اور جہاں کہیں استاد کا رنگ ہے وہاں مرزا داغ اور ان کے کلام میں اتنا فرق کرنا دشوار ہے۔

غرض کہ مجموعی حیثیت سے ظہیر کی شاعری دلی کی اصلی اور قدیم شاعری کا ایسا نمونہ ہے جس کی مثال ان کے بعد اور کسی کے کلام میں نہیں مل سکتی۔

نمونہ ملاحظہ ہو:

فقط اک سادگی پر شوخیوں کے ہیں گماں کیا کیا — نگاہ شرمگیں سے ہے نہاں کیا کیا عیاں کیا کیا

دل خوں گشتۂ حسرت نے کیا کچھ گل کھلائے ہیں — بہار آگیں ہے کھاب کی برس فصل خزاں کیا کیا

تصور میں وصال یار کے سامان ہوتے ہیں — ہمیں بھی یاد ہیں حسرت کی بزم آرائیاں کیا کیا

قدم رکھتے نہیں ہیں وہ زمیں پر بے نیازی سے — بڑھا جاتا ہے یاں شوق سجود آستاں کیا کیا

بہت ظہیر کو ہم یاد کر کے واں روئے　　کہیں جو ذکر حریفانِ بادہ خوار آیا

اک مشغلہ ٹھہری ہے تمہیں رنجش بیجا　　اک کھیل ہوا تم کو ستانا مرے دل کا

بیخود ہوں تصور میں کسی برق ادا کے　　سرمایہ تسکیں ہے تڑپنا مرے دل کا

اعجاز دلفریبی انداز دیکھنا　　ہر ہر ادا پہ مجکو گمان نظر رہا
قاصد بھی کوئی صبر دل ناشکیب تھا　　آتے ہی آتے راہ میں کمبخت مر رہا
پرہیز عشق سے مجھے وحشت فزوں ہوئی　　میں کچھ دوا سے اور بھی رنجور تر رہا

بات کیا ان سے کروں ان کو اٹھاؤں کیونکر　　مدعی بیچ میں دیوار بنے بیٹھے ہیں
کیا بری شے ہے محبت بھی الٰہی توبہ　　جرم ناکردہ خطا وار بنے بیٹھے ہیں
وہ ہیں اور غیر ہیں اور عیش کے سامان ظہیر　　ہم الگ سب سے گنہگار بنے بیٹھے ہیں

ہے مرے گھر پہ ابھی سے تیرگی چھائی ہوئی　　گو ابھی شام شب ہجراں سحر سے دور ہے

کہیے تو کہوں انجمن غیر کی روداد　　کیا اب بھی اسے آپ کرامت نہ کہیں گے

یہ شوخی ہے کہ تمکین ہے الٰہی کیا قیامت ہے　　الجھتے ہیں دم رفتار سو سو بار دامن سے
الجھ کر خار دامن سے مرے کیا کیا پشیماں ہیں　　کہ اب دامن چھڑانا ہو گیا دشوار دامن سے

☆☆☆

مرزا قربان علی سالک

قربان علی نام، سالک تخلص، نواب مرزا عالم بیگ کے بیٹے تھے، حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور دلی میں نشو و نما پائی اور فارسی کی درسی کتابیں وہیں کے ارباب فضل و کمال سے پڑھیں۔

مومن و غالب بقید حیات تھے، اس زمانہ میں شعر و سخن کا گھر گھر چرچا تھا، ان کو بھی اس کا شوق ہوا، پہلے بطور خود کچھ کہتے رہے، اس کے بعد حکیم مومن خاں کی خدمت میں پہنچے، اس وقت قربان تخلص کرتے تھے، غالباً خاں صاحب کے مرنے پر مرزا غالب کے یہاں رسائی پیدا کی اور سالک تخلص اختیار کیا۔

خوش مزاجی اور شگفتہ روئی کے ساتھ خدا نے ان کو ذکاوت ایسی عنایت فرمائی تھی کہ چند روز کی مشق میں سخن سنجی اور سخن فہمی میں یہ اپنے معاصرین سے بہت بڑھ گئے اور مرزا غالب کے شاگردوں میں سب سے بہتر نظر آنے لگے۔

۱۸۵۷ء کے عالم آشوب ہنگامہ کے بعد الور میں جا کر پناہ لی اور خوش قسمتی سے وکالت کے عہدے پر سرفراز ہو گئے، ایک عرصہ تک وہاں رہنے کے بعد اپنا مسقط الراس یاد آیا اور حیدر آباد چلے گئے، وہاں محکمہ تعلیمات میں سر رشتہ داری کے عہدے پر تقرر ہو گیا، اسی خدمت پر زندگی بسر کر دی۔

حیدر آباد میں مخزن الفوائد کے نام سے ایک موقت الشیوع رسالہ زیر سرپرستی نواب عماد الملک بہادر نکالا، جو اس زمانہ میں ناظم سر رشتہ تعلیم تھے، یہ رسالہ عرصہ تک جاری رہا اور اس میں بہت بکار آمد تاریخی مضامین نکلا کیے۔

ساٹھ پینسٹھ برس کی عمر تھی کہ ۱۲۹۱ھ میں سفر آخرت اختیار کیا اور حیدر آباد میں مدفون ہوئے، ہنجار سالک دیوان کا نام ہے۔

یوں عمر گزاری تری فرقت میں کہ ہردم — جینے کا گماں تھا مجھے مرنے کا یقیں تھا

دل وہ کافر ہے کہ مجکو نہ دیا چین کبھی — بے وفا تو بھی اسے لے کے پشیماں ہوگا

نہیں اک بار بھی اب سننے کی طاقت دل میں — پہلے سو بار ترا نام لیا کرتا تھا

میرا ہو آشیانہ اور آدھا جلا ہوا — بجھ بھی گئی تھی آگ تو بجلی کو کیا ہوا

تم غیر کے ہوئے تو رہا کیا جہان میں — گویا ہمارے واسطے کچھ بھی بنا نہ تھا

کچھ ہو پر ان کو جانب اغیار دیکھنا — اک بار منع کیجیے تو سوبار دیکھنا

گرے ہیں چشم خلائق سے خاک ہوکر ہم — ستم سے تم نے کیا کس طرح جہاں اپنا

اپنی ستم کشی کا مجھے امتحاں ہے اب — درکار ایک اور نیا آسماں ہے اب

اب تک بھی میرے ہوش ٹھکانے نہیں ہوئے — سالک کا حال رات کو ایسا سنا کہ بس

تم بھی وہی کہو تو کہے اک جہاں بجا — میں بھی وہی کہوں تو کہے اک جہاں غلط

کاش اے سپہر تجھ سے بھی رکھتے تو سہل تھیں — وہ خواہشیں کہ رکھتے ہیں اس بے وفا سے ہم

تم آگئے تو ہوش کہاں میزباں ہو کون — آج اپنے اپنے گھر میں ہیں کچھ میہماں سے ہم

پھرتے ہیں دادخواہ ترے حشر میں خراب — تو پوچھتا نہیں تو کوئی پوچھتا نہیں

اعتبار نگہ ناز ہے کیا کیا ان کو　　قتل کو آتے ہیں اور ہاتھ میں شمشیر نہیں

اے خضر اتنے دن ترے کیونکر بسر ہوئے　　ہم سے تو رات کٹ نہ سکی انتظار کی

ہوں وہ خودرفتہ کہ کب جانے کہاں دل کھویا　　یاد آتا ہے تو اتنا کہ نہیں یاد مجھے

جانے دے اے تصور جاناں نہ کر تلاش　　ایسا نہ ہو کہ وہ کہیں دشمن کے گھر ملے

کنج مزار میں بھی وہی اضطراب ہے　　دل ہے کہ اک فرشتۂ قہر و عذاب ہے
پہنچے عدو کے گھر میں تو دامن جھٹک دیا　　ہم خاک بھی ہوئے ہیں تو مٹی خراب ہے

صیاد اور بند قفس سے کرے رہا　　جھوٹی خبر کسی کی اڑائی ہوئی سی ہے

☆☆☆

میر مہدی مجروحؔ

میر مہدی مجروح، خلف میر حسین فگار، دلی کے رہنے والے اور مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کے منظور نظر و تربیت یافتہ تھے، وہ زمانہ آنکھوں سے دیکھا تھا، جب کہ میر نظام الدین ممنون مفتی صدر الدین خاں آزردہؔ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، شیخ ابراہیم ذوق اور حکیم مومن خاں وغیرہ ارباب فضل و کمال بقید حیات تھے اور ان کے نتائج فکر سے مشاعروں میں زندگی اور زندہ دلی کے آثار نمایاں تھے۔

غدر ۵۷ء کے بعد بھی یہ خانماں آوارہ ہو کر مدتوں پانی پت میں رہے، جب دلی میں امن و امان قائم ہولیا تو واپس آئے، مگر وہاں کیا دھرا تھا، ناچار گھر سے نکلے اور کچھ دنوں مہاراجہ شیودان سنگھ رئیس الور کی قدر دانی سے الور میں رہے تھے کہ وہاں بھی بد قسمتی نے رہنے نہ دیا۔

اخیر زمانہ میں قسمت نے یاوری کی اور نواب حامد علی خاں رئیس رامپور کی عنایت و مہربانی سے زندگی کے آخری لمحے کسی قدر راحت سے بسر ہوئے۔

۱۳۱۶ھ میں ایک دیوان مرتب کر کے مظہر معانی کے نام سے چھپوایا ہے، جس میں قصائد، غزلیں، رباعیاں، مخمس، ترکیب بند وغیرہ اصناف سخن موجود ہیں۔

مجروح کی زبان نہایت صاف و سادہ ہے، چھوٹی چھوٹی بحروں میں اکثر غزلیں لکھی ہیں جن میں محاوروں کی چاشنی زیادہ پائی جاتی ہے مگر اسالیب کلام میں جدت و تازگی نہیں ہے، انہی مضمونوں کو جنہیں متوسط طبقہ کے شعرا نے اپنی مخصوص زبان و طریقہ بیان

میں ادا کیا ہے، یہ بھی کام میں لائے ہیں مگر بعض جگہ نزاکت خیال کی دلفریبی نبھ نہیں سکی، معمولی بات چیت کا رنگ پیدا ہو گیا ہے تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ زبان کی صفائی اور سادگی کے ساتھ کلام میں پختگی کے لوازم اچھی طرح پائے جاتے ہیں۔

عود ہندی میں مرزا غالب کے ان کے نام بہت سے خطوط ہیں جو پڑھنے کے قابل ہیں، ان کے ایک ایک فقرے سے پیار و محبت کی تراوش ہوتی ہے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

> "میر مہدی! جیتے رہو، آفریں صد آفریں، اردو باعیات لکھنے کا کیا اچھا ڈھنگ پیدا کیا ہے، مجھ کو رشک آنے لگا، سنو دلی کے تمام مال و متاع و زر و گوہر کی لوٹ پنجاب احاطہ میں کی گئی ہے، یہ طرز عبارت خاص میری دولت ہے، سو ایک ظالم پانی پت انصاریوں کے محلّہ کا رہنے والا لوٹ لے گیا، مگر میں نے اس کو بحل کیا، اللہ برکت دے۔"

سخت مضطر دل ہنگامہ طلب ہے یارب آج ہی کیوں نہ وہ ہو جائے جو فردا ہوگا

کبھی چشم خمار آلود کی مستی نہیں دیکھی بجا ہے حضرت ناصح کو دعویٰ ہوشیاری کا

ساقی کی چشم مست کا گر دور ہے یہی زاہد کو آج کل ہی میں مے خوار دیکھنا

کچھ عرض تمنا میں شکوہ نہ ستم کا تھا میں نے تو کہا کیا تھا اور آپ نے کیا جانا

اچھا ہوا محفل میں مجروح نہ کچھ بولا وہ حال اگر کہتا تو کس سے سنا جاتا

نہ سوجھتی ہے رہائی نہ موت آتی ہے نہ مہرباں ہے قسمت نہ مہرباں صیاد

اس جہاں میں نہیں جز رنج مآل شادی گرتے ہیں خاک میں گل شاخ پہ خنداں ہو کر

ہوائے گل ہے اب نے شوق پرواز یہ تھے سارے بکھیڑے بال و پر تک

کوئی لخت دل آکے اٹکا ہے کیا　کھٹک سی ہے کچھ چشم پُر آب میں

کسی نے کوٹ کر بجلی کو شاید بھر دیا دل میں　نئے ڈھب کی تڑپ ہے کچھ ہماری جان مضطر میں

تھی وہ مجنوں کے دم ہی تک رونق　خاک اڑتی ہے اب بیاباں میں

جو درد دل کی ہے لذت وہ دل ہی جانے ہے　یہ دل لگی کی ہیں باتیں کہ بے قرار ہوں میں

اب ہم ہیں اور کنج قفس کی صعوبتیں　وہ نغمہ سنجیاں وہ نشاط چمن کہاں

دل ہی سمجھے ہے کچھ تڑپ کر مرے　برق کو لطف اضطراب کہاں

یہ بھی کچھ جی میں آگئی ہوگی　کیا وہ میرے بٹھائے بیٹھے ہیں
طور جس آگ نے جلایا تھا　ہم وہ دل میں چھپائے بیٹھے ہیں

ملتی ہے اس کی وضع زبس خوئے یار میں　آئے نہ کیوں مزہ ستم روزگار میں
سوز دروں نے مجکو کیا نخل آتشیں　شعلے بھرے ہوئے ہیں مرے برگ و بار میں
کب دیکھیں چاک جیب سے فرصت ملے ہمیں　دست جنوں کا دھیان ہے ایک ایک تار میں
گل سے تو لاکھ مرتبہ بہتر ہے روئے یار　بلبل پہ کیا ہے میں تو یہ کہہ دوں ہزار میں

مرے کس کام کا ہے بخت خفتہ　اسے رشوت میں دوں گا پاسباں کو

تھا برا مجروح پر اتنا نہیں　جس کے مرنے کی مبارک باد ہو

رہے شکوہ سنج ستم ہم سدا　کبھی آسماں کے کبھی یار کے

واں ستم تک دریغ ہے ہم سے   یاں توقع میں ہیں عنایت کے
دل کو کوئی بچا سکے کیوں کر   اس کے انداز ہیں قیامت کے

کچھ ان بن ہو چلی ہے باغباں سے   بس اب نکلا ہی سمجھو گلستاں سے

مشکل ہے وصل میں بھی تلافی فراق کی   پہلو میں گر یہی دل حسرت مآب ہے

سوز غم سے نہ دل بھنے جب تک   سوزش عشق کا مزا کیا ہے

صبر کے فائدے بہت ہیں ولے   دل ہی بس میں نہ ہو تو کیا کیجیے

کوئی ہم نوا ہے نہ یاد آشیاں   جو چھوٹے بھی ہم تو کدھر جائیں گے
یہ اہل عدم اور ہم میں ہے فرق   گئے وہ ہم تو ٹھہر کر جائیں گے

عاشق نہ سمجھتے تو وہ منھ کو نہ چھپاتے   کھویا دل بیتاب نے وہ لطف نظر بھی

ہم لوگوں میں ہو ربط نہ باہم تو عجب کیا   جب گرم نہ صحبت رہی موسیٰؑ و خضرؑ کی

جز غم مرگ دوستاں اے خضرؑ   کیا دھرا عمر جاودانی میں

☆☆☆

حکیم ضامن علی جلالؔ

ضامن علی نام، جلال تخلص، حکیم اصغر علی داستاں گو کے بیٹے اور لکھنؤ کے رہنے والے تھے، ۱۲۵۰ھ میں پیدا ہوئے غدر سے پہلے لکھنؤ کچھ اور ہی لکھنؤ تھا، عیش ونشاط کی گرم بازاری کے ساتھ ہر علم وفن کے ارباب فضل وکمال کا بے نظیر مجمع جن کے فیضان صحبت سے یہاں کا معمولی سے معمولی آدمی بھی دوسری جگہ کے قابل اور لائق لوگوں سے تقریر کی روانی اور شستگی میں بہتر نظر آتا تھا، اس کی باتیں سن کر کبھی اس کا گمان نہ ہوسکتا تھا کہ اس نے درسی کتابیں نہیں پڑھیں۔

جلالؔ اسی زمانہ کے آدمی تھے، لکھنؤ میں پیدا ہوئے، فارسی کی درسی کتابیں اس زمانہ کے رواج کے موافق پوری پڑھیں، عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے ہی تھے کہ شعر وسخن کا شوق پیدا ہوا، امیر علی خاں ہلال (۱) کے پاس آنے جانے اور اپنا کلام دکھانے لگے، ایک عرصہ تک انہی سے مشق سخن کی۔

---

(۱) امیر علی خاں ہلال پسر تراب علی خاں باشندۂ لکھنؤ میر علی اوسط رشک کے شاگرد تھے، غزلوں کا دیوان مقفی ومردف، مثنوی اور سراپا ان کی تصنیفات میں بیان کی جاتی ہے، واجد علی شاہ کی سرکار میں ان کا توسل تھا، انہی کے ساتھ کلکتہ گئے، کلام کا نمونہ یہ ہے:

مجھ سے الگ جو دفن یہ ہوتا تھا خوب تھا ۔۔۔ پہلو میں میری قبر کے بنتا مزار دل

بڑھ بڑھ کے کیا ہی وار لگائے ہیں جی میں ہے ۔۔۔ ہاتھوں کے بدلے چوم لوں اس تیغ زن کے پاؤں

یہ ہاتھا پائی بھی کہیں دیکھی سنی نہیں ۔۔۔ لاتوں کے ساتھ آپ کی چلتی ہیں کہنیاں

چوں کہ ان میں قابلیت اور مناسبت فطری موجود تھی، چند ہی روز میں اس نے اپنا رنگ دکھایا، جب ہلال نے ان کے کلام اور اپنی اصلاح کا اندازہ کرلیا تو خود انہیں اپنے استاد میر علی اوسط رشکؔ کے پاس لے گئے، یہ کچھ عرصہ تک ان سے مشق سخن کرتے رہے، جب وہ کربلائے معلیٰ چلے گئے تو مرزا محمد رضا برق سے اصلاح لینے لگے اور کثرت مشق سے کلام میں رنگ پیدا ہوگیا۔

غدر ۵۷ء کے بعد رامپور چلے گئے، اس وقت ان کا سن بائیس برس کا تھا، ان کے والد نواب یوسف علی خاں ناظم کی سرکار میں داستان گوئی کی خدمت میں مقرر تھے، یہ بھی اسی سرکار میں نوکر ہوگئے، یوسف علی خاں کے بعد نواب کلب علی خاں مرحوم نے بھی قدر دانی فرمائی، جلال کو سو روپیہ ماہوار ملتا تھا، چند مرتبہ مستعفی ہوکر چلے آئے مگر قدر دان نواب نے ایام معزولی کی بھی تنخواہ ادا کی اور ان کو ہر مرتبہ بلوا بھیجا۔

منگرول کے نواب حسین میاں ان کو پچیس روپیہ ماہوار بھیجتے اور ہر قصیدہ پر سو روپے دیتے تھے، علاوہ ان کے اور لوگ بھی ان کی خدمت کرتے تھے، ان کا یہ بھی دستور تھا کہ بغیر مالی منفعت کے کسی کے کلام میں اصلاح نہ دیتے تھے اور کسی خط کا جواب نہ دیتے جب تک اس میں جواب کے لیے ٹکٹ نہ رکھا ہو۔

ان کو اپنی زبان دانی کا بڑا دعویٰ تھا اور اس بات پر ناز تھا کہ وہ محاورے کو صحیح طور پر ادا کرتے ہیں، اس بارہ میں وہ کسی کو اپنا مدمقابل نہیں سمجھتے تھے۔

مگر باوجود مدمغ اور نازک مزاج ہونے کے اہل کمال سے بتواضع پیش آتے اور اپنی فروگزاشت کو جلد تسلیم کرلیتے۔

نواب کلب علی خاں مرحوم کے بعد لکھنؤ چلے آئے تھے اور منصور نگر میں ایک مکان خرید کر کے مستقل سکونت اختیار کرلی تھی۔

سرمایہ زبان اردو کے نام سے ایک مبسوط کتاب لکھی ہے جس میں محاورے،

کنائے اور اصطلاحیں زبان اردو کی بیان کی ہیں، مفید الشعرا ایک رسالہ تذکیر و تانیث کی بحث میں ہے، قواعد المنتخب ایک اور رسالہ ہے جس میں بعض مفرد و مرکب الفاظ کی تحقیق و تصریف بیان کی ہے۔

علاوہ ان کتابوں کے چار دیوان ہیں، بعضے مبسوط، بعضے مختصر، چوہتر برس کی عمر پائی اور ۱۳۲۵ھ میں جہاں کے تھے وہاں چلے گئے۔

خبر کیا تھی کہ خاموشی ہی راز عشق کہہ دے گی وہی غماز ہوگا جو ہمارا رازداں ہوگا
جفا کرتے ہیں کب تک باوفاؤں پر وہ دیکھیں تو ہمیں جو آزماتے تھے اب ان کا امتحاں ہوگا

جی خوب بہلتا ہے بھلا ہو کہ برا ہو سن لیتے ہیں ناصح سے کچھ افسانہ کسی کا

دل ناکام کو ہم کھو کے بہت پچھتائے کام اس سے بھی نکل جاتے تھے بیکار نہ تھا

گناہ عاشقی خواہان تعزیر آپ ہوتا ہے بنا دیتا ہے شوق دار خود منصور ہو جانا

طاقت نے سنبھالا نہ تحمل نے دم ہجر سب دعوئی ہی کرتے تھے کوئی کام نہ آیا

پائی راحت ترے خنجر ہی کے نیچے قاتل پھر جو ٹھہرا تو یہیں کچھ دل بسمل ٹھہرا

اٹھے جو بزم یار سے تنہا ہم آئے گھر طاقت کہیں، حواس کہیں، دل کہیں رہا

بہت بہار کی آمد سے خوش ہیں مرغ چمن شگوفے دیکھیں انہیں کیا نہال کرتے ہیں

ترا دامن دبا لینا تہ زانو سمجھتے ہیں ابھی کوئی نہ اٹھے ہم بھی یہ پہلو سمجھتے ہیں

نقش قدم پکارتے ہیں راہ عشق میں مٹ جائے حوصلے جسے نام نشاں کے ہیں

کم حوصلہ ہمیں ہیں وہاں کچھ کمی نہیں
انداز ۂ طلب سے دیا بڑھ کے جب دیا

ذرا جینے دو تو چندے کسی مرجانے والے کو
ادا و ناز پر یوں جان دیتے ہیں بتا دے گا

تمہیں سے پوچھتے ہیں کس مرض کی پھر دوا ہو تم
جگر کا درد کھویا اور نہ کی دل کی تڑپ زائل

حسرت ٹپک پڑے گی ہماری نگاہ سے
آنسو رکے تو کیا نہیں چھپے گا رازِ عشق

اتارے لیتے ہیں خار بیاباں پیرہن اپنا
کوئی دامن جنوں میں کھینچتا ہے آستیں کوئی

اک تیر تھا کلیجے کے جو پار ہی رہا
کیا تھی کسی کی ترچھی نظر کچھ نہ پوچھیے

یہ چوٹ وہ ہے جس کو ابھرنا نہیں آتا
رہتا ہے کلیجے میں نہاں درد محبت

چلو جانے دو بیتابی میں ایسا ہو ہی جاتا ہے
نہ ہو برہم جو بوسہ بے اجازت لے لیا میں نے

نہ یہ ناداں سمجھتا ہے نہ وہ جاہل سمجھتا ہے
جو سمجھاتا ہے ناصح کب ہمارا دل سمجھتا ہے

فرق بس اتنا کہ وہ آنکھوں میں ہے یہ دل میں ہے
ایک سی شوخی خدا نے دی ہے حسن و عشق کو

اب دیکھیں کہ آجاتے ہو تم دل میں کدھر سے
لو بند کیے لیتے ہیں ہم دیدۂ مشتاق

کہیں اچھوں کی کوئی بات بری ہوتی ہے
خوبرویوں کے بگڑنے میں ہیں لاکھ بناؤ

سی لیں گے گریباں کو ہم یہ تو بتادو
کس طرح رفو اس میں ہو دل تم سے جو پھٹ جائے

☆☆☆

شیخ امیر اللہ تسلیم

احمد حسین نام تھا مگر امیر اللہ کے نام سے مشہور ہیں، مولوی عبد الصمد انصاری کے بیٹے تھے، نواح فیض آباد میں منگلیسی ایک گاؤں تھا، وہاں ۱۲۳۵ھ میں پیدا ہوئے، والد ان کے پلٹن میں ملازم تھے، اس تقریب سے لکھنؤ میں نشو و نما پائی، باپ اور بڑے بھائی عبد اللطیف سے فارسی اور عربی کی کتابیں پڑھیں اور خطاطی میں کمال پیدا کیا۔

شعر و سخن سے مناسبت خداداد تھی، لکھنؤ میں صحبت بھی ایسے لوگوں کی میسر ہوئی جو شعر و سخن سے مذاق رکھتے تھے، اس لیے وہ رنگ چمک گیا، جب مرزا اصغر علی خاں نسیم لکھنؤ آگئے تو اس میں برگ و بار پیدا ہو گئے، ان سے مشق سخن کرنے کے بعد اپنی راہ اہل لکھنؤ سے الگ نکال لی۔

ان کے والد پلٹن میں کسی عہدے پر مقرر تھے جس کی تنخواہ تیس روپیہ ماہوار ان کو ملتی تھی، جب وہ کبر سنی کی وجہ سے کام کرنے کے قابل نہ رہے تو انہوں نے محمد علی شاہ کے زمانے میں ان کو اپنی جگہ پر کرا دیا، یہ مدت تک کام کرتے رہے اور مشق سخن بھی جاری رہی، واجد علی شاہ کے زمانے میں مسٹر سلیمن رزیڈنٹ لکھنؤ کی کسی شکایت پر ان کی پلٹن توڑ دی گئی، یہ بیکار ہو گئے، تین برس مسلسل کوششیں کیں مگر بے سود۔

اس زمانے میں شاعری زوروں پر تھی، ایک منظوم عرض داشت اپنے ہاتھ سے خوش خط لکھ کر مقبول الدولہ مرزا مہدی علی خاں قبول کی وساطت سے پیش کی، وقت آگیا تھا، بادشاہ کی نظر اس پر پڑ گئی، نظم میں حکم لکھوایا۔

بشنو اے خوش نویس وائے خوش گو ہر دو فن می کنی و ہر دو نکو
اسم تو مندرج بدفتر شد بست و دہ روپیہ مقرر شد

اس دن سے ان کو تیس روپیہ ماہوار پھر ملنے لگے، ایام غدر میں جب لکھنؤ میں نوابی ہوگئی تو پھر کسی پلٹن میں اسی عہدہ پر یہ مقرر ہوگئے جو شاہی زمانے میں تھا، نو مہینے تک جنگ کی کشاکش میں مبتلا رہے، جب کام بگڑا تو رام پور چلے گئے اور عرصہ تک وہاں رہے۔

جب لکھنؤ میں پھر انگریزوں کا تسلط ہوا اور راستے محفوظ ہوگئے تو رامپور سے چلے آئے، نواب محمد تقی خاں نے دس روپئے ماہوار کر دیے اور اپنا کلام اصلاح کے لیے ان کو دینے لگے اور منشی نولکشور نے اپنے چھاپہ خانہ میں بیس روپیہ ماہوار پر ملازم رکھ لیا۔

نواب کی زندگی تک تیس روپیہ ماہوار ان کو ملتے رہے، ان کے مرنے پر بیس روپیہ رہ گیا، تھوڑے دنوں کے بعد نواب کلب علی خاں مرحوم مسند نشین رامپور ہوئے اور ان کی قدردانی سے ہر طرف سے نامی گرامی شاعروں نے رامپور پہنچ کر خلعت ملازمت حاصل کیا، تسلیم اسی بیس روپیہ میں لکھنؤ میں پڑے ہوئے تھے۔

نواب کو خود یاد آیا، ان کو بلوا کر تیس روپیہ ماہوار تنخواہ کر دی مگر اس تیس روپیہ میں ان کی بسر اوقات کیا ہوتی، عید و بقر عید میں قصیدے پیش کرتے اور ہر موقع پر دو سو روپیہ ان کو ملا کرتا، اس پر بھی یہ قرضدار ہو جاتے، نواب مرحوم کو خبر ہوتی تو وہ افسوس کرتے اور بلا کر پوچھتے کہ کتنا قرض ہے، یہ جو کچھ بتاتے اس سے دونا چوگنا ان کو مل جاتا اور تاکید ہوتی کہ احتیاط رکھنا مگر نواب کی فیاضیوں نے سیر چشم بنا رکھا تھا، احتیاط کون رکھتا۔

نواب کی زندگی بھر یہی تماشا رہا، نواب کے مرنے کے بعد ان کی پنشن ہوگئی اور بجائے تیس کے دس پندرہ روپے رہ گئے، اس پریشانی اور ناکامی میں ٹونک گئے اور وہاں سے ناکام واپس ہوئے، پھر مانگرول گئے، نواب حسین میاں قدردان رئیس تھے، پچاس روپیہ ماہوار اور خرچ پر روکنا چاہا مگر وہاں کی آب و ہوا ان کو موافق نہ آئی، چلے آئے۔

جب نواب حامد علی خاں مسند نشیں ہوئے تو داداجان کے وقت کا شاعر سمجھ کر دربار میں بلایا اور حال پوچھا، معلوم ہوا کہ پنشن ہوئی ہے، فرمایا کہ پنشن کیسی، یہ کوئی سپاہی تھے کہ اب بندوق نہیں چلا سکتے، یہ تو شاعر ہیں جو کام پہلے کرتے تھے، وہ اب بھی کر سکتے ہیں، خلد آشیاں کے عہد کے تیس روپیہ بحال کیے جائیں اور ہماری طرف سے دس روپیہ ماہوار اضافہ۔

اس طرح تھوڑی فراغت پھر نصیب ہوئی مگر آنکھوں اور کانوں کی نعمتوں سے محروم ہو گئے تھے، بقیہ حیاتِ مستعار کو پورا کر کے چھیانوے برس کے سن میں ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی۔

غدر سے پہلے ایک دیوان تیار ہو گیا تھا، وہ غدر کے ہنگامہ میں ضائع ہو گیا، دوسرا دیوان غدر کے بعد مرتب کیا جس میں قصائد غدر سے پہلے کے شامل ہیں، یہ دیوان نظم ارجمند کے نام سے چند قصیدوں اور دو مثنویوں کے ساتھ لکھنؤ میں شائع ہو گیا ہے اور اس کی کاپی خود انہی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہے، رامپور میں تیسرا دیوان تیار ہوا جو نظم دل افروز کے نام سے چھپا ہے، اس کے بعد چوتھا دیوان دفتر خیال کے نام سے شائع ہوا، پانچویں دیوان کے متفرق اجزا ان کے رامپوری شاگردوں کے پاس ہیں جن کے شائع ہونے کی توقع نہیں۔

مثنویوں میں نالہ تسلیم اور شام غریباں پہلے دیوان کے ساتھ شائع ہوئی ہیں، اس کے بعد صبح خنداں، دل و جان، نغمہ بلبل، شوکت شاہجہانی، گوہر انتخاب اور تاریخ بدیعی یعنی تاریخ رامپور وقتاً فوقتاً لکھیں اور شائع ہوئیں، سفرنامہ نواب رام پور جس میں پچیس ہزار شعر سے کم نہ ہوں گے، رام پور کے سرکاری کتب خانہ میں قلمی موجود ہے۔

تسلیم کو اصناف سخن میں جو قدرت مثنویوں میں حاصل تھی وہ ان کے معاصرین میں سے کسی کو حاصل نہ تھیں، اخیر زمانے کی مثنویاں جو ان کی کمزوری اور بدحواسی کے زمانے کی تصنیف ہیں، دیگر اساتذہ کی بہترین مثنویوں کے برابر بلکہ ان سے بہتر کہی جا سکتی ہیں۔

قصیدوں میں بھی ان کا رنگ خاص ہے، مضمون کی بلندی اور بلاغت کو الفاظ کی

رنگینی اور فصاحت کے ساتھ ایسا نمایاں کرتے ہیں کہ اکثر موقعوں پر قصیدہ میں غزل کا رنگ جھلکنے لگتا ہے۔

تغزل میں نظم ارجمند کی غزلیں اپنی خصوصیتوں اور گوناگوں صنعتوں کے لحاظ سے ان کی عمر کا بہترین سرمایہ ہیں، اس کے بعد کلام میں کمزوری کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں۔

عام جوہر ان کے کلام کا پختگی کلام، رنگینی الفاظ اور دلپذیری مضامین ہے جس سے بے مثالی کی شان اس میں کھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

قصیدوں کا نمونہ ملاحظہ ہو:

نغمہ سنجی کے نہ قابل نہ سزاوار فغاں — بلبل تصویر ہوں رکھتا نہیں گویا زباں
ہر طرح پوشیدگی حاصل ہے مجھ کو غیب سے — سینہ میں مانند دل ہوں دل میں ہوں مثل گماں
بوئے گل ہوں گل کو بھی صحبت مری ہے ناگوار — ہوں سبک روحی سے اپنے طبع نازک پر گراں
عین پستی میں خیال سربلندی ہے وہی — ہوں ترقی آشنا مثل غبار ناتواں
ہوشیار اے خامہ بیہودہ پیا ہوشیار — تا کجا وقف زیاں آئین و رسم شاعراں
مطلع مضمون عالی یاد آیا ہے مجھے — جس سے پیدا ہے عروج التماس قدسیاں

اوج دکھلاتا ہے حسن پست فطرت ہر زماں — بوسۂ روئے زمیں لیتا ہے کیا کیا آسماں
جوش مستی میں جوانانِ چمن کے سامنے — چلتی ہے باد صبا کرتی ہوئی اٹکھیلیاں
منبر ہر شاخ پر پڑھتی ہے بیٹھی عندلیب — خطبہائے مدحت واجد علی شاہ جہاں
جس کی ادنیٰ ریزش زر کی بدولت دہر میں — مختصر ہے طول دامانِ زمین و آسماں

ٹپکے ہیں دیدۂ بے خواب سے کیا کیا گوہر — دیکھتے دیکھتے مٹ مٹ گئے کیا کیا گوہر
بے ثباتی کو مری دیکھ کے آنسو کی طرح — خود بخود ٹوٹ گیا ہاتھ جو آیا گوہر
تھا وہ غم دوست کہ صناع ازل کے آگے — اشک ہوتا میں بگڑ کر جو بناتا گوہر

دیتے ہیں اہل صفا اہل صفا کو قوت ضعف دل کے لیے لکھتے ہیں اطبا گوہر
کس طرف جوش میں جاتا ہے کدھرائے تسلیم تا کجا تار پریشاں میں پروتا گوہر
عذرشوریدہ سری ہے جو تجھے سن مجھ سے مطلع صاف کہ ہر نقطہ ہو جس کا گوہر

غور سے دیکھ ذرا ہمدم والا گوہر آبرو میں در مضمون ہیں سوایا گوہر
یہ دل وجاں ہے دل وجان صفا طینت کا آبلہ ہے جگر چاکِ صدف کا گوہر
اس سے ہے حشر تلک زینت نام ممدوح چند دم ہے سبب رونق دنیا گوہر
گر تامل ہے تو چل منصف دوراں کے حضور نہ رہے شک سخن اچھا ہے کہ اچھا گوہر

یوں ہی چندے جو رہا حوصلۂ صرف وکرم عالم بحر میں ہوجائے گا عنقا گوہر
پرتوِ عارضِ روشن جو دکھائے اعجاز حرم نظارہ ہو اک دیدۂ بینا گوہر
نقش پا ہے سبب زینت عالم ایسا جیسے ہو تاج سرشاہ کو زیبا گوہر

غزلوں کا رنگ ملاحظہ ہو:

وطن میں تازہ وارد ہوں طبیعت گھر میں کیا بہلے
ابھی پھرتا ہے آنکھوں میں مرے نقش بیاباں کا

وہ ہوا خواہ اسیری تھے کہ آزادی کے بعد رو دیے ہم دیکھ کر خالی قفس صیاد کا

ہائے کب تک نہ میں گھبراؤں گا اے دست جنوں
اب تو دامن بھی نہیں ہے کہ بہل جاؤں گا

اللہ رے اضطرابِ تمنائے دید یار اک فرصت نگاہ میں سو بار دیکھنا

اجل خفا ہے فلک مدعی زمیں دشمن مرا جہاں میں کوئی نظر نہیں آتا

حجاب دیدۂ نرگس سے باغ میں نہ کرو　　یہ دیکھنے کی ہیں آنکھیں نظر نہیں آتا

نالہ کھینچا ہے دل ہے خفا شوق ہے اداس　　تو کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

آبرو گر چاہتا ہے کنج خلوت کر قبول　　قطرۂ نیساں صدف میں آکے گوہر ہو گیا

محبت میں یہ بے رحمی کہ جینا ہو گیا مشکل　　خدا ناکردہ کیا ہوتا جو وہ کافر عدو ہوتا

تنگی کنج قفس، رنج اسیری، داغ گل　　اتنے سامانِ ستم اور ایک جانِ عندلیب

راحت طفلی، جوانی، غفلت، پیری و مرگ　　جیتے مرتے ہم نے دو آنکھوں سے دیکھے چار خواب

خشک گل، افسردہ سبزہ، شمع چپ، بالیں اداس　　جی بھر آیا عالم گور غریباں دیکھ کر

تڑپتی دیکھتا ہوں جب کوئی شے　　اٹھا لیتا ہوں اپنا دل سمجھ کر

پرواز اولیں میں اسیری ہوئی نصیب　　گویا قفس میں تھے جو اڑے آشیاں سے ہم

چاہیے سب کچھ مگر اے دوستو آتی ہے شرم　　ان نصیبوں میں کسی شے کی تمنا کیا کروں

مانا کہ حسن یار سے لبریز ہے جہاں　　لیکن وہ حوصلہ وہ شکیب نظر کہاں

غیر کیا دوست بھی ہوتا نہیں مشکل میں شریک　　پھر گئیں وقت اجل دیکھ کے بے دم آنکھیں

وہ برق میں شوخی وہ لگاوٹ تھی ہوا میں　　دی رخصت مے خود مجھے توبہ نے گھٹا میں

لے چلے ہیں دشت سے کیوں اقربا سوئے وطن　　اب تو مجھ کو وادی غربت بھی گھر سے کم نہیں

دو دن کی زندگی ہے اسیری میں عندلیب　　فکر قفس کرے کہ اسیری کا غم کرے

کیوں کر کہوں کہ لطف بھی ان کا ستم نہیں　　کب آئے دیکھنے کو کہ جب مجھ میں دم نہیں
اس کی سحر نہ اس کی زمانے میں شام ہے　　فرقت کی شب بھی روز قیامت سے کم نہیں

کیا خبر مجکو خزاں کیا چیز ہے کیسی بہار　　آنکھیں کھولیں آکے میں نے خانۂ صیاد میں

ملیں صبح وطن کی آرزوئیں خاک میں آکر　　مبارک باد دے اے بے کسی شام غریباں کو

پارسائی کیسی اے زاہد بتوں کے عشق میں　　میں اسی کا شکر کرتا ہوں کہ ایماں رہ گیا

ہٹ اس کی رہ گئی یہ بڑی بات ہے مجھے　　دل چیز کیا تھا ہاتھ سے اپنے گیا گیا

گل ہوں تو جگر چاک ہوں بو ہوں تو پریشاں　　ہر رنگ میں اک آفت غم دل سے لگی ہے

ہم سائیگی بھی سوختہ قسمت کی قہر ہے　　بھڑکی جو دل کی آگ کلیجہ کو جا لگی

کیا خاک سنوں ناصح مشفق تری باتیں　　کہنے میں نہیں میرے طبیعت کئی دن سے

رہا بھی ہوں تو کیا پرواز کی دل سے ہوس نکلے　　کہ ہل سکتے نہیں جو بال و پر زیر قفس نکلے
امید فیصلہ محشر میں کیا ہو وہ جو بیٹھے ہیں　　وہاں تھے جان کے دشمن یہاں فریادرس نکلے
پُر ارماں گردن و خنجر ہیں دونوں دیکھیے کیا ہو　　کسے ناکام رکھے آسماں کس کی ہوس نکلے
نکالے گا کوئی کب تک دل بسمل سے پیکاں کو　　جو سو میں ایک بھی نکلے تو یہ لاکھوں برس نکلے
یونہی لڑتے جھگڑتے عمر دو روزہ گزر جائے　　نہ ہم نکلیں نہ میخانہ سے اے ساقی عسس نکلے

قیامت ہے قفس میں دیکھ کر بازو کو رہ جانا　　بلا سے صبر آجاتا اگر بے بال و پر ہوتے

اٹھا لینے کی فرصت اضطرابِ دل اگر دیتا — تو جیتے جی مرے پامال کیوں لخت جگر ہوتے
مجھے تو طعنۂ پرواز فصل گل میں کیوں دیتا — اسی قابل اگر صیاد میرے بال و پر ہوتے
چلو ہم مر گئے فرصت ملی جھگڑا مٹا ورنہ — یہی شکوے گلے باہم مری جاں عمر بھر ہوتے
دم پیری مآل کار سے کیوں کر نہ غفلت ہو — کہ اکثر آنکھ لگ جاتی ہے انساں کو سحر ہوتے
برنگ شمع مہماں شب کا ہوں رو لے جو رونا ہو — کہاں پائے گی تو اے بے کسی مجھ کو سحر ہوتے
نہ رہتا کفر و دیں کا ایک بھی پابند دنیا میں — خدائی اس طرف ہوتی مری جاں تم جدھر ہوتے
پس پردہ سے یہ پردہ دری ہے جان مضطر کی — قیامت شیوہ گر ہوتی جو تم پیش نظر ہوتے
فقط آواز سن کر وہ رو دیتے ہیں غیروں کی — خدا معلوم کیا ہوتا جو نالے بے اثر ہوتے

نہ شامیانہ، نہ شمعِ تربت، نہ موجِ سبزہ، نہ چادرِ گل
بلا نصیبوں میں پھنس کے کیا کیا خراب مٹی ہے بے کسی کی

نالۂ تسلیم کا نمونہ

آغاز کلام

شگافِ کلک رنگیں خندہ زن ہے — مبارک باد آغاز سخن ہے
بھری ہے بے نیازی مدعا میں — سر تمکیں ہے عرض التجا میں
بڑھی ہے ناتمامی گفتگو سے — مرا مطلب سوا ہے آرزو سے
خیال آئینہ حیرت فزا ہے — زباں مصروف حمد کبریا ہے

دعائے عاشقانہ

الٰہی دے زبانِ نکتہ دانی — دکھاؤں جلوۂ حسن معانی
اجازت خواہ لطف گفتگو ہے — خموشی بہر رخصت روبرو ہے
نظر لوث سخن سے پارسا ہے — ابھی نادیدہ حسن مدعا ہے

سحاب آسا عطا کر چشم گریاں　　مصیبت زادۂ آغوش طوفاں
رہے بیداریوں کا حفظ آداب　　نہ ہوں آنکھیں کبھی منت کش خواب
نہ کم ہو کوئی دن سامانِ سودا　　رہے سر منزل احسان سودا
ترقی پر رہے شوقِ اسیری　　رہے وحشت کو پاس دستگیری
فلک کو لذت ذوق جفا سے　　نہ دوں فرصت تقاضائے بلا سے

خاتمہ

پلا ساقی شراب جام حسرت　　کہ ہوں خدمت سے اب مشتاق رخصت
جو تو نے شیشۂ و ساغر اٹھایا　　مجھے قول غنیمت یاد آیا
بیا ساقی بیا اے قبلۂ شوق　　کہ دور آخر شد و باقی است ایں ذوق
طبیعت جوش پر آنے نہ پائی　　عروجِ فکر دکھلانے نہ پائی
نہ نکلا حوصلہ اپنی زباں کا　　قلق ہے دل کو انجام بیاں کا
احبا نے کہا ہنگام اتمام　　کہ اس کا نالۂ تسلیم ہے نام
یہاں تک یہ پسند طبع آیا　　کہ گویا دل سے میرے نقل پایا
ہوا ہاتف سے بہر سال ارشاد　　قبول خاطر ارباب فن باد
۱۲۶۵ھ

نمونہ شام غریباں

حمد

اجازت او خیال قاصد دل　　کہ آپہنچا دم تکلیف مشکل
طبیعت پھر مری کچھ ناز پر ہے　　کوئی مطلب مگر آغاز پر ہے
فضا میں لپٹے ہیں فکر رسا سے　　زباں جنبش میں ہے حمد خدا سے
طلسمی کارخانہ اک بنا کے　　نظر سے چھپ رہا صورت دکھا کے

کسی کو عشق کی لذت عطا کی ۔ مزہ دیتی رہی اندوہ نا کی
کہیں ہے التماس شوق دیدار ۔ کہیں ہے محرمِ اسرار انکار
کہیں طالب کہیں مطلوب وہ ہے ۔ غرض ہر رنگ میں کچھ خوب وہ ہے
تماشا دوست یار خود نما ہے ۔ تصور بن کے پھرتا جا بجا ہے
کہاں تک ایک سی آہنگ فریاد ۔ بدل اب اور کوئی رنگ فریاد
ملک مشتاق ہیں حرف دعا کے ۔ فلک پر بھیج تحفے التجا کے

مناجاتِ عاشقانہ

الٰہی دے کوئی دل سر بسر جوش ۔ برنگ زخم خنداں غم فراموش
ہمیشہ سایۂ خنجر میں تڑپے ۔ اگر محشر بھی ہو محشر میں تڑپے
ہنسے رسوائی حال زبوں پر ۔ بہائے اشک تدبیر جنوں پر
نہ ہو پامال غم کی سرکشی سے ۔ اٹھائے ناز دشمن بھی خوشی سے
بڑھے گر بدگمانی چشم تر کی ۔ قسم کھائے سرِ داغِ جگر کی
نہ ہو کامل مذاق تلخ کامی ۔ رہے ہر مدعا میں ناتمامی
رگ سودا جنوں میں خون کو ترسے ۔ سنے طعنے زبانِ نیشتر سے
مروں تیور اگر بدلیں الم کے ۔ رکے سینہ میں دم رکنے سے دم کے
اجل سامانِ شادی کا سبب ہو ۔ صف ماتم صف بزم طرب ہو
بڑھیں رتبے یہ جنس سرسری کے ۔ اٹھاؤں ناز قحط مشتری کے
سیہ کاری قبول لم یزل ہو ۔ لباس کعبہ طومار عمل ہو
بس اے تسلیم کب تک جوشِ مستی ۔ کہاں تک شیوۂ مطلب پرستی
کمی کر شوق عرض التجا میں ۔ گرہ دے طول زلف مدعا میں
زباں ہے مائل ذکر پیمبرؐ ۔ دہن ہے حلقۂ گردابِ کوثر

مولوی محمد محسن

مولوی محمد محسن، محسن تخلص، مولوی حسن بخش خلف مولوی حسین بخش علوی کاکوروی کے بیٹے تھے، ۱۲۴۲ھ میں بمقام کاکوری پیدا ہوئے، سات برس کے سن سے سولہ برس کے سن تک اپنے دادا کے دامن تربیت میں پرورش پائی، ان کے انتقال کے بعد باپ اور مولوی عبدالرحیم سے تحصیل علم کی۔

مولوی ہادی علی اشکؔ ان کی ماں کے خالہ زاد بھائی تھے، ثقہ، پرہیزگار، عالم باعمل، تحقیقات علمی اور اصول شاعری پر ان کو عبور کامل حاصل تھا، انہی سے مشق سخن کی۔

مین پوری میں چندروز عہدۂ نظارت پر کام کیا اور وہیں سے وکالت ہائی کورٹ کا امتحان دے کر کامیابی حاصل کی، اس زمانے میں صدر دیوانی عدالت آگرہ میں تھی، بعد کامیابی آگرہ میں بودوباش اختیار کی، غدر ۱۸۵۷ء تک آگرہ میں رہے، اس کے بعد مین پوری میں مستقل قیام کر کے وکالت کو خوب ترقی دی، چندروز میں ان کی دیانت، راست بازی، صفائی معاملہ، نازک خیالی اور عالی دماغی کی دھوم مچ گئی، حکام ان کو خاص عزت و وقعت کی نظر سے دیکھتے تھے۔

ہر شخص سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملتے اور ہر کسی کے درد، دکھ میں شریک ہوتے، انکسار جوہر طبعی تھا، پرانی وضع داری اور ایشیائی مروت کا وہ بے مثل نمونہ تھے جس میں حکمت عملی، ضرورت وقت اور پالیسی کا گزر نہ تھا جس شخص سے جو برتاؤ ایک مرتبہ ہو جاتا، اس کو وہ اخیر تک نباہتے رہتے تھے۔

شعر و سخن کا شوق بچپن سے تھا، ابتدا میں کچھ غزلیں بھی لکھیں اور کبھی کبھی کسی کی فرمائش سے قصیدہ یا مثنوی، یا دوستوں اور بزرگوں کی تحریک سے تاریخ ہائے ولادت و وفات لکھیں، اس کے سوا نعت کے سوا انہوں نے کچھ نہیں لکھا، کلیات ان کے بڑے بیٹے مولوی نور الحسن بی اے، ایل ایل بی نے جمع کر کے چھپوا دیا ہے، اس میں سب سے پہلے ایک نعتیہ قصیدہ ''گلدستہ کلامِ رحمت'' ہے، ۱۲۵۸ھ میں لکھا تھا، اس کے بعد ''سراپائے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم)'' ہے جس کو ۱۲۶۶ھ میں تصنیف کیا تھا پھر ان کا مشہور قصیدہ ہے جو شہیدی کے قصیدے کے جواب میں ہے، اس کو ۱۲۷۴ھ میں لکھا تھا اور منشی امیر احمد امیرؔ نے اس کی تضمین کی ہے، پھر ''چترِ شہنشاہی'' ایک ترکیب بند ہے جو واجد علی شاہ کی تعریف میں کسی دوست کی فرمائش سے اور انہی کے نام سے لکھی تھی، پھر مثنوی ''صبح تجلی'' ہے جو ۱۲۸۹ھ میں لکھی ہے، پھر ''فغان محسن'' اور ''نگارستان الفت'' دو چھوٹی چھوٹی مثنویاں ہیں جن کو ۱۲۸۹ھ اور ۱۲۹۳ھ میں لکھا تھا، پھر ''مدح خیر المرسلینؐ'' ان کا وہ مشہور نعتیہ قصیدہ ہے جس نے ہر کہ و مہ سے خراج تحسین وصول کیا ہے، اس کا پہلا مصرعہ ہے ع

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل

اس کو ۱۲۹۳ھ میں لکھا تھا اور اس کا خمسہ منشی عبدالمجید سحر نے بھی بڑے زور کا لکھا ہے۔

پھر اپنی مشہور مثنوی چراغ کعبہ شب معراج کے حال میں ۱۳۰۱ھ میں لکھی تھی، پھر ان کی مثنوی شفاعت و نجات ہے، اس کو ۱۳۱۱ھ میں لکھا تھا، اس کے بعد رباعیاں، غزلیں اور تاریخیں ہیں۔

عام جوہر ان کے کلام کا مضامین کی بلند پروازی، الفاظ کا شان و شکوہ، بندش کی چستی، استعاروں کی رنگینی اور قصہ طلب تلمیحات ہیں جس میں ان کے معاصرین میں کوئی ان کا شریک نہیں بلکہ اردو شاعری میں اس کا جواب نہیں۔

ثاقبؔ نے مکتوبات امیر مینائی کے مقدمہ میں ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے ایک

مرتبہ منشی امیر احمد امیرؔ سے محسن کاکوروی کی سخن آفرینی اور بلاغت کلام کا تذکرہ کیا تو فرمایا کہ ''ان کا کلام ایک عالم ہے، خیالات نادرہ کا کہ اس کو دیکھ کر انسان حیران ہو جاتا ہے اور ان کا ہر شعر معراجِ بلاغت ہے۔''

۱۸ رصفر ۱۳۲۳ھ کو اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو رحلت کی، مرتے وقت پاسِ انفاس جاری تھا، تاریخ وفات منشی زین العابدین فرجاد نے بڑی معقول نکالی جو کہ آیۂ کریمہ ہے ''اِنَّهٗ فِی الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ''

صبحِ تجلی

بیضاویِ صبح کا بیاں ہے　　تفسیر کتاب آسماں ہے

ہے خاتمۂ شب دل افروز　　دیباچہ نگار نسخۂ روز

آثار سحر ہوئے نمایاں　　سیپارہ لیے ہوئے ہے دوراں

واللیل کو ختم کر چکا ہے　　آمادۂ دور والضحیٰ ہے

عنوان فلک ہے درمنثور　　لوح زرّینِ سورۂ نور

اطراف بیاض مطلع صاف　　''والفجر'' کے حاشیہ پہ کشاف

ہر دشت ہے مثل دشت ایمن　　ہر کوہ برنگ طور روشن

گردوں کے غلاف میں ہے پنہاں　　مشکوٰۃِ شریف مہر تاباں

ظلمت کا چراغ بے ضیا ہے　　انجم کا ستارا ڈوبتا ہے

ہنگام سپیدۂ سحرگاہ　　ساعات میں روز و شب کے واللہ

اک مخبر صادق البیانؐ ہے　　پیغمبر آخر الزماںؐ ہے

کیفیت وحی میں ہے بلبل　　ہے وقت نزول مصحف گل

سبزہ ہے کنار آب جو پر　　یا خضر ہے مستعد وضو پر

نوبت ہے صدائے قمریاں کی — تیاری ہے باغ میں اذاں کی
اک شاخ رکوع میں رکی ہے — اور دوسری سجدہ میں جھکی ہے
سوسن کی زبان پر مناجات — جاری لب جو سے التحیات
تسبیح شگوفہ یا مصور — تحریمۂ تاک ''ربِّ اغفر''
اللہ اللہ کیا سماں ہے — ہر شے کو حیات جاوداں ہے
سرسبزی ہے باغ میں جناں کی — آمد ہے بہار بے خزاں کی
لوح و قلم ادیب تقدیر — محو خط نسخ عالم پیر
ایام کا بخت پھر جواں ہے — پھر عہد شباب آسماں ہے
ہستی و عدم میں اک لے ہے — لاشے کے بھی لب پہ آج نے ہے
کیفیت خرمی سے آج مسرور — رنگین طبعانِ عالم نور
رضواں نے کہیں سبیل رکھی — ہر کوزے میں سلسبیل رکھی
تیار کیے بحکم باری — میکائیل اک طرف نہاری
آئی ہے ساغر و صراحی — کوثر سے کھنچی ہوئی صبوحی
گلدستے بہشت نے بنائے — جبرئیل درود پڑھتے آئے
بیٹھے ہوئے ہیں خوشی سے پھولے — غلمان لیے ہار، حور گجرے
خاکہ ہے زمیں میں آسماں کا — نقشہ ہے مکاں میں لامکاں کا
گویا اتر آئے ہیں زمیں پر — مینا بازار چرخ اخضر

ناگاہ بجلوۂ عبارت — پیدا ہوئی غیب سے بشارت
یہ صبح سعادت جہاں ہے — نو روزِ بہار جاوداں ہے
نازل ہے زمیں پہ کبریائی — بندے کے لباس میں خدائی

اس وقت دیار میں عرب کے مطلع سے تجلیات رب کے
برج شرف قریشیاں میں اور ہاشمیوں کے خانداں میں
کعبے کی زمین نامور سے اور عبدالمطلب کے گھر سے
اسلام کا آفتاب چمکا بے پردہ و بے نقاب چمکا
پیدا ہوئے سرور دوعالمؐ پیدا ہوئے فخر نوحؑ و آدمؑ
محبوب خدا نبی مرسلؐ صبح دومین روز اول
مقصود ازل اجل و اعلیٰ منظور حضور حق تعالیٰ
عین عرفان و مردم عین ابروے جبین قاب قوسین
جان و دل مرسلیں محمدؐ روح روح الامیں محمدؐ
کیفیت وجد میں ہے اب ذوق کہتا ہے خطیب خامۂ شوق
ہے ذکر ولادت پیمبرؐ اعلیٰ اولیٰ اہمّ و اکبر

چراغ کعبہ کا نمونہ

جبرئیلؑ

عمان کرم کے درمنثور قرآنِ شرف کے سورۂ نور
مانند دوا زمیں پہ نازل مانند دعا سپہر منزل
منشور اوامر و نواہی عنوانِ صحیفۂ الٰہی
وارد ہوئے ابرساں زمیں پر ساتھ ان کے براق برق پیکر

براق

چھوٹا سا فرس فرشتہ ہیکل کھیت اس کا بہشت خلد جنگل
مہ پارہ فلک سے آنے والا اطلس کو کتاں بنانے والا

یوں چرخ سے نکلے وہ سبک رو — فانوس سے جس طرح کہ پرتو
شیشے سے پری چمن سے شبنم — سیپی سے گہر جاب سے دم
گلشن سے بہار جسم سے جاں — آنکھوں سے نیند دل سے ارماں

درود

حاضر ہوئے اس کے آستاں پر — جس کا کہ مکاں ہے لامکاں پر
محبوب خدائے انس و جاں کا — مقصود رموزِ کن فکاں کا
ہاشم کی کلاہ میں گل تر — دامن میں قریشیوں کے گوہر
امکاں کے گہر کا ابر نیساں — دریائے قدم کا شاخ مرجاں
صانع کے قلم کا رنگ ایجاد — بندوں کے چمن کا سروِ آزاد
ایمان کی سند کا نقش خاتم — عرفاں کے نگیں کا اسم اعظم
لاہوت مقام و عرش مسند — شاہنشہ انبیا محمدؐ

بیداری

آداب سے آپؐ کو اٹھایا — یا اپنے نصیب کو جگایا
بیدار ہوئی جو چشم حق بیں — آہو ہوئی شکل خواب شیریں
دیکھا کہ عجیب ماجرا ہے — گھر برج قمر بنا ہوا ہے
انشائے رموز غیب مخبر — ہونے کا نہیں یہ دن کبھی پھر
سونا کبھی ہو نہ یہ جگانا — لیتا رہے کروٹیں زمانا
طالع میں نہیں یہ شب کسی کے — اختر سو بار سو کے جاگے
ہوگی نہ یہ پھر زمیں کی توقیر — مٹی ہو ہزار بار اکسیر
انوار کا ہے ورود پیہم — تاروں کی برس رہی ہے شبنم
جبریل ہیں اور براق بھی ہے — قاصد بھی ہے اشتیاق بھی ہے

سیر مقام اعلیٰ

زیر قدم جناب والا — اعلیٰ سے تھا جو مقام اعلیٰ
دل کی تنگ و دو تھی دم سے آگے — سرچار قدم، قدم سے آگے
چمکا ہوا ایمن تجلی — پھیلا ہوا دامن تجلی
وحدت کا کھلا ہوا وہ ناکا — جس میں نہیں دخل ما سوا کا
وارفتہ خیال جست و جو کے — چھاپے لیے خون آرزو کے
امید کے تہ نشیں سفینے — ٹوٹے ہوئے حوصلے کے زینے
نکلی ہوئی ہمتوں کی جانیں — اتری ہوئیں چلے سے کمانیں
جھیلے ہوئے دور باش ادب کی — طوبیٰ و بہشت و عرش و کرسی
جانے کا لے سکیں ملک نام — روحوں کا پہنچ سکے نہ پیغام
تاثیر دعا کے در سے محروم — کوشش شرف اثر سے محروم
انسان کی واں تھی کب رسائی — آنکھوں میں کشش بٹھا کے لائی
وہ مردم چشم دین و ایماں — کحل البصر وجوب و امکاں
آنکھوں کو تلاش جلوۂ رب — کانوں میں صدائے "نحن اقرب"
آیا سوئے بزم "لی مع اللہ" — آئینہ میں جیسے پرتو ماہ
پہنچا وہ وہاں جہاں نہ پہنچے — جبریلؑ کی عقل کے فرشتے
نزدیک خدا حضورؐ پہنچے — اللہ اللہ دور پہنچے

مدیح خیر المرسلینؐ

تشبیب

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل — برق کے کاندھے پہ لاتی ہے صبا گنگا جل

گھر میں اشنان کریں سرو قدان گوکل جا کے گنگا پہ نہانا بھی ہے اک طول امل
خبر اڑتی ہوئی آئی ہے مہابن میں ابھی کہ چلے آتے ہیں تیرتھ کو ہوا پر بادل
کالے کوسوں نظر آتی ہیں گھٹائیں کالی ہند کیا ساری خدائی میں بتوں کا ہے عمل
جانب قبلہ ہوئی ہے یورش ابر سیاہ کہیں پھر کعبہ میں قبضہ نہ کریں لات وہبل
دہر کا ترسا بچہ ہے برق لیے جل میں آگ ابر چوٹی کا برہمن ہے لیے آگ میں جل
ابر پنجاب تلاطم میں ہے اعلیٰ ناظم برق بنگالۂ ظلمت میں گورنر جنرل
نہ کھلا آٹھ پہر میں کبھی دو چار گھڑی پندرہ روز ہوئے پانی کو منگل منگل
ڈوبنے جاتے ہیں گنگا میں بنارس والے نوجوانوں کا سنیچر ہے یہ بڑھوا منگل
شاہد کفر ہے مکھڑے سے اٹھائے گھونگھٹ چشم کافر میں لگائے ہوئے کافر کاجل
جوگیا بھیس کیے چرخ لگائے ہے بھبھوت یا کہ بیراگی ہے پربت پہ بچھائے کمّل
وہ دھنوا دھار گھٹا ہے کہ نظر آئے نہ شمع گرچہ پروانہ بھی ڈھونڈھا سے لے کر مشعل
ابر بھی چل نہیں سکتا وہ اندھیرا گھپ ہے برق سے رعد یہ کہتا ہے کہ لانا مشعل

غزل

سمت کاشی سے چلا جانب متھرا بادل تیرتا ہے کبھی گنگا کبھی جمنا بادل
خوب چھایا ہے سر گوکل و متھرا بادل رنگ میں آج کنھیا کے ہے ڈوبا بادل
سطح افلاک نظر آتی ہے گنگا جمنی روپ بجلی کا سنہرا ہے روپہلا بادل
بجلی دو چار قدم چل کے پلٹ جائے نہ کیوں وہ اندھیرا کہ پھرتا ہے بھٹکتا بادل
میری آنکھوں میں سماتا نہیں یہ جوش وخروش کسی بے درد کو دکھلائے کرشما بادل
دل بیتاب کی ادنیٰ سی چمک ہے بجلی چشم پر آب کا ہے ایک کرشما بادل
طپش دل کا اڑایا ہوا نقشہ بجلی چشم پُر آب کا دھویا ہوا خاکا بادل

اپنی کم ظرفیوں سے لاکھ فلک پر چڑھ جائے — میری آنکھوں کا ہے اترا ہوا صدقا بادل
جام عمر فلک پیر ہوا ہے لبریز — لیے آتا ہے جنازہ دیے کاندھا بادل
راجہ اندر ہے پری خانہ ے کا پانی — نغمۂ نے کا سری کشن کنھیا بادل
دیکھتا گر کہیں محسنؔ کی فغان و زاری — نہ گرجتا کبھی ایسا نہ برستا بادل

گریز

روئے معنی ہے بہکنے میں بھی اعلیٰ کی طرف — تاکتا ہے تو ثریا کی سنہری بوتل
اک ذرا دیکھیے کیفیت معراج سخن — ہاتھ میں جام زحل شیشۂ مہ زیر بغل
گرتے پڑتے ہوئے مستانہ کہاں رکھا پاؤں — کہ تصور بھی وہاں جا نہ سکے سر کے بھل
یعنی اس نور کے میداں میں پہنچا کہ جہاں — خرمن برق تجلی کا لقب ہے بادل
تا باران مسلسل ہے ملائک کا ورود — پئے تسبیح خداوندِ جہاں عزو جل
گل بے رنگی مطلق کے لہکتے گلزار — بے نیازی کے ریاحین مہکتے جنگل
باغ تنزیہہ میں سرسبز نہال تشبیہ — انبیاؑ جس کی ہیں شاخیں عرفاں ہیں کونپل
گل خوش رنگ رسولؐ مدنی عربی — زیب دامانِ ابد، طرۂ دستارِ ازل

سراپا کے چند بند

للہ الحمد شب غم نے اٹھایا چادر — مرحبا طالع بیدار مبارک ہو سحر
مژدہ اے دل کہ ہوا نورِ خدا پیش نظر — بارک اللہ طبیعت کا ہے رنگ دیگر

گر نہ ہو پاسِ ادب تو مجھے کچھ دعویٰ ہے
سجدہ کرتے ہیں ملائک مرا وہ رتبہ ہے

لامکاں تک لیے جاتی ہے مجھے طبع رسا — لڑ گیا عرش کے پایے سے سخن کا پایا
ہو رہا ہے صف ارواح میں میرا چرچا — خیر مقدم کی چلی آتی ہے ہر سو سے صدا

بزم قدسی کا بلایا ہوا مہمان ہوں میں
ملک آنکھوں پہ بٹھاتے ہیں وہ انسان ہوں میں
آج کس دھوم سے خدام سخن آتے ہیں   مسندیں فکر کی محفل میں بچھا جاتے ہیں
تنگی بزم جہاں دیکھ کے گھبراتے ہیں   گاؤ تکیہ کرۂ ارض کا اٹھواتے ہیں
جشن کا روز ہے معنی کے شہ اقدس کا
اور اونچا کرو خیمہ فلک اطلس کا
ہم دکھاتے ہیں طبیعت سے تماشے کتنے   عالم نور میں چھوڑ آئے ہیں شوشے کتنے
حل کیے غنچۂ خورشید سے نکتے کتنے   عقد پردیں سے لکھے ہم نے معمے کتنے
سادہ کاغذ ورقِ مہر درخشاں ہے آج
دست پرنور عطارد میں قلم داں ہے آج

تضمین

کنویں جھانکا کروں کنعان کے تو سودا ہے مجھے   طور پر جاؤں تو ناحق کا بھٹکنا ہے مجھے
خبط ہے گر سر اعجاز مسیحا ہے مجھے   سچ تو یہ ہے کہ ترے گھر میں کمی کیا ہے مجھے
حسنِ یوسفؑ، دم عیسیٰؑ، یدِ بیضاؑ داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

☆☆

دور سوم

جدید شاعری کا آغاز

اردو شاعری کا یہ نیا دور اس وقت سے شروع ہوتا ہے جب کہ پنجاب کے دارالسلطنت لاہور میں کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیم ہو کر آئے اور ان کو اردو زبان کی اصلاح کی طرف توجہ ہوئی، اس کے لیے انہوں نے اردو میں قواعد کی چھوٹی چھوٹی کتابیں تیار کرائیں، اردو نثر میں قصے لکھوائے، مضمون نگاری کو ترقی دینے کے واسطے ایک سرکاری اخبار نکالا اور ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔

اس مشاعرے میں بجائے مصرعہ طرح کے عنوانِ مضمون دیا جاتا تھا تا کہ عاشقانہ خیالات کی جگہ پر مناظر قدرت اور جذبات انسانی کے خاکے کھینچے جائیں، سب سے پہلے مولوی محمد حسین آزاد اور مولانا الطاف حسین حالؔی نے جو اردو شاعری میں ذوق و غالب کی یادگار تھے اور حسن اتفاق سے ان کا تعلق ''سر رشتہ تعلیم'' سے تھا، بطور نمونے کے چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں۔

کوئی طرز بھی ہو، اول اول اس میں کمزوریاں ہوتی ہیں لیکن رفتہ رفتہ اس میں تراش خراش ہوتی ہے اور وہ حسن کے سانچے میں ڈھل جاتا ہے، یہی حالت اس طرز کی بھی ہوئی، پہلے پہل اخباروں میں شور و غل برپا ہوا، پھبتیاں اڑائی گئیں اور کمزوریوں کو خوب نمایاں کر کر کے دکھایا گیا مگر اب آندھی نکل گئی ہے اور یہ طرز اتنا مقبول ہو گیا ہے کہ کہن سال اور کہنہ مشق شاعر جن کی ساری عمر گل و بلبل کی داستان سرائی میں بسر ہوئی تھی، اسی طرز پر اتر آئے ہیں۔

☆☆

مولوی محمد حسین آزاد

مولوی محمد حسین خلف مولوی باقر علی، آزاد تخلص، دلی کے رہنے والے اور قوم کے مغل تھے، شمالی ہندوستان میں اردو اخبار پہلے پہل مولوی باقر علی کے قلم سے نکلا ہے۔

مولوی باقر علی کا بچپن سے شیخ محمد ابراہیم ذوق سے یارانہ تھا، اس زمانے کی یاری رشتے اور ناطے سے زیادہ مضبوط و مستحکم ہوتی تھی، اس لحاظ سے استاد ذوق آزاد کو اپنا بھتیجا سمجھتے تھے، انہی کے سایہ عاطفت میں آزاد نے تعلیم و تربیت پائی اور ان کے مرنے کے بعد حکیم آغا جان عیش (۱) کے فیض صحبت سے فائدہ اٹھایا۔

---

(۱) خاندانی طبیب تھے اور شاہی دربار سے تعلق تھا، آزاد کہتے ہیں کہ زیور علم اور لباس کمال سے آراستہ صاحب اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ صورت، جب دیکھو یہی معلوم ہوتا تھا کہ مسکرا رہے ہیں، ساتھ اس کے شعر کا عشق تھا، طبیعت ایسی ظریف اور لطیفہ سنج پائی تھی کہ جسے شاعری کی جان کہتے ہیں، غزل صفائی کلام، شوخی مضامین اور حسن محاورہ سے پھولوں کی چھڑی ہوتی تھی اور گویا لطائف و ظرائف کی پھل جھڑی۔

آزاد نے ان کو پہلے پہل استاد ذوق کے ساتھ مشاعرہ میں دیکھا تھا، کہتے ہیں کہ اس وقت کی تصویر اس وقت آنکھوں میں پھر گئی، میانہ قد، خوش اندام، سر پر ایک انگل بال سفید، ایسی ہی ڈاڑھی، اس گوری سرخ و سپید رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی تھی، گلے میں ململ کا کرتا جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس رہا ہے، استاد مرحوم کے بعد ذوق سخن اور ان کی کمال کشش نے کھینچ کر ان کی خدمت میں بھی پہنچایا، اب ان صورتوں کو آنکھیں ترستی ہیں اور نہیں پاتیں، غدر کے کچھ دنوں بعد دنیا سے انتقال کیا، افسوس ہے کہ آزاد نے ان کے دو شعر بھی نہیں لکھے۔ (باقی اگلے صفحہ پر)

غدر کے ہنگامہ میں آزاد کا گھر بار لٹ گیا، باپ شہید ہوئے اور استاد کی عمر بھر کی کمائی جس کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتے تھے، برباد ہوگئی، کچھ دنوں پریشان حالی میں ادھر ادھر مارے مارے پھرتے رہے، آخر کار لاہور پہنچے اور سررشتہ تعلیم کے دفتر میں پندرہ ماہوار کی اسامی مل گئی، اس پر مدتوں پڑے رہے، رفتہ رفتہ پچھتر روپے ہوگئے پھر کچھ اور بڑھ گئے اور ان کو موقع ملا کہ یہ اپنی کارگزاری کا جوہر دکھائیں، اس وقت گورنمنٹ کو بھی اردو کے نشو و نما و ترقی کی فکر تھی، ان کو اس سے خاص طرح کا لگاؤ تھا، انجمن پنجاب میں مشاعرہ کی بنیاد ڈالی گئی اور بجائے طرح کے مصرع کے، مضمون کا عنوان دینا قرار پایا، انہوں نے نمونے کے طور پر کئی نظمیں لکھیں اور مقبول ہوئیں۔

اسی اثنا میں تعلیمی کاموں کے علاوہ ملکی کاموں میں بھی ان کو شریک کیا گیا، ایک مرتبہ کسی سرکاری کام پر کلکتہ بھیجے گئے، کچھ دنوں کے بعد پنڈت من پھول میر منشی گورنمنٹ پنجاب کے ہمراہ کابل و بخارا کا سفر کیا، پھر ایران گئے۔

کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے قصص ہند کا دوسرا حصہ ان سے لکھوایا، اس کے بعد انہوں نے خود اپنی خواہش سے نیرنگ خیال کے دو حصے تالیف کیے اور اس میں انگریزی طریقہ کی مضمون نویسی کا چربہ اتارا۔

سب سے بہتر اور عمدہ تصنیف ان کی آب حیات ہے جو اردو زبان اور ریختہ شعر کی تاریخ میں پہلی کتاب اور اردو انشا پردازی کا بہترین کارنامہ ہے، عبارت کی بے ساختگی اور

سابقہ حاشیہ: سب سے زیادہ حیرت یہ ہے کہ نواب مصطفیٰ خاں مرحوم نے گلشن بیخار میں ان کا ذکر بھی نہیں کیا، دو شعر سخن شعرا سے اور ایک آب حیات سے نقل کرتا ہوں۔(۱)

کہتا ہے کوئی شعلہ جوالہ کوئی برق　　اس دل پہ گماں لوگوں کا کیا کیا نہیں ہوتا

اک زلف کا بل ہو تو کہوں سیکڑوں بل ہیں　　پیشانی سے ابرو تلک ابرو سے کمر تک

---

(۱) اس لحاظ سے تو تین شعر ہونے چاہئیں لیکن صرف دو ہی شعر نقل کیے ہیں۔ "ع"

برجستگی اوراس میں شاعرانہ تخئیل، استعاروں کی دلفریبی کے ساتھ ایسی چیز ہے جس پر غزلوں کے سیکڑوں دیوان قربان کردینے کے قابل ہیں۔

اس کتاب کی مقبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ جو غلط اور نادرست روایتیں مصنف کے جادو نگار قلم نے لکھ دی ہیں، وہ آج اردو کی انشا پردازی کے قالب میں روح کی طرح سے پیوست ہوگئی ہیں اور ضرب المثل کی طرح زبانوں پر چڑھ گئی ہیں، جس طرح سے اقلیدس کے اصول موضوعہ بے چوں وچرا مانے جاتے ہیں، اسی طرح سے ان کو بے تکلف کام میں لایا جاتا ہے۔

آزاد کی ایک اور تصنیف دربار اکبری ہے جو اسی قلم کی کشش کا نتیجہ ہے، جس نے آب حیات لکھی تھی، فرق اتنا ہے کہ اس کے مسودے کو وہ خود صاف نہیں کرسکے، یکایک دماغ بگڑ گیا اوران کے شاگردوں نے اس کو مرتب کر کے شائع کردیا۔

ایک اور تصنیف ان کی سخندان فارس ہے جو ایران سے لوٹنے پر لکھی تھے، علاوہ ان کتابوں کے مجموعۂ نظم اردو، قواعد اردو اور چھوٹی چھوٹی درسی کتابیں ہیں جو سررشتہ تعلیم کے تعلق سے لکھی تھیں۔

اخیر زمانہ میں پچھتر روپیہ ماہوار کی پنشن ہوگئی تھی مگر دماغ کے بگڑ جانے سے یہ کام کے نہیں رہے تھے، ۱۹۰۸ء میں وفات پائی۔

صنم ہے گردشِ عالم نگاہِ مہر سے تیری　　اگر تو مہرباں ہوتا تو عالم مہرباں ہوتا

سر اپنا کاٹ کے پھینک آیا کوئے قاتل میں　　یہ بوجھ تھا مری گردن پہ سو اتار آیا

جوان معرکۂ حسن و عشق تھا آزاد　　چلا نہ دل پہ جو قابو تو جان ہار آیا

ادھر بھی چشم عنایات ہو ذرا ساقی — کہ مست دیر سے امیدوار بیٹھے ہیں
کمان ابروئے جاناں کے دل سے ہوں قربان — کہ جتنے تیر ہیں سینے کے پار بیٹھے ہیں

آفریں ہمت کو اس کے دل کی جس نے عشق میں
جان تک پیاری نہ کی ایسا جگر والا تو ہو
ناخن خار آ کے خود کردے گا تیرا عقدہ وا
پہلے پائے شوق میں پیدا کوئی چھالا تو ہو

پوچھتا حالت ہے کیا میرے دل ناشاد کی — آہ کی ہمت نہیں، طاقت نہیں فریاد کی

دیکھنا قید تعلق میں نہ آنا آزاد — دام آتے ہیں نظر سبحہ و زنار مجھے

سنے گا دیکھنا رو رو کے آواز اک جہاں میری
تمہارے عشق کی ہے داستاں اور ہے زباں میری
تقاضا ہے گریباں کا کہ مجھ کو چاک کر ڈالو
تمنا ہے یہ دامن کی اڑا دو دھجیاں میری

از مثنوی شب قدر

اے رات تیرے وصف کہاں تک رقم کروں — اور اتنی روشنائی کہاں سے بہم کروں
وہ آفتاب تھا جو چمکتا جہان پر — بیٹھا تھا جس کا سکہ زمین آسمان پر
کھولے ہوئے شفق کا نشاں زرق برق سے — رکھ کر کرن کا تاج نکلتا تھا شرق سے
اس کے عمل کا توڑنا تیرا ہی کام ہے — سکہ ہے اب ستاروں پہ اور تیرا نام ہے
محنت ثمر تھا اس کا تو راحت تھا پھل ترا — چاندی تھا اس کا حکم تو سونا عمل ترا

از مثنویِ ابر کرم

چلنا وہ بادلوں کا قدم چوم چوم کر
اور اٹھنا آسماں کی طرف جھوم جھوم کر

بجلی کو دیکھو آتی ہے کیا کوندتی ہوئی
سبزہ کو ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا روندتی ہوئی

آتی ادھر صبا ہے ادھر ہے نسیم بھی
اور ان کے ساتھ ساتھ ہے آتی شمیم بھی

مستی میں جھومنا وہ جوانانِ باغ کا
جھک جھک کے لینا ہاتھ سے گل کے ایاغ کا

سبزے کے عکس سے در و دیوار سبز سبز
سیراب باغ و دشت تو کہسار سبز سبز

جھولوں میں نوجوان ہیں پینگیں چڑھا رہے
اور بچے آم کے ہیں پپیہے بجا رہے

ساون کے گیت اٹھا رہے طوفاں دلوں میں ہیں
پردیسیوں کی یاد سے ارماں دلوں میں ہیں

ہر تان میں ملہار کی مستی کا شور ہے
بادل گرج کے پردے میں دیتا ٹکور ہے

☆☆☆

خواجہ الطاف حسین حالؔی

''مولوی الطاف حسین خلف ایزد بخش پانی پتی امروز در دہلی است،
در صحبت حضرت شیفتہ خیلے بسر بردہ، مرزا غالب را فرو ہیدہ یادگار است
و در نغز سرائی نادرۂ گفتار۔'' (اہ طور کلیم)

مولانا الطاف حسین حالؔی اس زمانہ کے مسلم الثبوت شاعروں میں شمار کیے جاتے ہیں، ان کی نظمیں ہندوستان میں بچہ بچہ کی زبان پر ہیں، ان کی ولادت پانی پت میں ۱۲۵۳ھ کو ہوئی، دادھیال ان کا انصاری اور ننہال سادات کے ایک معزز گھرانے میں تھا۔

ولادت کے بعد ان کی والدہ کا دماغ مختل ہو گیا، جب نو سال کے ہوئے تو والد نے رحلت کی، اس وجہ سے تعلیم و تربیت کا جیسا انتظام ہونا چاہیے تھا وہ ان کو میسر نہیں ہوا، قرآن شریف حفظ کرنے کے بعد اپنے شوق سے سید جعفر علی سے کچھ فارسی پڑھی، اس کے بعد مولوی ابراہیم حسین انصاری سے جو شیعوں میں ایک جید عالم تھے، عربی شروع کی، ابھی اچھی طرح کتابیں نکلی نہ تھیں کہ ان کے سرپرستوں نے مجبور ہو کر شادی کر دی، اس وقت ان کا سن سترہ سال کا تھا، شادی کے بعد یہ روپوش ہو کر دلی چلے گئے۔

دلی میں مولوی نوازش علی مرحوم سے صرف و نحو اور منطق کی کتابیں پڑھیں، عربی میں اچھی طرح استعداد نہ ہونے پائی تھی کہ اہل وطن نے ان کو پانی پت بلا لیا، یہ وطن میں تھے کہ ہندوستان میں غدر ۱۸۵۷ء کا محشر خیز ہنگامہ برپا ہو گیا اور چھ سات برس تک ان کو نکلنے کا موقع نہ ملا، تاہم کچھ نہ کچھ کرتے رہے، مولوی محب اللہ، مولوی قلندر علی اور مولوی

عبدالرحمٰن محدث سے بغیر ترتیب و انتظام کے کبھی منطق و فلسفہ کی کتابیں پڑھیں، کبھی حدیث و تفسیر کا درس لیا، جب یہ لوگ باہر چلے جاتے تو شروح و حواشی کی مدد سے ادب کی کتابیں بطور خود مطالعہ کرتے رہتے۔

جس زمانہ میں دلی میں تحصیل علم کے لیے ٹھہرے ہوئے تھے، ان کو اکثر مرزا غالبؔ کے پاس جانے کا اتفاق ہوتا تھا، ان کے اردو فارسی دیوان کے اشعار جو سمجھ میں نہ آتے تھے ان کے معنی ان سے پوچھا کرتے تھے، اسی زمانہ میں مرزا نے اپنے فارسی دیوان کے چند قصیدے بھی ان کو پڑھا دیے تھے، مرزا غالبؔ کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر سے منع کرتے تھے، انہوں نے جو دو ایک اردو یا فارسی کی غزلیں کہہ کر مرزا کو دکھائیں تو انہوں نے کہا کہ میں اگرچہ کسی کو شعر کہنے کی صلاح نہیں دیتا مگر تمہاری نسبت میرا خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے، مگر دلی میں ان کو ایک دو غزل سے زیادہ کہنے کا اتفاق نہیں ہوا۔

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں ان کو بیکار رہتے گزر گئے اور فکر معاش نے انہیں وطن سے باہر جانے پر مجبور کر دیا تو حسن اتفاق سے نواب مصطفیٰ خان شیفتہؔ رئیس جہانگیر آباد سے شناسائی ہو گئی اور ان کی مصاحبت میں رہنے کا موقع مل گیا، نواب مرحوم جس درجہ کے شاعر تھے اس سے کہیں زیادہ ان کا مذاق شاعری تھا، حکیم مومن خاں کے بعد وہ اپنا کلام مرزا غالبؔ کو دکھاتے تھے۔

یہ جب ان کے پاس پہنچے تو ان کا پرانا شوق شعر و سخن کا جو ایک مدت سے افسردہ ہو رہا تھا، تازہ ہو گیا، انہوں نے متعدد غزلیں اردو فارسی کی لکھیں اور جس طرح نواب مرحوم اپنا کلام جہانگیر آباد سے دلی مرزا کے پاس بھیجتے تھے، انہوں نے بھی بھیجیں۔

مرزا کی اصلاح نے ان کی طبیعت پر اتنا اثر نہیں کیا جتنا کہ نواب مرحوم کے فیضِ صحبت سے یہ متاثر ہوئے، نواب مرحوم مبالغہ کو ناپسند کرتے اور حقائق و واقعات کے بیان

میں لطف پیدا کرنے اور سچی باتوں کو محض حسن بیان سے دلفریب بنانے کو منتہائے کمال سمجھتے تھے، چھچھورے اور بازاری الفاظ ومحاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب کو یکساں نفرت تھی، ان کی شاعری نے نواب مرحوم کے دامنِ تربیت میں پرورش پائی اور ان کی صحبت میں رہ کر ایک خاص مذاق ان کی طبیعت میں پیدا ہو گیا جس پر انہوں نے آگے چل کر جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔

گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت میں جب کہ ان کو انگریزی سے اردو میں ترجمہ کی ہوئی کتابیں درست کرنی پڑتی تھیں تو رفتہ رفتہ ان کو انگریزی خیالات اور انگریزی طرز ادا سے ایک خاص مناسبت پیدا ہو گئی اور شاعری اور مشرقی انشا کے فضول حصوں کی وقعت ان کے دل میں کم ہوتی گئی۔

جب کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر محکمۂ تعلیمات کے ایما سے لاہور میں ایک نئے قسم کے مشاعرے کی بنیاد ڈالی گئی جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان میں پہلا مشاعرہ تھا اور بجائے مصرع طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا، مولانا حالی نے چار مثنویاں لکھ کر اس مشاعرہ میں پڑھی تھیں: ۱۔ برکھارت ۲۔ نشاط امید ۳۔ مناظرۂ رحم و انصاف ۴۔ حب وطن، یہ مثنویاں بہت مقبول اور بار بار چھپ کر شائع ہوئیں۔

اینگلو عربک اسکول کی مدرسی کے زمانہ میں بھی کئی نظمیں اسی طرز کی لکھیں جس کی تحریک لاہور کے مشاعرہ میں ہوئی تھی، اسی زمانہ میں سر سید احمد خاں مرحوم نے ان کو ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کے موجودہ تنزل اور پستی کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو بہت مفید ہوگی، انہوں نے ان کی تحریک پر مسدس مدوجزر اسلام لکھا جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے اور جس کے اشعار ہر شخص کی زبان پر ہیں اور ہر قومی مجلس میں پڑھا جاتا ہے۔

آخر عمر میں ایک حصہ اپنے عربی کلام کا شائع کیا ہے، اردو کا دیوان انہوں نے مرتب کیا ہے اور اردو شاعری پر سوا دو سو صفحہ کا ایک مبسوط مقدمہ لکھ کر اس میں شامل کر دیا ہے

جو دیکھنے کے قابل ہے اور اردو زبان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نئی چیز ہے، اس سے مولانا کے مذاق شاعری کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

ان کی مشہور تصنیف حیات سعدی ہے جس میں شیخ سعدی شیرازی کے حالاتِ زندگی لکھے ہیں اور ان کی نظم و نثر پر نہایت عمدگی اور خوبی سے تنقید کی ہے۔

ایک کتاب یادگار غالب ہے، اس میں مرزا نوشہ کے حالات زندگی تفصیل سے لکھے ہیں اور ان کے فارسی و اردو اشعار کا انتخاب بھی شامل کر دیا ہے۔

ایک کتاب حیات جاوید ہے جس کی ضخامت ہزار صفحہ سے زیادہ ہے، اس میں انہوں نے سر سید مرحوم کے حالات زندگی لکھے ہیں اور ان کی تمام حیثیتوں پر مؤرخانہ و فلسفیانہ بحث کی ہے۔

علاوہ ان کتابوں کے اور بھی ان کی تصنیفات ہیں جن میں سے کچھ شائع ہوئی ہیں، اب ملتی نہیں اور کچھ اب تک شائع نہیں ہوئیں۔

بہر حال مولانا حالی اس زمانہ کے ان مشہور لوگوں میں تھے جنہوں نے پرانے مدرسہ میں تعلیم پا کر ایسے کارِ نمایاں کیے جن کی مثال تعلیم جدید اب تک نہیں پیدا کر سکی۔

۱۳ر صفر ۱۳۳۳ھ کو مولانا نے وفات پائی۔

یارب طلبِ وصل ہو یا طربِ وصل   جس دن کہ یہ دونوں نہ ہوں وہ دن نہ دکھانا

عشق سنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید   خود بخود دل میں ہے اک شخص سمایا جاتا

ملتے ہی ان کے بھول گئیں کلفتیں تمام   گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا

روزِ وداع بھی شب ہجراں سے کم نہ تھا   کچھ صبح ہی سے شامِ الم کا ظہور تھا

تعزیرِ جرم عشق ہے بے صرفہ محتسب   بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد

دل سے خوشیاں سب ہوئی ہیں گوشہ گیر نام تھا شاید جوانی کا نشاط
غنچہ چٹکا اور آ پہنچی خزاں فصل گل کی تھی فقط اتنی بساط

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں مری نگاہ میں ہیں رند و پارسا ایک ایک

اب بھاگتے ہیں سایۂ لطفِ بتاں سے ہم کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم

ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں

بیقراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں

میں تو میں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں

یارانِ تیز گام نے محمل کو جالیا ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے

چارہ گر کار باندازۂ تدبیر نہیں کیجیو ہمت اگر وقتِ دعا یاد رہے

سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے

ہے کچھ اک باقی خلش امید کی یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیے

ترک دنیا کے علائق تو کیے سب زاہد گر مناسب ہو تو اک ترک ریا اور سہی

مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر:

ہوئی ریعان جوانی کی بہار آخر حیف طبع رنگیں تھی مئے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب نہ الفت ہے نہ چاہت نہ جوانی کی امنگ سر ہے سودا سے تہی عشق سے دل ہے خالی

گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر
نہ رہی چیز وہ مضمون بجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو ہے وہ کہانی بے لطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں
لائیے باغ سے اوروں کے لگا کر ڈالی
کھینچیے وصل صنم کی کبھی فرضی تصویر
کیجیے درد جدائی کی کبھی نقالی
تا کہ بھڑکائے جوانی کے دل آتش کی طرح
وہ ہو جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل
"قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلالی"

حملۂ نفس

ہم سمجھتے تھے کہ نفس دوں ہمارے ریش میں
گر کبھی حملہ پہ اس کے غالب آجاتے تھے ہم
پر جو دیکھا غور سے وہ بھبکیاں تھیں نفس کی
جن کو نادانی سے حملے اس کے ٹھہراتے تھے ہم
جب کیا حملہ دیے سب عقل نے ہتھیار ڈال
زور بازو پر ہمیشہ جس کے اتراتے تھے ہم

قوم کی پاسداری

اک مسلماں خاص انگریزوں پہ تھا یوں نکتہ چیں
پاس ان لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کس قدر
چاہتے ہیں نفع پہنچے اپنے اہل ملک کو
گو کہ ان کے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر
کارخانہ کا یہ را جس کے کبھی چاقو نہ لیں
اس کا ہو بیچارہ ہندی بیچنے والا اگر
خوردنی چیزیں جو یاں سے لینی پڑتی ہیں انہیں
ان کو لندن سے منگائیں بس چلے ان کا اگر
الغرض اہل وطن کی پاسداری کو یہ لوگ
جانتے ہیں دین و ایماں اپنا، قصہ مختصر
سن کے حالیؔ نے کہا ہے حصر انگریزوں پہ کیا
ایک سے ہے ایک قوم اس عیب سے آلودہ تر
ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کے
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبور اس پہ ہے طبع بشر
مکھیاں جیتی نگل جاتے ہیں پاسِ قوم میں
اچھے اچھے راست باز اور حق پسند اور دادگر

ہاں بری اس عیب سے لے دے کے اس دنیا میں ہے چشمِ بد دور امتِ مرحوم اے جانِ پدر
اور قوموں سے انہیں لوگوں کو ہے یہ امتیاز حملہ جب کرتے ہیں یہ کرتے ہیں اپنی فوج پر
ہوگا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو یاں جس قدر ہے ان سے اپنوں اور یگانوں کو خطر

موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو کل انجامِ ترقی بشر یاروں سے کہا پیر مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہے گا کوئی انسان میں عیب ہو جائیں گے چھل چھلا کے سب عیب ہنر

توقع بیجا

ہیں یار رفیق، پر مصیبت میں نہیں ساتھی ہیں عزیز لیک ذلت میں نہیں
اس بات کی انساں سے توقع ہے عبث جو نوع بشر کی خود جبلت میں نہیں

کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انساں کے لیے بنتی نہیں زندگی میں بے کام کیے
جیتے ہو تو کچھ کیجیے زندوں کی طرح مردوں کی طرح جیے تو کیا خاک جیے

وقت کی مساعدت

اے دل بگاڑ کا ہے سب کے چارہ پر تجھ سے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہوجائے گر ایک تو ہمارا ساتھی پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

فکر عقبیٰ

منزل ہے بعید باندھ لو زادِ سفر موّاج ہے بحر، رکھو کشتی کی خبر
گاہک چوکس ہے لے چلو مال کھرا ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہ گزر

☆☆

مولوی محمد اسماعیل میرٹھی

محمد اسماعیل نام، وطن میرٹھ تھا، ۱۲ر نومبر ۱۸۴۴ء کو پیدا ہوئے، ۱۶ر سال کا سن تھا کہ سررشتہ تعلیم کی ملازمت اختیار کی۔

پہلے سررشتہ تعلیم کے دفتر میں ملازم رہے، پھر اس کے بعد اسکول میں "ہیڈ مولوی" کے عہدے پر مامور ہوئے، اول سہارن پور، پھر میرٹھ میں مدت تک رہ کر ۱۸۸۸ء میں سینٹرل نارمل اسکول آگرہ کو تبدیل ہو گئے، چنانچہ اردو ریڈروں کی تصنیف قیام آگرہ کے زمانہ میں ۱۸۹۳ء کے درمیان کی، تقریباً ۱۲ر سال آگرہ میں مدرس فارسی کے عہدہ پر مامور رہ کر ۱۸۹۹ء میں پنشن پائی اور اپنے وطن مالوف میرٹھ میں واپس آکر قیام اختیار کیا۔

ان کو تصوف کا بھی ذوق تھا اور حضرت غوث علی شاہ قدس سرہ العزیز پانی پتی کے مریدانِ خاص میں تھے۔

اردو زبان کی نظم اور نثر میں خواہ وہ عاشقانہ رنگ میں ہو یا تمدنی واخلاقی وسیاسی ہو، قدیم وجدید ہر ایک طرز میں بلند پایہ رکھتے تھے اور بقول مولانا شبلیؒ کے جدید رنگ میں مولانا حالی کے بعد اگر کسی نے سننے کے لائق کچھ کہا ہے تو وہ مولوی اسماعیل صاحب میرٹھی تھے۔

مرحوم کا یہ بھی قصد تھا کہ لغاتِ اردو کی ترتیب اور قواعد اردو کی تکمیل جدید طرز پر اپنے خیالات میں کر جائیں، چنانچہ ان کے مسودات محفوظ ہیں اور ان کے جانشینوں سے امید ہے کہ اس کی تدوین واشاعت کر کے پبلک کو مستفید کریں گے۔

ان کی آخری علمی خدمت یہ تھی کہ وہ نواب محمد اسحاق خاں صاحب آنریری

سکریٹری ایم اے او کالج علی گڑھ کی فرمائش سے حضرت امیر خسرو کے کلام کی تنقید اور ان کی سوانح عمری نہایت مدلل طور پر مستند کتب و تواریخ وغیرہ سے مرتب کر رہے تھے اور تنقید مثنوی قران السعدین منجملہ اس کے تکمیل ہو چکی تھی اور کچھ حصہ کتب مذکورہ کا مرحوم کے ناگہانی حادثہ کی وجہ سے نامکمل رہ گیا۔

پچھتر سال کی عمر میں یکم نومبر ۱۹۱۷ء کو اپنے وطن میں وفات پائی اور وہیں مدفون ہوئے۔

کلیات ان کا چھپ چکا ہے اور سررشتۂ تعلیم کے تعلق سے اردو ریڈریں ان کی اسکولوں میں بسبب کمال سادگی اور سلاست کے مقبول ہو چکی ہیں، ان سے بہتر درسی کتابیں گورنمنٹ کا سررشتۂ تعلیم آج تک نہیں لکھوا سکا۔

نظم بے قافیہ کی بیرنگی کو اردو زبان میں گوارہ اور پسندیدہ کرنا انہی کا کام ہے، انہوں نے غزلیں بھی لکھی ہیں اور وہ کلیات میں موجود ہیں جو بلحاظ متانت بیان و پختگی الفاظ کے وہی انداز رکھتی ہیں جو دیگر اساتذہ کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے۔

کھولا ہے مجھ پہ سر حقیقت مجاز نے ۔۔۔ یہ پختگی صلہ ہے خیالات خام کا
میں بے قرار منزل مقصود بے نشاں ۔۔۔ رستہ کی انتہا نہ ٹھکانا مقام کا

وصل و فراق وہم سہی دل لگی تو ہے ۔۔۔ پھر ہم کہاں جو پردۂ راز نہاں اٹھا

اب اور ڈھونڈیے کوئی جولانگہ جنوں ۔۔۔ صحرا بقدر وسعت یک گام ہو گیا

سب جتایا کیے نیاز قدیم ۔۔۔ وہ کسی کا بھی آشنا نہ ہوا
کیا کھلے جو کبھی نہ تھا پنہاں ۔۔۔ کیوں ملے جو کبھی جدا نہ ہوا
تو نہ ہو یہ تو ہو نہیں سکتا ۔۔۔ میرا کیا تھا ہوا ہوا نہ ہوا

ہے اشک و آہ راس ہمارے مزاج کو — یعنی پلے ہوئے اسی آب و ہوا کے ہیں
ان بددلوں نے عشق کو بدنام کر دیا — جو مرتکب شکایت جور و جفا کے ہیں

تو ہی نہیں ہے رمز محبت سے آشنا — ورنہ دیار حسن میں رسمِ ستم نہیں

خود فروشی حسن کو جب سے ہوئی مد نظر
نرخ دل بھی گھٹ گیا، جانیں بھی ارزاں ہوگئیں

کچھ کم ہے جو کرتے ہیں کرم حضرت ناصح — تھے ورنہ مرے ایسے ہوا خواہ کہاں کے

رہ گئی تیرے سوا شاید تمنا اور بھی — کچھ کھٹکتے ہیں ابھی پہلوے دل میں خار سے

بتلادیا ہے راہ نما نے مجھے پتا — دنیا بھی اک مقام تری رہ گزر میں ہے
چل شاہراہ دل میں اڑا توسن طلب — وحشت کا جوش چاہیے صحرا بھی گھر میں ہے

کشودِ کار سے تسکین دل کبھی نہ ہوئی — عجب نشاط تھی جو ترک مدعا نے دی

کوئی دن کا آب و دانہ اور ہے — پھر چمن اور آشیانہ اور ہے
ہاں دلِ بیتاب چندے انتظار — امن و راحت کا ٹھکانہ اور ہے
شمع پھیکی، رات کم، محفل اداس — اب مغنی کا ترانہ اور ہے
اتفاقی ہے یہاں کا ارتباط — سب ہیں بیگانے یگانہ اور ہے

راحت جسے کہتے ہیں وہ محنت کا صلہ ہے — راحت طلبی موجب راحت نہیں ہوتی

باایں ہمہ درماندگی انساں کے یہ دعوے — کیا ذاتِ شریف ان کو بنایا ہے خدا نے

ہے آج رخ ہوا کا موافق تو چل نکل — کل کی کسے خبر ہے کدھر کی ہوا چلے

برسات

وہ دیکھو اٹھی کالی کالی گھٹا — ہے چاروں طرف چھانے والی گھٹا
گھٹا کے آنے کی جو آہٹ ہوئی — ہوا میں بھی اک سنسناہٹ ہوئی
گھٹا آن کر مینھ برسا گئی — تو بے جان مٹی میں جان آگئی
زمیں سبزے سے لہلہانے لگی — کسانوں کی محنت ٹھکانے لگی
جڑی بوٹیاں پیڑ آئے نکل — عجب بیل پتے عجب پھول پھل
ہر اک پیڑ کا اک نیا ڈھنگ ہے — ہر اک پھول کا اک نیا رنگ ہے
یہ دو دن میں کیا ماجرا ہوگیا — کہ جنگل کا جنگل ہرا ہوگیا
جہاں کل تھا میدان چٹیل پڑا — وہاں آج ہے گھاس کا بن کھڑا
ہزاروں پھدکنے لگے جانور — نکل آئے گویا کہ مٹی کے پر

بارش کا پہلا قطرہ

گھنگھور گھٹا تلی کھڑی تھی — پر بوند ابھی نہیں پڑی تھی
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہ خطرہ — ناچیز ہوں میں غریب قطرہ
تر مجھ سے کسی کا لب نہ ہوگا — میں اور کے گوں نہ آپ جوگا
کیا کھیت کی میں بجھاؤں گا پیاس — اپنا ہی کروں گا ستیاناس
آتی ہے برسنے سے مجھے شرم — مٹی، پتھر تمام ہیں گرم
خالی ہاتھوں سے کیا سخاوت — پھیکی باتوں میں کیا حلاوت
کس برتے پہ میں کروں دلیری — میں کون ہوں کیا بساط میری
ہر قطرہ کے دل میں تھا یہی غم — سرگوشیاں ہو رہی تھیں باہم
کھچڑی سی گھٹا میں پک رہی تھی — کچھ کچھ بجلی چمک رہی تھی

اک قطرہ کہ تھا بڑا دلاور ہمت کے محیط کا شناور
فیاض و جواد و نیک نیت پھڑکی اس کی رگِ حمیت
بولا للکار کہ آؤ لو میرے پیچھے قدم بڑھاؤ
کر گزر جو ہو سکے کچھ احساں ڈالو مردہ زمین میں جاں
یارو یہ ہچر مچر کہاں تک اپنی سی کرو بنے جہاں تک
مل کر جو کروگے جانفشانی میدان پہ پھیردوگے پانی
کہتا ہوں یہ سب سے برملا میں آتے ہو تو آؤ لو چلا میں
یہ کہہ کے وہ ہوگیا روانہ دشوار ہے جی پہ کھیل جانا
ہرچند کہ تھا وہ بے بضاعت کی اس نے مگر بڑی شجاعت
دیکھی جرأت جو اس سخی کی دوچار نے اور پیروی کی
پھر ایک کے بعد ایک لپکا قطرہ قطرہ زمین پہ ٹپکا
آخر قطروں کا بندھ گیا تار بارش لگی ہونے موسلا دھار
پانی پانی ہوا بیاباں سیراب ہوئے چمن خیاباں
تھی قحط سے پائمال خلقت اس مینہ سے ہوئی نہال خلقت
جرأت قطرہ کی کرگئی کام باقی ہے جہاں میں آج تک نام

نظم بے قافیہ

(تاروں بھری رات)

ارے چھوٹے چھوٹے تارو کہ چمک دمک رہے ہو
تمہیں دیکھ کر نہ ہووے مجھے کس طرح تحیر
کہ تم اونچے آسماں پر جو ہے کل جہاں سے اعلیٰ
ہوئے روشن اس روش سے کہ کسی نے جڑ دیے ہیں
گہر اور لعل گویا

جو ہیں آفتاب تاباں نے چھپایا اپنا چہرہ
وہیں جلوہ گر ہوئے تم یہ تمہاری جگمگاہٹ
ہے مسافروں کے حق میں بڑی نعمت اور راحت
اگر اتنی روشنی بھی نہ میسر آتی ان کو
تو غریب جنگلوں میں یوں ہی بھولتے بھٹکتے
نہ تمیز راس و چپ کی نہ طرف کی ہوتی اٹکل
نہ نشانِ راہ پاتے

وہ غریب کھیت والے وہ امیدوار دہقان
کہ کھڑی ہے جن کی کھیتی کہیں کھیت کٹ رہا ہے
کہیں گہہ رہا ہے خرمن کہیں آنکھ ان کی جھپکی
یوں ہی شام سے سحر تک ہیں تمام رات جاگے
نہ گھڑی ہے واں نہ گھنٹہ نہ شمارِ وقت و ساعت
مگر اے چمکنے والو! ہو تمہیں انہیں بجھاتے
کہ گئی ہے رات آدھی

وہ جہاز جن کے آگے ہے وسیع بحر اعظم
انہیں ہولناک موجوں سے مقابلہ ہے کرنا
کوئی ہے چلا وطن سے کوئی آرہا ہے واپس
انہیں کچھ خبر نہیں ہے کہ کدھر ہے ان کی منزل
نہ تو مرحلہ نہ چوکی نہ سراغ راہ کا ہے
نہ کوئی دلیل و رہبر مگر اے فلک کے تارو
تمہیں ان کے رہنما ہو!

☆☆

سید اکبر حسین اکبرؔ

سید اکبر حسین نام، اکبرؔ تخلص، میر تفضل حسین کے بیٹے، الٰہ آباد وطن ۱۲۶۲ھ/ ۱۸۴۶ء میں بمقام بارہ ضلع الٰہ آباد پیدا ہوئے، جہاں ان کے چچا تحصیلدار تھے، بچپن ہی سے آثار ذہانت وفرزانگی ان کے ناصیۂ اقبال پر درخشاں تھے۔

۱۲۸۴ھ/ ۱۸۶۷ء میں وکالت درجۂ اولیٰ کا امتحان پاس کیا، ۱۲۸۶ھ/ ۱۸۶۹ء میں نائب تحصیلدار مقرر ہوئے اور ایک سال بعد ہائی کورٹ میں مسل خواں ہو گئے مگر ان کی ترقی خواہ طبیعت کے لیے یہ سہارا کافی نہیں ہوا، ۱۲۹۰ھ/ ۱۸۷۳ء میں ہائی کورٹ کی وکالت میں کامیابی حاصل کی اور چند برسوں کے بعد منصف مقرر ہو گئے۔

انگریزی بطور خود سیکھی تھی مگر عہدۂ منصفی میں قانونی قابلیت کے ایسے گراں قدر جوہر ان سے نمایاں ہوئے کہ سب ججی پر ان کو ترقی دی گئی، پانچ سال نہیں گزرے تھے کہ ڈسٹرکٹ وسشن ججی کے لیے ان پر نظر پڑی اور اس کی قائم مقامی انہوں نے سالہا سال کی، ۱۳۲۰ھ/ ۱۹۰۳ء میں اپنے مستقل عہدۂ ججی عدالت خفیفہ سے پنشن پر سبکدوش ہو کر خانہ نشین ہو گئے اور گورنمنٹ نے بطور اعتراف خدمت کے ''خان بہادر'' کا خطاب عنایت کیا۔

شعر وسخن کا ذوق ان کو بچپن سے تھا، کچھ دنوں مولوی وحید الدین (۱) رئیس کٹرہ ضلع الٰہ آباد سے جو مصحفی کے شاگرد تھے، مشق سخن کی اور باوجودیکہ ساری عمر سرکاری ملازمت

---

(۱) مولوی وحید الدین وحید کٹرہ ضلع الٰہ آباد کے رہنے والے عالی خاندان اور ذی وجاہت بزرگ تھے، ایک بھائی مولوی رفیع الدین مرحوم لکھنؤ میں وکالت کرتے تھے، میرے بچپن میں ان کی (باقی اگلے صفحہ پر)

اور عہدۂ جلیلہ کی ذمہ داریوں میں بسر کی، مگر چوں کہ شعروسخن سے ازلی مناسبت تھی، ان مخمصوں پر بھی شاعری ترقی کرتی رہی۔

جس زمانہ میں الٰہ آباد میں پڑھنے کو گیا ہوں، اکبر کی شاعری کا آغاز تھا، ان کے چھوٹے بھائی اکبر حسن ستم اور نسبتی بھائی میر کاظم علی سے ہر وقت یکجائی رہتی تھی، اس وقت اکبر کی نظمیں اودھ پنچ میں چھپا کرتی تھیں اور ان کی شوخی اور ظرافت کا چرچا رہا کرتا تھا، یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ اکبر روم وروس کی جنگ کا حال نظم کر رہے ہیں، خدا جانے انجام کو پہنچایا نہیں۔

اسی زمانہ میں انہوں نے مسٹر بلنٹ کی فیوچر آف اسلام کا ترجمہ بھی اردو میں کیا تھا، ''جنگ روم وروس'' کا دلوں پر اثر غالب تھا، لوگوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا اور قدردانی کی۔

سابقہ حاشیہ: وکالت اچھی تھی اور مہمان نوازی میں بہت مشہور تھے۔

مولوی وحید الدین کہنہ سال اور کہنہ مشق شاعر تھے، مصحفی کا زمانہ انہوں نے پایا تھا اور ان سے مشورۂ سخن کیا تھا، الٰہ آباد کے اکثر شعرا ان کے شاگرد تھے، تحصیل علم کے لیے پہلی مرتبہ جو مجھ کو سفر کا اتفاق ہوا تو میں الٰہ آباد گیا، اس وقت چودہ پندرہ برس کا سن تھا، وہاں پہنچ کر دیکھا کہ وحید میاں کی شاعری کا غلغلہ بلند تھا، یوں تو منشی غلام غوث خاں بیخبر، مولوی غلام امام شہید، محمد جان حسرت، حکیم خلیل الدین خان وغیرہ بھی اپنے اپنے رنگ میں خوش گو سمجھے جاتے تھے مگر وحید میاں کا نام بہت وقار اور عزت کے ساتھ لیا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ وحید کے گھر میں آگ لگی، ان کو اپنا دیوان یاد آیا جو ساری عمر کی کمائی تھی، اس کے نکالنے کو کوٹھری میں گھسے، دیوان تو ہاتھ آ گیا مگر دھواں اتنا بھر گیا تھا کہ نکلنے کو ان کو راستہ نہ سوجھا، جب لوگ تلاش کرتے ہوئے مکان کے اندر گھسے تو دیکھا کہ دیوان ہاتھ میں ہے، ایک کرسی پر بیٹھے ہیں اور دم نکل چکا ہے، بچپن کے سنے ہوئے دو شعر ان کے یاد ہیں:

ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا　　دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

ہم نے اپنے آشیانے کے لیے　　جو چبھے دل میں وہی تنکے لیے

پنشن لے کر خانہ نشین ہونے کے بعد ان کی شاعری چمکی اور زمانے کے میلانِ عام اور جدید طرزِ معاشرت کی خرابیوں کا جو اثر ان کے دل پر پڑا ہوا تھا اس کو ظرافت کے پردے میں ظاہر کرنے کی راہ انہوں نے ڈھونڈ نکالی۔

میرے دوست شیخ عبدالقادر ایڈیٹر مخزن (عالی خان بہادر جسٹس عبدالقادر) نے ایک بار مخزن میں ان کے کلام پر بحث کرتے ہوئے خوب لکھا ہے، جو انہی کے لفظوں میں سننے کے قابل ہے:

''ایک دن میرے ایک طباع دوست نے جو خود ایک نامور شاعر ہیں، مجھ سے پوچھا کہ تمہارے نزدیک اکبر کے کلام کی سب سے بڑی خصوصیت کیا ہے، میں نے کہا کہ میں یہ دیکھتا ہوں کہ اکبر روشن خیالی کے ساتھ مشرق کی سچی محبت کا واعظ ہے، اس کے نزدیک ہر مشرقی نژاد کا فرض ہے کہ اپنے وطن سے محبت رکھے، اپنے مذہب کی حفاظت کرے، اپنے بزرگوں کا ادب ملحوظ رکھے اور اپنے ہر رسم و رواج کو صرف اس لیے مذموم نہ سمجھے کہ وہ کسی مغربی رسم و رواج کے خلاف ہے بلکہ جائز حد تک اپنی چیزوں پر نازاں ہو، اپنے ماضی سے واقف ہو، اپنے حال کی تنقید کر سکے اور اپنے مستقبل کی نسبت اچھی امید رکھے، یہ خیالات اس زور اور اس خوبی کے ساتھ معاصرین میں سے کسی کے ہاں نہیں ملتے۔

میرے دوست نے مجھ سے اتفاق رائے کیا اور یہ کہا کہ تمام باتیں جو آپ نے بیان کیں، اکبر کے کلام میں پائی جاتی ہیں، ایسی بہت سی اور جو گنی جا سکتی ہیں مگر آپ نے نہیں گنی لیکن میں ان سب کو ایک مرکب لفظ میں ادا کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اکبر لسان العصر ہے۔''

اکبر کے لیے ''لسان العصر'' کا خطاب اتنا موزوں ثابت ہوا کہ ملک کے ایک

گوشہ سے دوسرے گوشہ تک اس کی صدائے بازگشت پہنچ گئی اور گورنمنٹ کے دیے ہوئے خطاب سے اس نے زیادہ مقبولیت حاصل کی۔

افسوس ہے کہ ۱۳۴۰ھ کو لسان العصر کی زبان بند ہوگئی اور جس منزل کی وہ دوسروں کو یاد اور زادِ راحلہ کے مہیا کرنے کی رغبت دلایا کرتے تھے وہی آخر کار ان کو پیش آگئی ع

حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

ان کے کلیات کی تین جلدیں اب تک شائع ہوچکی ہیں اور سنا ہے کہ خواجہ حسن نظامی ان کی سوانح عمری لکھ رہے ہیں:

ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہوجاتے ہیں بدنام　　وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا

مری آنکھوں سے ہے کیفیتِ مستیِ دل پیدا　　لب ساغر سے افشا ہو رہا ہے راز مینا کا

ملا ہے ہم کو یہ مضمونِ روشن چشم مینا سے　　کہ چھوڑی جس نے خود بینی اسے سب کچھ نظر آیا

ہے صاف عیاں سے عیاں جوش جوانی　　آنکھوں سے سنبھلتا نہیں مستانہ پن ان کا

دیکھنے سے شوق پیدا شوق سے پیدا طلب　　آفت دل آنکھ تھی دل آفت جاں ہوگیا

اک جھلک ان کی دیکھ لی تھی کبھی　　وہ اثر دل سے آج تک نہ گیا

جو دل میں آتی ہے اے واعظو نہیں رکتی　　سکوت خوب ہے لیکن تمہیں نے کیوں نہ کیا

ضبط سے کام لیا دل نے تو کیا فخر کروں　　اس میں کیا عشق کی عزت تھی کہ رسوا نہ ہوا

حیا سے سر جھکا لینا، ادا سے مسکرا دینا　　حسینوں کو بھی کتنا سہل ہے بجلی گرا دینا
یہ طرز احسان کرنے کا تمہیں کو زیب دیتا ہے　　مرض میں مبتلا کرکے مریضوں کو دوا دینا

حلاوت زندگانی کی کہاں اس تلخ گامی میں خدا کا حکم ہے جیتے ہیں اے اکبر مزا کیسا

کیا پوچھتے ہو مجھ سے کہ میں خوش ہوں یا ملول یہ بات منحصر ہے تمہاری نگاہ پر

نہ سحر چشم جاناں ہے، نہ لطف غمزۂ ساقی تو پھر صحن چمن میں دیدۂ نرگس سے کیا حاصل

ترچھی چتون سے خدا جانے وہ دیکھیں مجھے کب موت کا وقت کسی شخص کو معلوم نہیں

ادھر ہم سے بھی بات آپ کرتے ہیں لگاوٹ کی
ادھر غیروں سے بھی کچھ عہد و پیاں ہوتے جاتے ہیں

ہو جس طرف طبیعت لازم ہے شوق کامل ہر بات میں اثر ہے، ہر رنگ میں مزا ہے

کچھ قدر نہ کی عہد جوانی کی صد افسوس ہم رہ گئے غفلت میں یہ آیا بھی گیا بھی

میں سمجھ گیا وہی ہے مرے پردۂ نفس میں مجھے اب تو سانس لینا بھی ہے لطف زندگانی

میرے حواس عشق میں کیا کم ہیں منتشر مجنوں کا نام ہو گیا قسمت کی بات ہے

اسباب انتشار جنوں مجھ سے چھن گئے مطلب یہ ہے کہ عشق و جوانی کے دن گئے

اس مے سے نہیں مطلب دل جس سے ہے بیگانہ
مقصود ہے اس مے سے دل ہی میں جو کھنچتی ہے

حضرت منصور انا بھی کہہ رہے ہیں حق کے ساتھ
دار تک تکلیف فرمائیں جب اتنا ہوش ہے

اخلاقی تعلیم ظرافت کے پیرایہ میں:

بے پردہ کل جو آئیں نظر چند بی بیاں　اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے آپ کا وہ پردہ کیا ہوا　کہنے لگیں کہ عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

مغوی کو بھی بد نہ کہیے ترغیب ہے یہ　کس سے میں کہوں کہ دل کی تخریب ہے یہ

شیطان کو رجیم کہہ دیا تھا اک دن　اک شور مچا خلاف تہذیب ہے یہ

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے　بنگلہ بھی ہے پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن میں پوچھتا ہوں تجھ سے ہندی　یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

مذہب کی کہوں تو دل لگی میں اڑ جائے　مطلب کی کہوں تو پالسی میں اڑ جائے
باقی سر قوم میں ابھی ہے کچھ ہوش　غالب ہے کہ یہ بھی اس صدی میں اڑ جائے

جینا تھا جس قدر ہمیں دنیا میں جی لیے　ساغر کئی طرح کے ملے اور پی لیے
غم بھی رہا، خوشی بھی، تحیر بھی، فکر بھی　جاتے ہیں اب کہ آئے تھے ہم بس اسی لیے

عمل ان سے ہوا رخصت عقیدوں میں خلل آیا　کوئی پوچھے کہ ان کے ہاتھ کیا نعم البدل آیا
محلے میں نہ کی جب شیخ کی وقعت عزیزوں نے　تو بیچارہ کمیٹی ہی میں جا کر کود اچھل آیا

مسجدیں چھوڑ کے جا بیٹھے ہیں میخانوں میں　واہ کیا جوش ترقی ہے مسلمانوں میں

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا مسوں کا　جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں

آج بنگلہ میں مرے آئی تھی آواز اذاں　جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

زوالِ قوم کی تو ابتدا وہی تھی کہ جب تجارت آپ نے کی ترک نوکری کرلی

صبر، خودداری، دلیری، حق پرستی اب کہاں رکھ لیا اچھا سا اک نام اور مسلماں ہوگئے

فٹن نفیس، سڑک خوشنما، ڈنر ہر شب یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی

نئی تہذیب میں دقت زیادہ تو نہیں ہوتی مذاہب رہتے ہیں قائم فقط ایمان جاتا ہے

اسلام کی رونق کا کیا حال کہیں تم سے کونسل میں بہت سید، مسجد میں فقط جمن

حریفوں نے رپٹ لکھوائی جا جا کے تھانے میں کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

اب تو اکبر بار ہے ہم پر نماز عید بھی تم اگر رکھ سکتے ہو روزہ خدا روزی کرے

اغیار تو دنیا ہیں اٹھائے ہوئے سر پر ہم بیٹھے ہیں اس طرح کہ اٹھتا نہیں سر بھی

اغیار تو رگ رگ سے ہماری ہوئے واقف ہم وہ ہیں کہ پاتے نہیں اس کی کمر بھی

دیر میں محویت بھی ہے وعظ میں قبلہ رو بھی ہے شیخ ہمارا خوب ہے پیر بھی ہے گرو بھی ہے

وضع مغرب سے مجھے کچھ بھی تسلی نہ ہوئی ناز تو بڑھ گئے دولت کی ترقی نہ ہوئی

ہم کیا کہیں احباب کیا کارِ نمایاں کر گئے
بی اے ہوئے، نوکر ہوئے، پنشن ملی، پھر مر گئے

یہ پردہ در کو سوئے قوم کس نے بھیجا ہے کہ جس کی بحث سے مجروح ہر کلیجا ہے
یہی ہے عقدہ کشائی قوم تو اک دن ازار بند کو کہہ دیں گے جبس بیجا ہے

بتاؤں آپ سے مرنے کے بعد کیا ہوگا　　پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

حواس مختل، سمجھ پریشاں، عمل میں سستی، قدم میں لغزش
کبھی کوئی شوق رہنما ہے، کبھی کوئی پالسی ہے غالب
مرے مشاغل کی کچھ نہ پوچھو کہ میں ہوں دورِ فلک میں اکبر
مقیم دیر و مرید شیخ و اسیر قانون و محو مغرب

آمادگی مجھے تو رہی ہر گناہ پر　　فضلِ خدا سے بت ہی نہیں آئے راہ پر

گزران کا ہوا کب عالم اللہ و اکبر میں　　پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

اس نے میدان میں سر دے کے کیا قوم کا نام
آپ بنگلے میں منایا ہی کیے جان کی خیر
پارٹی کچھ بھی نہیں جب نہ ہو ذوقِ طاعت
قوم کی خیر نہیں جب نہیں ایمان کی خیر

لطف چاہو اک بتِ نوخیز کو راضی کرو
نوکری چاہو کسی انگریز کو راضی کرو
لیڈری چاہو تو لفظِ قوم ہے مہمان نواز
گپ نویسوں کو اور اہلِ میز کو راضی کرو
طاعت و امن و سکوں کا دل کو لیکن ہو جو شوق
صبر پر طبعِ ہوس انگیز کو راضی کرو

معاذ اللہ غفلت باریاں یہ ابرِ مغرب کی　　کوئی آلودۂ آنر، کوئی صرفِ جوانی ہے

ضمیمہ نمبر ا۔

مراثی کا بیان

عرب میں شاعری کی ابتدا اظہار جذبات سے ہوئی تھی، اس لیے سب سے پہلے شاعری کی ابتدا مرثیہ سے ہوئی جو سب سے قوی تر جذبہ ہے، فارسی شاعری کی بنیاد تکلف، آورد اور مداحی پر قائم ہوئی تھی، اس لیے اس کی ابتدا قصیدہ گوئی سے ہوئی اور اس لیے شاعری کے وہ انواع جن کو جذبات سے لازمی تعلق تھا، دفعۃً پستی کی حالت میں آگئے، تاہم چوں کہ آغاز میں ہر چیز میں فطرت کا اثر پایا جاتا ہے، اس لیے قدما کی شاعری میں جا بجا جذبات کا اظہار خوبی کے ساتھ نظر آتا ہے۔

اردو شاعری کی ابتدا دکن میں ہوئی تھی، وہاں شروع سے مرثیہ گو پیدا ہو گئے، علی عادل شاہ کے زمانہ میں ایک مرثیہ گو تھا جو اردو میں مرثیہ کہتا تھا اور بادشاہ کے اصرار پر بھی اس نے اپنی زبان کو بادشاہ کی تعریف سے آلودہ نہیں کیا، جب تک جیتا رہا صرف مرثیے کہتا رہا۔

مولانا نصرتی کا دیوان مفقود ہے ورنہ معلوم ہوتا کہ دیگر اصناف سخن کے ساتھ انہوں نے مرثیہ پر ہاتھ ڈالا ہے یا نہیں، محمد قلی قطب شاہ کے کلیات میں معتد بہ حصہ مراثی کا ہے۔ ابوالحسن تانا شاہ کے زمانہ میں کثرت سے مرثیہ گو تھے جو اردو میں طبع آزمائی کرتے

تھے، ان میں سے شاہ قلی خاں شاہی تخلص بڑے اچھے شاعر تھے، میر حسن اپنے تذکرہ میں کہتے ہیں کہ شائقین ان کا کلام ہاتھوں ہاتھ دکن سے ہندوستان لایا کرتے تھے، دکن کے شعرا میں سب سے پہلے ولی کا دیوان دلی میں آیا ہے اور وہ چھپ کر شائع ہو چکا ہے، ولی نے کربلا کے حالات میں ایک مثنوی لکھی ہے۔

میر و مرزا کے زمانہ میں میاں مسکین مرثیہ گو تھے، سودا نے ان کا نام شہر آشوب میں لیا ہے، اس وقت تک عموماً مرثیے چومصرع ہوا کرتے تھے، غالباً سب سے پہلے سودا نے مسدس لکھا جوان کے دیوان میں موجود ہے اور اردو میں مرثیہ کی وسعت و ترقی کا پہلا قدم ہے کیوں کہ چومصرع میں اول سے آخر تک ایک خاص قافیہ کی پابندی کی وجہ سے ہر قسم کے مطالب ادا نہیں کیے جاسکتے تھے۔

اسی زمانہ میں میاں سکندر ایک مرثیہ گو گزرے ہیں، ان کا ذکر مصحفی نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے، ان کے بعد میر ضمیر، میر خلیق، میاں دلگیر، میاں فصیح کا نام لیا جاتا ہے مگر اس وقت تک مرثیے کم وبیش تیس تیس بند کے ہوتے تھے اور ان میں حزن وغم کے سوا اور کوئی مضمون نہ ہوتا تھا اور شاعری کے دربار سے ان کی کچھ عزت وحوصلہ افزائی نہیں ہوتی تھی، اس زمانہ کی یہ مثل مشہور ہے ”بگڑا شاعر مرثیہ گو“ اور ”بگڑا گویا مرثیہ خواں“۔

جہاں تک معلوم ہوا ہے، سب سے پہلے میر مظفر حسین ضمیر نے اس میں جدتیں پیدا کیں اور جس نظم کی بنیاد محض درد وغم پر تھی اس میں گھوڑے، تلوار وغیرہ اسلحۂ جنگ کے الگ الگ اوصاف لکھے، سراپا ایجاد کیا، واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی، لڑائی کے داؤں پیچ اور اس کے ٹھاٹھ کا خاکہ کھینچا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کلام میں زور، بندش میں چستی اور صفائی پیدا کی اور سوز خوانی کی جگہ تحت اللفظ پڑھنے کی بنیاد ڈالی۔

میر انیس و مرزا دبیر نے اس بنیاد پر ایک بلند و مستحکم عمارت کھڑی کر دی، بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں بکثرت پیدا کر دیے، ایک ایک واقعہ کو سو سو

طرح سے بیان کر کے قوتِ متخیلہ کی جولانیوں کے لیے ایک نیا میدان صاف کر دیا، مناظر قدرت کی ایسی تصویریں کھینچیں کہ فارسی شاعری میں بھی اس کا نمونہ بمشکل مل سکے گا، اسی طرح جذباتِ انسانی کی صحیح ترجمانی کر کے اردو شاعری کو پستی سے بلندی پر پہنچا دیا۔

سچ تو یہ ہے کہ اگر اس حصہ کو اردو شاعری سے نکال لو تو پھر اس میں سوا خدو خال اور گل و بلبل کے کچھ نہیں رہ جاتا اور اردو شاعری کی تاریخ نامکمل رہے گی اگر اس میں اس کا ذکر نہ کیا جائے۔

مرزا سلامت علی دبیرؔ

مرزا سلامت علی نام، دبیر تخلص، مرزا غلام حسین والد کا نام تھا، کہتے ہیں کہ ۱۲۱۸ھ کو دلی میں پیدا ہوئے، چھ سات برس کی عمر میں باپ کے ساتھ لکھنؤ آئے، فارسی اور عربی کی کتابیں لکھنؤ کے نامور علما سے پڑھیں۔

حیاتِ دبیر کے مصنف نے لکھا ہے کہ درسی کتابیں ان کی نکلی ہوئی تھیں، مولوی غلام ضامنؔ اور مرزا کاظم علی اخباری وغیرہ علما کے شاگرد تھے اور استعداد علمی فاضلانہ رکھتے تھے۔

شعر وسخن سے قدرتی مناسبت تھی، میر مظفر حسین ضمیرؔ اس زمانہ کے مرثیہ گو شاعروں میں بہت ممتاز تھے، ان کی مجلسوں میں شریک ہوتے ہوتے ان کو بھی ذوق پیدا ہوا اور یہ ان کے شاگرد ہو گئے۔

جو کچھ استاد سے پایا اسے بقول آزاد بہت بلند اور روشن کر کے دکھایا، جو مرثیے بیس تیس بند سے آگے نہ بڑھتے تھے ان کو دو ڈھائی سو تک پہنچایا، شوکت الفاظ، مضامین کی آمد، اس میں جا بجا غم انگیز اشارے، درد خیز کنایے، المناک ودل گداز انداز جو مرثیہ کی اصلی غرض ہے، ان وصفوں میں وہ میر انیس سے ممتاز ہیں۔

کچھ شک نہیں کہ میر انیس زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے میں اپنا مثل نہیں رکھتے، مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات واستعارات ہیں، یہ اپنی قوت متخیلہ کے زور سے ایسے عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک ان کے حریفوں کا طائر وہم بھی پرواز نہیں کر سکتا، بقول علامہ شبلی

خیال آفرینی، دقت پسندی، جدت استعارات، اختراع تشبیہات، شاعرانہ استدلال، شدت مبالغہ میں ان کا جواب نہیں۔

مگر میری رائے میں اس فیصلہ کا یہ مطلب نکالنا خطرناک غلطی ہے کہ مرزا دبیر زبان کی صفائی، بندش کی چستی اور مناظر قدرت کی صحیح تصویر کھینچنے سے عاری ہیں، یا میر صاحب قوت متخیلہ میں بالکل ہیٹے ہیں اور ان کے ہاں عجیب استعارے اور نادر تشبیہیں نہیں ہیں، ایسا خیال کرنا ان دونوں بزرگوں کے دامنِ کمال پر دھبہ لگانا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ ہر شاعر کا رنگ طبیعت، انداز بیان اور طرز مذاق مخصوص قسم کا ہوا کرتا ہے، ایک چیز ایک کے ہاں افراط سے ملے گی، دوسرے کے یہاں اس سے کم یہی حال میر و مرزا کا بھی ہے، اس سے نہ ان کی تنقیص کی جاسکتی ہے نہ ان کی ع

ہر طرز میں جو خوب کہے خوب ہے وہ

مرزا صاحب نے چوہتر برس کی عمر پائی، چودہ پندرہ برس کے سن سے مرثیے کہنے لگے، اس پچاس ساٹھ برس میں کم سے کم تین ہزار مرثیے لکھے ہوں گے، نوحوں اور رباعیوں کا کچھ شمار نہیں، ۳۰ محرم ۱۳۲۹ھ میں وفات پائی اور اپنے ہی مکان میں مدفون ہوئے۔

صبح

گلگونہ شفق جو ملا حورِ صبح نے اسپند مشک شب کو کیا نورِ صبح نے
گرمی دکھائی روشنی طورِ صبح نے ٹھنڈے چراغ کردیے کافورِ صبح نے

لیلائے شب کی رات کو دولت جو لٹ گئی
افشاں جبیں سے مہر درخشاں کے چھٹ گئی

پیدا ہوا سپیدۂ طلعت نشانِ صبح سلطانِ صبح نے کیا قصد اذانِ صبح
باندھا عمامہ نور کا پہنا کتانِ صبح چرخِ چہار میں پہ گیا خطبہ خوانِ صبح

منہ سب کے سوئے قبلۂ امید ہوگئے
سرگرم سجدہ عیسیٰ و خورشید ہوگئے

آیا جو تیغ روز لیے شاہ نیمروز ماہی شکار، شیر سوار و جہاں فروز
باندھے کمر میں خنجر بیضائے کینہ سوز پھر دیو ہفت سر ہوا صیدِ عقاب روز
مہتاب لشکر شہ خاور میں گھر گیا
آرہ شعاع کا سر انجم پہ پھر گیا

بڑھ کر نقیب نور پکارا سحر سحر ذروں میں نور مہر در آیا قمر قمر
فرمانِ نور بدر کو پہنچا بدر بدر لوٹا سحر نے معدنِ شبنم گہر گہر
برقع جو اٹھ گیا تھا رخ آفتاب کا
پردہ تھا فاش صبح ملمع نقاب کا

دوسرے موقع پر کہتے ہیں:

پیدا شعاع مہر کی مقراض جب ہوئی پنہاں درازی پر طاوس شب ہوئی
اور قطع زلف لیلیٰ زہرہ لقب ہوئی مجنوں صفت قبائے سحر چاک شب ہوئی
فکر رفو تھی چرخ ہنرمند کے لیے
دن چار ٹکڑے ہوگیا پیوند کے لیے

یوسفؑ غریق چاہ سیہ ناگہاں ہوا یعنی غروب ماہ تجلی نشاں ہوا
یونسؑ دہانِ ماہیِ شب سے عیاں ہوا یعنی طلوع نیر مشرق ستاں ہوا
فرعونِ شب سے معرکہ آرا تھا آفتاب
دن تھا کلیمؑ اور ید بیضا تھا آفتاب

تھی صبح یا کہ چرخ کا جیب دریدہ تھا یا چہرۂ مسیحؑ کا رنگِ پریدہ تھا
خورشید تھا کہ چرخ کا اشک چکیدہ تھا یا فاطمہ کا نالۂ گردوں رسیدہ تھا

کہیے نہ مہر صبح کے سینہ پہ داغ تھا
امید اہل بیت کا گھر بے چراغ تھا

نکلا افق سے عابد روشن ضمیر صبح محراب آسماں ہوئی جلوہ پذیر صبح
کھولا سپیدی نے جو مصلائے پیر صبح ہر سجدہ گاہ بن گیا مہر منیر صبح
کرتی تھی شب غروب کا سجدہ ودود کو
سیارے ہفت عضو بنے تھے سجود کو

ظلمت جہاں جہاں تھی وہاں نور ہوگیا پھر مشک شب جہاں سے کافور ہوگیا
گویا کہ رنگ آئینہ سے دور ہوگیا باطل رسالۂ شب دیجور ہوگیا
کیا پختہ روشنائی تھی قدرت کے خامے میں
مضموں تھا آفتاب کے ذروں کے نامے میں

گرمی کی شدت

وہ دھوپ کہ مرغان ہوا کرتے ہیں نالا بس ہاتھ دھرا قبضہ پر اور پڑ گیا چھالا
بریاں ہوا دانہ بھی زراعت میں جو ڈالا اس دھوپ میں، اس لو میں کھڑے ہیں شہِ والا
پانی کے عوض آگ برستی ہے زمیں پر
پر تیروں کی بوچھار ہے جسمِ شہؑ دیں پر

نایاب ہیں مرغانِ ہوا صورت عنقا بیٹھے ہیں سراسیمہ چرندے لب دریا
بالائے فلک ایک پرندہ نہیں پیدا پر اوج امامت کا ہمار میں ہے تنہا
کیا قہر ہے سایہ نہیں اور دھوپ کڑی ہے
کیا ظلم ہے پانی نہیں اور پیاس کڑی ہے

دوسرے موقع پر:

تنہا کھڑے ہیں رن میں امامِ فلک جناب　　گرمی دکھا رہا ہے قیامت کی آفتاب
بے آگ مرغ قبلہ نما ہوتے ہیں کباب　　خط غبار سے ہے لپی ابری سحاب
چھالا ہے آفتاب کا گردوں کے پاؤں میں
خود چھپ رہی ہے دھوپ درختوں کی چھاؤں میں

مٹی خراب چرخ پہ ہے برجِ آب کی　　رنگت ہے برج حوت میں ماہی کباب کی
دریا میں آنکھ بیٹھ گئی ہے حباب کی　　حدت ہے موج موج میں تیر شہاب کی
فوارے کو نہ حوض میں گرمی سے کل پڑی
پانی کی بھی زبان دہن سے نکل پڑی

آتش بدل بھنور ہیں تو موجیں ہیں شعلہ وش　　آتے ہیں مچھلیوں کو حرارت سے غش پہ غش
سوز جگر سے مردم آبی ہیں نالہ کش　　نوحہ ہے تین روز کے پیاسوں کا العطش
نزدیک ہے کہ زہد کو بے آبرو کریں
تردامنی سے شہروں میں زاہد وضو کریں

آمد آمد کا کوکبہ

برہم ہیں صفیں شاہِ شہیداں کی ہے آمد　　ہر مورچہ لرزہ ہے سلیماں کی ہے آمد
فرعونیوں پر موسیٰ عمراں کی ہے آمد　　تیغوں کے جہازوں پہ بھی طوفاں کی ہے آمد
جن سیر کو نکلے تھے پہ رستے سے مڑے ہیں
پریوں کی طرح ہوش سلیماں کے اڑے ہیں

رن میں پسر فاتح خیبر کی ہے آمد　　صف گرتی ہے صف پر شہ صفدر کی ہے آمد
تاج شرف و فخر سکندر کی ہے آمد　　شاہ شہدا سبط پیمبرؐ کی ہے آمد

پیشانی جن و ملک اب فرش زمیں ہے
چتر سر اقدس پر جبریل امیں ہے

خورشید ہے دن کو مہِ نو شرم سے گھٹ کر اغلب ہے کہ سیدھا فلک کج ہو الٹ کر
پانی ہوئی جاتی ہے گھٹا ڈھالوں کی پھٹ کر اک سونے کا تنکا بن گئی ہے دھوپ سمٹ کر
ثابت ہے کہ سیارہ ہر اک ماند ہوا ہے
سیارے ہیں کیا شہر بدر چاند ہوا ہے

فتح و ظفر و نصرت و شمشیر دو سر ایک قہر و اجل و رعب شہ جن و بشر ایک
مولا کی سپر اور فلک ہفت سپر ایک افضال خدا اور نظر فیض اثر ایک
ہیبت ہے یہ بندے کی، یا خوف خدا ہے
سر خود سے، دل سینے سے، جاں تن سے جدا ہے

نے چرخ ہے، نے دشت ہے، نہ کہسار نہ قلزم وہ سکتہ ہے وہ گرد، وہ رعشہ وہ تلاطم
ہے برج بھی گردش میں گرے پڑتے ہیں انجم جس طرح سے آندھی سے جدا خوشوں سے گندم
خالی ہیں رگیں خون سے اور خون رگوں سے
ناموں کے حروف اڑتے ہیں مہروں کے نگوں سے

عباس نامدار پانی لانے کو جاتے ہیں:

عباس جب کہ جانب باغ جناں چلے شانے پہ لاکھ شان سے لے کر نشاں چلے
زوجہ نے پوچھا اے مرے والی کہاں چلے بولے جہاں سے اب نہ پھریں گے وہاں چلے
اب آخری وداع کی باری نہ آئے گی
آئی ہے سب کی لاش ہماری نہ آئے گی

عباس سے سنا جو یہ اس تشنہ کام نے دنیا سیاہ ہوگئی آنکھوں کے سامنے
اک آہ کی کمر کو پکڑ کے امام نے پردہ اٹھایا بازوے شاہِ انام نے

جھک کر ہلال برج فلک سے نکل گیا
نورِ نگاہ تھا کہ پلک سے نکل گیا

پاس ادب سے مجرے کو سب دور دور آئے　　عفو قصور کے لیے کبر و غرور آئے
غل پڑ گیا جلو کے لیے فوجِ نور آئے　　ہاں لاؤ مرکب دو رکابہ حضور آئے
آیا سجا سجایا تگاور جناب کا
پاکھر کرن کے تاروں کی، زین آفتاب کا

انگلی سے لکھ کے گردنِ توسن پہ یا علی　　اک جست میں سوار ہوا حق کا وہ ولی
فی الفور نور و طور کے معنی ہوئے جلی　　بجلی جلانا بھوک کے خود رشک سے جلی
ٹھنڈی ہوئی ہوا جو یہ گرم عناں ہوا
صرصر کی سانس رک گئی جب یہ رواں ہوا

پابوسی کو رکاب کا حلقہ وہاں بنا　　اور اس دھن میں پائے مبارک زباں بنا
پھر آستان خانۂ زیں آسماں بنا　　عرش جلیل زین تجلی نشاں بنا
آنسو مگر نہ تھمتا تھا اس راہوار کا
یعنی مجھی پہ آئے گا لاشہ سوار کا

رکھنے لگا جو ہاتھ تصور عنان پر　　بگڑا بنا کے منہ کہ نہ کھیل اپنی جان پر
بولی زمیں کدھر تو کہا آسمان پر　　پوچھا جو آسماں نے کہا لامکان پر
یہ کہہ کے فکر و وہم کی حد سے گزر گیا
سایہ ہوا سے پوچھ رہا تھا کدھر گیا

غل ہر مکاں سے واہ کا تا لامکاں اٹھا　　ایسا جھکا کہ نہ پھر سر آسماں اٹھا
شعلہ علم کے نور کا اک ناگہاں اٹھا　　جنگل میں دھوپ جل گئی کوسوں دھواں اٹھا
انسان کیسے جان جنوں کی نکل پڑی
گاو زمیں پہ تڑپی کہ مچھلی اچھل پڑی

تلوار کی روانی ملاحظہ ہو:

نکلی غلافِ نور سے تفسیر جوہری | یا آکے دست بوسِ سلیماں ہوئی پری
یا حجلے سے عروس نے کی جلوہ گستری | یا ہے یہ شاخ میوۂ طوبیٰ ہری بھری
اس ہاتھ سے مرادیں تھیں جو جو وہ مل گئیں
باچھیں خوشی سے تیغ کے قبضہ کی کھل گئیں

شاخ نیام سے ہوا اس طرح پھل جدا | پیروں کے قد سے جیسے جوانی کا بل جدا
ہستی جدا زمیں پہ، تڑپی اجل جدا | خنجر جدا فلک پہ گرا اور زحل جدا
غل تھا کہ اب مصالحۂ جسم و جاں نہیں
لو تیغ برق دم کا قدم درمیاں نہیں

سایہ بھی صاف تیغ سے فوراً جدا ہوا | مطلب ملا کہ پانی سے روغن جدا ہوا
تنہا نہ رنگ چہرۂ دشمن جدا ہوا | گردن سے سر، تو روح سے ہر تن جدا ہوا
پیہم صدا دلوں سے دھڑکنے کی آتی تھی
آوازِ بوق اٹھتی تھی اور بیٹھ جاتی تھی

سیدھی ہوئی جو تیغ تو لشکر الٹ گیا | میداں ہاتھوں چھینے سے دل سب کا ہٹ گیا
سب رو رہے تھے زور کو واں سے بھی گھٹ گیا | مانند ناف خوف سے سینہ سمٹ گیا
بولی یہ تیغ دم سرِ اعدا پہ لوں گی میں
برش پکاری تو یہ ٹھہرنے نہ دوں گی میں

پڑھتی ہوئی زبان سے یہ لافتا چلی | روشن نگاہ کہنے کو آگے قضا چلی
بائیں کو قہر، داہنے جانب بلا چلی | بالکل چراغ عمر ہوئے گل ہوا چلی
کیسے نہ تیغ دولہا کو برچھی لگائی تھی
ان پر حسنؑ کی آہ نے بجلی گرائی تھی

پھل وزن میں تھا پھول، تجلی میں نخل طور　　گرمی میں محض نار تو نرمی میں صاف نور
آسیب سایہ چال پری قبضہ چشم نور　　خود نہر آب زہر تڑپ قہر شور صور
یوں دفعۃً زمیں سے گئی آسمان پر
جس طرح غصہ آئے کسی ناتوان پر

پھر تو پکار تھی یہ ادھر وہ ادھر گرا　　وہ نیچہ وہ ہاتھ وہ خود اور وہ سر گرا
بن بن کے برق سایۂ تیغ ظفر گرا　　واں مورچہ سے باپ اٹھا یاں سپر گرا
گر گر کے سر یہ رن میں برابر طپاں ہوئے
جو رن میں سرزمین کی معنی عیاں ہوئے

چہروں پہ مردنی کی طرح تیغ چھاگئی　　ہر استخواں میں مثل تپ دق سماگئی
اعجاز خاکساری حیدر دکھاگئی　　مانند خاک ناریوں کے تن جلاگئی
سب کے گلوں سے ملتی تھی لیکن رکی ہوئی
جوہر یہ تھے کہ بوجھ سے خود تھی جھکی ہوئی

آتے تھے جوڑ توڑ عجیب تیغ تیز کو　　سر سے گری جدا کیا پائے گریز کو
اپنے سے گرم دیکھ کے اس شعلہ ریز کو　　برق و شرر نے نذر کیا جست و خیز کو
بوگل نے، رنگ لالے نے، سرعت ہوانے دی
یہ ہدیہ کیا ہے، اپنی نیابت قضا نے دی

قربانِ برق و بارقۂ تیغ شعلہ تاب　　موتی کی آب وتاب، سمندر کا پیچ وتاب
خود نوح خود سفینۂ وخود ماہی وخود آب　　سرگوشیاں فرات میں کرنے لگے حباب
ظرف تنک میں تھی نہ جگہ آب و تاب کی
بندھتی تھی اور کھلتی تھی مٹھی حباب کی

کاٹا پلک میں آنکھ کو پتلی میں نور کو　　پاؤں میں کج روی کو، سروں میں غرور کو

سینہ میں بغض و کینہ کو دل میں فتور کو نیت میں معصیت کو، طبیعت میں زور کو
ذات اک طرف مٹا دیا بالکل صفات کو
کیسی زباں زباں میں یہ کاٹ آئی بات کو

عباسؑ فرات پر تو پہنچ گئے مگر پانی پینے سے وفاداری روکتی ہے:

چلو بھر فرات سے سرکا کے آستیں عبرت سے دیر تک اسے دیکھا کیے وہیں
پھر لائے امتحاں کے لیے ہونٹوں کے قریں سینہ میں دل تڑپ کے پکارا نہیں نہیں
گو مہر فاطمہ ہے یہ مجھ پر حرام ہے
ہفتم سے فاطمہ کا پسر تشنہ کام ہے

پانی جو بے حسینؑ کے منہ سے لگائے گا ہے ہے وفا کا نام ابھی ڈوب جائے گا
اس وقت آبرو جو گئی پھر نہ پائے گا یہ روز اب زمانے میں کاہے کو آئے گا
حضرت کہاں، فرات کہاں، کربلا کہاں
تاعصر خاتمہ ہے یہ دکھ، یہ بلا کہاں

غازی نے دل کے مشورے پر مرحبا کہا دریا سے رو کے پیاسوں کا سب ماجرا کہا
کاندھے پہ مشک بھر کے رکھی یا خدا کہا چلتے ہوئے اجل نے پیامِ قضا کہا
ہے ہے نصیب پیاسوں کا رستے میں پھر گیا
سقہ حرم کا فوج میں طوفاں کے گھر گیا

علی اصغر کا پیاس کے مارے، حال بے حال ہے:

سر ننگے گرد جھولے کے سب کنبہ ہے بہم پھیلا رہے ہیں سمٹے ہوئے پاؤں کو حرم
تکیہ پہ سر ڈھلا ہوا رکھتے ہیں دم بدم چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے کبھی دیکھتے ہیں دم
قرآن کی ہوا کبھی گھبرا کے دیتے ہیں
بانو کو دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں

آخر کہا یہ سب نے بلاؤ امام کو ‏ لاؤ خدا کے واسطے لاؤ امام کو
اس بے زباں کا حال سناؤ امام کو ‏ نیلی رگیں گلے کی دکھاؤ امام کو
اکبر کی لاش لے گئے ہیں قتل گاہ میں
کوئی پکار لو وہ ابھی ہوں گے راہ میں

مظلوم کربلا شیرخوار بچہ کو لے کر پانی مانگنے کے لیے جاتے ہیں:

ہاتھوں پہ لے کے اس کو چلے شاہِ اتقیا ‏ اور ساتھ ساتھ گود کو کھولے ہوئے قضا
لکھا ہے دھوپ تیز تھی اور گرم تھی ہوا ‏ اصغر پہ ماں نے ڈال دی اجلی سی اک ردا
چادر نہ تھی وہ چہرہ پُر آب و تاب پر
ٹکڑا سفید ابر کا تھا آفتاب پر

ہر اک قدم پہ سوچتے تھے سبطِ مصطفیٰؐ ‏ لے تو چلا ہوں فوجِ عمر سے کہوں گا کیا
نے پانی مانگ آتا ہے مجھ کو نہ التجا ‏ منت بھی گر کروں گا تو وہ دیں گے کیا بھلا
پانی کے واسطے نہ سنیں گے عدو مری
بچے کی جان جائے گی اور آبرو مری

پہنچے قریب فوج تو گھبرا کے رہ گئے ‏ چاہا کریں سوال پہ شرما کے رہ گئے
غیرت سے رنگ فق ہوا تھرا کے رہ گئے ‏ چادر پسر کے چہرے سے سرکا کے رہ گئے
آنکھیں جھکا کے بولے کہ یہ ہم کو لائے ہیں
اصغر تمہارے پاس غرض لے کے آئے ہیں

گر میں بقول شمر و عمر ہوں گناہ گار ‏ یہ تو نہیں کسی کے بھی آگے قصور وار
شش ماہہ بے زبان نبی زادہ شیرخوار ‏ ہفتم سے سب کے ساتھ پیاسا ہے بے قرار
سن ہے جو کم تو پیاس کا صدمہ زیادہ ہے
مظلوم خود ہے اور یہ مظلوم زادہ ہے

یہ کون بے زباں ہے تمہیں کچھ خیال ہے　　در نجف ہے بانوے بیکس کا لال ہے
لو مان لو تمہیں قسم ذوالجلال ہے　　یثرب کے شاہزادے کا پہلا سوال ہے
پوتا علیؑ کا تم سے طلب گار آب ہے
دے دو کہ اس میں ناموری ہے، ثواب ہے

پھر ہونٹھ بے زبان کے چوسے جھکا کے سر　　رو کر کہا جو کہنا تھا وہ کہہ چکا پدر
باقی رہی نہ بات کوئی اے مرے پسر　　سوکھی زبان تم بھی دکھادو نکال کر
پھیری زباں لبوں پر جو اس نور عین نے
تھرّا کے آسمان کو دیکھا حسین نے

☆☆

میر ببر علی انیسؔ

میر مستحسن خلیق کے بیٹے، میر حسنؔ کے پوتے اور میر ضاحکؔ کے پر پوتے تھے، ان کی بلکہ ان کے گھرانے کی زبان اردوئے معلّٰی کے لحاظ سے تمام لکھنؤ میں سند تھی اور انہیں اس پر ناز تھا۔

ابتدائی کتابیں مولوی حیدر علی صاحب منتہی الکلام سے پڑھیں اور ضروریاتِ فن سے آگاہی حاصل کرنے کے بعد اپنے خاندانی کمال میں باپ کے شاگرد ہوئے اور جب سے مرثیہ کہنا شروع کیا، اس وقت سے تمام عمر اسی میں صرف کر دی۔

بیان کرنے کے نئے نئے اسلوب اردو شاعری میں بکثرت پیدا کر دیے، ایک واقعہ کو سو سو طرح سے بیان کر کے قوت متخیلہ کی جولانیوں کے لیے ایک نیا میدان صاف کر دیا اور زبان کا ایک معتد بہ حصہ جس کو اب تک شاعروں کے قلم نے مس تک نہیں کیا تھا اور جو محض اہل زبان کی بول چال میں محدود تھا، اس کو شعرا سے روشناس کر دیا، بقول مولانا حالی کے اردو شاعری میں جو ماءِ راکد کی طرح مدت سے بے حس و حرکت پڑی تھی، تموج بلکہ تلاطم پیدا کر دیا۔

مولوی محمد حسین آزاد نے آب حیات میں ٹھیک لکھا ہے کہ شاہنامہ کے ساٹھ ہزار شعر فردوسی کی عمر بھر کی کمائی ہیں، انہوں نے ایجاد مضامین کے دریا بہا دیے، ایک مقرری مضمون کو سیکڑوں نہیں ہزاروں رنگ سے ادا کیا، ہر مرثیہ کا چہرہ نیا، آمد نئی، رزم جدا، بزم جدا اور ہر میدان میں مضمون اچھوتا، تلوار نئی، نیزہ نیا، گھوڑا نیا، انداز نیا، مقابلہ نیا اور اس پر کیا

مختصر ہے، صبح کا عالم دیکھو تو سبحان اللہ، رات کی رخصت، سیاہی کا پھٹنا، نور کا ظہور، آفتاب کا طلوع، مرغزار کی بہار، شام ہے تو شامِ غریباں کی اداسی، کبھی رات کا سناٹا، کبھی تاروں کی چھاؤں کو چاندنی اور اندھیرے کے ساتھ رنگ رنگ سے دکھایا ہے، غرض جس حالت کو لیا ہے، اس کا سماں باندھ دیا ہے۔

میر امجد علی اشہری نے حیاتِ انیس میں اور مولانا شبلیؒ نے موازنۂ انیس و دبیر میں ان کے شاعرانہ کمال کو جس جس رنگ سے ظاہر کیا ہے وہ دیکھنے کے قابل ہے۔

میر انیس کا کلام پانچ جلدوں میں شائع ہوا ہے، ان کی ابتدائی مشق میں قدیم محاورے اور غلط الفاظ کثرت سے متداول تھے اور شعرا بے تکلف استعمال کرتے تھے، وہ ان کے ہاں بھی ابتدائی کلام میں پائے جاتے ہیں، پھر جس قدر زمانہ گزرتا گیا، ان الفاظ اور ترکیبوں کو چھوڑتے گئے۔

میر انیس نے بہتّر برس کی عمر پائی، غدر سے پہلے ان کو لکھنؤ سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہیں آئی، غدر کے بعد اول اول نواب قاسم علی خاں کے اصرار سے عظیم آباد تشریف لے گئے اور وہاں کی مجلس عزا میں اپنی شاعری کے زور اور بے مثل پڑھنے سے قیامت برپا کر دی، پھر ایک مرتبہ سید شریف حسین خاں کی تحریک سے حیدر آباد تشریف لے گئے، نواب تہور جنگ بہادر نے ان کی شان کے موافق خیر مقدم کیا، سامعین کی مجلسوں میں یہ کثرت ہوتی تھی کہ صدہا لوگوں کو سننے کی حسرت رہ جاتی تھی۔

میر صاحب کا کلام جس طرح لاجواب ہے، ان کا پڑھنا بھی بے مثل تھا، ان کی آواز، قد و قامت، صورت کا انداز غرض ہر شے اس کام کے لیے ٹھیک اور موزوں واقع ہوئی تھی، ان کا قاعدہ تھا کہ پہلے خلوت میں بڑا آئینہ سامنے رکھ کر بیٹھتے اور مرثیہ پڑھنے کی مشق کرتے، وضع، حرکات، سکنات، اور بات بات کو دیکھتے اور آپ ہی اس کی موزونی و ناموزونی کو اصلاح دیتے تھے، آخر کار ۱۲۹۲ھ میں وفات پائی اور سبزی منڈی میں اپنے ایک مکان کے اندر مدفون ہوئے۔

نور کا تڑکا

طے کر چکا جو منزلِ شب کاروان صبح　　ہونے لگا افق سے ہویدا نشانِ صبح
گردوں سے کوچ کرنے لگے اخترانِ صبح　　ہر سو ہوئی بلند صدائے اذانِ صبح
پنہاں نظر سے روے شب تار ہوگیا
عالم تمام مطلع انوار ہوگیا

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور　　یاد خدا میں زمزمہ پردازیِ طیور
وہ رونق اور وہ سرد ہوا وہ فضا وہ نور　　خنکی ہو جس سے چشم کو اور قلب کو سرور
انساں زمیں پہ محو، ملک آسمان پر
جاری تھا ذکر قدرت حق ہر زبان پر

وہ سرخی شفق کی ادھر چرخ پر بہار　　وہ بار ور درخت وہ صحرا وہ سبزہ زار
شبنم کے وہ گلوں پہ گہرہائے آبدار　　پھولوں سے سب بھرا ہوا دامانِ کوہسار
نافے کھلے ہوئے وہ گلوں کی شمیم کے
آتے تھے سرد سرد وہ جھونکے نسیم کے

دوسرے موقع پر فرماتے ہیں:

چلنا وہ بادِ صبح کے جھونکوں کا دم بدم　　مرغان باغ کی وہ خوش الحانیاں بہم
وہ آب و تاب نہر، وہ موجوں کا پیچ و خم　　سردی ہوا میں پر نہ زیادہ بہت نہ کم
کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا

وہ نور صبح اور وہ صحرا وہ سبزہ زار　　تھے طائروں کے غول درختوں پہ بے شمار
چلنا نسیم صبح کا رہ رہ کے بار بار　　کوکو وہ قمریوں کی، وہ طاؤس کی پکار

وا تھے دریچے باغ بہشت نعیم کے
ہر سو رواں تھے دشت میں جھونکے نسیم کے

ایک اور موقع پر:

وہ نور اور وہ دشت سہانا سا وہ فضا　　دراج و کبک تیہوؤ طاؤس کی صدا
وہ جوش گل وہ نالۂ مرغان خوش نما　　سردی جگر کو بخشتی تھی صبح کی ہوا
پھولوں کے سبز سبز شجر سرخ پوش تھے
تھالے بھی نخل کے سبدِ گل فروش تھے
وہ دشت وہ نسیم کے جھونکے وہ سبزہ زار　　پھولوں پہ جا بجا وہ گہرہائے آبدار
اٹھنا وہ جھوم جھوم کے شاخوں کا بار بار　　بالائے نخل ایک جو بلبل تو گل ہزار
خواہاں تھے زیب گلشن زہرا جو آب کے
شبنم نے بھر دیے تھے کٹورے گلاب کے

گرمی کا سماں:

وہ لوٗ وہ آفتاب کی حدت وہ تاب وتب　　کالا تھا رنگ دھوپ سے دن کا مثال شب
خود نہر علقمہ کے بھی سوکھے ہوئے تھے لب　　خیمے جو تھے حبابوں کے تپتے تھے سب کے سب
اڑتی تھی خاک، خشک تھا چشمہ حیات کا
کھولا ہوا تھا دھوپ سے پانی فرات کا
آب رواں سے منہ نہ اٹھاتے تھے جانور　　جنگل میں چھپتے پھرتے تھے طائر ادھر ادھر
مردم تھے سات پردوں کے اندر عرق سے تر　　خس خانۂ مژہ سے نکلتی نہ تھی نظر
گر آنکھ سے نکل کے ٹھہر جائے راہ میں
پڑ جائیں لاکھ آبلے پائے نگاہ میں
کوسوں کسی شجر میں نہ گل تھے نہ برگ وبار　　اک ایک نخل جل رہا تھا صورتِ چنار

ہنستا تھا کوئی گل نہ لہکتا تھا سبزہ زار کانٹا ہوئی تھی پھول کی ہر شاخ باردار
گرمی یہ تھی کہ زیست سے دل سب کے سرد تھے
پتے بھی مثل چہرۂ مدقوق زرد تھے

گرمی کی شدت میں لوگوں کی حالت:

وہ گرمیوں کے دن وہ پہاڑوں کی راہ سخت پانی نہ منزلوں، نہ کہیں سایۂ درخت
ڈوبے ہوئے پسینوں میں ہیں غازیوں کے رخت سونلا گئے ہیں رنگ جوانانِ نیک بخت
راکب عبائیں چاند سے چہرے پہ ڈالے ہیں
تونسے ہوئے سمند زبانیں نکالے ہیں

وہ دن ہیں جن دنوں کوئی کرتا نہیں سفر صحرا کے جانور بھی نہیں چھوڑتے ہیں گھر
رنج مسافرت میں ہیں سلطان بحر و بر لب برگ گل سے خشک ہیں چہرہ عرق میں تر
آتی ہے خاک اڑ کے یمین و یسار سے
گیسوئے مشک بار اٹے ہیں غبار سے

☆☆

گھوڑے کی جست وخیز

وہ جست وخیز وسرعت و چالاکی سمند — سانچے میں تھے ڈھلے ہوئے سب اس کے جوڑ بند
سم قرص ماہتاب سے روشن ہزار چند — نازک مزاج وشوخ وسیہ چشم وسر بلند
پتلی جدھر سوار نے پھیری وہ پھر گیا
اترا براق بن کے پری ہو کے اڑ گیا

جرأت میں رشک شیر تو ہیکل میں پیلتن — پوی کے وقت کبک دری، جست میں ہرن
بجلی کسی جگہ تو کہیں ابر قطرہ زن — بن بن کے آنے جانے میں طاؤس کا چلن
سیماب تھا زمیں پہ فلک پر سحاب تھا
دریا پہ موج تھا تو ہوا پر عقاب تھا

افزوں تھی زلف حور سے خوشبو ایال کی — دیکھیں تو لیں بلائیں سدا بال بال کی
پریاں خرام ناز میں شاگرد چال کی — غصہ میں جست شیر کی، شوخی غزال کی
وہ حسن تن پہ ساز کا جوبن براق کا
دلدل کے ہاتھ پاؤں تو چہرہ براق کا

غصہ میں انکھڑیوں کے ابلنے کو دیکھیے — بن بن کے جھوم جھوم کے چلنے کو دیکھیے
سانچے میں جوڑ بند کے ڈھلنے کو دیکھیے — تھم کر کنوتیوں کے بدلنے کو دیکھیے
وہ تھوتھنی کہ غنچۂ سوسن سے تنگ تر
وہ انکھڑیاں خجل ہوں ہرن جن کو دیکھ کر

☆☆

تلوار کی روانی

بجلی گری کہ فوج پہ تیغ دوسر گری کٹ کر کسی کی تیغ، کسی کی سپر گری
چمکی کبھی فلک پہ، کبھی فرق پر گری سر کاٹ کر ادھر سے جو اٹھی ادھر گری
زرہیں تنوں پہ مثل کفن چاک ہوگئیں
اک آن میں صفیں کی صفیں خاک ہوگئیں

اک شور تھا کہ تیغ ہے یہ یا خدا کا قہر بہتی ہے جس کی آگ سے کوسوں لہو کی نہر
ناگن ہے یہ کہ کاٹے کے جس کے نہیں ہے لہر اتری گلے سے چڑھ گیا سارے بدن میں زہر
زخموں سے جسم ڈر سے کلیجے فگار ہیں
جوہر نہیں ہیں تیغ میں دندان مار ہیں

غل تھا کہ وہ چمکتی ہوئی آئی یہ گری برچھی سے اڑ گئی وہ سناں یہ گرہ گری
ترکش کٹا، کمانِ کیانی سے زہ گری یہ سر اٹھا، وہ خود اڑا، یہ زرہ گری
آتی ہے لشکروں پہ تباہی اسی طرح
گرتی ہے برق قہر الٰہی اسی طرح

ہر بات میں اڑا کے کلائی نکل گئی کوندی گری زمیں میں، سمائی نکل گئی
کاٹی زرہ دکھا کے صفائی نکل گئی مچھلی تھی اک کہ دام میں آئی نکل گئی
چار آئینہ کے پار تھی اس آب و تاب سے
جس طرح برق گر کے نکل جائے آب سے

☆☆

دیگر

چم خم وہ تیغ کا وہ لگاوٹ وہ آب و تاب　　آتش کسی جگہ، کہیں بجلی، کہیں سحاب
سیلی تھی اک پری کے شکم پر کہ اس کی تاب　　تیزی زباں میں دو کہ فرشتوں کو دے جواب
جوہر سے اس کا جسم جواہر نگار تھا
گویا گلے میں حور کے ہیرے کا ہار تھا

پیاسی بھی خونِ فوج کی اور آبدار بھی　　غل تھا کہ ایک گھاٹ میں پانی بھی نار بھی
بجلی بھی، ابر تر بھی، خزاں بھی، بہار بھی　　تلوار بھی، چھری بھی، سپر بھی، کٹار بھی
پانی نے اس کی آگ لگا دی زمانے میں
اک آفت جہاں تھی لگانے بجھانے میں

☆☆

ہنگامۂ جنگ

نقارۂ دغا پہ لگی چوب یک بیک اٹھا غریو کوس کو ہلنے لگا فلک
شیپور کی صدا سے ہراساں ہوئے ملک قرنا پھنکی کہ گونج اٹھا دشت دور تک
شور دہل تھا حشر تھا افلاک کے تلے
مردے بھی ڈر کے چونک پڑے خاک کے تلے

کانپے طبق زمیں کے ہلا چرخ لاجورد مانند کہربا ہوا مٹی کا رنگ زرد
اٹھ کر زمیں سے بیٹھ گئی زلزلہ میں گرد تیغوں کی آنچ دیکھ کے بھاگی ہوائے سرد
گرمی سے رن کی، ہوش اڑے وحش طیر کے
شیر اس طرف اتر گئے دریا کو پیر کے

تھرا رہا تھا خوف سے مینائے لاجورد ہلتے تھے کوہ کانپتا تھا وادی برد
تھا دن بھی زرد، دھوپ بھی زرد اور زمیں بھی زرد خورشید چھپ گیا یہ اٹھی کربلا کی گرد
اک تیرگی غبار سے تھی چشم مہر میں
ٹاپو پڑے ہوئے تھے محیط سپہر میں

☆☆

حملہ کا زور شور

نکلی جو رن میں تیغ حسینی غلاف سے　　اڑنے لگے شرر دمِ خارا شگاف سے
بجلی بڑھی چمک کے جو دشت مصاف سے　　صاف آئی الاماں کی صدا کوہِ قاف سے
طبقے فلک کے صورتِ گہوارہ ہل گئے
دب کر پہاڑ خاک کے دامن سے مل گئے

جنگل میں تھی علم جو وہ تیغ شرر فشاں　　تھرا کے آسمان میں چھپتا تھا آسماں
غار اژدروں سے چھٹ گئی شیروں سے نیستاں　　برپا تھا بر و بحر میں اک شور الاماں
مانند موج مچھلیوں میں اضطراب تھا
زہرہ ہر ایک سنگ کا پانی میں آب تھا

تھا فوج قاہرہ میں تلاطم کہ الحذر　　تھیں موج کی طرح سب ادھر کی صفیں ادھر
چکر میں تھی سپاہ کہ گردش میں تھا بھنور　　پانی میں تھے نہنگ ابھرتے نہ تھے مگر
فوجیں فقط نہ بھاگی تھیں منہ موڑ موڑ کے
دریا بھی ہٹ گیا تھا کنارہ کو چھوڑ کے

پریوں سے قاف چھوٹ گیا اور جنوں سے گھر　　شیروں سے دشت، گرگ سے بن، اژدروں سے در
شاہین و کبک چھپ گئے اک جا ملا کے سر　　اڑ کر گرے جزیروں میں جنگل کے جانور
سمٹے پہاڑ منہ کو جو دامن میں ڈھانپ کے
سیمرغ نے گرا دیے پر کانپ کانپ کے

☆☆

دو حریفوں کی معرکہ آرائی

یہ کہہ کے اپنے چھوٹے سے نیزے کو دی تکاں　　چمکی انی تو برق پکاری کہ الاماں
اک بند باندھ کر جو فرس سے کہا کہ ہاں　　ڈانڈ آئے ڈانڈ پر توسناں سے لڑی سناں
بل کیا کرے کہ زور ہی موذی کا گھٹ گیا
غل تھا کہ اژدہے سے وہ افعی لپٹ گیا

جھنجھلا کے چوب نیزہ کو لایا وہ فرق پر　　قاسم نے ڈانڈ ڈانڈ پر مارا! بچا کے سر
دو انگلیوں میں نیزۂ دشمن کو تھام کر　　جھٹکا دیا کہ جھک گئی گھوڑے کی بھی کمر
نیزہ بھی دب کے ٹوٹ گیا نابکار کا
دو انگلیوں سے کام لیا ذوالفقار کا

سنبھلا وہ بے شعور یہ جھٹکا اٹھا کے جب　　قبضہ میں لی کمانِ کیانی بصد غضب
چلے میں تیر جوڑ چکا جب وہ بے ادب　　تیوری چڑھائی قاسم نوشاہ نے بھی تب
تیر نگاہ سے وہ خطا کار ڈر گیا
کانپے یہ دونوں ہاتھ کہ چلہ اتر گیا

لایا جو حرف سخت زباں پر وہ بدخصال　　جھپٹا مثالِ شیر درندہ حسن کا لال
گھوڑے سے بس ملا دیا گھوڑا بصد جلال　　اتنے بڑھے کہ لڑ گئی اس کی سپر سے ڈھال
اوجھڑ لگی کہ ہوش اڑے خود پسند کے
گھوڑے نے پاؤں رکھ دیے سر پر سمند کے

عباسؓ نامدار نے پہلو سے دی صدا!　　ہاں اب نہ جانے دیجیو احسنت و مرحبا
دشمن کے مار ڈالنے کی بس یہی ہے جا　　سنتے ہی بس فرس کو فرس سے کیا جدا
گھوڑا بھی اس طرف کو ادھر ہو کے پھر پڑا
مارا کمر پہ ہاتھ کہ دو ہو کے گر پڑا

امام کی بے کسی اور دشمنوں کا نرغہ

آج شبیر یہ کیا عالم تنہائی ہے　　ظلم کی چاند پہ زہرا کے گھٹا چھائی ہے
اس طرف لشکر اعدا میں صف آرائی ہے　　یاں نہ بیٹا، نہ بھتیجا، نہ کوئی بھائی ہے
برچھیاں کھاتے چلے جاتے ہیں تلواروں میں
مارلو پیاسوں کو ہے شور ستم گاروں میں

زخمی بازو ہیں، کمر خم ہے، بدن میں نہیں تاب　　ڈگمگاتے ہیں نکل جاتی ہے پاؤں سے رکاب
پیاس کا غلبہ ہے لب خشک ہے آنکھیں ہیں پرآب　　تیغ سے دیتے ہیں ہر وار کا اعدا کے جواب
شدت ضعف سے جس جا پہ ٹھہر جاتے ہیں
سیکڑوں تیر ستم تن سے گزر جاتے ہیں

گیسو آلودۂ خوں لپٹے ہیں رخساروں سے　　شانے کٹ کٹ کے لٹک آئے ہیں تلواروں سے
تیر پیوست ہیں خوں بہتا ہے سوفاروں سے　　لاکھ آفت میں ہے اک جان دلآزاروں سے
فکر ہے سجدۂ معبود میں سر دینے کی
وار سے تیغوں کے فرصت نہیں دم لینے کی

خون میں تر پیچ عمامے کے ہیں سر زخمی ہے　　ہے جبیں چاند سی پُرنور مگر زخمی ہے
سینہ سب تیروں سے جو تابہ کمر زخمی ہے　　تیر بیداد سے دل زخمی جگر زخمی ہے
ضرب شمشیر سے بے کار ہیں بازو دونوں
ظلم کے تیروں سے مجروح ہیں پہلو دونوں

برچھی آکر کوئی پہلو پہ لگا جاتا ہے　　مارتا ہے کوئی نیزہ تو غش آجاتا ہے
بڑھتے ہیں زخم بدن زور گھٹا جاتا ہے　　بند آنکھیں ہیں سر پاک جھکا جاتا ہے
گرد زہرا و علی گریہ کناں پھرتے ہیں
غل ہے گھوڑے سے امام دو جہاں گرتے ہیں

مرثیہ گوئی کی تاریخ میں اتنی بات صاف کہنی چاہیے کہ حضرات اہل بیت اطہار (رضوان اللہ علیہم اجمعین) کی اصلی شان دکھانے میں مرثیہ گویوں نے بڑی کمی کی ہے، اکثر وقار و ثبات کو جزع و فزع و اضطراب تک پہنچا دیا ہے، بی بیوں کی شان اس پیرائے میں لکھی ہے جس سے معلوم ہو کہ یہ نہایت بزدل اور خوف زدہ، دکھ کی ماری، ہستی محو نوحہ و بکا ہے، حالانکہ وہ پاک بزرگ ان کمزوریوں سے بہر حال دور تھے، مدعا عوام کو رلانا تڑپانا تھا، اس نے مراثی کا پایہ بہت پست کر دیا ہے، شاعری میں جان پڑی ہو مگر اخلاقی و مذہبی پہلو مفلوج ہو کر رہ گیا، شہادت نامہ خواہ کتنا ہی مؤثر ہو گیا مگر وقائع نگاری کا خون ہو گیا۔

ضمیمہ نمبر۲۔

اس کتاب میں میرے والد بزرگوار کا ذکر کئی جگہ آیا ہے نیز اس لیے کہ وہ بہت بڑے شاعر اور بہت بڑے مؤرخ تھے، ان کے حالات زندگی کے بیان کرنے کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں، جہاں تک ممکن ہے اختصار کے ساتھ لکھوں گا تاکہ جو حالات مجھے معلوم ہیں وہ ان کی اکثر تصنیفات کی طرح ضائع نہ ہو جائیں۔

مرحوم کا اسم گرامی مولوی سید فخر الدین، ان کے والد کا نام مولوی سید عبدالعلی، سادات قطبیہ حسینیہ کے چشم و چراغ تھے، نسب کا اتصال امام حسن مثنیٰ خلف الصدق سبط اکبر امام حسن مجتبیٰ سے ہوتا ہے، حسن مثنیٰ اپنے عم نامدار شہید کربلا امام حسینؓ کی چھوٹی صاحبزادی فاطمہ صغریٰ سے بیاہے ہوئے تھے، اسی لحاظ سے اس خاندان کے لوگوں کو حسنی حسینی سے تعبیر کیا جاتا ہے، اسی خاندان میں سید شاہ علیم اللہ، سید محمد جیؒ، سید شاہ لعل، شاہ ابوسعید، شاہ محمد واضح، مولانا قطب الہدیٰ محدث، مولانا محمد ظاہر، مولانا خواجہ احمد، مولانا ضیاء النبی، سید مصطفیٰ اور سب سے زیادہ نامور حضرت سید احمد شہیدؒ بڑے زبردست علما و مشائخ میں گزرے ہیں۔

والد مرحوم کی ولادت تکیہ شاہ علیم اللہ بیرون شہر رائے بریلی میں ۱۲۵۶ھ میں ہوئی، کم سنی میں اپنی والدہ کے ساتھ ناگور تشریف لے گئے جہاں ان کے والد ماجد تحصیلدار تھے، وہیں فارسی اور عربی کی ابتدائی کتابیں مولوی سید محمد طٰہٰ نصیر آبادی اور حکیم احمد جان دہلوی سے پڑھیں، تیرہ برس کا سن تھا کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا، سرکار نے ان کی خدمات جلیلہ پر

نظر کر کے کچھ وظیفہ تعلیم مقرر کر دیا جو عرصہ تک والد مرحوم کو ملتا رہا۔

ناگور سے آنے کے بعد اپنے نانا مولانا سید محمد ظاہر مرحومؒ کے دامن تربیت میں پرورش پائی اور شرح وقایہ تک ان سے اور مرزا رحیم اللہ بریلوی سے وطن میں رہ کر تعلیم پائی، اپنے نانا کے وفات پانے کے بعد لکھنؤ تشریف لائے اور مولانا محمد نعیم فرنگی محلی کے حلقہ درس میں شریک ہوئے اور طب کی کتابیں حکیم محمد یعقوب لکھنوی سے شروع کیں، شعر و سخن کا ذوق ناگور میں حکیم احمد جان کی صحبت میں پیدا ہوا تھا، پھر اپنے نانا سید محمد ظاہر کی صحبت میں ترقی ہوئی، وہ علمی فضل و کمال کے ساتھ فارسی و اردو خاص کر بھاشا کے بہت اچھے شاعر تھے، لکھنؤ پہنچ کر وہ شوق تازہ ہو گیا، شیخ امیر اللہ تسلیم کے شاگرد ہوئے اور تین برس مسلسل لکھنؤ میں رہ کر متعدد علوم و فنون کی تحصیل کی اور خطاطی میں بھی کمال پیدا کیا، نسخ و نستعلیق و شفیعہ بہت اچھا لکھتے تھے اور ان کے شکست میں عجیب طرح کی شیرینی تھی۔

لکھنؤ سے وطن گئے اور چند روز وہاں رہے، اس کے بعد وجہ معیشت حاصل کرنے کو باہر نکلے، چند روز راجپوتانہ میں، چند روز ساگر میں رہے، ساگر میں مہتمم بندوبست کے اجلاس میں نائب سررشتہ دار ہو گئے تھے مگر شاید سال ڈیڑھ سال کے بعد کسی بات پر برہم ہو کر نوکری چھوڑ دی اور وطن چلے آئے، کچھ دنوں رہ کر حیدرآباد روانہ ہو گئے۔

اس زمانہ میں ہر جگہ ریل نہیں تھی، یہاں سے حیدرآباد تک کہیں گھوڑے پر، کہیں ریل پر، کہیں بہلی اور کہیں تانگے پر، شاید بیس دن میں امراوتی پہنچے تھے، حیدرآباد میں چند روز کی امیدواری کے بعد کسی اسکول میں صدر مدرس مقرر ہو گئے اور تقریباً آٹھ برس تک مختلف اضلاع میں اسی خدمت کو انجام دیتے رہے۔

ضلع بدر میں سید محمود اصفہانی حریف تخلص سے شناسائی ہوئی، یہ وہاں صدر مدرس تھے اور وہ صدر تعلقہ دار (کمشنر) کے میر منشی تھے، اس موقع کو غنیمت سمجھ کر ان سے فارسی زبان اور محاورے کی تصحیح کی اور جب تک وہاں رہے، ان کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔

حیدرآباد سے بوجہ بعد مسافت کے ترک تعلق کر کے وطن آگئے اور دو ڈیڑھ سال وطن میں رہ کر بھوپال تشریف لے گئے، وہاں بھی چند سال رہے، جب وہاں سے آئے تو عرصہ دراز تک کہیں نہیں گئے، مرحوم کی عادت تھی کہ رخصت لے کر بہت کم آتے تھے، جب کہیں رہتے رہتے دل گھبرا جاتا تھا تو نوکری چھوڑ کر چلے آتے تھے۔

عرصہ دراز تک وطن میں رہتے رہتے جب دل گھبرایا تو ٹونک تشریف لے گئے، وہ بھی مثل وطن کے تھا، اکثر اعزہ دو دو چار چار پشت سے رہتے رہتے وہیں کے ہو گئے تھے، نواب ابراہیم علی خاں نے صیغۂ طبابت سے تنخواہ مقرر کر دی، دو ڈیڑھ سال رہنے کے بعد پھر وطن چلے آئے اور ایسے آئے کہ پھر کہیں نہیں گئے، وطن کے گوشۂ عزلت میں زندگی پوری کر دی، بیعت طریقت اپنے پھوپھا مولانا سید خواجہ احمد علیہ الرحمہ سے کی تھی، ان کی طرف سے نیز اپنے نانا مولانا سید محمد ظاہر کی جانب سے خلیفۂ مجاز تھے اور ذکر و شغل خاندانِ نقش بندیہ کے طریقے پر کرتے تھے مگر پیری مریدی نہیں کرتے تھے۔

مزاج میں خاموشی، متانت، حلم اور عزلت پسندی انتہا درجہ کی تھی، برادرانہ جھگڑوں سے ان کو کچھ واسطہ نہیں تھا، ہر شخص سے دوست ہو یا دشمن، اچھی طرح سے ملتے اور کسی سے پرخاش نہ رکھتے، صبر و قناعت کی صفت ان کی ہر ادا سے ظاہر ہوتی تھی، تمکنت اور غرور ان کو چھو نہیں گیا تھا، ایک چمار یا کولی رات کے وقت آتا تو گھر سے باہر نکل کر اس کا حال پوچھتے، اگر وہ کسی مریض کو دکھانے کو لے جانا چاہتا تو اسی وقت اس کے ساتھ ہو لیتے اور بڑی شفقت سے اس کو دیکھتے اور دوا بتاتے تھے۔

ایک زمانہ میں طاعون شدت سے پھیلا ہوا تھا، گاؤں کے گاؤں ویران پڑے ہوئے تھے، مرد عورت، لڑکے، بوڑھے سب جھونپڑیوں میں پڑے ہوئے تھے، ان جھونپڑیوں میں خود جا کر بیمار پرسی کرتے اور دوا بتاتے، ایک مرتبہ اتفاق سے میں بھی حاضر تھا، مجھے ساتھ لے کر تشریف لے گئے اور دیر تک گنواروں کو سمجھاتے اور دوا بتاتے رہے، اس تنگ جھونپڑی میں

دیر تک مریض کے پاس کھڑے رہنے سے جو تکلیف مجھے ہوئی تھی، وہ آج تک یاد ہے۔

طبیعت میں کاہلی نام کو نہ تھی، جو کام جس وقت کرنے کا ہوتا اسی وقت انجام کو پہنچاتے، ایک شخص نبض دکھا رہا ہے، اس کے مرض کی تشخیص کر کے نسخہ لکھ کر دیا، ایک نے کہا مجھے تعویذ لکھ دیجیے، اس کو تعویذ لکھ کر دیا، ایک کھڑا ہے کہ اس طرح پر مجھے غزل لکھ دیجیے، کوئی کسی کی ولادت یا وفات کی تاریخ یا شادی کی منظوم نوید لکھوانے آیا ہے، وہ ہر ایک کی فرمائش پوری کر رہے ہیں، پڑھنے والے کتاب لیے بیٹھے ہیں، ان کے سبق شروع ہو گئے، گھر میں ان کا خلوت خانہ علاحدہ تھا، وہاں صرف ایک مشغلہ تھا، کتب بینی اور تصنیف و تالیف۔

تصنیفات کا ایک دفتر بے پایاں تلف ہو چکا ہے، جو نام مجھے یاد ہیں وہ یہ ہیں:

تاریخ تکھیل کھنڈ اردو، ناگور میں لکھی تھی، چمنستان اردو، اردو صرف و نحو کی بسیط کتاب ناگور یا ساگر میں لکھی تھی، جوش دل اردو کا پہلا دیوان، پریم راگ بھاشا کا دیوان، دیوان فارسی اور رقعات فخر یہ دونوں حیدر آباد میں لکھے تھے، کیا عجب ہے کہ ان دونوں کی نقلیں ان کے حیدر آبادی شاگردوں کے پاس ہوں، دیوان خیالی تیسرا دیوان اردو کا جس کو بھوپال میں ترتیب دیا تھا، مثنوی بہار تسلیم، جان فخر، فغان فخر تینوں مثنویاں لکھنؤ میں یا وہاں سے آنے کے بعد وطن میں لکھی تھیں، ان میں سے فغان فخر ذو بحرین تھی، ان کے مسودے میرے بچپن تک موجود تھے، فغان فخر کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یاس ہے اب عشق کی تاثیر سے — پھر گیا دل نالۂ شب گیر سے
آہ سے جاتا رہا بالکل اثر — کرتی ہے اب نفع کے بدلے ضرر
حسن کے گل سے اڑی بو مہر کی — لذت الفت نہیں باقی رہی
جل گئے پروانہ کے مانند ہم — خاک میں اب تک وہی ہے سوز غم
وحشت دل کا وہی ہے زور و شور — ہو گئی شیرینی جان ہائے شور
آتش جاں سوز ہے یہ بد بلا — پانی سے بجھتا نہیں اس کا جلا

بے سلسلہ

جوش میں وحشت کے جب آتا خلل | تھام کے دل پڑھتا یہ آخر غزل
عادت مشق ستم اچھی نہیں | اتنی بھی غفلت ستم اچھی نہیں

چشم تھی تر آہ کا لب پر دھواں | نبض تھی ساقط دل مضطر تپاں
لوٹتا تھا خاک پر بسمل کی شکل | پھرتی تھی پر آنکھ میں قاتل کی شکل
جلتا تھا اس آگ میں جس کا دھواں | دیدۂ ظاہر سے رہتا تھا نہاں
برق کی صورت کبھی آتی ہنسی | ابر کے مانند میں روتا کبھی
ناخن وحشت سے تھا سینہ فگار | فاش تھا رازِ دل و جاں بے قرار

"بہارِ تسلیم" کا رنگ ملاحظہ ہو

مدحِ سخن

ہے لطف سخن نیا ہمیشہ | یہ بات ہے شوق زا ہمیشہ
ہے مخزن راز ہائے لاریب | کہتے ہیں اسے خزانۂ غیب
گلزار سخن سدا ہے باقی | فانی ہے زباں، صدا ہے باقی
کرتی ہے کرشمہ شکل دلدار | آغوش سخن میں بکر افکار
شبدیز سخن ہے کلک شاعر | ہے ملک کلام ملک شاعر
گلزار خیال ہو سخنور | رکھتا ہے بہار تازہ و تر

جانِ فخر کا نمونہ

ہوگئی باہم جو دونوں کی نظر | آئی آفت ایک بیچارہ کے سر
ہاتھ سے جاتا رہا دامان ضبط | دل کی وحشت نے بگاڑی شان ضبط
راہ راہ اپنی گئی وہ تو گزر | یہ دل صد پارہ اپنا تھام کر

بستر غم پر گرا زار و نزار | دم بدم بڑھنے لگا رنج و فشار
دل میں برپا اک قیامت کا الم | پر بہ پاسِ وضع آنکھیں تھیں نہ نم
تھم نہ سکتا اس سے جب گریہ کا جوش | اٹھتا یہ بیساختہ دل کا خروش

غزل

پاس جب تک وہ قمر آتا نہیں | دل سنبھلتا اب نظر آتا نہیں
ڈر سے اشکوں کا بھی ٹوٹا سلسلہ | سوے مژگاں اک گہر آتا نہیں
فرط بیتابی سے وہ دن کون ہے | منہ تلک اپنے جگر آتا نہیں
دیدۂ و دل میں تو کب کا آبسا | گھر میں وہ ظالم مگر آتا نہیں

ایک مثنوی بھوپال میں کسی کی فرمائش سے لکھی تھی، زرافشاں اس کا نام تھا، گلزار نسیم کی بحر اور نسیم کے رنگ کی مثنوی تھی، علاوہ ان کے فارسی اور اردو کے بیسیوں قصیدے جو حمد ونعت یا اپنے شیوخ واساتذہ کی مدح میں لکھے تھے، تلف ہو گئے، ان کے کچھ کچھ شعر بطریق انتخاب مہر جہانتاب میں درج ہیں، نمونہ کے طور پر چند قصیدوں کے اشعار نقل کرتا ہوں۔

فی التوحید

اے بجسم ساتگیں از بادہ جاں انداختہ | مرزیاں از نکتۂ اندر زیاں انداختہ
نسر عرفاں طائرت در جیب منقار خودش | پر عنقا بہر نسبت آشیاں انداختہ
نو عروس لفظ را از حرفہا بستہ نگار | زلۂ معنی بلفظ اندر دہاں انداختہ
تیر فکر ہر کہ بر روے نشاں شد بوسہ گیر | خویشتن را از سر نام ونشاں انداختہ
بہر ہیچ جنس سرسبزی امید بہار | دست امکاں زر بدامان خزاں انداختہ

منم کہ مہر جہانتابم از بریق ضمیر | برخ کشیدہ ز آزرم آں نقاب زریر
چو عکس خامہ من چشم حاملہ بیند | شود مشیمہ دروں کور عقلی نقد بصیر

بزہرہ آب کند شیر در نیستانہا | برآرد از نے کلکم زحرف رزم صریر
کشد بپائے چو طاوس خامہ نقش بزم | ہمائے ہوش عطارد کند بدامِ اسیر
بجام لفظ شراب معانیم طوقیست | بگردن خرد و پائے فہم را زنجیر

رفتم اے آز زباب تو بہ حرماں رفتم | خلعت آرزو آوردم و عریاں رفتم
غنچہ بودم زکشودن چو سبک روح شدم | برسر باد چو بوئے گل خنداں رفتم
نکہت اندر دہن غنچہ بدایں آمد و رفت | آمدم صورت باد و صفت جاں رفتم
گاہ چوں ابخرہ از ارض برافلاک شد | گاہ چوں قطرہ فرو گشتہ بعماں رفتم
از نگاہ عرفاء دور فتادم چوں تجلی | وز دل اہل نظر صورت احساں رفتم
کس ندانست دواے دل عصیاں خیزم | بر در گبر شدم پیش مسلماں رفتم

عشق پا کم نگر اے دل کہ پس از خاک شدن | خانہ بردوش ہوا بر در جاناں رفتم
ہچو ذرات در انوار رخش رقص کناں | تا بجولا نگہ قدس از رہ ایقاں رفتم

لالہ گونم کفن از تیغ تمنا بسمل | جامہ رنگیں جو گلے رنگ شہیداں رفتم
زلف فکرم شدہ پیچاں برخ دولت وزر | گاہ در ہند شدم گاہ بکرماں رفتم

نکرم دست کشید لطف و کرمی کہ ازو | تا بصبح اہل از شام غریباں رفتم
آں رحیمے کہ بہر بار سرائے قربت | در دلش بے زدن حلقہ بسنداں رفتم
معصیت گشت دلیل رہ غفراں از وے | خار در پائے زصحرا بخیاباں رفتم

فی التوحید

نور وحدت را ضرورت از حجاب کثرت ست | ذرۂ خاکم ولیکن ہست گوہر آفتاب

سیرت اندر صورتم بیں لفظ را معنی طلب — بازی دیگر کند ہچوں کبوتر آفتاب
اخگر روشن ز خاکستر حجاب اندر بود — جرم تن چوں مجمر خاکی و اخگر آفتاب
ہمت عالی فرو نار و سر خود پیشکش — طبع من یاست ما بخشندۂ زر آفتاب
گرچہ دل گرمم ہمی لرزد ز چرخ سرد مہر — سایہ بر آبے ہمی لرزد چو مضطر آفتاب
ہاں مگر دستم کشد اصلم کہ پیش رفتنش — ہچو من فرعی بود وز ذرہ کمتر آفتاب
شامگاہاں چوں ہمی بوسد زمین خدمتش — می بر آید ہر سحر با تاج انور آفتاب
گر رخ او جلوہ نمودے بچشم دیدہ ور — می نمودش حلقۂ زلف معنبر آفتاب

اے باکسیر توالت بوتۂ زر آفتاب — بہر ظرف سفرۂ عام تو زرگر آفتاب
نوعروسان بہاراں را حلے بندے ز تست — میدہد ہم مہرگاں را از تو زیور آفتاب
زلف لیلائے شب از سودائے لطف مشک بو — عارض سیمین قیس روز یکسر آفتاب

چیست کہ مہر منیر خلعت زر یافتہ — چرخ ز ماہ شہیر تاج گہر یافتہ
خشک خزاں راد ہن فصل گل اندر چمن — بلبل شیریں سخن نغمۂ تر یافتہ
آب بقا را اثر باد نمو را ہنر — خاک سکوں از سفر شعلہ شرر یافتہ
صحن چمن را بہار شاخ پر از برگ و بار — دشت گل نو بہار خردۂ زر یافتہ
ابر سیہ قطرہ ہا قطرہ گہر را بہا — گوہر روشن ضیا بحر درر یافتہ
تاک مے خوشگوار نرگس شہلا خمار — گل ورق آبدار تازہ و تر یافتہ

عالم کون و فساد دل بسکوں در نہاد — ملک دکن را سواد زیب دگر یافتہ

جشن نوروزی عید است گل افشاں امروز — غم فردا الم دی شدہ پنہاں امروز
بہ بہاری شدہ افلاک خزاں را گردش — کہ زمیں را خس و خار است گلستاں امروز

عمل نیک تو آورد فردوس زبہشت — کہ بہر سو چمن آرا شدہ رضواں امروز
بسکہ شد سوختہ و بیختہ عود و عنبر — مشک بیز است ہوائے پرمرغاں امروز
بادۂ ناب بر در شک بآب خالص — سبزہ شد غیرت صد دستۂ ریحاں امروز

ایک سو بیس شعر کے قصیدہ میں سے چند شعر بغیر کسی سلسلہ کے:

سپیدہ دم تتق خواب شد ز دیدہ چو دور — نمود جلوہ در آغوش دل عروس سرور
مہ دو ہفتہ زلوح جبینش داغ بدل — غریق لجۂ تشویر پیش او کافور
کمان ابروے آں بت کشیدہ گر بیند — کنند چلہ کشاں خم بسجدہ فرق غرور
بدیدنش شدہ بادام بندۂ بے دام — بشوخیش شدہ بیمار نرگس مخمور
ستادہ یک طرف اسپانِ باد پیمایاں — کہ طے کنند بیک گام عرصہ ہائے دہور
بیال کاہکشاں و بدم چو پروینی — چو گل بکثرتِ رنگ و بچہرہ ہمچوں حور
گہ رکوب چو برق و گہ سکوں چو زمیں — گہ قتال چور عدو دم صدا چوں صور

دہ چہ خورم بود گلستانے — غنچہ خنداں و ابر گریانے
برکلالہ بنفشہ چشمک زن — بر سر زلف سنبلستانے
گل تر رشک خد گلرویاں — یاسمیں ہمچو ماہ تابانے
نرگس نیم خواب وزیدہ — دیدہ بکشادہ چوں نگہبانے
شدہ رطب اللسان گل سوسن — چمن دہر را غزل خوانے
بادا زرشح آب برسر خاک — فرش گستردہ سبز دامانے
طوطی سبز فام از مستی — برسر شاخ شکر افشانے
ویں ہمہ زیب و زیں کے باشد — کاندراں باغ شد انسانے
ہست او آنکہ بے شک و شبہت — عالمش تن بود و او جانے

حل کن عقدہائے لاینحل ملت و ملک را نگہبانے
پایہ بر ترکن فنونِ ملل مایہ دار علوم ادیانے

اردو قصیدوں میں سے صرف ایک قصیدے کی تشبیب پیش کرتا ہوں:

آگیا سامنے وہ بت دل و دیں کا دشمن رخصت اے شیخ حرم کفر ہوا تو بہ شکن
کیا کہوں کیا نظر آیا رخ کافر میں مجھے طالب رشتہ زنار ہے ہردم گردن
ہے تمنا کہ لکھوں اس کا سراپائے جمال سخن حسن سے لبریز ہے آغوش دہن
زلف ہے یا شب دیجور کہ جس کے آگے شام غربت سے زیادہ ہے رخ صبح وطن
اس کی ہر ایک گرہ سے ہے پڑی دل میں گرہ کھل گئی یاں گرہ زلف چلیپائے سخن
مہ یک ہفتہ کہوں اس کو اسے ابر سیاہ یا اسے بال کہوں اس کو جبین روشن
شکل ابرو سے یہ ہوتا ہے نظر کو دھوکا دو ہلال ایک جگہ حق نے کیے جلوہ فگن
سرمگیں ناز بھرے دید کے قابل دیدے نشۂ حسن میں سرشار خرد کے رہزن
بینی اس شوخ کی ہے حسن کے شعلہ کی لو دیکھ کر جس کو ہو پھر غنچہ گل برگ سمن
مہر و مہ صدقہ ہوا کرتے ہیں دونوں رخ پر پانی پانی ہوئے جاتے ہیں جوانانِ چمن
لب ہیں یا تعبیہ ہیں درج دہن پر یاقوت یا ہیں دو پنکھڑیاں گل کی لطیف و احسن
غنچۂ گل ہے دہن اس پہ مستی کا جوبن ایک ہی شاخ میں پھولے ہیں گلاب و سوسن

والد مرحوم کی جو تصنیفات ضائع ہونے سے بچ گئی ہیں، ان میں سب سے زیادہ عجیب کتاب مہر جہاں تاب ہے، فارسی زبان میں ایک جلد اس کی فل اسکیپ کی تقطیع میں تیرہ سو صفحوں پر تمام ہوئی ہے، دوسری جلد آدھی لکھی تھی کہ عمر نے وفا نہ کی۔

پہلی جلد میں تین دفتر ہیں، دفتر اول میں علوم و فنون متعارف و غیر متعارف کے مسائل لکھے ہیں، جس طرح سے سیوطی نے نقایہ اور اس کی شرح میں لکھے ہیں، دوسرے دفتر میں انبیائے کرام، اہل بیت، صحابہ، تابعین، محدثین، علما، حکما اور مشائخ کے حالات جدا جدا

قلم بند فرمائے ہیں، تیسرے دفتر میں عربی، فارسی، اردو اور بھاشا شاعروں کے تذکرے علاحدہ علاحدہ درج کیے ہیں۔

دوسری جلد میں دنیا کا جغرافیہ اور تاریخ لکھنی چاہی تھی جس میں سے ایشیا کا بڑا حصہ ہو چکا تھا، یہ جلد آدھی ہو چکی تھی کہ ان کو یہ بات محسوس ہوئی کہ جس زبان میں یہ کتاب لکھ رہے ہیں، اس کا زمانے نے ورق الٹ دیا ہے اور چند دنوں میں اس کا کوئی سمجھنے والا بھی باقی نہ رہے گا، اس خیال کے آنے سے ہمت پست ہو گئی، چند دنوں کے لیے قلم رکھ دیا، پھر اپنی گزشتہ محنت پر تاسف ہوا اور اردو میں از سر نو لکھنا شروع کیا، دس بارہ جز و لکھ چکے تھے کہ داعی حق کو لبیک کہہ کر خلد بریں کو سدھارے۔

ایک کتاب ان کی سیرۃ السادات فارسی میں ہے، اس میں بھی بڑی تفصیل کے ساتھ سادات کی بہت سی شاخوں کا نسب نامہ دیا ہے اور جن بزرگوں کے حالات ملے ہیں، ان کو بھی ساتھ ہی ساتھ لکھتے گئے ہیں، اس کتاب کا شمار بھی ان کی بہترین تصنیفات میں ہے۔

ایک اور کتاب فارسی میں سیرت علمیہ ہے، اس میں سید شاہ علیم اللہ کے حالات اور ان کے خاندان کے تمام علما، مشائخ اور سادات کے حالات بیان کیے ہیں، یہ بھی بہت مفید اور عمدہ کتاب ہے۔

ایک کتاب عربی میں سبیل النجات ہے، اس میں ہر قسم کی دعائیں جمع کی ہیں اور بطور حزب الاعظم کے اس کو احزاب پر تقسیم کیا ہے اور بین السطور ترجمہ اس کا اردو میں کر دیا ہے۔

ایک کتاب مجربات خیالی اردو میں ہے، اس میں وظیفے، دعائیں اور خاندانی اعمال ہر ایک مرض اور ہر ایک حاجت کے جمع کیے ہیں۔

فخر المطالب سیوطی کی ایک تصنیف کا ترجمہ ہے، ایمان ابوین کی بحث میں یہ کسی کی فرمائش سے کیا تھا، شاہ ولی اللہ کی انصاف فی بیان اسباب الاختلاف کا ترجمہ بھی اردو میں کسی کی فرمائش سے کیا تھا اور حاشیہ پر فوائد لکھے تھے، طالب علمی کے زمانہ میں شرح وقایہ

کا حاشیہ عربی میں لکھنا شروع کیا تھا، اس کے اجزا بطور مسودے کے موجود ہیں۔

شعر و سخن میں میں نے جو کتابیں پائیں یا چھپ گئی ہیں ان میں دیوان فخر حضرت کا دوسرا دیوان ہے جو لکھنؤ میں مرتب کیا تھا، یہ مجھ کو اتفاقاً ان کے ایک شاگرد سے مل گیا، اس میں چند قصیدے، غزلوں کا دیوان، نامے، مسدس، رباعیاں، اخیر میں مناظرۂ شب و روز اردو نثر میں ہے۔

مثنوی ماہ و خورشید بھوپال میں غلام احمد فروغی کی فرمائش سے لکھی تھی، تقریباً پانچ ہزار شعر کی کتاب ہے، اس کا ناتمام مسودہ میرے پاس ہے، کتاب صاف کر کے فروغی کو دے دی تھی، معلوم نہیں انہوں نے کیا کی۔

مثنوی نگار خانہ چیں فروغی کی فرمائش سے بھوپال میں لکھی تھی، یہ بھی ماہ و خورشید کے برابر ہے، اس کو فروغی نے چھپوالیا تھا۔

مسدس خیالی، مسدس حالی کے جواب میں مولوی عبدالعلی مدراسی نے لکھوائی تھی اور انہی نے اس کو چھاپ دیا ہے۔

نثر خیالی، سہ نثر ظہوری کے طرز پر لکھی تھی، فروغی نے احمد جان صوفی کے مطبع میں چھپوایا تھا مگر اب ملتی نہیں، منجیات خیالی ایک مختصر مجموعہ نعت کی غزلوں کا میں نے چھپوایا تھا، اس کے اور ٹکڑے مثلاً واردات خیالی، مناجات خیالی وغیرہ ابھی رکھی ہوئی ہیں، یہ اخیر زمانہ کی تصنیفیں ہیں جب کہ ان کی شاعری کا ذوق جاتا رہا تھا، بچوں اور عورتوں کی فرمائش سے ان کے مناسب حال کچھ فرما دیا کرتے تھے۔

میرے ماموں مولانا سید عبدالسلام رحمۃ اللہ علیہ نے جب رحلت فرمائی تو ان کے شاگردوں اور مریدوں نے فارسی، اردو اور بھاشا میں ان کے حالات لکھے، کسی نے مثنوی لکھی، کسی نے نثر میں لکھا، میرا سن اس وقت چودہ برس کا تھا، دیکھا دیکھی ان کی وفات کی تاریخ فارسی میں میں نے بھی لکھی اور اردو میں مثنوی لکھنا چاہی، مگر اس کا سلیقہ نہ اس وقت تھا، نہ

اب ہے اس لیے میں نے والد مرحوم سے استدعا کی، انہوں نے نظم عالی کے نام سے ایک مثنوی لکھی جو میری طرف منسوب ہے۔

شروع میں اردو فارسی اشعار میں فخر اور بھاشا میں میر تخلص تھا، حیدر آباد میں اردو فارسی میں خیالی تخلص قرار دیا جو اخیر زمانہ تک قائم رہا۔

عربی میں کبھی کبھی تغزل یا مناجات کے اشعار نظم فرمایا کرتے تھے، مہر جہانتاب میں اس کا بھی انتخاب کیا ہے مگر وہ بہت تھوڑا ہے، شاید تیس چالیس شعر ہوں گے۔

راجپوتانہ کی کسی ریاست میں جب چند روز رہنے کا اتفاق ہوا تو ہندی بھی سیکھ لی تھی اور بے تکلف اس میں لکھتے پڑھتے تھے۔

ان کے حالات زندگی پر نظر کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت بڑے ذہین و ذکی تھے، جس طرف توجہ کرتے تھے اس کو بآسانی حاصل کر لیتے تھے، حافظہ کمزور تھا، مقرر بھی نہ تھے، اس کے ساتھ طبیعت میں کم آمیزی کا مادہ تھا اور اظہار کمال سے سخت نفرت تھی۔

یہی وجہ تھی کہ زندگی میں ان کو کم کسی نے جانا اور بایں ہمہ کمالاتِ علمی و عملی وہ گوشۂ گمنامی میں چھپے رہے اور آخر کار ۱۰ر رمضان ۱۳۲۶ھ کو تصنیفات کا بہت بڑا ذخیرہ چھوڑ کر وفات پائی۔

فارسی غزلوں کا انتخاب:

چمن نادیدہ دامِ صید دریابم رسید اینجا — تمنائے تماشائے گلم بیخود کشید اینجا
پر و بالم بیک پرواز صیادے شکست اکنوں — کرا باشد بہ پرواز دگر اے دل امید اینجا

زود آئے کہ یادت بکمین دل و جانست — مشتاق قدوم تو بہر سو نگران است
بشکست دلم چرخ و ہنوزم نگران است — در مشق ستم پیر شد و جور جوان است
اے دوست مپرس از دل چوں زلف پریشاں — بنگر برخ زرد عیاں را چہ بیان است

زچشم انتظار من سیاہی وقف شبہا شد　　تمنا مژدہ بعد از من صباح وصل پیدا شد
چو بودم پر دل از غم خالی از شادی پس از مردن　　دلم شد خاک و ساغر گشت و گریاں چشم مینا شد
دل پر آبلہ می داشت آب زر ز بے کیفی　　نگاہِ چشم مستش رابدل جا داد و صہبا شد

از شکست بند کار از پیش بہتر می شود　　تیغ چوں بر خود شکست آورد خنجر می شود
صحبت روشن دلاں تاریکی دل می برد　　پیش آتش درد می انگشت اخگر می شود

جان را بہ برق جلوہ جانانہ سوختیم　　شوقش زبانہ زد و مستانہ سوختیم
از گرمی ہجوم تمنائے دل چو عود　　پنہاں بسوز ہجر دلیرانہ سوختیم
تابِ سخن نماند بس انیست مختصر　　باشمع ساختیم چو پروانہ سوختیم

اردو غزلوں کا انتخاب:

رہے ہم ہاتھ ہی ملتے جنوں نے پاؤں پھیلائے　　نشانِ تار تک چھوڑا نہیں جیب و گریباں کا
جسے سمجھا تھا دل آرام جاں اے وائے بیدردی　　وہ اک آتش کا پرکالہ ہے خرمن سوزی جاں کا
زمیں ہے مدفنِ نعش اور سینہ مخزنِ حسرت　　دل پر آرزو بھی رشک ہے گورِ غریباں کا

ارمان وصل کا دل شیدا میں رہ گیا　　میں عمر بھر فریب تمنا میں رہ گیا
کیا کیا دیا ہے ساتھ رفیق جنوں نے آہ　　ٹوٹا جو خار دشت کف پا میں رہ گیا

مر کے ٹھنڈے ہوئے تو یہ سمجھے　　عشق تھا وہ جو شعلہ افگن تھا

حسرت ہے پھر وہی کوئی ایسا ہو دلفریب　　کیا کیا نگاہ ناز نے ظالم مزا دیا

مجبور سچ ہے آدمی اس جی کے ہاتھ سے　　دل جس پہ آیا، آیا، جدھر سے پھرا، پھرا

زندگی اک خواب کی سی تھی　　یہ کھلا ہم پہ بعد مردن آج

مسافران خیالات گزرے ہیں کیا کیا — ہمارے دل کا بھی حال ہے رہ گزر کی طرح

شجر گل پہ جو دو چار پر آتے ہیں نظر — تھا کسی وقت یہ بلبل کا نشیمن آباد

مر کر بھی شوخیوں کا تقاضا نہ کم ہوا — باد صبا سے کرتا ہے میرا غبار ناز

نکبت ہے اب تو ثمرۂ دانش زمانے میں — سایہ کا بھی نہیں ہے نہال ہنر سے فیض

ہم کو برسوں میں رقیبوں کے لیے — تین دن میں آئے اس کے چار خط

فخر اس زہد ریائی پہ نہ کرنا زنہار — بندگی کی نہیں پروا ہے وہاں اے واعظ

ہے فصل گل خزاں گئی بدلا ہوا کا رنگ — جمنے لگا چمن میں نسیم و صبا کا رنگ

نکہت گل کی طرح آزاد بربادی سے ہیں — پھرتے ہیں بے قید کیا کیا خانہ ویرانی سے ہم
بے نشانی سے نہیں احساں کسی کا بعد مرگ — پاک ہیں یارو کی رسم فاتحہ خوانی سے ہم

دیکھا تو آپ میرے ہی گھر میں تھے گوشہ گیر — ڈھونڈ آیا بہانہ میں ان کو جہاں تمام

انکار وصل ہوتا تو اقرار سہل تھا — دشوار تو یہی ہے کہ انکار بھی نہیں

وصل میں بھی ادبِ عرض بیاں مانع ہے — ہائے جو دل میں ہے وہ منہ سے نکلتا ہی نہیں

دیکھی اک دن بھی نہ اس باغ جوانی کی بہار — فصل گل میں بھی ہم اے فخر خزاں رکھتے ہیں

گل کھلے گا اور اے بلبل نہ چھیڑ — منہ جو غنچے کا کھلا اچھا نہیں

ہے ابتدائے عشق خیالی ابھی سے آپ — دل پکڑے پکڑے پھرتے ہیں گھبرا ئے جاتے ہیں

مانا کہ حوصلہ وہی اب تک فغاں کا ہے — لیکن ہجوم یاس امید اثر کہاں

غضب کی تیزیاں کرتا ہے ابلق شب و روز　　کسی سوار کا جمتا نہیں رکاب میں پاؤں

محبت سے یہ بت کدھر دیکھتے ہیں　　برا دیکھتے ہیں جدھر دیکھتے ہیں

خود گم رہے کسی کی کبھی جستجو نہ ہو　　دل دے خدا وہ جس میں کوئی آرزو نہ ہو
نظروں سے میں گرا صفت اشک بے اثر　　مجھ سا بھی خلق میں کوئی بے آبرو نہ ہو

خلاف قاعدہ کی مدح تم نے میری غیروں سے　　سمجھتا ہوں مگر میں خوب ان باتوں کے پہلو کو

بہار باغ میں ہو یا خزاں جو ہو سو ہو　　اگر ہمیں نہ رہے تو وہاں جو ہو سو ہو

ایک عالم ہے برابر تپش پیہم سے　　میرے پہلو میں کوئی دل ہے کہ اخگر کیا ہے
خار صحرائے جنوں چارہ گری کرتے ہیں　　جوش وحشت میں مجھے حاجت نشتر کیا ہے

آج آیا ہے دل زار جو لیتے ہو تو لو　　کل مرے پاس یہ نادان رہے یا نہ رہے

بتو سنگ مزار فخر دیکھو　　کہ بعد از مرگ بھی چھاتی پہ سل ہے

حسرت برس رہی ہے مری مشت خاک پر　　چادر نہ پھول کی ہے نہ شمع مزار ہے
دکھلا رہا ہے چرخ پس از مرگ رفعتیں　　باد صبا کے دوش پہ میرا غبار ہے

غنچہ ہے مدتوں سے گل آرزوے فخر　　نا آشنائے لطف نسیم بہار ہے

اپنے ہوتے غیر بیٹھیں ان کے پاس　　یہ بھی اے دل گردش ایام ہے

لبوں پر دم نہ کیونکر آئے جس دم ہمنشیں دل کو　　وفا کی جس سے ہو امید وہ ہی بے وفا نکلے

برآئی اے فلک تجھ سے نا امید ایک بھی دن　　رہا یہ حوصلہ برسوں کہ کوئی حوصلہ نکلے

شیخ صاحب کی نرالی ہے بات یہ سن اور لہو و لعب کیا کہیے

دل وجگر کیوں نہ پیش کردوں سنوں نصیحت میں کیا کسی کی
ستم ہے چتون وہ ترچھی ترچھی وہ بانکی بانکی ادا کسی کی
لٹیں یہ چھوٹی ہیں گیسوؤں کی کہ سرگرانی ہے عاشقوں کو
ادھر سے اتری ادھر کو آئی کسی کے سر پر بلا کسی کی
بھیرویں ۶ گھڑی سے ۹ گھڑی دن تک موسم بارش میں
بدریا گھیرے سیا ما نہیں آوے رے

کبری سوت جس بادر گرجت آنس چویں رت پاوس کیرے رے
یہ تن کبھوں دامن جس چمکے دہ کی گلن نت پھیری رے
بچھوہ رین سانون کیری رتیاں بہور دھوپ پرے کیری رے
نس اندھیاری پنتھ نہ سوجھے میر پیا تمہیں اب کت ہیری رے

آلہیا نو گھڑی دن سے گیارہ گھڑی تک
جاؤ جی تم کشن کنھیا

تم الگرجی اپنے گرجی پھر کو کے نا ہیں سنیا
میر کہوں کیا سام کی گھاتیں ہے چھیلا پت کا لیویا
سارنگ آدھے دن سے ۳ گھڑی دن تک
ٹھنڈی ٹھیاں بنیا ٹھاؤں

ببریا ڈولے جیرہ ہلساوے بولے کوئلیا پیانانوں
پپیہا کوکو، مورو ا بولے میر پیا کا کہہ بدھ پاؤں
گوری ۳ گھڑی دن سے آخر تک یعنی ۶ گھڑی تک
جیرا رہت لبھاوے

اوکلی جو بن بالک ہے کنہیا، سنگ کی سکھی سب پیا سنگ کھیلیں، ہل ہل دھوم مچائے، ہمرے بلمہ پلنا میں جھولیں ہم بیٹھے مرجھائے، ساس نند موہیں نسدن واگیں، ناکو ہوئے سہائے، میر بلمہ نادان نہ ہوں تو کس پہ دکھ ہم پائے۔

یمن ٦ گھڑی شام سے ۹ گھڑی رات تک

اتنا ناپی تم جیرا جارو

سوتن سنگھ تم رین نار ہو چھانڈو پرتھہ نج پاچھو ہمارو
میر پیارو سے کہ میارو تم تونس دن تن من وارو

جھنجھوٹی ۹ گھڑی سے آدھی رات تک

لاگ رہی نت سرت تہاری سدھ بہ بسیار بو بلمھو ہماری
من کے من کے پھیر رہی ہوں تن جل بھن کے بن گئو چھاری
بیٹھی ہوں تمہری آس لگائے راکھیو تراس تا موہیں میں واری
میر سوں بھینٹ کر وہو موہن نس دن تم پر رہت بلہاری

بھاگ آدھی رات سے تین گھڑی رات تک

جن چھوؤ بانکے پار پائل موری ان جھن باجی
ساس بری مورے پھوڑے نیرے نند ہٹیلی گاجی
بھرے جان تو آنکھ ملھیو کاہہ کرم کتو جو ساجی
بہت ستاؤ نہ جگیون ساس ایسو ٹھٹھول جائے راجی
میر کہیو کا آئے کے جگ ماں آئے رہیو کہہ کاجی

سورٹھ ایضاً

اب میں جوگن ہوتھیوں اے پیارے ساتھ

گھائل کر موہن پیا کہوں چھائے　　پھنس گئے پر آری ناری ہاتھ
میر چوندر موی میل بھئی ہے　　سیج پیا دھوکا رس کھات

پرج ۳ گھڑی رات سے ۶ گھڑی صبح تک

سیام کون گن گائے اودھو

نین کچوا لکھیں بسرا ہیں　　بھویں دوبج بجائے اودھو
سارنگ میں امین رس ادھرن　　بیج دسن چمکائے اودھو
میرہ جایا ہر لیکیو تتکھن　　لے کر مرلی بجائے اودھو

کالنگڑا ۳ گھڑی رات سے ۶ گھڑی صبح تک

سونی سندر بن سیج ہماری

سورھواں[16] سنگار برھواں[12] ابرن　　موتیں مانگ سنواری
چوا چندن سو گندھ کیوگھر　　چو مکھ دنیا باری
میر پیا بلمھو کہوں جائے　　سدھ نہ تن کے بساری

بسنت ہر وقت

آئی بسنت بہار سکھی ری کہیں جرد ے چھائے

کوؤ چوندر کو و ساری رنگائے، کیسر رنگ رچائے　　پھرت لیے کرسوں ڈارے، کیل مچو سنسار
ٹیسو پھولے آنبہ بورائے، کوئل سبد سناوے　　ہمراہی بلمہ پردیس ماں چھائے بسرؤ ہے سکر و سنگار
یہ سنسار سیں کر لیکھا، سہسن کھیل کھلاوے　　میر چیو ہر نام رین دن، جو چاہو اپکار

ہولی

موہے ٹھگ گیو بنسی بجیا　　کیسے کروں جیا گئو ہی بھٹک
گرہ انروگ بے پانے نہ نکست　　بنن بنن کے نہیں ڈٹٹ پڑیا
جیو کرتیج اسدھ نہیں ایکو　　ہرگے ہتھی جو کام کریا

جا سوگئے ہردے کے لک

جھمارا بیر کے رنگ ہے مکھ پر آنسو رنگ ہیں نین بہیا
روپ سنگارا ہے سب بگڑا من ہے نہیں جوبن کالو بھیا

جاس رہت کل رنگ چٹک

لاگے کریجے پریم کے گانسے گھاؤ کا ناہیں دکھیا
پیر دکھ نہیں کوؤ دھرت ہے بھینٹ ہے جیرا کا دکھیا

جاس جات کریج مسک

توری چتون کے میر بلہاری پریم نجریا چتویا
ایک نجر ٹک دیکھیں موہن مورے جیا کے بلمبسیا

اب تو مٹاؤ آنکھیں کی کھٹک

☆☆

متفرقات

رات کی بتیاں میٹھی میٹھی تورے جیا سے نکس گئیں رہے

قول و قسم کیو بہتاں گہہ گے اپنی غرض کیو پت موری لے کے

بسر گئو اب سب گن لے کے وہ بتیاں اب کس گئیں رے

پیتم جب سے بدلیس سدھارے ہرم جور کرت ادھکارے

سیر جیا مہیں رہت سنبھارے انکھیاں درس کا ترس گئیں رے

ایضاً

موہ گئے من سانوریا نینن نین ملائے

اک تو روپ انوکھا تا پہ ٹھمک وا کی چال سنمکھ ہوتے نجریا دیت جیا ہولسائے

اس جھل بل دیکھ کے دھیر دھرے کب جیو دیکھ کے سونی سجریا میر رہونا ہیں جائے